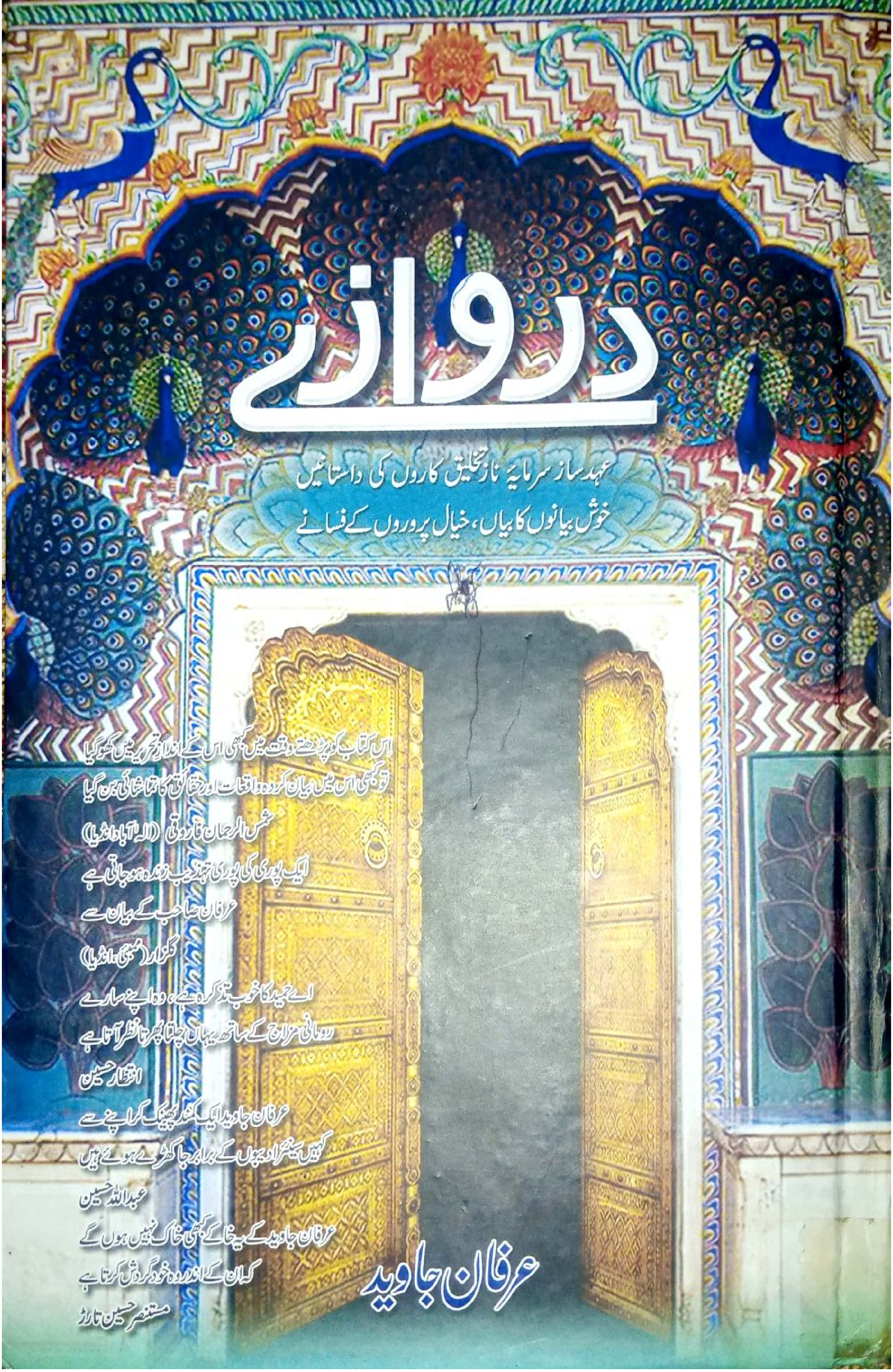

دروازے

عہد ساز سرمایۂ ناز تخلیق کاروں کی داستانیں
خوش بیانوں کا بیاں، خیال پروروں کے فسانے

اس کتاب کو پڑھتے وقت میں کبھی اس کے اندازِ تحریر میں کھو گیا
تو کبھی اس میں بیان کردہ واقعات اور حقائق کا تماشائی بن گیا
شمس الرحمان فاروقی (الہ آباد انڈیا)

ایک پوری کی پوری تہذیب زندہ ہو جاتی ہے
عرفان صاحب کے بیان سے
گلزار (ممبئی، انڈیا)

اے حمید کا خوب تذکرہ ہے، وہ اپنے سارے
رومانی مزاج کے ساتھ یہاں چلتا پھرتا نظر آتا ہے
انتظار حسین

عرفان جاوید ایک کمند پھینک کر اپنے سے
کہیں سینئر ادیبوں کے برابر جا کھڑے ہوئے ہیں
عبداللہ حسین

عرفان جاوید کے یہ خاکے کبھی خاک نہیں ہوں گے
کہ ان کے اندر وہ خود گردش کرتا ہے
مستنصر حسین تارڑ

عرفان جاوید

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے ساتھ شامل ہونے
کے لیے ہم سے رابطہ کر سکتے
ہیں ہمیں امید ہے آپ کو یہ
کاوش پسند آئے گی

منیجنگ ڈائریکٹر: 03056406067

انتظامیہ

:03340120123/03168782185

aʒjp:03478848884

دروازے

(خاکے)

عرفان جاوید

Arslan Raza Book Bank
and Library Suppliers
Panjab University Old Campus New Anarkali Lahore.
0307-4198217 0323-4251011

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4394 Javed, Irfan
Darwaazay/ Irfan Javed.- Lahore :
Sang-e-Meel Publications, 2017.
256pp.
1. Urdu Literature - Essays.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2017ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2997-9
ISBN-13: 978-969-35-2997-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ابو اور امی کے نام

[illegible]

سپردم به تو مایهٔ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

دریچے

پارس 9 احمد ندیم قاسمی

بارش، خوشبو اور سماوار 29 اے حمید

شریر 45 احمد فراز

کاہن 57 مستنصر حسین تارڑ

باگھ 85 عبداللہ حسین

کامریڈ 109 احمد بشیر

کھلکھلاتا آدمی 129 عطاء الحق قاسمی

بازی گر 147 شکیل عادل زادہ

نانگا پربت 185 تصدق سہیل

ٹِلّا جوگیاں کا مصلّی 205 نصیر کوی

دوسرا آدمی 217 جاوید چودھری

دُھندلا آدمی 245 محمد عاصم بٹ

پارس

احمد ندیم قاسمی

دو مناظر ہیں،
اِن مناظر میں صدی بھر کا فاصلہ ہے۔

پہلا منظر بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی راج کے لاہور کا ہے۔ زندہ، دھڑکتا، ثقافتی رنگوں کی پچی کاری سے سجا، موسیقی کی لذیذ دھنیں بکھیرتا شہرِ لاہور جس کے مقامی باسی قدیم فصیل کے اندر آباد اور باہر چھلک آنے والی چند آبادیوں کے ماحول کو اپنی چہل پہل، قہقہوں، خوانچہ فروشوں کی صداؤں، رنگا رنگ پہناووں، سفید تہہ بندوں، رنگین پگڑیوں اور سرخ تلک سے آباد رکھتے۔ چوڑیوں کی جھنکار، قہقہوں کی پھوار، صبح سویرے ڈالیوں پر اُتر آنے والے پرندوں کی چہکار، موذن کی پکار اور تھا تھئی تھا، تھا تھئی تھئی تھئی تھتھا تھتھا کے قدموں میں نچھاور ہوتے سکوں کی چھنکار میں ایک اور آواز بھی گھلتی ملتی تھی۔

انگریز نے ایک ترتیب اور شکوہ سے مخصوص برطانوی طرزِ تعمیر کا نیا سرسبز لاہور بساطِ زمین پر کھینچا تھا۔ یہ ٹھنڈی سڑک اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والی گھنے درختوں میں گھری متمول چھدری آبادیوں پر مشتمل تھا جو بھنگی کی توپ سے شروع ہو کر میاں میر چھاؤنی میں جا تھمتا تھا۔ اسی ٹھنڈی سڑک پر نرسنگھ داس نامی ایک متمول ہندو نے وکٹورین طرز کی ایک شان دار کوٹھی تعمیر کروائی۔ یہ کوٹھی ٹھنڈی سڑک پر اسی طرح ایک جگمگاتا ہیرا تھی جس طرح ہند کو تاجِ برطانیہ کا سب سے خیرہ کُن ہیرا کہا جاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف باغات تھے جن میں گلاب، موتیے، نرگس، رات کی رانی اور چنبیلی کے پھول رنگ دکھاتے اور بیرونی گیٹ سے شروع ہو کر ایک سڑک اندر صدر دروازے تک باقاعدہ بَل کھاتی آتی۔ اونچے آہنی شہتیروں پر لیٹی چھتیں کمرے ٹھنڈے رکھتیں، ساتھ میں روشن دان جن کے ساتھ لمبی ڈوریں لٹکتی ہوتیں اور بڑی چوبی جالی دار کھڑکیاں اِنھیں روشن اور ہوادار رکھتیں۔ اس کوٹھی میں اکثر و بیشتر عمائدینِ شہر دعوتوں پر مدعو کیے جاتے۔ ان میں انگریز جوڑے اور متمول مقامی لوگ شامل ہوتے۔ ایک رقص گاہ تھی جہاں جوڑے موسیقی کی دھنوں پر بانہوں میں بانہیں ڈالے اس وقت تک تھرکتے جھومتے رہتے جب تک صبح کا ٹھنڈا میٹھا دودھیا نور آسمان کی سیاہ چادر پر اُبھر نہ آتا۔

پس نرسنگھ داس کی کوٹھی سے اُٹھنے والی موسیقی اور ایڑی دار رقص کرتے جوتوں کی ٹک ٹک دور کہیں تھا تھئی کی تال میں گُھل مِل جاتی۔

دوسرا منظر اُسی صدی کے اواخر کا ہے۔ نرسنگھ داس کی وہی کوٹھی اور وہی ٹھنڈی سڑک جو اَب مال روڈ کہلاتی ہے۔ اب اِس سڑک پر ٹریفک بہت بڑھ چکا ہے۔ تانگوں کی ٹپ ٹاپ کی جگہ موٹر کاروں اور اسکوٹروں کا نکیلا شور لے چکا ہے۔ اس عمارت کو ایک کچا تنگ رستہ جاتا ہے جس کے ایک جانب جھاڑ جھنکار اور دوسری جانب ڈھیتی ہوئی سال خوردہ دیوار چلتی چلی جاتی ہے۔ سامنے بوسیدہ ہوتی عمارت ہے جس سے چونا جھڑ رہا ہے۔ صدر دروازہ مقفل ہے البتہ بائیں دروازے سے داخل ہوں تو دائیں جانب ایک چھوٹا سا کمرا ہے جس میں ایک بوڑھا شخص سر جھکائے ٹائپ رائٹر پر کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف ہے۔ آگے جائیے تو سامنے ایک اور دروازہ ہے۔ یہ دروازہ ایک بڑے کمرے میں کھلتا ہے۔ کمرے میں قدامت سانس لیتی ہے۔ ایک جانب بڑی سی کھڑکی باغیچے میں کھلتی ہے۔ کمرے میں چہار جانب کتابوں کے انبار ہیں۔ پچھلی دیوار پر دو بلیک اینڈ وائٹ تصاویر آویزاں ہیں، حمید احمد خان اور امتیاز علی تاج کی تصاویر۔ وسط میں ایک بڑی میز ہے۔ میز کے پیچھے ایک سفید بالوں والا منحنی شخص کان میں آلۂ سماعت اُڑسے کوئی مسودہ پڑھنے میں منہمک ہے۔ اُس شخص کی ٹھوڑی کے قریب گال پر زخم کا نشان ہے۔ وہ شخص مسودے سے نظریں اٹھاتا ہے اور قریب پڑے مگ سے گھونٹ بھرتا ہے اور سر جھکا کر مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

یہ نوے کی دہائی کا واقعہ ہے کہ یونی ورسٹی کا ایک طالب علم دروازہ کھٹکھٹا کر کمرے میں جھجکتا ہوا داخل ہوتا ہے اور میز کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے۔ بزرگ، نوجوان کو استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہے اور شائستگی سے سامنے کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہے۔ نوجوان بیٹھ جاتا ہے اور اپنا ادھورا سا تعارف کروا کر ایک مسودہ بزرگ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ بزرگ غور سے مسودہ دیکھ کر ورق گردانی کرتا ہے اور پوچھتا ہے۔

’’آپ انگریزی میڈیم کے پڑھے ہوئے لگتے ہیں، اُردو لکھائی سے ظاہر ہوتا ہے۔‘‘

نوجوان اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔ بزرگ گھنٹی بجاتا ہے، چپراسی آتا ہے، اُسے چائے کا کہہ دیا جاتا ہے۔ بزرگ مسودہ میز کی دراز میں رکھ دیتا ہے اور شگفتہ لہجے میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔

بات جب چل نکلتی ہے تو نوجوان بتاتا ہے کہ کئی دہائی پہلے اُس کی والدہ کا خاندان جناب کے ہمسائے میں نسبت روڈ پر رہتا تھا۔ بزرگ کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک آجاتی ہے اور وہ کھڑکی سے باہر چہچہاتی چڑیوں اور بلبلوں کو دیکھنے لگتا ہے اور کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔ باہر چڑیوں کی چہچہاہٹ میں رقص کرتے قدموں کی چاپ گھلتی جاتی ہے۔

جب نرسنگھ داس نے وہ عمارت تعمیر کی تھی اور وہ رقص گاہ کے ایک کونے میں کھڑا آسودہ جوڑوں کو رقص کرتے دیکھتا تھا اور مسکراتا تھا تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں، بہت بعد، برصغیر کا ایک نابغۂ روزگار ادیب بیٹھے گا۔ نرسنگھ داس نے رقص کی چاپوں میں زبانِ اردو کے عظیم دماغوں اور ادبی اساتذہ کی آمد و رفت کی آوازیں نہ سنی ہوں گی۔ پھر یہ کیسے ممکن کہ اُس نے مجھ جیسے نوآموز ناپختہ کار یونی ورسٹی کے طالب علم کے جھجکتے قدموں کی چاپ سنی ہو۔ ممکن ہے کہ رات کے پچھلے پہر سب مہمانوں کو رخصت کرکے، خمار کے اُس عالم میں جب کبھی، شاید کبھی، ماورائی انکشاف بجلی کے مانند دماغ پر کوند جاتا ہے، یہ سب اُس پر وارد ہوا ہو......شاید۔

پہلی ملاقات میں لمبے لٹکتے ہوئے پرانے پنکھے کی گھرر گھرر، روشن دان سے آتی سنہری دھوپ کی ترچھی کرنیں، کھڑکی کی جالی سے ٹکراتی کھیلتی چڑیاں اور کمرے میں سانس لیتی قدامت کے خستہ اوراق سے مماثل مہک مجھے تذبذب میں مبتلا کرتی تھیں کہ میں بیسویں صدی کے اوائل میں سانس لیتا ہوں یا اواخر میں زندگی برت رہا ہوں۔ سامنے منٹو، بیدی، کرشن چندر اور فیض کے ہم عصر احمد ندیم قاسمی صاحب بیٹھے اوراقِ زندگی لمحہ لمحہ پلٹ رہے تھے اور میں ایک بھرپور دور کی ترجمانی کرتے اُستادِ ادب کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ پہلی ملاقات، لاتعداد ملاقاتوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ چند روز بعد میں اُن کے پاس دوبارہ گیا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے خبر دی کہ میرا افسانہ معمولی ترمیم کے بعد سہ ماہی ''فنون'' میں شائع کیا جا رہا ہے۔

آج جب ہندوستان کا مایۂ ناز فلم ساز اور ادیب گلزار کہتا ہے ''میں بابا کی سال گرہ ''فنون'' کا شمارہ سامنے رکھ کر اور کینڈل جلا کر مناؤں گا۔'' رات کے اس پہر قاسمی صاحب کے چلے جانے کے کئی برس بعد میں ہمت پاتا ہوں کہ اُن کی ذات پر، عقیدت علیحدہ کرکے کچھ لکھوں تو پیچھے مجھے یادوں کے شبستان کے مقدس تالاب پر واقعات روشن دیوں کی طرح تیرتے نظر آتے ہیں۔ سو یہ احوال صرف ادیب احمد ندیم قاسمی کا نہیں بلکہ احمد شاہ نامی آدمی کا بھی ہے۔

محمد خالد اختر نے قاسمی صاحب پر لکھے خاکے میں ایک کالج ڈرامے کا احوال بیان کیا ہے جس میں ان دونوں نے حصہ لیا تھا۔ ڈراما بڑے کر و فر سے شہر کے واحد سینما ہال میں سٹیج ہوا۔ اسے دیکھنے کے لیے بہاول پور کے سبھی افسران اور معززین مدعو کیے گئے تھے۔ اس ڈرامے میں نوجوان احمد ندیم قاسمی نے اپنا رول بخوبی ادا کیا، البتہ خالد اختر کے پیر لڑکھڑا گئے۔ اس پر سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا اور کئی ایک نے آوازے بھی کسے۔ ''واحد شخص جو مجھ پر نہ ہنسا، ندیم تھا۔ اس نے کبھی اس کا ذکر تک نہ کیا۔'' یہ وضع قاسمی صاحب کی شخصیت کا اخیر تک حصہ رہی۔ کوئی نظم، غزل یا افسانہ انھیں اشاعت کے لیے بھیجا جاتا اور وہ ان کے معیار پر پورا نہ اترتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ یہ اُن کے معیار کے مطابق نہیں بلکہ وہ اکثر و بیشتر یہی کہتے کہ نظم یا افسانہ اُس شاعر یا افسانہ نگار کے معیار کا نہیں۔ اسی طرح اگر مضافات سے کوئی ملاقاتی آتا تو وہ اسے بھی اسی گرم جوشی سے اُٹھ کر ملتے جتنا پرانے شناسا ادیب کو۔

مجلسِ ترقیِ ادب کے دفتر میں بے شمار سویرے، دوپہریں، سہ پہریں اور شامیں اس طرح گزریں کہ وہ اپنے پرانے دوستوں اور معاصر ادیبوں کے قصے سناتے اور میں یک سُو ہو کر انھیں سنتا رہتا۔

جب کبھی اُن کے بچپن کا تذکرہ ہوتا تو وہ اسے شدت اور ناسٹلجیا سے یاد نہ کرتے کیوں کہ ان کے وہ دن بہت مشکل اور تنگ دستی میں گزرے تھے۔ البتہ اُس دور کا مشاہدہ، قدرت اور ماں کی محبت کی یادِ ایامِ رفتہ کی کلفتوں پر غالب آجاتی اور ان کی آواز بھیگ بھیگ جاتی۔ ان کی سون سکیسر سے جذباتی وابستگی تحریروں اور گفتگو پر غالب رہی۔ لہلہاتے کھیت، امڈتے بادل، ڈھلی پہاڑیاں، چکراتی بل کھاتی پگ ڈنڈیاں، بیکڑ کے پھول کی جڑ میں مٹھاس کا موتی، چٹختی چٹانوں کی دراڑوں سے پھوٹتے جنگلی پھول، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو، نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی سڑک، بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادروں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ، مکئی کے بھٹوں کے لانبے لانبے سنہرے بالوں میں مکئی کی مہک، رات کے سناٹے میں اونٹ کی گھنٹی یا خچر کے ٹاپ، مینہ کے چھینٹے، موسلا دھار بارش کی عمودی دیواریں اور سیاہ بادلوں سے بجلی کے لشکارے اُن کی تحریروں میں دَر آتے ہیں۔

بچپن کے مشاہدۂ قدرت نے ان کے تحت الشعور میں ایسا ورود کیا کہ بعد کے مستقر ان کے اندر اس طرح جگہ نہ بنا سکے۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ کیا کبھی لاہور نے جذباتی طور پر ان کے اندر جگہ بنائی تو انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا اور بتایا کہ انھیں لاہور سے کبھی وہ جذباتی وابستگی محسوس نہ ہوئی جو آبائی علاقے سے تھی۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ لاہور اتنا بدل گیا ہے کہ اگر کوئی اصحابِ کہف کے مانند مدت کی نیند سے بیدار ہو کر اِدھر لوٹے تو اسے قطعی طور پر پہچان نہ پائے۔

لڑکپن کی ایک یاد کا کئی مرتبہ انھوں نے ذکر کیا جب وہ 1937ء میں دو بزرگوں کے ہم راہ علامہ اقبال سے ملنے گئے تھے۔ ان بزرگوں میں سے ایک عبدالمجید سالک تھے۔ ان دنوں اقبال کافی بیمار تھے، ان کا گلا ٹھیک نہیں تھا۔ آواز بھی باریک ہو چکی تھی۔ دونوں بزرگ اقبال سے گفتگو کرنے لگے اور نوجوان قاسمی انھیں عقیدت سے دیکھتے رہے۔ اقبال اس وقت حقے سے بھی شوق فرما رہے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک بزرگ نے حقے کی جانب اشارہ کر کے لقمہ دیا 'علامہ آپ کا اس حقے کی خودی کے بارے میں کیا خیال ہے۔' اقبال اشارہ سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے حقے کا رخ اُن کی جانب کر دیا۔

ایک مرتبہ میں نے اُن سے پوچھا کہ ادب میں باقاعدہ آمد اور ابتدائی تربیت میں وہ کس کو سب سے اہم سمجھتے ہیں تو انھوں نے عبدالمجید سالک کا نام لیا اور بتایا کہ وہ ایکسائز کے محکمے کی ملازمت سے حد درجہ بیزار تھے، جہاں ان کا منشیات کے معاملات سے واسطہ پڑتا تھا۔ انھوں نے سالک صاحب کو خط لکھا اور درخواست کی کہ کوئی متبادل اور مزاج سے ہم آہنگ سلسلۂ روزگار کی جانب راہ نمائی کی جائے۔ سالک صاحب تب تک قاسمی صاحب کی تحریروں اور شاعری سے خاصے متعارف ہو چکے تھے۔ چناں چہ انھوں نے بچوں کے رسالے 'پھول' کی ادارت کی پیش کش کی۔ قاسمی صاحب نے فوراً قبول کر لی۔ بعدازاں قاسمی صاحب نے 'تہذیب نسواں' کی ادارت بھی کی جو ادب کے سنہرے دور میں ان کی آمد کا وسیلہ بھی بنی۔

یہ اُسی دور کی بات ہے کہ بیدی، منٹو، کرشن چندر اور اردو ادب کی کہکشاں کے درخشندہ ستاروں سے ان کے ذاتی تعلق کا آغاز ہوا۔ ایک روز میں نے پوچھا کہ اتنے قد آور ادیبوں اور دیگر نمایاں لوگوں کے ساتھ تعلق میں اپنے دِل کے سب سے نزدیک کس کو پاتے ہیں۔ اس پر وہ گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

''نادروان گاڈیا'' وہ بالآخر بولے اور بتایا کہ گاڈیا صاحب اینگلو انڈین تھے، معروف کتب خانے فیروز سنز میں ملازم تھے اور چند برس پہلے فوت ہوئے تھے۔ وہ بہت نفیس اور مخلص آدمی تھے۔ قاسمی صاحب سے ان کی دوستی اور محبت کا ایسا عالم تھا کہ رمضان کے مہینے میں جب سارے ہوٹل بند ہوتے تو قاسمی صاحب اپنے گھر سے ان کے لیے کھانا بنوا کر ٹفن میں لاتے۔ قاسمی صاحب یہ بات سنا رہے تھے تو میں چشمِ تصور میں ایک چھریرے بدن والے بزرگ کو لُو پھونکتی اور سیک دھونکتی دوپہر میں ویران مال روڈ پر ٹفن لے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ بزرگ کتابوں کے ایک بڑے شوروم کے باہر دَم بھر کو کھڑا ہوتا ہے۔ باہر شیشے کی ایک دیوار پر سنہرے رنگ سے کندہ ہے ''یہ ادارۂ طباعت و اشاعت ہے......''

پارس

پھر وہ بزرگ شوروم کے ٹھنڈے ماحول میں داخل ہوجاتا ہے جہاں ایک اور نرم نقوش اور شفیق مسکراہٹ والا وان گاڈیا مہمان کو دیکھ کر کھل اُٹھتا ہے اور احمد ندیم قاسمی سے ٹفن لے لیتا ہے۔

وان گاڈیا کے گزر جانے کا قاسمی صاحب کو بہت صدمہ تھا۔ گاڈیا صاحب کے ذکر سے قاسمی صاحب کی آنکھوں میں چمک آگئی، انھوں نے اپنا بٹوا نکالا اور مسکراتے ہوئے اس میں سے ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ گاڈیا صاحب کی تصویر تھی۔ وہ تصویر میرے لیے ایک انکشاف کا درجہ رکھتی تھی۔

”میں نادر گاڈیا کی تصویر ہر وقت اپنے بٹوے میں رکھتا ہوں۔ وہ مجھ سے کبھی بھی جدا نہیں ہوئے۔“ نمی کی ایک مہین تہہ قاسمی صاحب کی آنکھوں میں اُبھر آئی۔

مجلسِ ترقی ادب کا دفتر یقیناً برصغیر میں ادب کا سب سے اہم اور متحرک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ کلب روڈ پر واقع نرسنگھ داس کی تعمیر کردہ یہ عمارت قاسمی صاحب کی زیرِ ادارت نکلنے والے سہ ماہی ”فنون“ کا بھی دفتر قرار پائی۔ دہائی بھر سے زیادہ کے تعلق میں میری قاسمی صاحب سے فون پر ہر دوسرے تیسرے روز بات ہوجاتی اور دس بارہ دن بعد میں ان کے دفتر میں حاضر ہوجاتا۔ کیا کیا دماغ تھے اور کیا کیا لوگ جو اس مرکزِ فن و ثقافت میں آمد و رفت رکھتے۔ وہ دروازہ کھلا اور احمد فراز اندر داخل ہوئے، یہ محمد کاظم صاحب چلے آرہے ہیں، گلزار صاحب کا ہندوستان سے فون ہے، اِدھر فون رکھا اُدھر برطانیہ سے ساقی فاروقی کا فون آجاتا ہے، ابھی افتخار نسیم اٹھے ہیں تو امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی داخل ہوتے نظر آرہے ہیں۔

اِن سب کے درمیان احمد ندیم قاسمی اپنے مخصوص لہجے میں ہلکی ہلکی پُھل جھڑیاں چھوڑ رہے ہیں۔ سب ان سے محبت بھی کرتے ہیں اور آداب کا تکلف بھی قائم ہے۔

انھیں ہمیشہ میں نے لباس میں خوش ذوق پایا۔ زیادہ تر نفیس استری شدہ شلوار قمیص کے اوپر واسکٹ میں دیکھا، کبھی تقریبات کے لیے میچنگ سُوٹ بھی زیبِ تن کر لیتے جو اِن پر خوب جچتا۔

ان کے بیٹھے ہونے سے ماحول میں ایک سکون اور ٹھیراو ہوتا۔ میں نے ان کے منہ سے کبھی کوئی نازیبا بات یا اونچی آواز نہیں سنی۔ اُن میں ایک صلاحیت یہ تھی کہ ان کے حلقے کا ہر شخص یہ سمجھتا گویا وہ اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اُن کی محفل میں جہاں ایک بے تکلفی ہوتی وہیں مراتب کا بھی خیال رکھا جاتا۔

ایک مرتبہ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ کمرے میں احمد فراز، جلیل عالی، منصورہ احمد اور تسنیم منٹو بھی بیٹھے تھے۔ بہت دیر سے ایک خشک فلسفیانہ موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ ماحول خوش گوار کرنے کے لیے محترمہ تسنیم منٹو نے احمد فراز سے فرمائش کی کہ وہ اپنا تازہ کلام پڑھ کر سنائیں تو فراز، قاسمی صاحب کی جانب اشارہ کر کے دھیمی آواز میں بولے کہ ایسے بزرگ اور استاد کے سامنے اپنا کلام پڑھنا بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔ فراز حلقۂ یاراں میں شوخ اور بے باک جانے جاتے تھے لیکن قاسمی صاحب کے سامنے وہ بھی باادب ہوجاتے۔ اسی دوران ان تحائف کا ذکر چل نکلا جو ”فنون“ میں شائع ہونے کے بعض خواہش مند لے کر آجاتے، بالخصوص جب ان کی تحریریں ناقابلِ اشاعت ہوتیں۔ یہاں فراز بول پڑے کہ ناقابلِ اشاعت مسودہ تو ضرور لوٹا دیا کریں لیکن تحفہ نہ لوٹایا کریں۔ اس پر قاسمی صاحب گویا ہوئے۔ ”ایک مرتبہ ایک سکھ کے گھر کوئی بم رکھ گیا۔ کسی نے سردار جی کو خبر دی تو انھوں نے سنی اَن سنی کر دی۔ خبر دینے والے نے جھنجلا کر کہا کہ وہ اس سنگین اطلاع پر توجہ کیوں نہیں دے رہے تو سردار جی بولے۔ 'یار کوئی کچھ رکھ کر ہی گیا ہے، لے کر تو نہیں گیا۔' اس پر خوب قہقہہ پڑا۔

اسی طرح ایک مرتبہ شاعر خالد احمد محفل میں ایک لطیفہ سنا رہے تھے۔ لطیفہ خاصا طویل تھا سو حاضرین اس میں دل چسپی کھونے لگے۔ بیچ میں عطاء الحق قاسمی صاحب نے لقمہ دیا۔ ”خالد! لطیفہ سنانے سے بہتر ہے کہ تم اِسے لکھ کر کاپیاں سب میں تقسیم کر دو تا کہ سب پڑھ

لیں۔" یہاں احمد ندیم قاسمی صاحب نے مسکراتے ہوئے مداخلت کی۔ "عطا لطیفے کی طوالت دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ اس کا 'خاص نمبر' شائع کرنا پڑے گا۔"

'خاص نمبر' کی بھی ایک تاریخ ہے۔ یہ 1963ء کی بات ہے۔ ایوب مارشل لا اپنے عروج پر تھا، وہیں اُردو کے فعال اور اہم ترین ادیب غیر معمولی ادب تخلیق کر رہے تھے۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے حبیب اشعر کے ساتھ "فنون" کا اجرا کیا۔ جلد ہی رسالہ مقبولیت کی معراج پر پہنچ گیا۔ اِسے فقط خالص ادب تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ فنونِ لطیفہ کی دیگر اصناف مصوری، موسیقی، تصوف، فلسفے وغیرہ کو بھی جگہ دی گئی۔ بہت جلد ان اصناف کے اساتذہ اس پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے۔ جہاں مصوری پر عبدالرحمٰن چغتائی کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے وہیں ابوالخیر مودودی 'خدا' کے موضوع پر نمایندہ تحریر کے ساتھ آن موجود ہوئے۔ افسانے میں راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے شہ پارے پہلے ہی شمارے میں موجود تھے۔ ایک جانب جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کی شاعری اس میں جگہ پانے لگی دوسری جانب کرشن چندر 'بڑا آدم' انتظار حسین 'آخری خندق' خالد اختر 'ننھا مانجھی' اور غلام عباس شاہ کار افسانوں کے ساتھ شریکِ محفل ہوئے۔ ستر کی دہائی تک یہ برصغیر میں علم و فن کا سب سے اہم جریدہ بن چکا تھا۔ اس قافلۂ رنگ و بو کے سالار قاسمی صاحب تھے جو اپنی شاعری اور افسانوں کے ساتھ اس نازنینِ ادب کے ماتھے کا جھومر تھے۔

"فنون" نہ صرف نام ور ادیبوں کی نمایندہ تحریروں کو جگہ دے رہا تھا بلکہ نو واردانِ ادب کی بھی پرورش کر رہا تھا۔ 'آج' کے اجمل کمال ہوں جنھوں نے خالد طور کو فنون کے پرانے شماروں سے ڈھونڈ نکالا، نام ور مصور تصدق سہیل جو اپنی مصوری سے زیادہ فنون میں چھپنے والے افسانوں پر نازاں ہیں یا دیگر نمایاں تخلیق کار، فنون کے پرانے شماروں سے آج بھی جواہر نکلتے چلے آتے ہیں۔

قاسمی صاحب نے جہاں سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، محمد کاظم وغیرہ کو متعارف کروایا وہیں شاعری میں اختر حسین جعفری، پروین شاکر، احمد فراز، امجد اسلام امجد، خالد احمد، نجیب احمد، عباس تابش، اعجاز رضوی، شاہ نواز زیدی اور ایوب خاور کے علاوہ درجنوں دیگر کو سامنے لے کر آئے۔ افسانے میں تو یونس جاوید سے لے کر نیلو فر اقبال تک ایک دمکتی کہکشاں ہے۔ فلسفے میں علی عباس جلال پوری سے لے کر محمد ارشاد تک نمایاں نام ہیں۔

اُردو میں عربی ادب کو صحیح معنوں میں محمد کاظم ایسے سکالر "فنون" کے توسط ہی سے سامنے لائے۔

قصہ مختصر، فنون کا دفتر ادیبوں کی آماج گاہ بن گیا جہاں قاسمی صاحب مسکراتے ہوئے، سب کو شفقت اور محبت میں شرابور رکھتے۔ وہاں جدید فکری نظریات اور فلسفوں پر بحثیں ہوتیں، نئے نکتے ڈھونڈ کر لائے جاتے، تازہ خیالات کو نمو ملتی اور پرانے خیالات رد کیے جاتے، یہ سارا کچھ "فنون" کے صفحات پر نمایاں ہو جاتا۔

"فنون" سے پہلے "نقوش" خاص نمبر نکالنے کی شہرت رکھتا تھا، بھلے یہ نمبر موضوعاتی ہوں یا شخصیاتی۔ 'فنون' نے 'غزل نمبر'، 'اقبال نمبر' اور 'غالب نمبر' وغیرہ جیسے شان دار نمبر نکال کر خوب داد سمیٹی۔

میں نے ذاتی طور پر قاسمی صاحب اور 'فنون' کے درمیان تعلق میں چند چیزیں نمایاں طور پر محسوس کیں۔ ہمارے ہاں حقیقی معنوں میں ایڈیٹنگ کا تصور موجود نہیں۔ یہ ادبی رسالے ہوں یا اشاعتی ادارے۔ ہمارا ادیب اس معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس ہے، وہ اپنی تحریر میں کاٹ چھانٹ عمومی طور پر پسند نہیں کرتا۔ جہاں تک ایڈیٹر کا تعلق ہے تو وہ بھی اس تردد میں نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ دنیا میں ایڈیٹر اور ادیب کا مسلسل رابطہ اور صلاح مشورہ جاری رہتا ہے۔ نتیجتاً عمدہ معیار کا، بین الاقوامی سطح کا ادب وجود میں آتا ہے۔

قاسمی صاحب کو میں نے مسودات کی باقاعدہ سرخ قلم سے کاٹ چھانٹ کرتے اکثر دیکھا۔ وہ ترمیم شدہ مسودہ ادیب کو یہ کہتے ہوئے بھجواتے کہ غالباً وہ بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا۔

معیار پر انھیں کبھی سمجھوتا کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ وہ کسی نئے نوجوان ادیب (جس میں انھیں صلاحیت نظر آتی) کی حوصلہ افزائی کی غرض سے نسبتاً ناپختہ تحریر بھی ترامیم کے ساتھ شائع کر دیتے۔ کئی مسودات میں نے انھیں لوٹاتے بھی دیکھا۔ میرے چند افسانے انھوں نے لوٹائے اور ایک افسانے کا عنوان ''شب گزیدہ'' سے بدل کر ''بھونچال'' کر دیا۔ انھیں میں نے اشعار کے الفاظ تبدیل کرتے اور افسانوں کے پورے اقتباسات حذف کرتے دیکھا۔

جب تک 'فنون' پریس میں نہ چلا جاتا وہ اسے بناتے سنوارتے رہتے، جیسے بیوٹی پارلر میں دلہن سنواری جاتی ہے۔

ایک بار میں اُن کے پاس بیٹھا تھا، ساتھ میں اُن کی منہ بولی بیٹی منصورہ بھی تھیں۔ بات رسالے میں چھپنے والے مضامین پر چل نکلی۔ منصورہ نے کہا کہ رسالہ تو بہت پہلے آجانا چاہیے تھا مگر کچھ اُن کی یہ عادت کہ آخری لمحے تک نثر اور شاعری کی جمع تفریق میں مصروف رہتے ہیں اور کچھ بیماری کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا بلکہ بار ہا ہو چکا ہے۔

اس پر قاسمی صاحب نے بہت سادگی سے اپنی ڈائری کھولی اور دکھانے لگے کہ اس سے اگلے شمارے کے بھی سبھی افسانے مکمل ہیں۔ ڈائری میں ایک فہرست لکھ رکھی تھی۔ اس پر منصورہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔ ''جانے بھی دیجیے بابا، آپ ہر مرتبہ اسی طرح کہتے ہیں کہ مواد مکمل ہے مگر رسالہ ہے کہ مکمل ہونے ہی میں نہیں آتا۔'' اس پر میں نے پوچھا کہ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انھوں نے جتنے صفحے افسانے یا شاعری کے لیے مختص کیے ہوں ان کی تعداد میں معیاری مواد کی کمی کے باعث ردّ و بدل کرنا پڑا ہو۔ انھوں نے بتایا کہ ایسا بار ہا ہوا ہے۔

اس معاملے میں میں نے قاسمی صاحب میں ایک اور عادت دیکھی۔ وہ اپنے قلمی معاونین سے باقاعدہ تحریری درخواست کرتے کہ انھیں تخلیقات بھجوائی جائیں۔ ایسے میں وہ سینئر اور جونیئر کی تخصیص نہ رکھتے۔ جاوید انور ابھی فیصل آباد میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے کہ انھوں نے اپنی ایک نظم 'فنون' میں اشاعت کے لیے بھجوائی۔ اگلے شمارے میں ان کی نظم بہت اہتمام سے شائع ہوئی۔ اِس پذیرائی نے جاوید انور کو خوش گوار حیرت سے دوچار کیا اور وہ سنجیدگی سے شاعری کی طرف مائل ہوئے اور عمدہ شاعر کے طور پر جانے گئے۔ اسی طرح افتخار بخاری سناتے ہیں کہ کس طرح ان پر تخلیقی جمود طاری تھا کہ انھیں قاسمی صاحب کا مکتوب ملا جس میں تازہ کلام کی فرمائش کے ساتھ پیار بھری دھمکی بھی شامل تھی کہ اس کے بغیر 'فنون' کا اگلا شمارہ نہ آئے گا۔ پس یہ دھمکی کارگر ہوئی اور یوں بخاری صاحب کا تخلیقی جمود ٹوٹا۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ اچھا اور معیاری لکھنے کے لیے وہ نئے لکھنے والوں کو کیا مشورہ دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مسلسل مطالعہ بہت اہم ہے۔ ہر ادیب کو یہ عادت بنا لینی چاہیے کہ وہ کچھ وقت مطالعے کو ضرور دے۔ اس سے نہ صرف تازہ ترین ادبی تخلیقات اور رجحانات سے آگاہی رہتی ہے بلکہ سوچ اور تخلیق کا نیا مواد بھی سامنے آتا رہتا ہے۔

دوسرے انھوں نے زور دیا کہ روزانہ لکھنا بہت اہم ہے۔ مشق جاری رہنی چاہیے۔ اس سے تحریر میں روانی، پختگی اور نکھار آتا ہے۔ یہاں انھوں نے اپنی مثال دی کہ جب لمبے وقفے کے بعد قلم اُٹھایا تو تحریر میں رُکاوٹ اور زبان میں لکنت آگئی اور پہلی سی روانی محسوس نہ ہوئی۔

تیسرا اہم نکتہ جس پر انھوں نے زور دیا، وہ مشاہدہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض اوقات ایک لمحے کا مشاہدہ طویل ریاضت پر بھاری ہوتا ہے۔ جب کبھی میں قاسمی صاحب کے ہم راہ کہیں جاتا تو وہ اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتے، وہ گلبرگ کا ریستوران ہو، مال روڈ پر واقع ہوٹل ہو، جم خانہ ہو یا کوئی دفتر۔ وہ نہ صرف مشاہدہ کرتے بلکہ معاملات کا معروضی تجزیہ کرتے۔

سوالات ہر وقت ان کے ذہن میں جنم لیتے رہے، جن کا جواب مل جاتا، افسانے میں ڈھل جاتے۔ وہ آخری عمر تک متجسس رہے۔ عالمی نظریات ہوں، ملکی حالات یا جدید ادب، اُن کی دل چسپی برقرار رہتی۔ ایسے میں بہت سے معاملات تشنہ بھی رہتے۔

شہرۂ آفاق نفسیات دان سگمنڈ فرائڈ نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ''ایک پیچیدہ گتھی جسے میں اپنی تیس سالہ عرق ریزی اور تحقیق کے

باوجود ہنوز سلجھا نہیں سکا، یہ ہے ''عورت آخر چاہتی کیا ہے؟''

تجسس اُنھیں مشاہدے پر اُکساتا اور انکسار اُنھیں حصول علم پر۔

آخری عمر میں، جب وہ زندگی کی آٹھویں دہائی میں تھے، زیادہ دیر تک کہیں بیٹھ نہیں سکتے تھے چناں چہ اکتاہٹ یا تھکاوٹ کے باعث کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھنے کی فرمائش کرتے۔ ایک امر البتہ قابلِ غور ہے کہ وہ اپنے دفتر میں قریباً نوے برس کی عمر تک روزانہ باقاعدگی سے نہ صرف آتے بلکہ شام چھ بجے تک تمام امور کی انجام دہی میں مصروف رہتے۔

ابھی موبائل فون نیا نیا آیا تھا اور اسے جدید ایجاد اور ماڈرن لوگوں کے استعمال کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ایک کھانے پر انھوں نے مسکراتے ہوئے سادگی سے سامنے اشارہ کیا جہاں ایک برقع پوش خاتون موبائل پر بات کر رہی تھی اور بولے۔ ''دونوں کتنے مختلف ہیں، موبائل اور باپردہ خاتون۔'' ایسے میں کئی مرتبہ ان کے عقیدت مند اور چاہنے والے ان کے گرد تصاویر بنوانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے ان کے لکھنے کے انداز کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بیدی کے بارے میں بتایا کہ بیدی ایک تحریر کو دسیوں بار ترامیم کر کے حتمی شکل دیا کرتے تھے، اپنے بارے میں قاسمی صاحب نے بتایا کہ وہ عموماً ایک مرتبہ نظر ثانی کرتے ہیں اور اپنی تحریر کو حتمی شکل دے دیتے ہیں۔

اسی طرح ''فنون'' میں اُن کے نامکمل ناول کے ابواب قسط وار شائع ہوئے۔ میں نے اس کے نامکمل رہ جانے کی وجہ پوچھی تو بتانے لگے کہ انھوں نے باقاعدہ کسی پلان کے تحت ناول کو شروع نہیں کیا تھا بلکہ کہانی خود ہی آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ایک مقام پر آن کر رُک گئی اور باوجود کوشش کے آگے نہ بڑھ سکی۔ اُن کا کہنا تھا۔ ''کہانی اُن کی اُنگلی تھام کر چلتی ہے اسی لیے اس کی چال قدرتی ہوتی ہے۔''

اُن کے کھانے کے معاملات بہت سادہ تھے۔ دوپہر میں گھر سے آیا کھانا لگ جاتا۔ پلیٹیں سالن وفتری میز ہی پر سج جاتے۔ عموماً وہ لیس دار خوراک جیسے بھنڈی یا اروی شوق سے نہ کھاتے، البتہ ٹنڈے، لوکی وغیرہ رغبت سے کھاتے۔ پھلوں میں آم خاص پسند تھا بلکہ کہا کرتے تھے کہ آم کے بعد پانی بھی نہیں پینا چاہیے کیوں کہ اس سے آم کا ذائقہ بھی جاتا رہتا ہے۔

کھانے کے بعد وہیں دفتر میں صوفے پر لیٹ جاتے۔ ایسے میں ان کا منحنی جثہ سمٹ جاتا اور وہ چھوٹے بچے کی طرح پیٹ سے گھٹنے جوڑ کر سو جاتے۔ ان کی قریباً نوے برس کی طویل عمر اور اچھی صحت میں غالباً دوپہر کے مختصر آرام کا بھی ہاتھ تھا۔ قیلولے کی عادت میں نے شکیل عادل زادہ صاحب اور عبداللہ حسین صاحب میں بھی دیکھی۔ قاسمی صاحب کہتے تھے کہ قیلولہ انھیں بقیہ دن کے لیے جسمانی طور پر چاق چوبند اور ذہن کو تر و تازہ کر دیتا ہے۔ قیلولہ گرم اور مرطوب علاقوں میں آج بھی عام ہے۔ برطانوی راج میں دفاتر کے ساتھ قیلولے کے لیے 'ریٹائرنگ روم' بنائے جاتے تھے۔ شہرۂ آفاق برطانوی راہ نما چرچل میں قیلولے کی عادت کچھ ایسی راسخ ہو چکی تھی کہ وہ جنگِ عظیم کے دوران بھی قیلولہ کرتا جسے وہ "Power Nap" کا نام دیتا تھا اور تر و تازہ ہو کر پھر سے جنگی حکمتِ عملی اور امورِ مملکت میں تن دہی سے مصروف ہو جاتا۔

قاسمی صاحب سے دنیا جہاں کے موضوعات پر بات چیت ہوتی رہتی۔ وہ اکثر ملکی حالات میں خرابی پر رنجیدہ ہو جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھ لیا کہ معاشرتی و اخلاقی تنزل کا آغاز کب ہوا تو بتانے لگے کہ اس کا آغاز تقسیم کے فوری بعد ہی ہو گیا تھا جب ہندوؤں کی چھوڑی زمینوں اور جائداد کی بندر بانٹ ہو رہی تھی۔ تب غیر منصفانہ الاٹ منٹوں نے خرابی کا آغاز کیا جو روز بہ روز بڑھتی ہی رہی۔

غیر منصفانہ سلوک کا وہ خود بھی شکار بنے جب ایک بیوروکریٹ نے انھیں مجلس کی نظامت سے ہٹا دیا۔ وہ اس دفتر سے اُٹھ آئے

جہاں کئی دہائیوں سے ادب کی آب یاری کر رہے تھے اور صفاں والا چوک کے قریب ایک تنگ گلی میں واقع 'فنون' کے دفتر میں جا بیٹھے۔ وہاں میں نے انھیں بے حد افسردہ اور مضمحل دیکھا۔ گو میں نے اُن کی دل جوئی کی اپنی سی کوشش کر دیکھی مگر ان کی فطری شگفتگی اور بشاشت تب تک نہ لوٹی جب تک اُن کے چند پرستاروں کی مداخلت سے اُنھیں واپس بحال نہ کر دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک اجنبی شخص اُن کے دفتر میں آیا اور اپنا تعارف کروایا کہ وہ میاں والی سے لاہور کسی کام سے آیا ہے، کام جن صاحب کے پاس ہے، اُن کی کوئی سفارش اُس کے پاس نہیں۔ متعلقہ صاحب کا نام سنتے ہے قاسمی صاحب بے اختیار بول اٹھے۔ 'ارے وہ تو میرے جاننے والے ہیں، ابھی فون کر دیتا ہوں' قبل اس کے کہ میں اُن سے درخواست کرتا کہ اُس شخص کے بارے میں پوری طرح جانچ کر لیں، وہ فون کا چونگا اٹھا کر نمبر ملا چکے تھے۔

اپنے ہم عصر ادیبوں کے حوالے سے اُن کی یادداشت کی زنبیل میں بے شمار واقعات تھے۔ منٹو کو بہت محبت سے یاد کرتے تھے اور ان کے مزاج کی نفاست اور شرافت کی بہت تعریف کرتے۔ ''منٹو صبح اُٹھ کر اجلے لباس میں میز کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ سامنے عمدہ کاغذ اور تراشی ہوئی پنسلیں ہوتی تھیں۔ وہ تیزی سے افسانہ مکمل کرتے اور رسالے کے مدیر کے پاس لے جاتے تاکہ پیسوں کا انتظام ہو سکے۔ انھیں افسانے کی تکنیک پر اس حد تک عبور تھا اور خداداد صلاحیت کچھ ایسی تھی کہ وہ ان حالات میں بھی اعلیٰ ترین شاہ کار تخلیق کر لیتے تھے۔ ہاں بعد میں معیار پر انھیں خاصا سمجھوتا کرنا پڑا لیکن وہ آخر منٹو تھے۔ ہٹ دھرم منٹو جو کہاں کسی کی سنتے تھے۔''

منٹو کے افسانوں کے متنازع موضوعات پر بات ہوتی تو قاسمی صاحب بتاتے کہ منٹو بنیادی طور پر شرمیلے شخص تھے، اپنی بیوی صفیہ کے مکمل وفادار تھے۔ ان میں ایک خاص صلاحیت یہ تھی کہ دوستی بہت جلد بنا لیتے تھے۔ ان کے افسانوں کے بیش تر کردار حقیقی زندگی سے اٹھائے گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اُن کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے اور منٹو نے ان سے افسانے کا عطر کشید کر کے اسے الفاظ کی شکل دے دی۔ ایسے میں چند لوگ بعد ازاں ان سے ناراض بھی ہوئے۔

شراب کی لت تو ایک بیماری تھی جو منٹو کو لگ گئی تھی وگرنہ اُن کے اندر ایک حساس اور زندہ دل دھڑکتا تھا۔ ایک مرتبہ منٹو کا واقعہ سنانے لگے کہ بہت پریشانی میں منٹو صاحب اُن کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بیٹی نگہت بیمار ہے، بیس روپے کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے قاسمی صاحب کے پاس فوری طور پر اتنے پیسے نہ تھے، انھوں نے منٹو کو پیش کش کی کہ وہ پیسے کسی سے ادھار پکڑ لاتے ہیں۔ منٹو نے یہ پیش کش یہ کہ کر مسترد کر دی کہ اگر اُن کے پاس پیسے ہوتے تو ٹھیک تھا مگر اس طرح کسی سے پیسے ادھار مانگ کر لانا مناسب نہیں۔ قاسمی صاحب نے کافی اصرار کیا مگر منٹو نہ مانے اور وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ گئے ہی تھے کہ شباب کیرانوی صاحب آن پہنچے۔ وہ ان دنوں ڈائرکٹر نامی ایک رسالہ نکال رہے تھے، جس کے لیے انھوں نے قاسمی صاحب سے افسانے کی فرمائش کی۔ قاسمی صاحب کو رسالے کے معیار اور مزاج سے اختلاف تھا، انھوں نے معذرت کر لی مگر شباب کیرانوی مصر رہے تا آں کہ انھوں نے تیس روپے قاسمی صاحب کی میز پر رکھے اور وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ گئے ہی تھے کہ منٹو واپس آ گئے اور کہنے لگے۔ ''شباب کیرانوی آیا تھا، کچھ رقم ضرور دے کر گیا ہوگا۔'' قاسمی صاحب نے فوراً تیس روپے منٹو کے سامنے رکھ دیے۔ منٹو نے بیس روپے اُٹھائے اور کہنے لگے۔ ''احمد ندیم قاسمی (وہ قاسمی صاحب کو پورے نام سے پکارا کرتے تھے) بس مجھے اتنے پیسوں ہی کی ضرورت ہے۔ باقی ضرورت سے زیادہ ہیں۔'' قاسمی صاحب کے اصرار کے باوجود منٹو مزید رقم لیے بغیر چلے گئے۔ اتفاق سے اُسی شام قاسمی صاحب کو ایک محفل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ محفل اس وقت جوبن پر تھی اور منٹو وہاں رونقِ محفل بنے بیئر سے شغل فرما رہے تھے۔ قاسمی صاحب کو سامنے دیکھ کر منٹو جیسا پُراعتماد شخص بوکھلا گیا، ندامت چہرے پر ہویدا ہو گئی۔ خیر قاسمی صاحب نے منٹو سے اِس ضمن میں کوئی تذکرہ کیا اور نہ ہی منٹو نے کوئی وضاحت پیش کی البتہ ایک حساس باضمیر دوست کے چہرے پر اُبھر آنے والی ندامت قاسمی صاحب کو یاد رہی۔

ایک دفعہ سُنانے لگے کہ وہ پشاور میں ملازمت کرتے تھے کہ منٹو انھیں ملنے کے لیے آئے۔ اب وہاں قاسمی صاحب جیسے آدمی کے پاس منٹو کے لیے کوئی انتظام نہ تھا۔ قاسمی صاحب کے ضمیر نے گوارانہ کیا کہ وہ اپنے دوست کی بھرپور مہمان داری نہ کر پائیں چناں چہ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر منٹو کے لیے انتظام کرلائے۔ منٹو صاحب خوش ہو گئے۔ بعدازاں جب کبھی منٹو کی ان سے ملاقات ہوتی وہ قاسمی صاحب کی مہمان نوازی کا خاص ذکر کرتے اور مروتاً کہہ دیتے کہ وہ پیسے آتے ہی اس کی ادائیگی کر دیں گے۔ منٹو کی گزراوقات ویسے ہی تنگ دستی میں ہوتی تھی سو ان کے لیے ادائیگی کا کام انجام دینا ذرا مشکل تھا۔ البتہ اپنے دوست کی مہمان نوازی کا متواتر تذکرہ منٹو کی وضع ومروّت کی علامت تھا۔

ایک روز بتانے لگے، ایک ایسا وقت آیا تھا کہ ادبی تحریروں میں غیر ضروری بے باکی باقاعدہ دَر آئی تھی۔ ’’یہ میں ہی تھا جس نے منٹو کی کہانی ’’بو ‘‘ ادبِ لطیف میں شائع کی تھی۔ بعدازاں مجھے اس سلسلے میں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا بیانیہ افسانے کے موضوع اور فن کے لیے ضروری تھا اس لیے میں اپنے موقف پر جم کر کھڑا رہا مگر میں فقط لمحاتی اور سستی شہرت کی خاطر بے باکی سے کبھی سمجھوتا نہیں کر سکا۔‘‘

جب میں نے منٹو کی وفات کے بعد بچیوں کی کفالت کا پوچھا تو بتانے لگے کہ منٹو کے بھتیجے حامد جلال (عائشہ جلال کے والد) نے بعد میں بچیوں کا بہت خیال کیا اور اُنھیں کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

قاسمی صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اپنی مختصر سی 43 سالہ زندگی کے آخری حصے میں منٹو کے اعصاب پر دو چیزیں سوار تھیں۔ پہلی، اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کا غم جس نے اُن کے اعصاب چٹخا دیے تھے اور دوسری غالبؔ کی شاعری سے ایسا مجنونانہ لگاؤ کہ پہروں غالبؔ پڑھتے اور اس کی شاعری میں گم رہتے۔

اپنی آخری ملاقات کا سناتے کہ منٹو کو کثرتِ مے نوشی سے منع کیا تو وہ زہرخند لہجے میں بولے۔ ’’احمد ندیم قاسمی! میں نے تمھیں اپنے ضمیر کی مسجد کی امامت کا حق نہیں دیا۔‘‘

اس کے چند روز بعد وہ نادرِ روزگار چل بسا۔

منٹو کے حُسنِ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ خود تو شراب کی علت میں مبتلا تھے مگر کبھی انھیں پینے پر مجبور نہیں کیا۔

اس پر میں نے سوال کیا کہ شاعری اور شراب کو لازم وملزوم سمجھا جاتا رہا ہے، ایسے میں کبھی کم زور لمحات بھی آئے ہوں گے۔ اس پر انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ البتہ سنانے لگے۔

’’ایک مرتبہ ہمارا وفد ہندوستان کے دورے پر تھا۔ اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے بہت سے شاعر اور ادیب شامل تھے۔ ایک رات ہم نے ایک پرفضا مقام پر قیام کیا جہاں جھیل کنارے محفل منعقد ہوئی۔ بہت سے لوگ پینے پلانے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے لیے سنگتروں کا رس منگوالیا۔ اتنے میں فیضؔ صاحب نے مجھ سے شراب پینے پر اصرار کیا مگر میں نے شایستگی سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ ٹہلتے ہوئے آئے اور میرے گلاس میں شراب انڈیل دی۔ میں نے سارا گلاس جھیل میں انڈیل دیا۔ فیض صاحب وقتی طور پر ناراض سے ہو گئے۔

اسی طرح ایک روز صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بھی کافی اصرار کیا بلکہ یہاں تک کہا کہ انھوں نے میرے لیے اعلیٰ ولایتی بوتل سنبھال رکھی ہے۔ انھوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ اس کی خبر کانوں کان کسی کو نہ ہوگی۔ میں نے بڑے احترام سے معذرت کی تو جز بز ہوئے اور کہنے لگے کہ شراب میں کوئی ایسی بُری بات نہیں جو اسے اتنا برا بنا دیا گیا ہے، ایک دفعہ آزما کر تو دیکھیں۔ میں نے گزارش کی کہ میں نے شراب پی کر بڑے معزز ادیبوں کو جو حرکتیں کرتے دیکھا ہے، اگر میں خود بھی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھا تو ساری زندگی نادم رہوں گا۔ اس پر صوفی صاحب

پاس

مایوس ہو کر چلے گئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چند روز بعد مجھے ملے تو بے اختیار بولے۔ ''آپ کے حصے کی شراب ذوالفقار بخاری پی گئے۔'' اس پر میں نے شکر ادا کیا کہ ایک آزمائش سے میری جان چھوٹی۔''

ایک دفعہ فراز صاحب بیٹھے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر شرارتاً مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ''قاسمی صاحب کو ایک مرتبہ گردوں میں پتھری ہو گئی تو میں نے مشورہ دیا کہ پانچ چھے بوتلیں بیئر کی پی لیں، پیشاب میں نکل جائے گی۔'' یہ سن کر کسی مسودے میں گم قاسمی صاحب نے چونک کر لاحول ولا پڑھی۔ فراز صاحب کا قہقہہ بلند ہوا۔

ایک سہ پہر میں اُن کے دفتر میں پاس بیٹھا تھا کہ انگلستان سے ساقی فاروقی کا فون آ گیا۔ بہت ہم دردی سے اُن کی باتیں سنتے رہے۔ فون بند ہوا تو تاسف اور محبت سے کہنے لگے۔ ''بے چارے ساقی صاحب بہت دل گرفتہ تھے۔ کہتے تھے کہ آخری سانسیں ہیں، جلدی سے میرے اوپر چند سطریں گھسیٹ ڈالیے۔'' یہ کہہ کر افسوس میں سر ہلاتے رہے۔ کسی نے لقمہ دیا کہ بے چارے ساقی کو تو شراب خانہ خراب لے بیٹھی۔ اس پر جلدی سے بولے۔ ''نہیں نہیں، اب تو کہتے ہیں کہ چھوڑ دی ہے۔'' پھر گویا کچھ یاد کر کے زیرِ لب مسکرا دیے اور بولے ''ساقی صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ رسالے میں انھیں سب سے پہلے شائع کیا جائے جب کہ میں ہمیشہ فراز کو شائع کرتا ہوں۔ اس پر ساقی ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں برطانیہ میں اِن سے ملا تو پوچھ بیٹھے کہ میں کس کے ساتھ آیا ہوں۔ میں نے فراز کا نام لے دیا۔ بس پھر کیا تھا، گویا بھڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگا دیا۔ وہ برا بھلا کہا کہ خدا کی پناہ۔ اتنے میں فراز کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کو دیکھ کر گویا ساقی صاحب کی دنیا ہی بدل گئی۔ آگے بڑھ کر اتنی گرم جوشی سے فراز کے گلے لگ گئے گویا مدتوں کے بچھڑے محبوب ترین دوست ہوں۔'' یہاں پہنچ کر قاسمی صاحب کے بردبار چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ آ گئی اور بولے۔ ''بھلا یہ شراب بھی آدمی سے کیا کچھ کراتی ہے۔''

فیض صاحب پر لکھے ان کے ایک خاکے کا کافی چرچا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس خاکے میں قاسمی صاحب کو فیض صاحب کی بشری خامیوں سے صرفِ نظر کرنا چاہیے تھا۔ جب اس بارے میں اُن سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ فیض ان کے ہم عصر اور دوست تھے۔ جہاں دوستوں میں اشتراکِ رائے ہوتا ہے، وہیں نظریاتی اور ذاتی اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ یوں بھی ان سے ایک پرستار کی جانب سے لکھی گئی تحریر کی توقع رکھنا بے جا ہے۔ یہ ایک ہم عصر کی تحریر تھی۔ اس کے بعد انھوں نے منصورہ احمد کی موجودگی میں فیض صاحب کے کلام کی بے پناہ تعریف کی اور نہ صرف ان کے کلام میں سے مثال کے طور پر چند اشعار لحن میں گنگنائے بلکہ خاکے کے دو تین واقعات کا ضمناً حوالہ دیا جو اِن کی باہمی بے تکلفی کے مظہر تھے۔

ایک قصہ مشہور ماہرِ موسیقی رفیق غزنوی صاحب کا ہے۔ غزنوی صاحب کراچی میں مقیم تھے۔ وہ قاسمی صاحب اور فیض صاحب کو اپنے ہاں لے گئے اور سامنے بیئر رکھ دی۔ جب فیض صاحب نے مطلع کیا کہ قاسمی صاحب اجتناب کرتے ہیں تو غزنوی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وہ بیئر ایسی غیر نشہ آور چیز بھی نہیں پیتے۔ وہ تو گنے کے رس سی بے اثر شے ہے۔ اس پر قاسمی صاحب نے کہا کہ ان کے اور غزنوی صاحب کے عزیز دوست سعادت حسن منٹو نے بیئر کے حوالے سے غزنوی صاحب کے متعلق کچھ اور ہی کہا ہے۔

رفیق غزنوی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''کیا بکواس کی تھی اس کشمیریے نے؟''

قاسمی صاحب نے انکشاف کیا کہ منٹو کہتے تھے، رفیق غزنوی کا سا مضبوط جثّہ کا آدمی بیئر کی دو بوتلیں پی کر لڑھک جاتا ہے اور اس سے ایک خاص لفظ ٹھیک سے نہیں بولا جاتا۔

غزنوی یہ سُن کر ہنس پڑے اور کہا کہ منٹو بہت فضول بک بک کرتا ہے اور پوچھا کہ ویسے اُس نے کون سا لفظ بتایا تھا۔

اب تک وہ دو بوتلیں پی چکے تھے، سو فیض صاحب نے قاسمی صاحب کے کان میں کہا کہ جناب نے دو بوتلیں نوش فرما لی ہیں اس

لیے وہ لفظ بتا دیتے ہیں۔ غزنوی بھی منتظر تھے۔ چناں چہ قاسمی صاحب بولے۔ ”ٹمبکٹو“

رفیق غزنوی مسکرائے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ ”ٹکٹمبو“

اس پر قاسمی اور فیض صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اصرار کیا۔ ”غزنوی صاحب بولیے ٹمبکٹو۔“

غزنوی صاحب اعتماد سے بولے۔ ”ٹکٹمبو...... ٹکٹمبو۔ میں کہہ تو رہا تھا کہ منٹو شرارتی تھا، بکواس کرتا تھا۔ ٹکٹمبو۔“

اسی طرح ایک مرتبہ فیض صاحب اپنی گاڑی میں قاسمی صاحب کے ہم راہ معروف مصور عبدالرحمان چغتائی کے ہاں جا رہے تھے۔ نسبت روڈ سے گزرے تو انھیں سڑک کنارے ”قاسمی پریس“ کا بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ یہ نہ جانے کس کا بورڈ تھا۔ فیض صاحب بورڈ کی جانب اشارہ کر کے مسکرائے اور بولے۔ ”آپ چپکے چپکے اتنا بڑا کاروبار چلا رہے ہیں؟“ اس پر دونوں ہنس پڑے۔ آگے میو ہسپتال کے قریب ایک بورڈ دکھائی دیا جسے دیکھ کر قاسمی صاحب نے فیض صاحب سے کہا۔ ”فیض صاحب کاروبار تو آپ نے بھی خوب پھیلا رکھا ہے۔ وہ بورڈ دیکھیے۔“ بورڈ پر ”فیض ہیئر کٹنگ سیلون“ کے الفاظ درج تھے۔ فیض صاحب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

فیض صاحب اپنی معصومانہ ڈرائیونگ کی وجہ سے بدنام تھے۔ ایک مرتبہ پاکستان ٹائمز کے دفتر کی جانب جا رہے تھے، ساتھ میں قاسمی صاحب بھی تھے۔ فیض صاحب نے ایک مقام پر گاڑی کا گیئر بدلا، ٹھیک اسی وقت قریب سے گزرنے والے ٹرک نے بھی گیئر بدلا جس میں سے گھرر کی خوف ناک آواز آئی۔ فیض صاحب نے یہ سمجھا کہ آواز ان کی گاڑی سے آئی ہے، بولے۔ ”لو بھئی قصہ ختم ہو گیا، گیئر ٹوٹ گیا ہے۔“

قاسمی صاحب نے انھیں بتایا کہ آواز ٹرک کے گیئر کی تھی تو فیض صاحب کھسیا کر ہنس پڑے۔

قاسمی صاحب نے میرے سامنے کئی مرتبہ فیض صاحب کے اشعار سنائے اور ان کی تعریف کی۔

بلاشک میرے سامنے قاسمی صاحب نے ہمیشہ فیض صاحب کی تعریف کی لیکن ایک ان دیکھا تناؤ بہر حال دونوں بزرگوں کے بیچ محسوس ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ منیر نیازی نے قاسمی صاحب کے بارے میں ایک سخت بیان دے دیا۔ ”احمد ندیم قاسمی اچھا شعر کہنا نہیں جانتا، بھلا اچھا افسانہ کیا لکھے گا۔“ میری قاسمی صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی تو بولے۔ ”اگر کوئی مجھ سے اس بارے میں پوچھے تو میں صرف اتنا کہوں گا ’بے چارہ منیر نیازی‘ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ منیر نیازی میرے اتنا خلاف کیوں ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایک وقت تھا کہ اُس نے اپنی ایک کتاب کا دیباچہ تک مجھ سے لکھوایا تھا۔ بات یہاں تک رہتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ شاید سیاق و سباق سے ہٹ کر ہے، مگر اس نے تو احمد فراز کو بھی تک بند شاعر قرار دیا ہے۔“

کچھ دیر توقف کر کے بولے۔ ”ایک مرتبہ منیر نیازی نے کراچی میں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ کراچی میں کوئی بھی اچھا شاعر نہیں جس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ بعد میں مجھ سے بھی یہ سوال کیا گیا تو نہ صرف میں نے اس بات کی تردید کی بلکہ بہت سے شاعروں کے نام بھی لیے جو فی الواقع اچھے شاعر ہیں۔ منیر نیازی کی باتیں وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔“

آخری عمر میں قاسمی صاحب پر اُن کی منہ بولی بیٹی اور باصلاحیت شاعرہ منصورہ احمد کی تیز طبیعت اور صاف گوئی کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ منصورہ کی کسی بات سے متاثر ہو کر وہ اپنی رائے قائم کر لیتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے ایک تذکرہ میری پسندیدہ فلموں میں سے ایک ایرانی فلم "The Hidden Half" یعنی ”پنہاں نصف“ کا۔ یہ بین الاقوامی پذیرائی حاصل کرنے والا شاہ کار انسانی نفسیات اور زندگی کی مختلف جہتوں پر لطیف انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک جج اور اُس کی بیوی کی کہانی ہے۔ جج ایک دور افتادہ بستی میں ایک خاتون کو سزا

سنانے جا رہا ہے۔ وہاں اُس کا جانا فقط رسمی ہے کہ سزا کا فیصلہ مروّجہ قانون کے مطابق ہو چکا ہے۔ جب جج طویل سفر کے بعد اُس شہر پہنچتا ہے اور کمرے میں جا کر آرام کی غرض سے اپنا سامان کھولتا ہے تو اس میں سے ایک خط نکلتا ہے۔ یہ خط اُس کی بیوی نے سامان میں رکھا ہے۔ یہاں کہانی ایک چونکا دینے والا موڑ لیتی ہے۔ خط میں بیوی نے اپنے اوائل جوانی کی کہانی بیان کی ہے۔ وہ اس وقت اٹھارہ برس کی تھی اور تہران یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی۔ تعلیم کے دوران وہ سیاست میں دل چسپی لینے لگتی ہے اور ایک انقلابی کمیونسٹ گروپ میں شامل ہو جاتی ہے جہاں اُس کی ملاقات ایک رسالے کے مدیر اور دانش ور سے ہو جاتی ہے۔ دانش ور کی پروقار شخصیت سے متاثر ہو کر وہ اُس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ دانش ور بھی طالبہ کے معصومانہ اور بے غرض جذبے سے متاثر ہوتا ہے اور وہ دونوں قریب آ جاتے ہیں۔ اس دوران اسلامی انقلاب آ چکا ہے اور اس نوعیت کی انقلابی کارروائیاں قابل گرفت ہیں۔ دانش ور اور طالبہ کے درمیان محبت پروان چڑھ رہی ہوتی ہے کہ بیچ میں دانش ور کی بیوی آ جاتی ہے جو طالبہ سے معاندانہ رویہ اختیار کر کے اُسے نہ صرف یہ بتاتی ہے کہ دانش ور شادی شدہ ہے بلکہ ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔ یہ انکشاف طالبہ کے لیے دھچکے کا باعث بنتا ہے اور وہ تعلق قطع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد طالبہ کی شادی جج سے ہو جاتی ہے اور ان کے ہاں خوش گوار ازدواجی زندگی کے دوران ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ بیوی مکتوب میں اپنے شوہر کو لکھتی ہے کہ میاں بیوی کے سے قریبی رشتے میں بھی وہ ایک زندگی ہم راہ گزار کر ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے، جیسا کہ جج اپنی بیوی کی زندگی کے انتہائی اہم مخفی گوشے اور دوسرے رخ سے نا آشنا تھا، اس طرح یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اُس ملزمہ سے انصاف کر پائے جب کہ وہ ملزمہ کے موقف سے آگاہ نہیں۔ یہ پڑھ کر جج سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔ فلم کے آخری سین میں ملزمہ کو جج کے سامنے لایا جاتا ہے۔ ملزمہ سزا کے لیے تیار ہے۔ لیکن جج خلافِ روایت ملزمہ کو سامنے بیٹھنے کا حکم دے کر کہتا ہے کہ وہ اس معاملے کا دوسرا رخ دیکھنا چاہتا ہے یعنی ملزمہ کا موقف سننا چاہتا ہے۔ ملزمہ کو حوصلہ ملتا ہے اور وہ بولنا شروع کرتی ہے اور فلم اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

یہ فلم زندگی کے دوسرے رخ اور پوشیدہ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

منصورہ نے اسّی کی دہائی کے اوائل میں مجلس میں ملازمت اختیار کی اور جلد ہی قاسمی صاحب کی توجہ حاصل کرنے میں کام یاب ہوئی جس کی وجہ سے اُس کی طبیعت میں کچھ اتراہٹ اور تلخی آ گئی۔ اگر یہ حدِ اعتدال میں رہتی تو مناسب تھا لیکن اس کے باعث قاسمی صاحب کے احباب کو کچھ شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ اِس رویے کی وجہ سے اختر حسین جعفری جیسا باکمال شاعر اور وضع دار شخص ایک مرتبہ دفتر میں پھٹ پڑا تو پروین شاکر چشم بر آب باہر نکلیں اور عطاء الحق قاسمی تو منصورہ سے مستقل ناراض ہو گئے۔ فن کار تو حساس ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کی شخصیت کے قرب نے اُسے دیگر ادبا کے ساتھ رعایت لینے پر آمادہ کر دیا اور مزاج میں کڑوے باداموں کی سی تلخی شامل ہو گئی۔ ایسے میں یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ وہ حدِ اعتدال عبور کر جاتی۔

اِس معاملے کا ایک اور رُخ بھی تھا، دُوسرا رُخ۔

میرے سامنے قاسمی صاحب نے چند ایک مرتبہ کہا۔ ''آج اگر میں زندہ ہوں تو بیٹی منصورہ کی وجہ سے۔'' یہ سن کر منصورہ آب دیدہ ہو جاتی۔ اور مَیں قاسمی صاحب کی آنکھوں میں ہم دردی کے ایسے دیے روشن ہوتے دیکھتا جو صرف ایک شفیق باپ کی آنکھوں میں روشنی دے سکتے ہیں۔

منصورہ قاسمی صاحب کے ہم راہ صبح دفتر آتی، اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے روٹی نرم کرتی، سیب کی قاشیں کاٹ کر رکھتی اور اُن کے آرام کا خیال کرتی۔ منصورہ کا کہنا تھا کہ اُس نے قاسمی صاحب سے دو دہائی سے بڑھ کر تعلق میں لوگوں کو انھیں کام یابی کے لیے استعمال کرتے اور پھر ان کی غیبت کرتے سنا ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ لوگ آتے ہیں اور اِس بڑھاپے میں قاسمی صاحب کے لیے ہم دردی کے دو بول بول کر چلے جاتے ہیں۔ ''ساتھ کوئی نہیں نبھاتا جب کہ میں بابا کی دل و جان سے خدمت کرتی ہوں۔'' اس کے علاوہ منصورہ کا کہنا تھا کہ اُس

نے ایسے ایسے بزرگوں کو اپنے ساتھ فلرٹ کی کوشش کرتے آزما لیا ہے کہ اُس کا بالعموم ادیبوں اور بالخصوص مردوں پر اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ قاسمی صاحب کی خواہش تھی کہ منصورہ کسی مناسب شخص سے بندھن میں بندھ جائے۔ اِس کا اظہار انھوں نے مجھ سے بھی کیا۔ چند رشتے آئے بھی مگر جوڑ نامناسب تھے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنا ایک افسانہ قاسمی صاحب کو رائے کے لیے پیش کیا۔ موضوع خاصا بے باک تھا اور الفاظ کسی حد تک تیز تھے۔ آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو اپنی حماقت پر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ خیر اگلی ملاقات میں مَیں نے اس پر قاسمی صاحب اُن کی رائے کی درخواست کی تو انھوں نے مقفل دراز چابی سے کھولی اور نیچے کاغذات کے بنڈل سے نکال کر افسانہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ‘‘مجھے خوف تھا کہ کہیں منصورہ کی اِس پر نظر نہ پڑ جائے۔’’

اس قصے کا ایک تیسرا پہلو بھی تھا۔ منصورہ کی قاسمی صاحب سے محبت نے اُس میں جذبۂ ملکیت پیدا کر دیا جس سے قاسمی صاحب کی حقیقی اولاد متاثر ہوئی اور اُس کے اور منصورہ کے بیچ برفانی دیوار کچھ ایسی کھڑی ہوئی کہ بات قاسمی صاحب کے وصال کے بعد ‘‘فنون’’ کے حقِ ملکیت تک چلی گئی۔

طویل العمری کے آخری سرے پر قریب آنے والا شخص بعض اوقات بزرگ کے فیصلوں اور تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اور ایسا ہی منصورہ کا قاسمی صاحب پر اثر ہوا۔ یہ جاں کاہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ قاسمی صاحب کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد منصورہ جو تنہا رہ گئی تھی، جوانی میں خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ اِس دوران میری جب بھی اُس سے ملاقات ہوئی، میں نے دل جوئی کی اپنی سی کوشش کی لیکن اُس پر اداسی مستقل سایہ فگن رہی، وہ روز بہ روز بیمار ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ایک روز موت کے اندھے کنویں میں اُتر گئی۔

قاسمی صاحب کی شخصیت کے چند دل چسپ اور متاثر کن پہلوؤں کے تذکروں کے بغیر اُن کا تذکرہ تشنہ رہے گا۔

شاعر اور دانش ور افتخار بخاری صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا۔ ‘‘جب میں نے نظم ‘‘چودھویں صدی کی آخری نظم’’ قاسمی صاحب کو اشاعت کے لیے بھیجی تو وہ فوراً چھپ گئی۔ اس بات نے مجھے بہت متاثر کیا کہ بغیر کسی تعارف اور نام کے میری تخلیق کو قاسمی صاحب نے ‘‘فنون’’ میں نمایاں جگہ دی چناں چہ جب میں لاہور گیا تو قاسمی صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔’’

‘‘دفتر میں داخل ہوتے وقت میں قاسمی صاحب کے ادبی مقام کی عظمت اور دانش ورانہ شوکت کے رعب تلے دبا ہوا تھا، یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے ایک بہت شفیق اور مسکراتا، منکسر شخص بیٹھا تھا جو میرے تعارف کروانے پر نہ صرف مجھے پہچان گیا بلکہ بہت تپاک سے ملا اور بولا۔ ‘‘آپ کی تخلیق کی پختگی دیکھ کر میں آپ کو بڑی عمر کا شخص سمجھ بیٹھا تھا، آپ تو ابھی بالکل جوان اور تر و تازہ ہیں۔’’

ان کی اس حوصلہ افزائی نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہ میرے تخلیقی سفر کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

اسی طرح آصف فرخی صاحب نے ایک مرتبہ تذکرہ کیا کہ جب انھوں نے اپنا ایک افسانہ قاسمی صاحب کو بھیجا تو فوراً چھپ گیا۔ جب آصف صاحب کی قاسمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو قاسمی صاحب نے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ دہرایا۔ ‘‘میں تو آپ کو خاصی بڑی عمر کا آدمی سمجھ بیٹھا تھا۔’’

نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کا قاسمی صاحب کا یہ اپنا انداز تھا۔ انھوں نے بہت سے ایسے لوگوں کی کتابوں کے فلیپ بھی لکھے جو چند معترضین کی نظر میں اس کے اہل نہ تھے۔ قاسمی صاحب اس پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ‘‘مجھے جس میں ذرّہ برابر بھی خوبی نظر آتی ہے میں اُس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتا ہوں۔ عین ممکن ہے ان میں کوئی باصلاحیت ہو جو میری زبان، ادب اور میرے وطن کے لیے بار آور ثابت ہو۔’’

پارس

ایک روز میرے مربی اور صف اول کے ادیبوں کے معروف پبلشر سنگ میل کے مالک افضال احمد مسکراتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ''عرفان بھائی، میں نام ور اور بڑے ادیبوں کے حوالے سے ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے بیش تر کے لیے اپنی ذات سے مقدم اور کچھ نہیں ہوتا، یہ خواہش مند ہوتے ہیں کہ نو واردانِ ادب ان کی کاسہ لیسی کریں۔'' میں نے اختلاف کرتے ہوئے چند ایک نام لیے جن میں سر فہرست قاسمی صاحب کا نام تھا۔ اُن کا نام سن کر افضال صاحب نے توقف کیا اور بولے۔ ''قاسمی صاحب کا تو تذکرہ ہی کیا۔ ایسے بڑے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ادیبوں کی نسلیں سنوار دیں اور اپنے لگائے پودے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔''

دو تین بار میں نے قاسمی صاحب کے سامنے کچھ ایک ایسی جسارتیں کیں جن پر کوئی اور شاید سیخ پا ہو جاتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے نہ جانے کس ذہنی رو کے تحت شاعری پر بات کرتے ہوئے اُن سے کہہ دیا۔

''میں شاعری کی رموز میں بالکل کورا ہوں لیکن اقبال کے ہاں جو شوکت، راشد کے ہاں خیال، فیض کے ہاں غنائیت، فراز کے ہاں رومانوی گداز، ناصر کے ہاں اُداسی نظر آتی ہے ویسی کوئی نمایاں پہچان آپ کی شاعری کی نہیں، اس میں تخلیقی مہارت تو ہے مگر غنائیت اور روح کو چھو جانے اور سرشار کرنے والی شعریت نہیں۔''

یہ سن کر قاسمی صاحب خاموش ہو گئے۔ منصورہ قریب سے بولیں۔ ''بابا کے ہاں فکر کی گہرائی اور خیال کی جو ندرت ہے وہ ان کے ہم عصروں میں نایاب ہے۔''

قاسمی صاحب نے منصورہ کو ٹوکا۔ ''بیٹی، عرفان صاحب کو رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے۔''

اسی طرح ایک مرتبہ میں نے ایک افسانہ بھیجا جس کا عنوان ''ابورشن'' تھا۔ جب اُن سے ملنے گیا تو افسانہ کمپوز ہوا رکھا تھا اور اُس کا عنوان ''ابارشن'' درج تھا۔ درج شدہ عنوان دیکھ کر میں نے گزارش کی کہ یہ انگریزی کی ترکیب ہے اور اس میں "الف" کی جگہ ''و'' کا آنا زیادہ درست ہوگا۔ اتنا سننا تھا کہ قریب میں بیٹھے ایک ادیب نے تلخی سے مجھے ٹوک دیا۔ ''کیا اب آپ ہمیں سکھائیں گے۔''

یہ سن کر قاسمی صاحب نے مسودہ اٹھایا اور سرخ قلم سے ''ابارشن'' کاٹ کر دوبارہ ''ابورشن'' لکھ دیا اور بولے۔ ''یہ انگریزی اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے درست فرما رہے ہوں گے۔''

کسی نے لکھا کہ اُس نے ٹی وی پر ایک پاپ گلوکار کو اپنا سینہ ٹھونک ٹھونک کر کہتے سنا۔ ''ہاں میں عظیم ہوں۔'' تو اُسے اُستاد بڑے سلامت علی خان یاد آ گئے۔ استاد فن کی معراج پر تھے کہ کوئی ان کی تعریف کرتا تو انکسار سے سمٹ کر شرما جاتے اور فرماتے۔ ''میری کیا اوقات ہے۔''

جب معاشرے کوتاہ قامت ہو جائیں تو بونے قد آور ہو جاتے ہیں اور زندہ معاشرے تو کھڑے ہی قد آور لیکن عظیم اور منکسر لوگوں کے کندھوں پر ہوتے ہیں۔

دمے کی بیماری کے باعث چند ایک مرتبہ اسپتال میں داخل ہونا پڑا لیکن قاسمی صاحب کے مزاج کی شگفتگی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ کبھی کسی اہم دقیع نکتے پر بحث کے دوران سنجیدہ ہو جاتے لیکن عموماً اُن کی کوشش ہوتی کہ محفل کا ماحول شگفتہ رکھیں۔ ایسے میں شستہ مزاح کی پھوار برستی رہتی۔

ایک مرتبہ کہنے لگے۔ ''ایک صاحب بہت دور سے ملنے آئے، میں اُن کے جذبے سے بہت متاثر ہوا اور اُن کی خوب مدارات کی۔ کچھ دیر بعد مہمان نے گھڑی دیکھی اور بولے۔ 'میں شورش سے ملنے آیا تھا، وہ تھے نہیں، سوچا کہ اُن کے بہانے آپ سے بھی ملتا چلوں۔ اب تک وہ آ گئے ہوں گے۔ سو اجازت چاہتا ہوں۔' یہ سننا تھا کہ میری خوش فہمی ہوا ہو گئی۔''

بیماری کی وجہ سے نقاہت ہو جاتی، تقریبات میں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ ایک مرتبہ فون آیا۔ دوسری جانب سے کوئی تقریب میں شرکت کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ یک دم قاسمی صاحب کی آواز میں کمزوری دَر آئی اور کھانستے ہوئے عاجزی سے معذرت کی اور بتایا کہ کس طرح ان کی صحت ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر اُدھر سے سنتے رہے اور پھر بولے۔ ’’بس دعا کیجیے۔‘‘ جب فون بند کیا تو چہرے پر بشاشت لوٹ آئی اور کھنکتی آواز میں شرارت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ’’دیکھا کس طرح بنایا ہے۔‘‘

آخر میں کچھ اونچا سننے لگے تھے آلۂ سماعت کا سہارا لیتے۔ ایک روز کہنے لگے۔ ’’اِس اونچا سننے نے مجھے بہت شرمندہ کیا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب میاں والی سے آئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ ’ہور سناؤ، کیہ حال اے‘ اس پر میں نے انھیں آہستہ بولنے کا اشارہ کیا اور مسکرا کر پوچھا، جناب کیا قیامت آگئی ہے؟ میرے اونچا سننے کی بدنامی کہاں تک جا پہنچی ہے۔‘‘

ایک شام مجلسِ ترقیٔ ادب میں محترمہ نیلم احمد بشیر اور پروین عاطف سے ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ احمد بشیر صاحب بیمار ہیں۔ پروین عاطف صاحبہ بہت دکھ سے بتانے لگیں کہ حالت بہت بگڑ چکی ہے، کافی لوگ ملنے آ رہے ہیں۔ پھر اضافہ کیا کہ کمیونزم سے اس شدت سے لگاؤ ہے کہ کمرے میں اب تک مارکس وغیرہ کی تصاویر سجی ہوئی ہیں۔ البتہ ان کا بیٹا امریکا جا کر کافی صاحب ثروت ہو چکا ہے اور اپنے بچوں کو بتاتا رہتا ہے کہ مارکس اور لینن وغیرہ بدمعاش اور قاتل تھے۔ باپ اور بیٹے میں عجیب تضاد ہے۔ ایک پکا کمیونسٹ اور دوسرا کیپٹلسٹ۔ پروین صاحبہ نے بات مکمل کی تو قاسمی صاحب نے زیرِ غور مسودے سے سر اُٹھایا اور بولے۔ ’’احمد بشیر صاحب کیسے ہیں؟‘‘ یہ سن کر سب مسکرا پڑے۔ گویا انھوں نے اب تک کی کوئی بات نہ سنی تھی۔ حاضرین محفل میں سے کسی نے بتایا کہ خللِ سماعت کے شکار مخاطب سے جب تک اُس کی جانب چہرہ کر کے اور نام لے کر بات نہ کی جائے تو مخاطب متوجہ نہیں ہوتا۔

فون پر بہت مختصر اور مطلب کی بات کرتے۔ بعض اوقات مخاطب کو غلط فہمی ہوتی کہ شاید اُس سے ناراض ہو کر فون رکھ دیا ہے لیکن شناسا اس عادت سے واقف تھے۔

ایک مرتبہ درازیٔ عمر کی بات چل رہی تھی تو معصومیت سے بولے۔ ’’میری عمر اتنی ہو گئی ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔‘‘

میری آنکھیں بھر آئیں۔

ملکی حالات اور عدم برداشت کے بڑھتے رجحان پر دکھی ہو جاتے۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر یقین رکھتے۔ ایک دوپہر رمضان میں روزے کے دوران اُن کے دفتر میں داخل ہوا تو چند ادیب بیٹھے چائے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک صاحب بولے۔ ’’بھئی ہمارے مسلک میں چائے اور سگریٹ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہم سب الحمدللہ روزے سے ہیں۔‘‘ یہ سن کر قاسمی صاحب مسکرا دیے اور بات کا سرا وہیں سے پکڑ لیا جہاں سے چھوڑا تھا۔

ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے کہ جانے کیا ماجرا ہوا ہے کہ تقسیم کے بعد سے لوگوں میں نظریاتی، مسلکی اور سیاسی برداشت گھٹتی ہی جا رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا قیام پاکستان سے قبل باہمی تعلقات میں مذہبی رجحان حائل ہوتا تھا تو نفی میں سر ہلا دیا اور بولے۔ ’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِکا دُکا انفرادی واقعات سے ہٹ کر کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ کون ہندو، سکھ یا مسلمان ہے۔ پھر کرشن چندر اور بیدی سے اپنے تعلق کی مثال دی جس میں کبھی کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق میں سب افسانہ پڑھتے، اس پر بحث ہوتی، اختلافِ رائے بھی ہوتا لیکن بعد ازاں سب اکٹھے ہوتے اور کسی کے دل میں ذرّہ برابر کدورت نہ ہوتی۔‘‘

قاسمی صاحب ایک چھوٹی سی گاڑی میں دفتر آتے، لباس نفیس اور صاف ستھرا لیکن سادہ عموماً شلوار قمیص اور واسکٹ پر مشتمل ہوتا،

پارس

لاہور کی ایک متوسط آبادی کے چھوٹے سے گھر میں رہتے، روزگار کا انحصار شرم ناک حد تک محدود تنخواہ پر ہوتا، کالم اور رائلٹی کی آمدنی سلسلۂ جسم و جان کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی۔ خودداری کا یہ عالم کہ کبھی قلتِ وسائل کا شکوہ نہ کرتے دیکھا گیا۔ سرمایۂ افتخار فن کار، بابائے ادب کو قلم کی مزدوری میں صبح سے شام کرنا پڑتے۔

ساٹھ کی دہائی سے آخرِ عمر تک بے پناہ ٹیلنٹ کو بنانے، سنوارنے، راہ نمائی کرنے اور متعارف کروانے میں قاسمی صاحب کا کردار مثالی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر یقیناً اُن سے بڑے، بلکہ بہت بڑے نام اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک معاملہ جس میں انھیں انفرادیت حاصل رہی وہ نئے تخلیق کاروں کی دریافت، حوصلہ افزائی، تربیت اور تعارف میں اپنی تمام تر مخلصانہ توجہ اور محنت کو بروئے کار لاتے ہوئے نمایاں کرنے میں بلامبالغہ بین الاقوامی سطح پر کوئی اُن کے قریب بھی نظر نہیں آتا۔ بیش تر اہم تخلیق کاروں کے سوانح پر نظر دوڑایئے، سبھی 'وحدہ' 'لاشریک' کا ورد کرتے اپنی ذات کے استھان پر سجدہ ریز نظر آتے ہیں، جب کہ ناتواں احمد ندیم آخر عمر تک کچی مٹی کے باوے بنا کر انھیں پکاتا اور چومتا رہا۔ وہ یقیناً دیومالائی پارس کے پتھر کے مانند تھا، وہی افسانوی پتھر جو جس دھات سے بھی چھو جائے اُسے سونے میں ڈھال دے۔

تخلیق کاروں کی راہ نمائی کے سوا تخلیقی فعالیت کا یہ عالم کہ شاعری، افسانہ، خاکہ، کالم نگاری، مضامین اور تنقید پر مشتمل درجنوں (پچاس سے اوپر) کتابیں تصنیف کیں۔

اُن کی تحریروں میں مون سون کی بارشوں کی رِم جھم، تازہ کٹے چارے کی کچی مہک، رہٹ سے نکالے کنویں کے میٹھے ٹھنڈے ٹھار پانی کی تازگی، اُپلوں پہ پکتے پکوان کی اشتہا انگیز خوشبو اور تالاب میں اُترتی بھینسوں کی چھپاک چھلکتی ہے۔ ان میں جنگلوں میں بہتی ندی کی سی روانی اور بانسری کی موسیقی کا سا جادو ہے، خیال آرائی ہے، قادر الکلامی ہے، رنگ سازی ہے۔ یہ تحریریں آگ اُگلتے سورج کی طرح چندھیا دینے والی نہیں بلکہ پورن ماشی کے چاند کی طرح نرم اور ٹھنڈک بخشنے والی ہیں۔ بالکل احمد ندیم قاسمی کی طرح۔

کچے ذہن کچی مٹی کی طرح ہوتے ہیں جن پر اوائلِ عمر کے نقوش گوتم بدھ کے قدموں کے نشانوں کی طرح پکے اور دیرپا ہوتے ہیں، شاید اسی لیے، بچپن میں پڑھی درسی کتابوں میں درج حکایات اور کہانیاں ساری زندگی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بعدازاں بیش تر لوگ اُن ادیبوں کا عکس انھی تحریروں کے چاندی آئنوں میں دیکھتے ہیں۔

میں نے قاسمی صاحب کو اُن کی دیہی طرزِ حیات پر مشتمل افسانوں میں بعد میں دریافت کیا۔ ''رئیس خانہ'' بعد میں دیکھی، پہلی تحریر ''گھر سے گھر تک'' پڑھی جو متوسط شہری گھرانے کی عکاسی کرتی ہے۔ اُن کی تحریروں کی سلاست، روانی، شگفتگی، شائستگی اور سادگی مجھے بہت پُرکشش لگی۔

اُن کے سترہ افسانوی، آٹھ شعری، تین تحقیقی وتنقیدی مجموعوں کے علاوہ درجنوں کتابیں بچوں کے ادب، اخباری کالموں، تراجم، مضامین، ڈراموں، خاکوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔

یوں 1916ء میں انگہ میں جنم لینے، وادیٔ سون سکیسر میں ابتدائی زندگی گزارنے، معمولی سرکاری ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز اور جلد اُکتا کر اُس سے قطع تعلق کرنے والے دیہاتی لڑکے کو ''بابائے ادب'' بننا تھا، یہ صحیفۂ ادب میں لکھ دیا گیا تھا۔

تین تاریخیں ہیں اور ان تاریخوں کا نرسنگھ داس سے کوئی تعلق نہیں۔

سَن ہے دو ہزار چھ عیسوی اور تاریخ جولائی کی چھ۔

میرا لاہور کافی دنوں کے بعد جانا ہوا تھا۔ پہلے ہر آٹھ دس دن بعد قاسمی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ کراچی جانے کے بعد

لمبے وقفے آنے لگے تھے۔ اُس روز مصروفیات کو کچھ یوں ترتیب دیا کہ آغاز قاسمی صاحب سے ملاقات سے رکھا تھا۔

سو جب اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو حسبِ معمول وہ کوئی مسودہ پڑھنے میں مشغول تھے۔ وقت کمرے میں تھم چکا تھا۔ کمرا ویسا ہی تھا اور کھڑکی سے آتی سورج کی کرنیں اور پرندوں کی چہکار کی رِم جھم وہی تھی۔ البتہ قاسمی صاحب مزید کم زور نظر آئے۔

مجھے دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی طلوع ہوگئی اور گرم جوشی سے اُٹھنے کو تھے کہ میں نے اُن کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

’’کیسے ہیں‘‘ اُنھوں نے پوچھا۔

’’ٹھیک ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

لہجے میں خفگی در آئی۔ ’’آپ تو لاپتا ہوگئے۔ میں تو پریشان ہوگیا تھا کہ خیریت سے ہوں۔ فون کرنے کو تھا۔‘‘

ہر چند روز بعد خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کا فون آجایا کرتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا کہ میرے قیام کے شہر میں کوئی حادثہ ہوا تو خیریت دریافت کرنے کے لیے سب سے پہلے، میرے اہلِ خانہ سے بھی قبل ان کا فون آجاتا۔ میں سیال کوٹ میں تھا کہ ایک دھما کا ہوگیا، اہل خانہ کے علاوہ سب سے پہلا فون اُن کا آیا۔ اسی طرح 2005ء کے زلزلے کے بعد اسلام آباد میں میری خیریت دریافت کرنے والے ابتدائی پرسانِ حال میں وہ شامل تھے۔ اس زلزلے سے وہ بہت رنجیدہ رہے۔ وہ اپنے رفقا، ’’فنون‘‘ کے معاونین اور دوستوں کے لیے ایسے ہی فکر مند رہتے۔

میرے لہجے میں ندامت آگئی۔ ’’سر کراچی چلا گیا ہوں اس لیے کوتاہی ہو جاتی ہے۔‘‘

’’کم از کم فون ہی کر لیا کریں، اس پر چند سیکنڈ کا فاصلہ ہے۔‘‘

میں نے معذرت کی تھی۔

انھوں نے آصف فرخی صاحب کی خیریت دریافت کی اور مجھے ’’دنیا زاد‘‘ رسالہ تھما دیا تھا۔

’’عمدہ رسالہ نکالا ہے فرخی صاحب نے۔‘‘ انھوں نے کہا تھا۔

میں رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا تھا۔

اُس دن کا ہر لمحہ میرے یادداشت پر کیسے نمایاں ہے، روزِ حشر کے نامۂ اعمال کی طرح۔

ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو اُن سے بولے تھے۔

’’میری شاعری اور نثر کے تمام مسودوں کے بارے میں مَیں نے فلاں صاحب کو کہہ دیا ہے، آپ وہ مسودے لیتے آیئے گا۔‘‘

میں نے بات بیچ سے اُچک لی تھی۔

’’سر، کیا آپ کا ان تمام مسودوں پر دوبارہ کام کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’کچھ کام کرنا ہے اُن پر۔ اس کے علاوہ تاثرات اور خاکوں پر مشتمل ایک کتاب پر بھی کام کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا۔‘‘ سنجیدگی نے اُن کے چہرے پر پُرعزم جال بننا شروع کر دیا تھا۔

میں نے کسی تازہ عمدہ تصنیف کا دریافت کیا تو انھوں نے مسعود مفتی کے افسانے اور اسد محمد خاں کے افسانوں کی کتاب ’’تیسرے پہر کی کہانیاں‘‘ مجھے عطا کیں اور کچھ کہنے کو تھے کہ ایک صاحب، غالباً شاعر سعد اللہ شاہ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ قاسمی صاحب نے تپاک سے اُن کی خیریت دریافت کی تھی۔ چند رسمی جملوں کے بعد انھوں نے اپنی ایک تازہ غزل قاسمی صاحب کو پیش کی۔ قاسمی صاحب نے اسے بغور پڑھا، ایک آدھ لفظ بدلا، چند الفاظ کے بارے میں استفسار کیا اور مسودہ قریب میں پڑے بریف کیس میں رکھ لیا تھا۔

اب تک دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ کھانا میز پر چن دیا گیا۔ قاسمی صاحب میز کی اِس جانب آ گئے۔ اُن کے سامنے دو سادہ کباب پلیٹ میں سجا دیے گئے۔ میں اجازت لے کر اٹھنے کو تھا کہ قاسمی صاحب بھی اُٹھے، میں نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے، اور باہر چلا آیا تھا۔

باہر مال روڈ پر زندگی زور و شور سے رواں دواں تھی۔

یہ تاریخ تھی جولائی کی آٹھ اور سن وہی۔

میں نے مجلس کے دفتر فون کیا تاکہ عاریتاً لی گئی کتابیں لوٹا دوں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ قاسمی صاحب بیمار ہو گئے ہیں، اسپتال داخل کرا دیا گیا ہے۔

میں روز مرہ کی طرح گھر سے نکلا، مجلس کے دفتر گیا، کتابیں لوٹائیں، اسپتال کا معلوم کیا، بتایا گیا شام تک لوٹ آئیں گے۔

سال با سال کے تعلق میں وہ چند ایک مرتبہ پہلے بھی اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ اسپتال کا خوں آلود ماحول مجھے دہشت زدہ کر دیتا ہے۔ نہ جانے اُس روز میں کیوں کر قاسمی صاحب کی عیادت کرنے اسپتال چلا گیا تھا۔

وہ انتہائی نگہداشت وارڈ میں داخل تھے۔ میں اُن کے بستر تک جا پہنچا۔ قریب میں اُن کے برخوردار نعمان قاسمی کھڑے تھے اور معروف ایم آر شاہد بیٹھے بہت عقیدت سے قاسمی صاحب کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایم آر شاہد نے قاسمی صاحب کی جانب اشارہ کیا تھا اور فقط تین لفظ بولے تھے۔ ''میرا روحانی باپ۔'' میں نے سر ہلا دیا تھا۔ اسی اثنا میں قاسمی صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انھوں نے ایم آر شاہد کو اشارے سے ٹانگیں دبانے سے منع کیا اور نعمان قاسمی سے میری جانب اشارہ کر کے کچھ بڑبڑائے تھے۔

میں ان کے ہونٹوں کے نزدیک ہو گیا، وہ مدھم لہجے میں بولے تھے۔ ''آپ کے بزرگ میرے ہمسائے میں رہتے تھے۔ ہمسایوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائے تھے۔

مجھے یاد تھا، میں نے یہ تذکرہ بہت سال پہلے، اپنی پہلی ملاقات میں کیا تھا۔

میں نے چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ میں نے تردد اور تذبذب سے کہا۔ ''سر! بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔''

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا، کروٹ بدلی اور آنکھیں موند لی تھیں۔ میں دبے قدموں باہر نکل آیا تھا۔

یہ کون سی تاریخ تھی اور کون سا سن یاد نہیں۔

لوگ بتاتے ہیں کہ جولیس سیزر کے مہینے کی دس اور عیسیٰ کا دو ہزار چھ برس تھا۔

میں کراچی لوٹ آیا تھا۔ معمول کے کام میں مصروف تھا کہ خیال آیا کہ قاسمی صاحب کو فون کر کے خیریت دریافت کر لوں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔

سو فون ملایا تھا۔ ''جی قاسمی صاحب سے بات کرائیے۔''

ایک گمبھیر مردانہ آواز فون پر تھی۔ ''وہ آج صبح فوت ہو گئے ہیں۔ جنازہ پانچ بجے ہے۔''

چند جملے کتابوں میں پڑھے ہوتے ہیں، جن کی ہم سب جگالی کرتے رہتے ہیں۔

''زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی محسوس ہوئی۔'' یہ جملہ بے شمار مرتبہ پڑھا تھا، اُس دن تجربہ بھی ہو گیا۔

قاسمی صاحب کہتے تھے کہ ادیب بننے کے لیے تجربے اچھے ہوتے ہیں۔

اس روز گھر آ کر ٹی وی آن کیا تو کسی کی موت کی خبر آ رہی تھی۔ جھنجلا کر ٹی وی بند کر دیا اور لیٹ گیا۔

پارس

اب تک دو پہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ کھانا میز پر چن دیا گیا۔ قاسمی صاحب میز کی اس جانب آ گئے۔ اُن کے سامنے دو سادہ کباب پلیٹ میں سجا دیے گئے۔ میں اجازت لے کر اٹھنے کو تھا کہ قاسمی صاحب بھی اُٹھے، میں نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے، اور باہر چلا آیا تھا۔

باہر مال روڈ پر زندگی زور و شور سے رواں دواں تھی۔

یہ تاریخ تھی جولائی کی آٹھ اور سن وہی۔

میں نے مجلس کے دفتر فون کیا تا کہ عاریتاً لی گئی کتابیں لوٹا دوں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ قاسمی صاحب بیمار ہو گئے ہیں، اسپتال داخل کرا دیا گیا ہے۔

میں روز مرہ کی طرح گھر سے نکلا، مجلس کے دفتر گیا، کتابیں لوٹائیں، اسپتال کا معلوم کیا، بتایا گیا شام تک لوٹ آئیں گے۔

سال ہا سال کے تعلق میں وہ چند ایک مرتبہ پہلے بھی اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ اسپتال کا خوں آلود ماحول مجھے دہشت زدہ کر دیتا ہے۔ نہ جانے اُس روز میں کیوں کر قاسمی صاحب کی عیادت کرنے اسپتال چلا گیا تھا۔

وہ انتہائی نگہ داشت وارڈ میں داخل تھے۔ میں اُن کے بستر تک جا پہنچا۔ قریب میں اُن کے برخوردار نعمان قاسمی کھڑے تھے اور مصنف ایم آر شاہد بیٹھے بہت عقیدت سے قاسمی صاحب کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایم آر شاہد نے قاسمی صاحب کی جانب اشارہ کیا تھا اور فقط تین لفظ بولے تھے۔ ”میرا روحانی باپ۔“ میں نے سر ہلا دیا تھا۔ اسی اثنا میں قاسمی صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انھوں نے ایم آر شاہد کو اشارے سے ٹانگیں دبانے سے منع کیا اور نعمان قاسمی سے میری جانب اشارہ کر کے کچھ بڑبڑائے تھے۔

میں ان کے ہونٹوں کے نزدیک ہو گیا، وہ نحیف لہجے میں بولے تھے۔ ”آپ کے بزرگ میرے ہم سائے میں رہتے تھے۔ ہم سایوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائے تھے۔

مجھے یاد تھا، میں نے یہ تذکرہ بہت سال پہلے، اپنی پہلی ملاقات میں کیا تھا۔

میں نے چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ میں نے تردّد اور تذبذب سے کہا۔ ”سر، بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا، کروٹ بدلی اور آنکھیں موند لی تھیں۔ میں دبے قدموں باہر نکل آیا تھا۔

یہ کون سی تاریخ تھی اور کون سا سن یاد نہیں۔

لوگ بتاتے ہیں کہ جولیس سیزر کے مہینے کی دس اور عیسیٰ کا دو ہزار چھٹا برس تھا۔

میں کراچی لوٹ آیا تھا، معمول کے کام میں مصروف تھا کہ خیال آیا کہ قاسمی صاحب کو فون کر کے خیریت دریافت کر لوں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔

سو فون ملایا تھا۔ ”جی قاسمی صاحب سے بات کرائیے۔“

ایک گمبھیر مردانہ آواز فون پر تھی۔ ”وہ آج صبح فوت ہو گئے ہیں۔ جنازہ پانچ بجے ہے۔“

چند جملے کتابوں میں پڑھے ہوتے ہیں، جن کی ہم سب جگالی کرتے رہتے ہیں۔

”زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی محسوس ہوئی۔“ یہ جملہ بے شمار مرتبہ پڑھا تھا، اُس دن تجربہ بھی ہو گیا۔

قاسمی صاحب کہتے تھے کہ ادیب بننے کے لیے تجربے اچھے ہوتے ہیں۔

اُس روز گھر آ کر ٹی وی آن کیا تو کسی کی موت کی خبر آ رہی تھی۔ جھنجلا کر ٹی وی بند کر دیا اور لیٹ گیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے، کیوں ہو جاتا ہے۔

سُنا ہے کہ اُس روز اُردو کے ادبی حلقوں میں کہرام برپا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس روز ایک آدمی اُٹھ گیا تھا۔ خواب تھا یا حقیقت تھا، آدمیت کا افتخار یا مشتِ غبار کچھ معلوم نہیں۔ کہ معلوم اور نامعلوم کے بیچ ایک لطیف حد ہوتی ہے، پس اُس روز ایک آدمی سلطنتِ خداوند کے عالم اجسام سے خاموشی سے اُٹھا اور چلا گیا۔ وہ ایک آدمی......

اُس روز کے بعد جانے کتنی مرتبہ نرسنگھ داس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرا ہوں لیکن اندر نہیں گیا، مبادا قاسمی صاحب ناراض ہو جائیں کہ اتنے دِنوں سے اُن سے بات کیوں نہیں کی۔ ویسے بھی اِن دنوں وہ کچھ حساس ہو چکے ہیں۔

بارش، خوشبو اور سماوار

اے حمید (خاکہ)

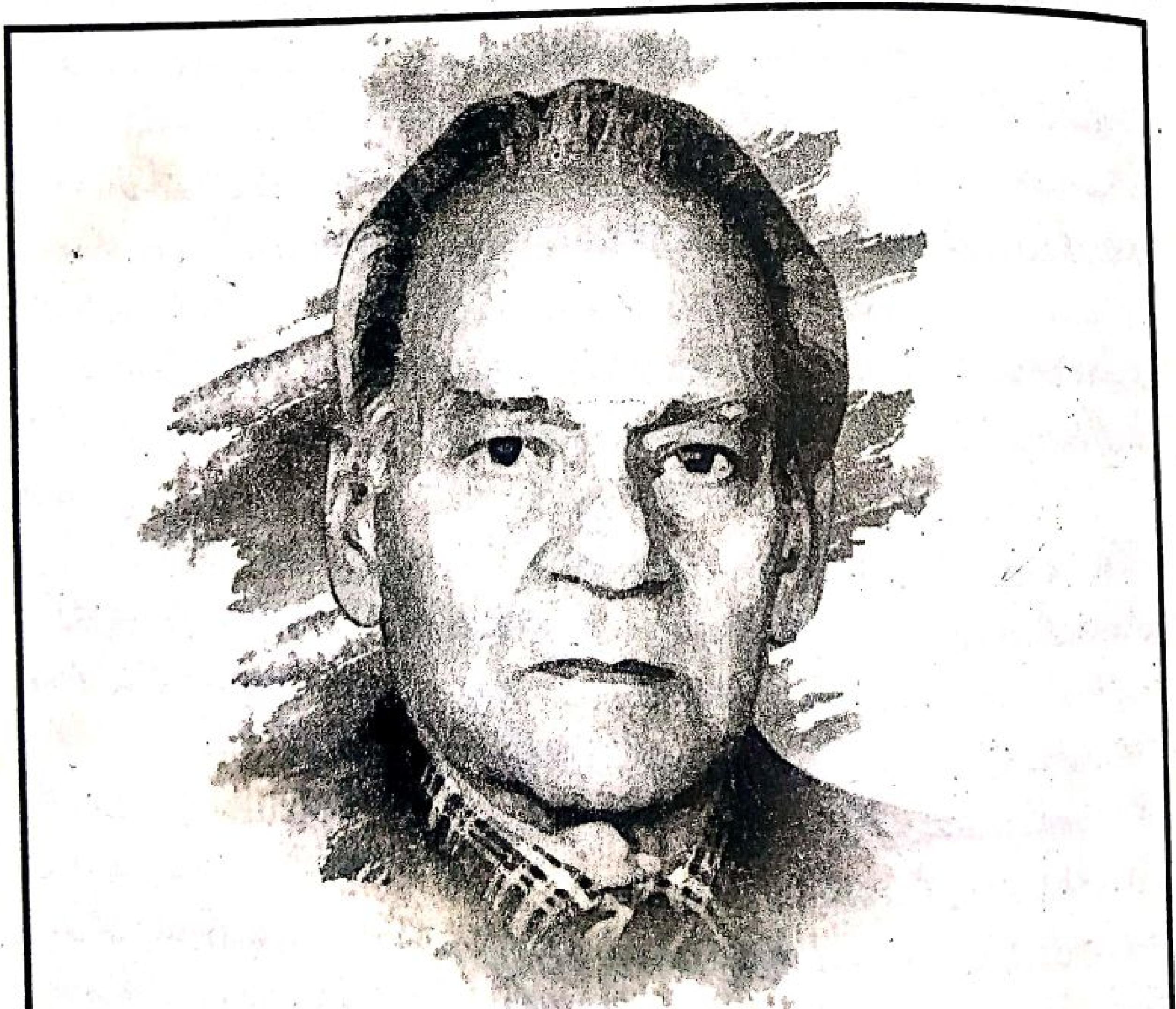

میں چھوٹا سا بچہ تھا تو صبح سویرے کی تازہ نیم سرد ہوا میں ورانڈے میں بیٹھے دادا جی کی گود میں چڑھ آتا تھا۔ تازہ غسل کے بعد اُن سے ولایتی صابن، ٹیلکم پاؤڈر اور اولڈ سپائس آفٹر شیو لوشن کی مہک آیا کرتی تھی۔ وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر، سامنے سڑک سے گزرتی اکا دُکا رینالٹ، واکس ویگن، موریس گاڑیوں، آسمانی رنگ کے ویسپا سکوٹروں، گھنٹی کی جل ترنگ میں خراماں سائیکلوں کی میکانکی موسیقی میں گھلتی ملتی چھاؤنی کے قدیم برگد کے چھتناور درختوں میں کوکتے پرندوں، نیم کے درختوں سے گرتے نیم کے پیلے پکے پھل کی تھک تھک درختوں سے جامن کے گرنے کی ہلکی ٹپ ٹپ اور انگور کی بیلوں میں چھپی چھوٹی رنگین چڑیوں کی چہکار میں گھلتی ملتی کہانیاں سُنایا کرتے۔ اُن کی سُنائی کہانیاں، کہانیاں کم اور اُن کے وطن امرت سر، جسے وہ امبر سر کہتے تھے، کے قصے زیادہ ہوتے۔ اُن کی زبانی ماضی کی تصوراتی عینک سے دیکھا گیا امبر سر کوئی جادوئی شہر لگتا تھا جہاں امرت کے چشمے بہتے، سونے میں ڈھلا سورج سنہری شعائیں بکھیرتا، ٹھنڈے ٹھار میٹھے پانی کے کنویں اپنی گہرائیوں میں برف آب، آبِ حیات کا خزانہ رکھتے۔ وہاں کے کمپنی باغ کی کیاریوں میں خوش رنگ پھول جھومتے اور سبزے سے لدے درخت روشوں پر جھک آتے۔ اُن کی یادوں کا سلسلہ تب ٹوٹتا جب گوالا سائکل کی گھنٹی بجاتا دودھ بھری گڑویاں لیے کوٹھی میں داخل ہوتا۔

دادا جی کے گزر جانے کے بہت سال بعد جب میں نے اے حمید سے سوال کیا کہ کیا امبر سر اتنا ہی جادوئی شہر تھا جس میں ہر سُو موتیے، گلاب، رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو ہوا کے ہم راہ ہلکورے لیتی اور چھوٹی چاندی آئینہ ندیاں باغات میں بکھری ہوتیں تو وہ مسکرائے اور کسی اور دُنیا میں گم ہو گئے تھے۔

”میرا امرت سر اس سے بھی کہیں زیادہ حسین تھا۔ اس میں چالیس ٹھنڈے میٹھے پانی کے کنویں تھے، سرسبز و شاداب اور پُرسکون کمپنی باغ تھا، بیچ میں نہر بہتی تھی۔ میں روز وہاں نہایا کرتا اور روز نیا اِنسان ہو جانے کا احساس دل و دماغ کو سیراب کیا کرتا۔ وہاں کا پانی ایسا تھا کہ وَید جب دوا دیتے تو ہدایت کرتے تھے کہ اسے امرت سر کے پُرتاثیر پانی کے ساتھ لیا جائے۔“

اے حمید صاحب نے کھوئے ہوئے لہجے میں یہ بات مجھ سے پہلی ملاقات میں کہی تھی۔ بعد کی ملاقاتوں میں تقسیم کے بعد کا لاہور، لنکا، برما، بنگال، محبتیں، نمکین ملیح لڑکیاں، بودھ، نیم، شیشم، ناریل کے درخت، ہندومت، سکھ مذہب، دینِ اسلام، سادھو سنت، ست رنگے دوست، بیٹیاں اور جانے کون کون سے موضوعات تھے جن پر ہماری بات نہ ہوئی ہو۔ ان میں بہت سی وہ باتیں بھی کھلیں جو اُن کی تحریروں میں موجود نہ تھیں۔

وہ خوش پوشاک، خوش خوراک، سرخ و سفید، نازک مزاج رومانوی اے حمید جو تصویروں میں نظر آتا تھا، اُسے ڈھونڈتا جب میں سمن آباد کی ایک پُرسکون سڑک کے چھوٹے سے مکان تک جا پہنچا تو وہاں میری ملاقات ایک نحیف، کم زور، کھچڑی بالوں والے شخص سے ہوئی۔

وہ رایل لنڈن کراکری، عمدہ ولایتی کپڑے کا نفیس لباس، خوشبودار تمباکو اور بھاپ اُڑاتی رومانوی سیلون کی چائے جس کا تذکرہ اُن کی تحریروں سے یوں ٹپکتا تھا جیسے چھوٹی مکھی کے چھتے سے بہشت کا شہد، ندارد تھا۔ سفید پوشی تھی یا شاید عسرت تھی، سادگی تھی، متانت تھی، خودداری تھی ناسٹلجیا تھا اور بلا کی یادداشت تھی۔

اے حمید کا پورا نام عبدالحمید تھا۔ انھوں نے اُس دور کے فیشن کے مطابق اسے مختصر کر لیا، زیڈ اے بخاری، زیڈ اے سلہری، ایم ڈی تاثیر کی طرح۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں امرت سر میں پیدا ہونے والے اے حمید کو اُنیس برس کی عمر میں ہجرت کر کے لاہور آنا پڑا لیکن اُن کا امرت سر سے رشتہ اتنا شدید تھا جتنا بیش تر مر چکے لاہوری ہندو سکھوں کا لاہور سے۔ شہروں کے مذہب نہیں ہوا کرتے، نومولودوں کی طرح، جنھیں ہم بعدازاں اپنے پسندیدہ مذاہب اُوڑھا دیتے ہیں۔ 1928ء میں امرت سر میں جنم لینے والے اور 'منزل منزل' نامی افسانے سے ادبی زندگی کا آغاز کرنے والے اے حمید نے بلاشبہ سیکڑوں افسانے، ناول، سفرنامے، کالم، یادداشتیں اور ڈرامے لکھے۔ ان کی کتب کی تعداد

دوسو سے بڑھ کر تھی۔ البتہ اُن کی شہرت کا باعث ''اردو شعر کی داستان''، ''اُردو نثر کی داستان''، ''مرزا غالب لاہور میں''، ''داستان گو اشفاق احمد''، ''مٹی کی مونا لیزا''، ''جنگل اُداس ہے''، ''جنگل روتے ہیں'' کے علاوہ بے شمار افسانوی مجموعے اور ناول بنے۔ ان کے ہاں دیو مالا، حقیقت اور تاریخ تحریر کے بنیادی تار و پود ہوتے جو تحیر و رومان کی کھڈی پر فن پارے کی شکل میں بُنے جاتے۔ جہاں یہ یک سانی اُن کی انفرادیت و شناخت بنی وہیں اُن کی یک رنگی تحریریں تنوع سے محرومی کے باعث وہ ارفع مقام نہ پا سکیں جو اُن کے سے قادر الکلام و پر خیال وپُر کار فن کار کا مقدر بن سکتا تھا۔ ان کو نوجوان طبقے میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مگر سنجیدہ علمی حلقوں میں مقبولیت تو بہت ملی، وہ مقام نہ مل پایا جو وہ تنوع اور عمدہ معیار قائم کر کے حاصل کر سکتے تھے۔ قلم کے ملازم تھے چناں چہ روزانہ ایک نئی چادر بُنتے۔ فکرِ روزگار سے اتنی فرصت نہ تھی کہ یک سوئی سے کئی برس صرف کر کے نازک و نفیس کشمیری پشمینہ بُنتے جو سونے کی انگوٹھی سے گزر جاتی۔

وہ دور ہیجان انگیز تل پٹ کا تھا، وہیں تخلیقی فعالیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو، اختر شیرانی، احمد راہی، ابن انشا، ناصر کاظمی، اشفاق احمد، منیر نیازی، انجم رومانی، قیوم نظر، مصور شاکر علی، انور جلال شمزا، گلوکار استاد امانت علی خان اور جانے کون کون سے ستارے اس کہکشاں کا حصہ تھے۔

اُنؒ کے ناول اور افسانے بالخصوص نوجوان طبقے میں فطرت کی عکاسی، رومان اور شگفتہ طرزِ تحریر کی وجہ سے مقبولیت کے عروج تک پہنچے۔ امرت سر، لاہور، سیلون، رنگون اور ہندوستان کے طول و عرض کی یادداشتیں، مشہور ادیبوں کے خاکے، عام زندگی کے کرداروں کی عکاسی میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل رہا۔ بچوں کے ادب کی جانب آئے تو بسیار نویسی کے باوجود جاسوسی اور ماورائی کہانیاں ادبی رنگ میں لکھیں۔ 'عنبر ناگ ماریہ' پڑھ کر تو ایک پوری نسل جوان ہوئی۔ اس سلسلے کے ایک سو سے زیادہ ناول لکھے۔ البتہ روانی تخلیق میں چند بنیادی اغلاط کر گئے جیسے چنگیز خان اور ہنی بال کا دور سکندرِ اعظم سے پہلے آ گیا۔ ان اغلاط کا اعتراف کیا مگر توجیہ یہ پیش کی کہ یہ کوئی تاریخی و تحقیقی دستاویز نہیں بلکہ تخیلاتی اور طلسماتی دنیا کی تخلیق ہے جو زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ وہ ہر نابود شئے سے محبت میں مبتلا ہو کر ایک سوگوار رومانوی تعلق قائم کر لیتے۔ ''میں نے عظیم مصور رینائر کی دو سو برس پرانی پینٹنگ میں پیرس کی ایک لڑکی دیکھی۔ وہ لڑکی ایک باغ میں تھی۔ اب وہ لڑکی مر چکی ہے مگر اس پینٹنگ کی وجہ سے زندہ ہے۔ میں اُس لڑکی سے محبت میں گرفتار ہوں۔'' کالموں کی شائستہ اور رواں اور دل چسپ تحریر نے قارئین کے دل موہ لیے۔ ٹی وی ڈرامے لکھے۔ بچوں کے لیے ڈراما 'عینک والا جن' نے تو 'کھڑکی توڑ رش' لیا۔ گویا تصور و تخیل کی دنیا میں رہنا اور اسے قلم سے کاغذ پر منتقل کرنا اُن کا عشق اور روزگار ٹھیرا۔ جہاں عشق اور روزگار ایک ہو جائیں وہاں کام کام نہیں رہتا لطافت و لذت کا یادگار تجربہ بن جاتا ہے۔

جہاں منٹو نے اُنھیں پیار سے ایک بکواسی کا خطاب دیا جو کھمبے سے بھی عشق کرتا ہے، وہیں انتظار حسین نے انھیں بیسویں صدی کے تین بڑے رومانوی ادیبوں میں ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے ساتھ شمار کیا۔ کشور ناہید نے ان کے رومانوی مزاج کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ''جب مالی باغ کی صفائی کرتا تو وہ خشک پتے واپس بکھیر دیتے کہ ان کے بغیر باغ سُونا لگتا۔'' بانو قدسیہ نے اُن کے دھیمے مزاج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اُن کی موجودگی میں مخاطب میں اپنی ذات کی مضبوطی اور طاقت کا احساس فزوں تر ہو جاتا۔ ابن انشا نے تو ان کی محبت میں لکھا۔ ''اب کے لاہور آیا تو ملوں گا' اور جی کڑا کر کے تمھارا منہ چوموں گا اور شہر گھومیں گے۔'' احمد راہی کا خیال تھا کہ جب بھی انھوں نے فلم بنائی تو اے حمید اس کا ہیرو ہوگا۔ خالد حسن ایسے اپنے مزاج کے شخص نے تو ان کے شاہ پارے انگریزی میں ترجمہ کر کے انھیں عالمی قارئین سے متعارف کروایا۔

اے حمید سے میرے تعلق اور ان کی جانب رجحان کی وجوہ کچھ اور تھیں۔ عنفوانِ شباب تک میرا کوئی دوست نہ تھا۔ بھرے پُرے خاندان میں رہنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ خاندان کا پہلا بچہ ہونے کے باعث میں اپنے دادا جی اور نانا جی کے بے انتہا قریب تھا، زیادہ وقت اُن

کے ساتھ گزارتا یا پھر کتابوں کے ساتھ۔ میرا خاندان بھی امرت سر سے ہجرت کر کے لاہور چھاؤنی آباد ہوا چناں چہ امرت سر کا کوئی بھی حوالہ اُن کے دِل کے تار چھیڑ دیتا تھا۔ ”نوائے وقت“ اُس وقت سب سے مقبول روزنامہ تھا جس میں امرت سر سے متعلق تحریریں چھپا کرتیں۔ امرت سر کی یادیں تازہ کرنے میں اے حمید سرِ فہرست تھے۔ مجھے اُن کی تحریریں اُن میں موجود پاکیزہ یادوں اور زبان کی درستی کے لیے پڑھائی جاتیں۔ میں یہ تحریریں کو پڑھ کر جو ”بارش خوشبو اور سماوار“ کے عنوان سے چھپتی تھیں، ایک رنگین دھندلکے میں کھو جاتا۔ اُن کی تحریریں کیا تھیں، صندل کے جنگلوں سے ہلکی بارش کے بعد سرمئی دھند میں اٹھنے والی روح پرور مہک، کشمیری ہاتوؤں کے چھوٹے پہاڑی مکانوں میں اُبلتی سماوار کی نمکین خوشبو، امرت سر کی باقرخوانیوں کی خستگی، لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر چلتی وکٹوریا میں جُتے سفید رنگ کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز، بنگال کے بندرابن کی جھیلوں میں گھٹنے گھٹنے ڈوبے درختوں سے لٹکتے شیش ناگوں کی پھنکار، راتوں کو دریاؤں سے لوٹتے مچھیروں کے چپوؤں کی چھپاک ہوتی تھی، رنگ برنگی بے شمار جزئیات کی سخن آرائیاں۔

میں امرت سر نہیں گیا مگر امرت سر کے سحر میں گرفتار ہوں۔ میں مسلمان ہوں، آواگون پر شاید یقین نہیں رکھتا مگر رکھتا بھی ہوں کہ مجھے لگتا ہے، میں نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے لاہور میں زندگی، بھرپور زندگی گزاری ہے۔ میں نے وہ سنہالی لڑکی نہیں دیکھی جس نے ریلوے اسٹیشن پر مڑ کر ٹرین کی کھڑکی میں بیٹھے خوب رو اے حمید کو شیدائیت بھری نظروں سے دیکھا تھا اور ہجوم میں گم ہو گئی تھی مگر میں آج بھی اُس لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوں۔ میں اُس سراپا ملاحت برمی لڑکی سے تو عشق کرتا ہوں جو ایک بم حملے میں ماری گئی تھی (مجھے آج بھی یقین نہیں کہ خوب صورت بھولی بھالی لڑکیاں مر بھی سکتی ہیں) یہ بھی سچ ہے کہ پچھلے دنوں ایک رات کے پچھلے پہر امین سیانی کی آواز میں رِکارڈنگ سن کر مجھے وہ ریڈیو سیلون، جانکی بائی، شمشاد بیگم اور کندن لال سہگل یاد آ گئے جنھیں میں نے اے حمید کے کانوں سے سنا تھا۔ میری یادداشت میں چابی والے قد آدم گھڑیال کے گھنٹے کی آواز، لنکا کے ساحلوں پر ناریل کے جنگلوں میں ڈُھکے ہوئے بنگلے۔ اُن بنگلوں کے باغوں میں خودرُو گھاس میں اُگتے جنگلی پھولوں پر منڈلاتی تتلیوں کے نازک پروں کی مہین پھڑپھڑاہٹ بھنورے کی پھرر پھرر گدگدا رہی ہے۔ میں نے بہت کچھ نہیں دیکھا لیکن ہلکی پھوار کے بعد سیاہ بادلوں کے پھٹنے سے وجود میں آتے شگاف میں سے ترچھی سنہری شعاعوں کا سمندر کی لہروں پر ناچ، برمی لڑکیوں کے رنگین فراک نُما جھالروں والے لباس میں رقص کے دوران ہست و بود سے ماورا ہو جانا، قراقرم کے پہاڑوں کی بلندیوں سے برف کی سلیں لاتے پہاڑی لوگوں کی قطاریں میں نے کہیں دیکھ رکھی ہیں۔ شاید میں نے یہ سب نہیں دیکھا مگر دیکھا ہے، بہت قریب سے دیکھا ہے اور اب یہ سب کچھ، بہت کچھ میری روح کا حصہ ہے۔

میری یادداشت میں ایک ذائقہ بھی ہے۔ بڑی ہرنی آنکھوں، صراحی گردن اور شفاف جلد والی شرمیلی لڑکی کی اُنگلی سے گلاب کا پھول توڑتے ہوئے کانٹا چبھ جانا پھر اُنگلی پر اُبھرتی لہو کی بوند کو اپنے منہ میں جذب کر لینے کا ذائقہ۔ جنون کچھ ایسا طاری ہوا اور کچھ ایسا سودا سر میں سمایا کہ اے حمید کے ریل گاڑی کے طویل سفر، کھڑکی میں سے نظر آتے سرزمینِ ہند کے سونا اُگلتے کھیتوں میں کام کرتے دہقان، لنکا کی چائے چنتی سلونی لڑکیاں، گھنے اندھیرے جنگلوں میں سے اُٹھتی وحشی سبزے کی تیز مہک، یک دم بنتے بادلوں سے گرتے پانی کے چھینٹوں کی بوچھاڑ، سرنگ سے گزرتی ریل کے پہیوں کی کٹاکٹ کی گونج، شیشے کے بجتے گلاسوں میں بکتی دودھیلی چائے، ریل کی جانب لپکتے سرخ لباسوں میں ملبوس بازوؤں پر بندھے سفید نمبروں والے قلی، سرکتی ٹرین کے ساتھ بھاگتے دوست، تیز رو گاڑی کی کھڑکی سے پھسلتا اور لہراتا جاتا رنگین دوپٹا میرے حواس پر مدتوں سے سوار ہیں۔ شاید اسی لیے میں نے ریل کے بے ضرورت کئی سفر کیے۔ ایک صبح لاہور کی ٹرین میں سوار ہوا اور کھڑکی کے ساتھ باہر جھانکتا، کتاب پڑھتا پشاور جا پہنچا۔ رات عزیز کے ہاں قیام کیا اور اگلی صبح لوٹ آیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا اور ڈبے میں ہجوم پنڈی کے بعد چھٹ گیا، سو ابر آلود موسم میں وہ سفر کچھ ایسا بھایا کہ پوٹھوہار کی سرخ پہاڑیوں سے لے کر دریا کے قدیم ریل پُل کے وہ مناظر، تنہا ڈبا اور سرد ہوا جو بدن کا رواں رواں گدگداتی تھی، اُن لمحات کی دین ہے جو آج بھی مجھ میں تلاطم برپا کرتے ہیں۔

اے حمید کا چھوٹا سا مکان سمن آباد لاہور کی ایک پرسکون، یک رویہ درختوں سے سجی سڑک پر تھا۔ سنا تھا، گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ میری اُن سے ٹیلی فون پر چند ایک مرتبہ بات ہو چکی تھی۔ میرے خاندان کے امرت سر سے، وہاں میرے پردادا کے نام پر کوچہ دین محمد کا سُنا تو اُن کے لب و لہجے میں گرم جوشی دَر آئی۔ نفاست، قرینہ اور سادگی اُن کے اندازِ زندگی سے نمایاں تھے۔ مکان کے اندر بائیں جانب چھوٹے برآمدے سے ملحق اُن کے کمرے کا جالی دار سپرنگ والا دروازہ تھا۔ وہ کمرا ہی اُن کا کتاب خانہ، سونے کا کمرا اور خال خال ملاقاتیوں سے ملنے کی جگہ تھی۔ کمرے میں ایک جانب معمولی میز کرسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے پڑھتے تھے، میز پر کتابوں کا انبار بھی دھرا ہوتا تھا، سامنے رکھے پلنگ پر سادہ اور صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی، وہ تھک جاتے تو پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور گھٹنوں پر امتحانی گتا رکھ کر لکھتے رہتے، وہیں سو بھی جاتے۔ کمرے کی قابلِ ذکر اشیا میں ایک اور میز بھی تھی جس پر کھانے پینے کا سامان دھر دیا جاتا۔ میز پر کپڑے کا میز پوش پڑا رہتا جس کے کبھی کھسکنے سے بوسیدہ میز کی کھرچی ہوئی سطح ننگی ہو جاتی۔ کمرے سے ملحق لاؤنج یا پرانی زبان میں گول کمرا تھا جس کے اُدھر باورچی خانہ تھا۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا، وہاں سے کبھی کبھار پانی کے ٹپکنے کی آواز متواتر آتی رہتی۔

اُنھیں ایک سامع کی ضرورت تھی اور مجھے گھنٹوں اُن کی باتیں سننے کا اشتیاق، سو وہ لمحات میری زندگی کے فرحت بخش لمحات ہیں۔ جب کبھی جی اُچاٹ ہو جاتا ہے، روح بوجھل اور تھکن ہڈیوں تک اُتر آتی ہے تو اُن کی وہ دھیمی دھیمی روح پرور باتیں پژمردہ اور دِل گیر وجود کو لوریاں سناتی اور نرم تھپکیاں دیتی ہیں۔

اے حمید کے دادا پکے امبرسری تھے۔ اپنی جمع پونجی لگا کر ایک خوب صورت مکان تعمیر کیا اور اُسے خوب سجایا۔ ساری عمر اس مکان میں گزار دی۔ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے۔ ایک مرتبہ شہر میں شور اُٹھا کہ زلزلہ آ رہا ہے۔ لوگ خوف زدہ ہو کر گھروں سے نکل کر میدانوں میں جمع ہونے لگے، بازار ویران ہو گئے، مدرسوں میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ دادا کے اہلِ خانہ بھی سامان اسباب اُٹھا کر باہر کو لپکے لیکن دادا نے جانے سے انکار کر دیا اور ایک ہی بات دہراتے رہے۔ ''یہ میرا گھر ہے اور قبر بھی۔ یہ گھر گرے گا تو میرے ہی اوپر گرے گا، میں اسے کسی صورت چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' یہ علیحدہ بات ہے کہ بلا ٹل گئی۔

گویا خبط وراثت میں تھا۔

والد پہلوان تھے۔ پہلوانوں کی خوب عزت کی جاتی تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ بیٹا بھی پہلوان بنے۔ چناں چہ اس کی صحت بنانے کے لیے باقاعدہ ڈنڈ نکلواتے، ورزش کرواتے اور کھیتوں، میدانوں اور نواحی جنگلات میں صبح سویرے سیر کے لیے لے جاتے، ان سیروں نے طبیعت میں فطرت سے لگاؤ اور رومان پیدا کر دیا۔ پنجاب کی گھنی ہریالی اور جنگلی پھول، تازہ ہوا میں پرندوں کی چہکار دُور افق پر نارنجی دائرہ پیلا اُودی گولا اور پھر سنہرا دمکتا دہکتا چندھیاتا سورج بن جاتا۔ والد اِس دوران درختوں، پودوں اور پھولوں کے بارے میں بتاتے جاتے، بیٹا شوق اور حیرت سے دیکھتا جاتا۔

بیٹے کو تازہ دودھ پینے کا شوق باپ سے وراثت میں ملا۔ وہ بھینس کا تازہ کچا نیم گرم دودھ وہیں دھاروں کی شکل میں پی لیتا۔ البتہ ایک شوق اور تھا، اور وہ تھا مطالعے کا۔ رات کو اپنے پسندیدہ مصنّفین کے ناول لے کر کمپنی باغ چلا جاتا۔ لوگ جلد سو جایا کرتے تھے، سرِ شام ہی ہر سُو سناٹا ہو جایا کرتا۔ ایسے میں کمپنی باغ کی روشیں سرکاری سٹریٹ لیمپوں کی روشنی سے منوّر ہو جاتیں۔ اب رات میں وہاں پتنگے لائٹوں کا طواف کرتے یا پھر جھینگروں کی آوازیں سناٹے میں سیندھ لگاتیں۔ ایسے میں نوجوان اے حمید کسی سٹریٹ لیمپ کے نیچے بیٹھ جاتا اور ایک وقت کتابیں پڑھنے میں گزار دیتا۔

اے حمید کئی بہنوں کے بعد پہلے بیٹے تھے، کچھ نازک مزاج اور نفاست طبع بھی تھے۔ ماں بہنوں کے لاڈلے، اس جسمانی مشقت، ایسے غیر شاعرانہ مشاغل پر کیوں کر آمادہ ہوتے۔ باپ کی سختی اِس حد تک بڑھ جاتی کہ نوبت مار پیٹ تک آ جاتی۔ اے حمید کے مزاج میں

بغاوت تو شاید پیدا نہ ہو سکی، البتہ فرار ضرور در آیا۔

قریباً پورا ہندوستان چھان مارا۔ رنگون سے سیلون تک زمینِ وطن، ہندوستان کا چپّا چپّا دیکھ ڈالا۔ اسی آوارگی اور سیاحت نے جہاں رنگ رنگ کے لوگ، گورکھے، چینی، بنگالی، پنجابی، گووَن وغیرہ سے ملوایا، وہیں ہر طرح کے ماحول، جان ور، پرند، پھلوں، پھولوں، اور درختوں سے بھی روشناس کروایا اور مزاج میں گداز، لطافت اور برداشت کو یوں اُبھارا جیسے تنور کی آنچ میں میدے کا پیڑا پھول کر اُبھر آتا ہے۔

گرمیوں میں ایک دوپہر میں اُن سے ملنے گیا تو آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں درختوں کی شاخیں، جھوم رہی تھیں۔ اُس روز خوش گوار موڈ میں تھے۔ ہم باہر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور وہ منتظر نظروں سے بادلوں کو دیکھنے لگے۔ ہر سو ہلکا سرمئی اندھیرا ابھرا ہوا تھا۔ بادلوں میں بجلی کی بے آواز کوند لشکارا مار جاتی تھی۔ ایسا موسم تھا جو روح کو تراوت دیتا ہے۔ نہ جانے کس لہر میں تھے کہ خود کلامی کے سے انداز میں بولنے لگے۔

"مذہب کتنی رومانٹک چیز ہے۔ میں بھی بہت رومانٹک ہوں۔ پیغمبروں کو دیکھو، پہاڑوں پر چڑھے، ٹھنڈے غاروں میں قیام کیا روشنی پانے کے لیے، اور گیان دھیان کیا۔ اس میں اسرار کی ایک لطیف دُھند ہے، مٹھاس اور نرمی ہے۔ گوتم بدھ جنگل جنگل تپسیا کرتا ہے اور ایک درخت، بودھ گیا کے درخت تلے نروان پاتا ہے۔ مذہبی آدمی سخت مزاج تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو انسان کو دھیما اور رومانٹک کرتا ہے۔ قدرت کی گود میں بیٹھ کر تپسیا کرنے سے آپ کے اندر ایک درد اور رواداری پیدا ہوتی ہے۔ گوتم کو جب گیان ہوا تو اُس نے کُل جہاں پر رحم کی نظر ڈالی۔ وہ جان گیا کہ سب مجبور ولاچار ہیں، کچھ حالات کے اور کچھ اپنی فطرت کے۔ سبھی محبت، شفقت اور رحم کے مستحق ہیں۔"

اس کے بعد پیغمبروں، ولیوں، جوگیوں کے قصے سنائے۔ اشعار اُن کی زبان پر یوں اُتر رہے تھے جیسے سیاہ گلابوں پر شبنم اُترتی ہے۔ ٹُلسی داس کے اشعار سنائے، چند یاد رہ گئے۔

ٹُلسی دیا دھرم کا مول ہے
پاپ کا مول ابھیمان
ٹُلسی دیا نہ چھوڑیے
جب تک تن میں پرأن

تلسی یاں سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ
سب سے ہل مِل رہیے ندی ناؤ سنجوگ

پھر کہنے لگے کہ وہ کسی مذہب کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ ہر مذہب کی حقانیت کے قائل ہیں۔ ہندو دھرم کے نظریۂ آواگون کو تو بہت بڑی حقیقت مانتے ہیں۔

"تمام مذاہب ایک ہی آفاقی سچائی کی جانب جاتے ہیں۔ ارجن کرشن کو کہتا ہے۔ 'تُو نے اتنے روپ دِکھائے تو یہ ہزاروں فرقے کیسے ہیں؟'

کرشن کہتا ہے۔ 'مجھ سے ملنے جو کوئی جس راستے سے آتا ہے میں اُس سے اُسی راستے میں ملتا ہوں۔'

ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے اسی طرح مذاہب انسان کو زیادہ انتخاب کی آزادی اور مواقع دیتے ہیں۔ یہ انسان کی انفرادیت مجروح نہیں ہونے دیتے۔ یوں خلقت کی رنگارنگی دنیا کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔"

جوگی، سنت، جٹادھاری سادھوؤں کے بارے میں بتانے لگے کہ ایسے جوگی ہوتے تھے جو اپنے بدن کو راکھ سے لیپ لیتے

تھے، چند اتنے کم خور ہوتے کہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن جاتے، کچھ ناخنوں اور بالوں کو اتنا بڑھا لیتے کہ مونچھ داڑھی چہرہ ڈھانپ لیتی اور ہونٹ نظر نہ آتا۔ ان کے بال اتنے بڑھ جاتے کہ انھیں رسیوں کی شکل دے کر درختوں کے تنوں، شاخوں پر کمند کے مانند پھینکتے جو ان کے گرد لپٹ جاتے اور یہ بندروں کے مانند ان سے جھولنے لگتے۔ چند ایسے بھی تھے جو تنفس پر اس حد تک قدرت حاصل کر لیتے کہ خود کو زمین میں دفنا لیتے اور گھنٹوں بعد زندہ باہر نکل آتے۔ ایسے سادھو انھوں نے اپنی آنکھوں سے یا تو لاہور میں دسہرے کے تہوار پر دیکھے یا پھر آوارہ گردیوں کے دوران۔

امرت سر کے دنوں میں بلا ارادہ جہاں گردی کو نکل جاتے۔ سودا جب سماتا تو سیلاب بلا ہر سوراخ کر جاتا۔ ایک مرتبہ رنگون میں بڑی آپا کے ہاں چلے گئے جن کے شوہر کیپٹن ممتاز کی وہاں تعیناتی تھی۔ نصف برس وہاں قیام کیا اور اُس سرزمین کے عشق میں کچھ ایسے مبتلا ہوئے کہ آخر حیات تک اصل حیات رہا۔ رومان تو لاہور آنے کے بعد ٹھنڈی سڑک کی شاہ دین بلڈنگ، پاک ٹی ہاؤس، لارنس باغ کے درختوں اور اُن پر رین بسیرا کرنے والے پرندوں، شکر دوپہروں کی سنسان سڑکوں اور شاداب پنجابی دوشیزاؤں سے بھی کیا۔

’’عشق بہت کیے لیکن کسی لڑکی کو خراب نہیں کیا۔‘‘ ایک روز اُن کی بیگم ریحانہ نے چائے بھجوائی تو اس کی چسکیاں لیتے ہوئے کہنے لگے۔ ’’میں اُن خوش نصیبوں میں سے ہوں کہ جس سے عشق کیا، اُسے پا بھی لیا۔ میرا سب سے شدید عشق ریحانہ سے تھا اور آج بھی ہے۔‘‘

ایک عجب داستان بھی سُنائی۔

اے حمید نے افسانے لکھنے شروع کیے تھے۔ ان کے افسانے ’’ادبِ لطیف‘‘ میں چھپتے اور ساتھ میں تصویر ہوتی۔ کنیئرڈ کالج کی ایک لڑکی نے انھیں خط لکھا جس میں ان کی تحریر کی از حد تعریف تھی۔ اے حمید کے افسانوی ذہن نے ایک منصوبہ بنایا اور یہ کنیئرڈ کالج جا پہنچے۔

وہاں انھوں نے بہانہ بنایا کہ یہ باصلاحیت لڑکیوں کے انٹرویو کے لیے ایک رسالے کے نمایندے کے طور پر آئے ہیں۔ اُسی لڑکی کا حوالہ دیا کہ اُس کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ انتظامیہ کو شک ہوا تو سہی لیکن بہر طور ان کی مطلوبہ لڑکی سے ملاقاتی کمرے میں ملاقات کروا دی گئی۔

بعد ازاں یہ کنیئرڈ کالج کے ایک فنکشن میں اُس لڑکی کے بھائی بن کر جا پہنچے اور اُسے لے کر لارنس باغ چلے آئے۔ وہاں رات میں ایک پولیس والے نے پکڑ لیا تو بہانہ بنایا کہ یہ اُس کے چچا ہیں جو اُسے کالج فنکشن کے بعد گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ یہ بعد کی ملاقاتوں کا نقطۂ آغاز تھا۔ معاملات اس حد تک بڑھ گئے کہ بات شادی تک جا پہنچی۔ اُس دور میں پسند کی شادیاں بہت معیوب سمجھی جاتی تھیں اور ایسے لڑکے لڑکیوں کو عموماً آوارہ سمجھا جاتا تھا۔ رشتے میں پیچیدگی دَر آئی۔ لڑکی کے باپ کا چھاپا خانہ تھا اور وہ خاصے خوش حال لوگ تھے جب کہ لڑکے کی آمدنی کا دارومدار اُس کی تحریروں پر تھا جو بہ مشکل جیب خرچ کے برابر تھی۔ بات بگڑتی سنورتی، سنورتی بگڑتی رہی اور بہت بڑھ گئی۔ بالآخر لڑکی والوں نے لڑکے کی سرکشی پر سپر ڈال دی یہ معاملہ مستقل رفاقت پر منتج ہوا۔ اس معاملے میں احمد ندیم قاسمی، اے حمید کی جانب سے لڑکی والوں کو قائل کرنے بھی گئے۔

یہ اے حمید کی پہلی شادی تھی اور آخری بھی۔ لڑکی کا نام ریحانہ تھا۔
لڑکی کو سسرال والوں نے آخری وقت تک قبول نہ کیا، بہت بعد تک اے حمید کو دیگر لڑکیاں رشتے اور دوسری شادی کے لیے دکھاتے رہے۔

’’عورت مرد کی ملاقات کبھی مشکل نہیں رہی۔ یہ سب قصے کہانیاں ہیں کہ پہلے لڑکے لڑکیوں کی ملاقاتیں ناممکن تھیں۔ ملاقات تو چھوڑو، مجھے سیلون کی وہ لڑکی آج بھی یاد ہے جسے میں نے ٹرین کی کھڑکی سے پلیٹ فارم پر جاتے دیکھا۔ ہم دونوں کی نظریں ملی تھیں، وہ ٹھٹھکی، اور آگے بڑھ گئی تھی۔ میں دم سادھے اُسے دیکھتا رہا تھا۔ یکایک وہ رُکی اور اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اُس کی نظروں میں بیک وقت اپنائیت اور دعوت تھی، یاس بھی تھا۔ اتنے میں میری ٹرین چل پڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھتی رہی تھی یہاں تک کہ ایک مبہم سایہ بن گئی تھی۔ وہ سایہ آج

بھی میرے ساتھ موجود ہے۔“

اے حمید نے شادی کے بعد بھی محبتیں کیں لیکن وہ خود کہتے تھے۔

”ریحانہ کو معلوم ہے کہ میں نے اُسے چھوڑ کر کہاں جانا ہے۔ جب کچھ دور چلا، اُلٹے قدموں سے اُسی کے پاس چلا آؤں گا۔“

حیرت انگیز معاملہ تو یہ تھا کہ ریحانہ کی قریبی ترین سہیلی ’ش‘ گورے چٹے تیکھے نقوش والے کشمیری اے حمید سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ عشق کی منزل پہ جا پہنچی۔ اِس اسیری میں اُس نے عمر بھر شادی نہ کی۔ ریحانہ کے لیے یہ کوئی راز نہاں نہیں تھا لیکن ریحانہ نے بھی ایسی وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا کہ اُس سے دوستی ختم نہ کی۔ وہ ان کے ہاں باقاعدگی سے آتی رہی۔

ریحانہ سے اُن کی وابستگی اتنی دھیمی اور گہری تھی کہ نصف صدی سے کچھ زیادہ کے تعلق میں ایک روٹین تھا۔ دونوں میاں بیوی شام کی چائے اکٹھے پیتے۔ چائے کا وقت ہوجاتا تو گھڑی دیکھنے لگتے اور میں سمجھ جاتا، اُن سے اجازت طلب کرتا اور وہ مسکراتے ہوئے کہتے۔ ”ریحانہ کے ساتھ چائے کا وقت ہوگیا ہے۔“

میں قریباً غروب ہوتا نارنجی سورج دیکھتا باہر چلا آتا۔

محبت کس روپ اور صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، اس کا اظہار ایک امریکی لڑکی نے ایک کتاب ”روح کی غذا“ کے محبت سے متعلق ایک باب میں کیا ہے۔

ایک مرتبہ وہ لڑکی اپنے نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک عمدہ ریستوران میں ’ڈیٹ‘ پر کھانا کھانے گئی۔ جوانی کی دیوانگی تھی، جذبات اُبل اُبل پڑتے تھے۔ ریستوران کے بعد فلم پر جانے کا ارادہ تھا۔ پس منظر میں لائیو آرکسٹرا بج رہا تھا اور باوردی بیرے چاندی کی چمک دار طشتریوں پر، دمکتے کرسٹل کے فانوس کے نیچے سبک رفتاری اور بے آواز قدموں سے مہمانوں کی مدارات میں مشغول تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے لڑکی نے لڑکے سے اپنے بے پناہ دلی جذبات کا اظہار کیا جن میں اپنے پرانے تعلقات اور بوائے فرینڈز کی بے رخی کا تذکرہ بھی تھا۔ لڑکے نے مستعدی سے اُس کی باتیں سنیں اور پر مزاح گفتگو سے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر میں وہاں اُن دونوں کے اُبلتے قہقہے اور ہنسی کی پھوار کی مترنم آواز بکھر رہی تھی۔ اچانک لڑکی کی نظر قریب کی میز پر پڑی جہاں ایک سفید برف بالوں والا بوڑھا اور نفاست سے بنے بالوں پوپلے منہ والی پُروقار بڑھیا خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ وہ بہت سلیقے سے اپنی پلیٹ سے فش، چکن یا سلاد کا ٹکڑا کانٹے سے اُٹھاتے اور منہ میں ڈال کر بے آواز کھانے لگتے۔ لڑکی نے لڑکے کو اشارہ کیا اور وہ بھی اُس بوڑھے جوڑے کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد لڑکی نے لڑکے کو کہا: ’اِس بور جوڑے کو دیکھ رہے ہو۔ مجھے تو انھیں دیکھ کر ہی الجھن ہوتی ہے۔ ان میں ایک لاتعلقی ہے، جیسے دونوں کا آپس میں کوئی جذباتی تعلق ہی نہیں۔ کتنا ٹھنڈا اور غیر رومانوی جوڑا ہے۔‘ اس پر لڑکے نے اُس جوڑے پر ایک پھبتی کسی اور دونوں ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے لڑکے سے پوچھا: ”جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو کیا ہم بھی اتنے ٹھنڈے، بے محبت اور بور ہو جائیں گے؟“ لڑکے نے گرم جوشی سے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ”ہرگز نہیں۔“ بعد ازاں موضوع بدل گیا۔ کھانے کے بعد جب وہ بل ادا کر کے باہر کی جانب چلے تو اُس بوڑھے جوڑے کے قریب سے گزرے۔ ناگاہ لڑکی کی نظر نیچے کی جانب گئی تو اُس نے دیکھا، دونوں میاں بیوی خاموشی سے ایک ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے اور دونوں نے ایک دوجے کا دوسرا ہاتھ میز کے نیچے تھاما ہوا تھا۔ گویا وہ اس تمام عرصے میں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے رہے تھے۔ لڑکی بیان کرتی ہے کہ خاموش محبت کا یہ منظر دیکھ کر اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ محبت، جس میں خموشی گفتگو اور بے زبانی ہے زباں، کا یہ منظر اس کے لیے بہت جاں فزا اور نشاط انگیز تھا۔

شادی کے بعد اے حمید کے لااُبالی پن میں کمی آ گئی۔ وہ ایک ذمے دار شوہر بن گئے۔ ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ اُن کی تحریریں تھیں۔ جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتے تو اُن کی چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کا ریحانہ بیگم بھرپور خیال رکھتیں، بھلے وہ بازار سے سگریٹ لانے

ہوں یا دیگر گھریلو خریداری۔ اے حمید کے مزاج میں ایک رومانی لاابالی پن زیریں سطح پر ضرور رہا۔ جب اُن کا گھر سمن آباد میں تعمیر ہو رہا تھا تو سریا وغیرہ بھی ریحانہ بیگم ہی لاتیں۔ اپنے خاندان کے ریحانہ کے ساتھ سرد رویے کی وجہ سے ان کا بھی رویہ اپنے خاندان سے بیگانگی کا ہو گیا۔

اے حمید پرانے لاہور کو یوں یاد کرتے گویا وہ اب کسی اور کرہ پر آباد ہوں۔ وہ امرت سر میں رہتے اور ادیب بننا چاہتے تھے تو بھی لاہور آتے رہتے۔ یہاں اُن کا ٹھکانا انارکلی کا ممتاز ہوٹل یا پھر منزل نامی ریستوران ہوتا۔ ادیب زیادہ انھی ہوٹلوں میں بیٹھتے۔ ایک روز بتانے لگے کہ وہ لاہور کو اس کے مرچکے لوگوں کے علاوہ، ختم ہو چکے ماحول اور تہواروں، لبادوں، موسموں کی ٹکڑیوں کی شکل میں یاد کے شیش محل میں آباد رکھتے ہیں۔ پرانے دوستوں اقبال کوثر، احمد راہی، ناصر کاظمی اور ان کے ساتھ آندھی طوفان میں گلی کے چھجے تلے ستون کی اوٹ میں پناہ لینے، بھیگی اندھیری راتوں میں سڑکوں پر آوارگی اور تپتی دوپہروں میں پرانی عمارتوں میں رسالوں کے دفتروں سے ملحق آرام کمروں کی ٹھنڈک میں منٹو کے ساتھ مودبانہ گپ شپ کی یادیں زندہ کرتے رہتے۔

اُن کے شب و روز میں تبدیلی تب آئی جب وہ اسّی کی دہائی میں امریکا سے لوٹے۔ ضیاء الحق کا دور تھا۔ سب بدل چکا تھا۔ پرانے دوست بچھڑ چکے اور ٹھکانے خرابوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جی کچھ اُٹھ سا گیا۔ اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئے۔ کبھی بہت مجبوری ہوتی تو رکشے میں شہر کی جانب چلے جاتے مگر ایسے میں مٹی گرد اور حواس مختل کرتا شور انھیں بے دم کر دیتا۔ یہ واقعی وہ لاہور نہ تھا جس میں انھوں نے زندگی بسر کی تھی، زندگی سے پریم کیا تھا، اس کے بوسے لیے تھے اور اس کی زلفیں سنواری تھیں۔ یہ وہ بستی نہ تھی جسے وہ چھوڑ کر امریکا گئے تھے۔ یہ تو اور کوئی اجنبی دنیا تھی۔

کچھ خاص پس انداز نہ کیا تھا۔ جو چیز دل کو بھائی، خرید ڈالی۔ پس انداز کی رقم بھی اس طرح غائب ہو گئی جیسے چھلنی سے ریت۔

ایک روز میں نے اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ لارنس باغ چلیں۔

مجھے اُن کی درختوں اور لارنس باغ سے محبت کا علم تھا۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ ’’مجھے درختوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، یہ خود چل کر میرے پاس آ جاتے ہیں۔ درخت جانتے ہیں کہ انھیں کون پیار کرتا ہے سو یہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس علاقے میں سب سے زیادہ درخت میرے گھر والی سڑک پر ہیں۔ یہ میں نے نہیں لگائے، خود ہی چلے آئے ہیں۔ سب سے پہلے سامنے سنبل کا درخت تھا، پھر اس کے بچے ہوئے، اب تو وہ پردادا ہے۔ اُس کا پورا خاندان میری سڑک پر گھر کے سامنے آباد ہے۔ ان کی Polination میرے سامنے ہوئی ہے۔‘‘ اس کے بعد ایک حیران کن واقعہ سنایا۔

لاہور کا ریڈیو اسٹیشن قیامِ پاکستان کے بعد ایک اہم ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ چوں کہ اس دور میں ٹی وی تھا نہیں، فلم نے بہت ترقی کی نہ تھی، تمام اہم ادیب شاعر یہیں اکٹھے ہوتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ فرمایش پر وہیں بیٹھے بیٹھے شاہکار ڈراما تحریر کر دیا جاتا۔ سارا دن ریڈیو اسٹیشن کی راہ داریوں میں جید علما، معروف دانش ور اور ادب کے زریں دور کے ادیب متحرک نظر آتے۔ برآمدوں میں اس ہماہمی کے باوجود ایک سکون ٹھیرا نظر آتا اور محسوس ہوتا۔ ایک تخلیقی تقدس کی باس تھی۔

سردیوں کے دن تھے۔ زیڈ اے بخاری مہتمم اعلیٰ تھے۔ ریڈیو کی کینٹین لان میں تھی۔ سردیوں کی دوپہروں میں دھوپ کی تمازت لان کے مختلف گوشوں میں بکھر جاتی تو ریڈیو کے لوگ کینٹین کے سامنے خوش گپوں کے لیے یہاں بیٹھ جاتے۔ ایسے میں شہر سے دیگر ادیب شاعر موسیقار بھی آ جاتے اور گویا محفل کا سماں ہو جاتا۔ لوگ باگ دھوپ تاپتے اور مالٹے کنو، مونگ پھلی اور دیگر میوہ جات سے لطف اندوز ہوتے۔ گرما گرم چائے سستے کھنکتے پیالوں میں مختلف میزوں پر بیٹھے لوگوں میں گردش کرتی رہتی۔

لان کے اطراف میں درخت پودے اور بیلیں دیواروں پر جھکے رہتے یا اُنھیں سجائے رکھتے۔ دیوار کے ساتھ پیپل اور پیپلی کا ایک

(ہماری شادی محبت کی، گھر بھی محبت سے تعمیر کیا تو روشنی بھی وہی جلے گی جس سے محبت ہوگی)

مزاج سے اختلاف ناراض کر دیتا۔ کبھی کسی خاص کھانے کی خواہش ہوتی اور کھانا کچھ اور تیار کر دیا جاتا یا بے مزہ ہوتا تو خاموش رہتے مگر بے چینی صاف ظاہر ہو جاتی۔ کبھی بولتے ضرور تھے اور خاصی ناراضی سے۔ بارش کا موسم ہوتا، اچھی موسیقی ہوتی یا ویسے ہی طبیعت سرشار ہوتی اور کوئی بجلی کے بل کا تذکرہ کر دیتا۔ ایسے میں باہر بارش کم برستی اور اندر وہ زیادہ برستے۔ برستے بھی ریحانہ پر جو چپ رہ کے طوفانِ بلا کے گزر جانے کا انتظار کرتیں۔

مزاج میں جہاں برہمی آ جاتی، وہیں مزاح بھی در آتا۔

ایک مرتبہ گھر کے باہر پودوں کو پانی دے رہے تھے کہ تبلیغی جماعت کے چند لوگ آ گئے۔ انھوں نے ان سے بات کرنا چاہی تو اے حمید نے اپنے آپ کو ملازم ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں۔ تبلیغی جماعت والے اگلی منزل کی جانب چلے گئے اور یہ پودوں کو انتہائی سنجیدگی سے پانی دیتے رہے۔

نئے الفاظ اور تراکیب تراشنا مشغلہ تھا۔ ان کے لکھے ٹی وی سیریل ''عینک والا جن'' کی بل بتوڑی ناساں چوڑی ہو یا دیگر کردار۔

ایک جمعے کی دوپہر انھیں کہیں جانا تھا۔ نماز کا وقت تھا سو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر میزبان سے معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''جمعے کا شوٹو ٹا تھا، بہت رش تھا، سو دیر ہو گئی۔''

ان کی زیادہ دوستی ابن انشا، احمد راہی، حمید اختر اور ناصر کاظمی سے رہی۔ احمد راہی اور حمید اختر کا ذکر بے تکلفی سے کرتے جب کہ ناصر کا میٹھی محبت سے۔

کئی واقعات وہ اپنے کالموں اور کتابوں میں لکھ چکے تھے مگر اُن کی زبانی سن کر گویا وہ سب کردار اور ماحول آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتے۔

ناصر کاظمی کی سب سے زیادہ دوستی پاک ٹی ہاؤس کے سامنے ایک درخت سے تھی جس سے وہ کھڑکی کے اِس طرف بیٹھے باتیں بھی کیا کرتے۔

ایک روز بتانے لگے کہ ناصر کاظمی رات کے راہی تھے۔ رات گئے پاک ٹی ہاؤس بند ہو جاتا تو یہ دونوں شہر گردی پر نکل جاتے۔ ایسے میں ناصر پہ ایک سحر طاری ہو جاتا۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب وہ میکلوڈ روڈ کی جانب سے آ رہے تھے کہ جی پی او کی عمارت کے گنبد کے پیچھے پورا چاند ایک گول دمکتے چاندی کے تھال کی طرح سفید روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ناصر کاظمی پر جادو سا ہو گیا اور انھوں نے اپنا مشہور شعر وہیں کہا۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اُسی کو چوم لیا

بتانے لگے ناصر کاظمی خوابوں کی دنیا میں رہتے تھے چناں چہ اپنی ذات اور زندگی کے متعلق جو بھی تصور کر لیتے، اسے خود ہی حقیقت مان لیتے۔ بعض اوقات زیبِ داستان کچھ زیادہ بڑھ جاتی۔

''ایک روز ناصر بہت خوش تھا۔ میں نے خوشی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ 'اے حمید میرے کرشن نگر کے گھر کی گلی میں انگور کی بیلیں ہیں جن پر انگور کے رسیلے گچھے لٹکتے رہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب میرے بچے انگور کی اُن بیلوں کے نیچے سے گزرتے ہیں۔' یہ علیحدہ بات ہے کہ اُس کی گلی میں انگوروں کی کوئی بیل نہ تھی۔''

''اسی طرح ایک روز میں باغ میں بیٹھا تھا۔ باغ میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف بڑھا تو دھوپ کو دیکھ کر رک گیا

اور اس کے کنارے کنارے سائے میں چلتا آیا۔ میرے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ میرے ساتھ آ کر گم سم بیٹھ گیا۔ جب اُسے اس طرح چپ بیٹھے کافی دیر ہوگئی تو میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اُداسی سے کہنے لگا ’یار میں روزانہ صبح ناشتے میں اناناس کھاتا ہوں۔ آج صبح مجھے اناناس نہیں مِلا اس لیے طبیعت بے چین ہے۔‘ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب لاہور میں اناناس عام نہیں ملتے تھے۔

ناصر کاظمی بہت معصوم آدمی تھا اور جب کبھی پَھڑ مارنے پر آتا تو ایسی بات کہہ جاتا جس پر اُس کا اپنا یقین کرنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ ایک روز کہنے لگا۔ ’یہ جو کرشن نگر میں میرا گھر ہے، انبالے میں اس سے بڑا تو میرا کبوتر خانہ تھا۔‘ اس کے بعد ناصر کا ایک واقعہ سُنایا۔ ’جب ناصر امرت سر چھوڑ کر پاکستان کی جانب ہجرت کر رہا تھا تو اُس نے اپنے تمام کبوتروں کو آزاد کر دیا۔ گھر چھوڑتے وقت جب اُس نے مکان پر آخری نظر ڈالی تو کبوتر واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ یقیناً گھر کو لوٹ آئے ہوں گے۔ افسوس وہ پرندے تو گھر لوٹ آئے۔ بے چارہ ناصر پھر کبھی گھر واپس نہ آ پایا۔‘‘

اس دل گداز قصّے کے بعد مسکرا کر کہنے لگے کہ ناصر کے ہاں کبوتر خانہ تو تھا مگر اس وسعت کا یقیناً نہ تھا جس کا ناصر نے نہ صرف دعویٰ کیا بلکہ شاید اپنے اس گمان پر یقین بھی کر لیا۔

’’اُس دور میں اُدھار عام تھا۔ ایک روز ناصر کو پاک ٹی ہاؤس آنے میں دیر ہوگئی۔ میں نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ سامنے سے آنے کے بجائے وہ نیلا گنبد سے پچھلے حصے سے گھوم کر آیا ہے۔ نکڑ پر واقع پان والے سے اُدھار چل رہا تھا جو کافی بڑھ گیا تھا۔ ناصر کہنے لگا کہ پچھلی شب وہاں سے گزرا تو پان والے کی ’آنکھوں میں خون‘ دیکھا تھا۔ وہ پان والا ایک بھلا مانس شخص تھا جو شاعروں ادیبوں کے ہاتھوں ویسے ہی نیم جان تھا۔ ناصر کاظمی کا مشاہدہ فقط تصوراتی تھا۔‘‘

شہر گردی کا ایک اور واقعہ ہنستے ہوئے سنایا۔ ’’میں اور ابن انشا لاہور کی سڑکوں پر مٹر گشت کرتے ہوئے تصور کر لیتے جیسے ہم قدیم بغداد کے بازاروں اور محلوں میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اندرونِ لاہور کی کسی نیم تاریک گلی سے گزرتے ہوئے انشا رُک جاتا اور کہتا ’یا شیخ! خلیفہ ہارون الرشید انھی گلیوں میں لوگوں کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر پھرا کرتا تھا۔‘ اندرونِ لاہور میں کئی گلیاں یک دم بند ہو جاتی ہیں جنھیں عُرفِ عام میں ’بند گلی‘ کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں اور انشا اسی طرح مٹر گشت کرتے ایک بند گلی کے اخیر میں پہنچ گئے جو کسی گھر کے صحن پر ختم ہوتی تھی۔ وہاں ایک عورت روٹیاں پکا رہی تھی جب کہ اُس کے ساتھ ایک شخص آرام کرسی پر نیم دراز حُقّہ پینے میں مشغول تھا۔ ہمیں وہاں دیکھ کر اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا ’کیوں میاں یہاں کیا کر رہے ہو۔‘ انشا لاجواب ہو گیا تو میں بے اختیار بول اُٹھا ’ہم منور صاحب سے ملنے آئے ہیں‘ کیا وہ یہاں رہتے ہیں؟ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا ’میں منور ہوں اور یہاں رہتا ہوں‘ میں نے فوراً کہا۔ ’دراصل ہم مرزا منور قریشی سے ملنے آئے ہیں۔‘ اُس نے بلا تامل کہا ’میں ہی مرزا منور قریشی ہوں۔‘ اس کے بعد جو ہوا، وہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔‘‘

’’مولانا چراغ حسن حسرت بلند پایہ ادیب تھے، بذلہ سنج بھی خوب تھے۔ ایک مرتبہ میں اور دیگر نوجوان ادیب مولانا کے ہم راہ لاہور کے کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ ہم نے کچھ دیر پہلے چائے کا آرڈر دیا ہوا تھا۔ گفتگو جاری تھی کہ مولانا بے چین ہو کر کہنے لگے ’چائے آنے میں خاصی تاخیر ہوگئی‘ جب ایک دوست نے ایک ویٹر کی جانب اشارہ کر کے پوچھا ’مولانا کیا یہی سفید داڑھی والے ویٹر کو آپ نے آرڈر دیا تھا؟‘

مولانا بے ساختہ بولے۔ ’ہاں یقیناً! لیکن جب میں نے آرڈر دیا تھا تب اس کی داڑھی سیاہ تھی۔‘‘‘

سعادت حسن منٹو سے عزت اور مرعوبیت کا رشتہ قائم رہا۔ افسانوں کی پہلی کتاب شائع ہو رہی تھی تو منٹو سے ان پر کچھ لکھنے کی

درخواست کی۔ منٹو نے بے اختیار کہا۔ ''اے حمید بکواس ہے جو کھمبے کو دیکھ کر اس کے بھی عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' یہ بات اے حمید کو اتنی پسند آئی کہ اپنی کتاب کی پیشانی پر لکھ ڈالی۔

''منٹو کو میں نے کبھی فحش گفتاری کرتے نہیں دیکھا۔ میرا اُس کا کافی ساتھ رہا لیکن وہ میرے سامنے کبھی ہیرا منڈی نہیں گیا۔ وہ اپنے چند مخصوص الفاظ بولتا تھا لیکن ٹھیٹھ گالی میں نے اُس کے منہ سے کبھی نہیں سنی۔ وہ عورت کی نفسیات کا حیران کن مشاہدہ رکھتا تھا اور نفسیاتی تجزیہ کرتا تھا۔ عورت اُس کی نظر میں مظلوم تھی۔ عورت کے لیے اس معاشرے میں اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لینا ضروری تھا۔ یہ ضرورت عورت کو ہرجائی کر دیتی تھی۔ وہ نئے رشتے کے بعد پرانے تعلق کو مکمل بھول جاتی۔ منٹو اعتدال سے شراب پیتا تھا۔ جب اُس کا بیٹا مرا تو میں نے اُسے بے انتہا دُکھی دیکھا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ باقاعدہ شراب پینے لگا یہاں تک کہ شراب اُس کو پی گئی۔''

ایک روز میں اُن سے ملنے گیا تو وہ اُداس دِکھ رہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بُجھے لہجے میں بولے ''انشا اور ناصر بہت یاد آ رہے ہیں۔ پچھلی تین دہائیوں میں خالی لوگ آئے ہیں۔ وہی دور اچھا اور قیمتی تھا۔ کیا کیا درویش اور فقیر تھے جو دانش ور بھی تھے اور جنھیں لوگ عزت بھی دیتے تھے۔ آج تو دولت ہی عزت کا معیار بن گئی ہے۔ پہلے لڑکیاں ننگے پیٹ کے ساتھ ساڑھیاں پہنے عام چلتی پھرتی تھیں۔ کسی کی نظر میں گندگی اور ہوس نہ ہوتی تھی۔ اب تو لوگ پورے لباس میں چلتی بچیوں کو نظروں سے ننگا کر دیتے ہیں۔ اس معاشرے کی سب سے بڑی ناانصافی یہ ہے کہ یہاں عورت کو اس کا حق نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا تو شائستگی کا اور مشرقی اخلاقیات کا تقاضا سمجھ کر نہ صرف اس کی خطائیں معاف کر دی جاتیں بلکہ اس کا تذکرہ بھی معیوب سمجھا جاتا۔ کہا جاتا 'مرنے والے کو بُرا مت کہو کہ خدا اُس کا حساب کرتا ہے۔ اُس نے اس کی کھڑکیاں کھول دی ہیں'۔''

سانس بھر کر بتانے لگے کہ آج بھی اُن پر جوانی کے اُس زمانے کا نشہ ہے، ایک گُونہ بے خودی ہے جس کی وجہ سے 'میں تھکتا نہیں'۔

ادب کے حوالے سے اعجاز بٹالوی کی ایک نصیحت کو سند کا درجہ دیتے تھے کہ تیس برس کی عمر تک ہر کتاب پڑھو، لیکن پھر مزاج بنا لو اور مخصوص کتابیں پڑھو۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی ادب میں چیخوف سب سے زیادہ پسند تھا۔ اردو ادیبوں میں احمد علی، حجاب امتیاز علی اور سیّد رفیق حسین۔ سیّد رفیق حسین کی کتاب 'آئینۂ حیرت' کا خاص ذکر کرتے۔ ان ادیبوں کی تحریریں اُن کے منفرد مزاج کی عکاسی کرتی تھیں۔ احمد علی مخصوص ادبی روایت سے جڑی تحریریں، حجاب امتیاز علی اسرار اور رومان میں ڈوبی دُھندلی لیکن دبیز قالینوں، بھاری ریشمی پردوں، اخروٹ اور آبنوسی مسہریوں، گول کمروں میں آتش دانوں کے سامنے جماہی لیتی سیامی بلیوں ایسی کہانیاں اور سیّد رفیق حسین جانوروں اور فطرت کے حیران کُن حقیقی مشاہدے پر مشتمل افسانے لکھتے تھے۔ یہ سب اے حمید کے دل کے قریب تھا۔

دل کے قریب تو موسیقی بھی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اچھے تخلیق کار کو موسیقی دِل کا گداز اور خیال کی رفعت عطا کرتی ہے۔ ریڈیو سیلون پر ایک زمانے میں پرانے ہندوستانی گانے بہت شوق اور حسرت سے سنتے اور ماورائی دنیا میں چلے جاتے۔ اس کا حوالہ جا بہ جا اُن کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ایک روز کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے دھیمی موسیقی سُن رہے تھے۔ کمرے میں صرف ایک لیمپ روشن تھا۔

مجھ سے کہنے لگے ''موسیقی کے بغیر ادیب نامکمل رہتا ہے۔ ہندو بالکل درست کہتے ہیں 'سُر ایشور ہے'۔ یورپ میں پیانو گھر کا لازمی حصہ رہا ہے۔ گرجا گھروں میں بھی موسیقی ہوتی ہے اور مندروں میں بھی گھنٹیوں کی جل ترنگ۔ موسیقی ایک لہر ہے جو آدمی کو اُٹھاتی ہے اور بلندی پر بادلوں کے بیچ لے جاتی ہے جہاں ایک طلسمی دنیا آباد ہوتی ہے۔ مجھے خاص طور پر کلاسیکی موسیقی بہت پسند ہے۔ بیگم اختر اور اُستاد

برکت علی خان صحیح معنوں میں گلوکاری کی معراج پر تھے۔ طفیل نیازی اور پرویز مہدی بھی اچھے گلوکار رہے۔ ایک دور میں مجھے فلموں کا بھی بہت شوق تھا اور میں سینما میں جا کر پہلا شو دیکھتا اور کئی روز تک ان فلموں کے پھونکے منتر کے سحر میں رہتا۔ خاص کر اُن کے گانے اور رنگین مناظر میرے اندر گدگدی سی کرتے رہتے۔"

اُن کے گزر جانے کے بعد ایک مرتبہ میں اُن کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا اُنھیں یاد کر رہا تھا تو بتایا گیا کہ 'کابلی والا' فلم میں منا ڈے کا گانا

اے میرے پیارے وطن
اے میرے بچھڑے وطن
تجھ پہ دل قربان

سن کر امرت سر کو یاد کر کے اُن کی آنکھوں میں حقیقی آنسو آ جاتے تھے۔

میں نے پوچھا کیا وجہ تھی کہ امرت سر سے ہجرت کے بعد وہ دوبارہ اپنے وطن مالوف کو نہ گئے تو ایک حیران کُن انکشاف ہوا۔ تقسیم کی قتل و غارت گری نے اُن کی روح اس حد تک زخمی کر دی تھی کہ اُن کے دل میں ہندوستان سے ایک دوری پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انسانیت کے وحشی پہلو کو اس بے شرمی سے برہنہ ہوتے دیکھ لیا تھا کہ اُن کا لطیف مزاج اور گداز دل اس کی تاب آخر دم تک نہ لا سکا اور ان سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکتا رہا۔

نازک مزاجی کی وجہ سے گھر میں ایک خاموشی ٹھیری رہتی۔ اُن کے کمرے میں جہاں وہ لکھتے، پڑھتے، آرام کرتے اور سوتے تھے کسی کو جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی اونچی آواز، گھر میں چھوٹے بچوں کا شور اور سڑک سے گزرتے رکشے کی پَھٹ پَھٹ سُن کر چہرے پر ایسے تاثرات آ جاتے جیسے کسی نے زور سے چٹکی بھر لی ہو۔ وہ ایک دن میں بارہ گھنٹے بلا تکان لکھتے۔ اَن تھک محنت سے انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے جس کی وجہ سے انھیں معیار پر بھی سمجھوتا کرنا پڑ جاتا۔ ارتکاز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ اپنے نواسے نواسیوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کے کھیل کود سے انھیں ذہنی کوفت ہوتی۔ موڈ بحال ہونے میں خاصا وقت لگتا۔

وقت تو تب بھی بہت لگا تھا جب میں اٹلانٹا کے 'بارنز اینڈ نوبلز' نامی کتب خانے میں کتابیں دیکھتا تھا اور باہر رات میں آسمان سے بارش کے سوگوار قطرے سڑکیں اور عمارتیں گیلا کرتے تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میرے وطن پاک و ہند کی بارشوں، موسموں، پھلوں، پھولوں اور لوگوں میں کیا خاص انفرادی مہک ہے جو امریکا میں ندارد ہے۔ مگر اُس وقت میں یہ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مجھے خبر ملی تھی کہ اے حمید 83 برس کی عمر میں گردوں کے عارضے کے باعث گزر گئے۔ ابھی آخری ملاقات میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انھوں نے بہت کچھ لکھنا ہے۔

میرا ذہن کچھ بھی نہیں سوچتا تھا، بس نمی کی ایک چادر تھی جو وجود کے اندر روح کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

اٹلانٹا کی وہ تاریک رات، وہ سوگوار بارش اور وہ نیم ویران کتب خانہ میں کیسے بھول سکتا ہوں جہاں پناہ لینے کو میں بے وجہ اپنے ہوٹل سے چلا آیا تھا۔

اے حمید نے ایک مرتبہ انتظار حسین سے کہا تھا "مجھے نیند بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے سونا اس لیے اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس طرح مجھے خواب آتے ہیں اور میں خوابوں میں رنگون، کولمبو اور امرت سر کا سفر کرتا ہوں۔ آہ میں کس طرح امرت سر بھول سکتا ہوں۔ وہاں میں خوب صورت لڑکیوں کو دیکھتا ہوں، بارش کی سوندھی خوشبو مجھے مہکاتی ہے اور میں گیلے درختوں کے بیچ روشوں پر بکھرے پتوں کے قالینوں پر چلتا

ہوں۔ صرف تب، آہ صرف تب!"

اے حمید آواگون پر یقین رکھتے تھے۔ جب میں گرمیوں کی بارش کی پھوار میں بھیگ جاتا ہوں، سردیوں میں کسی پہاڑی قہوہ خانے میں انگیٹھی پر پکتی چائے کی نشہ آور مہک سونگھتا ہوں، کھلے آسمان تلے کے ایل سہگل کے گانے سنتا ہوں، کسی ریستوران میں وجیہ اور خوش پوشاک شخص کو کونے کی میز پر کسی خاتون سے رومانوی اور نفیس انداز میں گفتگو کرتے دیکھتا ہوں، کسی باپ کو مُنّی سی بیٹی کو کمر سے لپٹائے سکوٹر پر جاتے دیکھتا ہوں یا بے وجہ کی کسک دِل کو آنچ دینے لگتی ہے تو اے حمید کا خیال آجاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ شاید انھوں نے دنیا کے کسی اور خطے میں خوب صورت معصوم کھلکھلاتے بچے کی شکل میں جنم لے لیا ہو یا شاید وہ ابھی انتظار میں ہوں، جیسے دُور دراز کے قصبے کے ویران ریلوے اسٹیشن کے سال خوردہ مہمان خانے میں دُودھیا بھاپ اُڑاتے انجن والی ریل کار کا انتظار کرتے تھے، تاکہ بہشت کے باغات میں دوبارہ جنم لیں اور اب کی بار کسی گھنیرے درخت یا مہکتے پھول کی شکل میں جنم لیں۔

شریر

احمد فراز

فرازؔ صاحب نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میری شہرت اچھے شاعر کی ہے لیکن میرا اصل کمال شاعری نہیں کچھ اور ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''حصص اور پلاٹوں میں بہترین سرمایہ کاری! اسی لیے میں شاعروں میں سب سے امیر شاعر ہوں۔''

گرمیوں کی ایک دوپہر سہ ماہی ''معاصر'' کے دفتر میں دیسی گھی میں بُھنے گوشت اور کلیجے کھانے کے بعد سگریٹ سُلگاتے اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے احمد فرازؔ نے یہ بات سرسری انداز میں کہی تو قہقہے بلند ہوئے اور موضوع بدل گیا۔

احمد فرازؔ سے میری زیادہ ملاقاتیں تو نہ رہیں۔ جو رہیں، اُن میں سے بیش تر اتنی بھرپور تھیں کہ اُن کا نقش میرے دل و دماغ پر یوں مرتسم ہے جیسے آج بھی ساتھ کے کمرے سے اُن کے زندہ قہقہے اور بھاری آبنوسی آواز سنائی دے رہی ہو۔

فرازؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات مجلسِ ترقیٔ ادب کے دفتر میں ہوئی تھی۔ وکٹورین طرز کی یہ عمارت لاہور میں جی او آر کے سرسبز علاقے کے پُرسکون گوشے میں واقع ہے جسے ایک وسیع خودرو پھولوں اور جھاڑیوں بھرا میدان مال روڈ سے جدا کرتا اور اس کے اِردگرد اونچے گھنے قدیم درخت پرندوں کی چہچہاہٹ سے اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ یہ عمارت احمد ندیم قاسمی صاحب کے معروف ادبی سہ ماہی ''فنون'' کے دفتر کا بھی درجہ حاصل کر چکی تھی۔ میں وہاں زمانۂ طالب علمی سے قریباً ہر ہفتے جایا کرتا تھا۔ ایک روز حسبِ معمول قاسمی صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تو پرانے چوبی دروازے کی درزوں سے بہہ کر باہر آتے بھرپور قہقہوں اور نامکمل جملوں نے میرے قدم روک دیے۔ میں نے جھجکتے ہوئے قدم بڑھائے اور دروازہ کھولا تو سامنے احمد ندیم قاسمی صاحب چند لوگوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر قاسمی صاحب کی آنکھوں میں شناسائی اور محبت کی چمک اُمڈ آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن سے مصافحہ کیا اور قریب ہی بیٹھنے کو تھا کہ ایک صاحب سے نظریں دوچار ہوئیں۔ وہ گھنگھریالے بالوں اور شرارتی مسکراہٹ والے صاحب احمد فرازؔ تھے۔ اُس وقت کمرے میں غالباً جلیل عالی، تسنیم منٹو اور منصورہ احمد بھی موجود تھے۔ کسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ جب میں نے توجہ سے سنا تو فرازؔ صاحب کہہ رہے تھے۔

''ایک تو یہ ایئرپورٹ حکام ہر بار میری شراب پکڑ لیتے ہیں۔''

اس پر منصورہ نے لقمہ دیا۔ ''آپ اُنھیں نہ بتایا کریں کہ آپ بوتلیں لے کر آ رہے ہیں۔''

فرازؔ صاحب نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہی تو مسئلہ ہے۔ جہاز کے مسافروں میں میری شکل دیکھتے ہی حکام کہتے ہیں 'اور کوئی ہو نہ ہو یہ کم بخت فرازؔ شراب کی بوتلیں ضرور ساتھ لا رہا ہوگا۔ چناں چہ وہ میری طرف یوں لپکتے ہیں جیسے شکاری شکار کی طرف اور ہر مرتبہ مجھ سے بوتلیں برآمد ہو جاتی ہیں۔''

فرازؔ صاحب نے بات مکمل کی تو قہقہے گونج اُٹھے۔ اُنھوں نے قاسمی صاحب کو شرارت سے دیکھا اور بولے۔ ''عرصہ پہلے قاسمی صاحب کے گردے میں پتھری ہو گئی۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ یہ پانچ سات لیٹر بیئر پی لیں، پتھری خود بہ خود نکل جائے گی۔''

قاسمی صاحب جو شراب سے مکمل پرہیز کرتے تھے، بے اختیار بول اُٹھے ''لاحول ولا قوۃ۔''

اُن کی بے ساختگی پر بھی سبھی مسکرا اُٹھے۔

اُس محفل میں کافی دیر لطائف اور چٹکلے چلتے رہے، جملے کسے جاتے رہے اور ماحول میں شگفتگی کی مہک آور پھوار برستی رہی، یہاں تک کہ قاسمی صاحب تھک کر قیلولے کے لیے لیٹ گئے اور سب نے رخصت چاہی۔

اُس تعارفی ملاقات کے بعد فرازؔ صاحب سے مجلسِ ترقیٔ ادب، ادبی رسائل کے دفاتر کے علاوہ لاہور جم خانہ اور دیگر مقامات پر کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ابتدائی چند رسمی اور بعد کی بیش تر بے تکلفانہ ملاقاتیں۔

فرازؔ کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے ایک لڑکے کو پختہ چہرہ دے دیا گیا ہو۔ اُن کی جملہ بازیوں نے چند احباب کو وقتی طور پر جز بز کیا ہو لیکن اُن

کے اندر کا عاجز اور معاملہ فہم انسان وقتی جذبات پر قابو پا کر ایک سنجیدہ اور عاجز رُخ کو سامنے لے ہی آتا۔ وہ ایک متین اور باادب آدمی ہوتا۔

جولائی میں فرازؔ صاحب اور چند دوسرے شعرا اور ادیبوں کے ساتھ مجلس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس روز احمد ندیم قاسمی صاحب ایک خاص موڈ میں اپنے شعر سنا رہے تھے۔ وہ سنا چکے تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور قاسمی صاحب فون پر مصروف ہو گئے۔ ایک خاتون شاعرہ نے ہولے سے فرازؔ صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنا تازہ کلام سنائیں۔ فرازؔ نے احمد ندیم قاسمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنے سینئر شاعر اور اُستاد کے سامنے شعر سنانا بے ادبی سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور جم خانے میں ایک محفل منعقد کی گئی، فرازؔ بھی مدعو تھے۔ گرمیوں کا موسم، چھٹی کا دن اور بعد دوپہر کا وقت، شہر ستا رہا تھا، سڑکوں پر ٹریفک بھی نہ تھی۔ ایک سکون اور قدرے کاہلی کا سا حال تھا اور محفل میں ایک خاص شانتی تھی۔ اے سی کی دھیمی گڑگڑاہٹ میں دوپہر کے مرغن کھانے، ٹھنڈے انور رٹول آموں سے شغف کے بعد فرازؔ صاحب نے جیب سے سگریٹ نکالا، اُس کا فلٹر پانی میں ڈبو کر تر کیا اور سُلگانے کے لیے ماچس یا لائٹر تلاش کرنے لگے۔ میں قریب بیٹھا تھا۔ پہلی مرتبہ فرازؔ صاحب کو سگریٹ تر کرتے دیکھا تھا تو پوچھ بیٹھا۔

’’یہ آپ نے سگریٹ کو گیلا کیوں کیا؟‘‘ یہ سن کر احمد ندیم قاسمی صاحب مسکرا دیے۔ میں نے دونوں کو حیرت اور الجھی نظروں سے دیکھا تو فرازؔ صاحب نے کہا۔

’’قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ میں سگریٹ کو استنجا کرواتا ہوں۔‘‘

یہ اُسی محفل کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے فرازؔ صاحب سے اُن کی ایک مشہور نظم سنانے پر اصرار کیا۔ فرازؔ صاحب نے قاسمی صاحب کو دیکھا اور پوچھا۔ ’’اجازت ہے؟‘‘ قاسمی صاحب نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور کمرے میں فرازؔ کی بھاری آبنوسی آواز سحر طاری کرنے لگی۔

صاحبِ طرز شاعر، دانش ور اور میرے ہم دم دیرینہ افتخار بخاری صاحب نے مجھے چند واقعات سنائے۔

راول پنڈی کا قصہ ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق میں ایک کتاب کی تعارفی تقریب تھی۔ شاعر یاسین قدرت صاحب تھے اور کتاب کا نام غالباً ’نیلی آنکھ کا ارژنگ‘ تھا۔ شرکائے محفل اور سامعین میں فرازؔ صاحب بھی شامل تھے۔ مختلف ادیبوں نے کتاب پر اظہارِ خیال کیا۔ صاحبِ کتاب کے کلام سنانے کی باری آئی تو فرازؔ نے یاسین قدرت صاحب کے اشعار پر داد دینی شروع کی اور داد دیتے ہوئے کہنے لگے ’’سبحان تیری قدرت۔‘‘ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا، یہاں تک کہ ایک مقام پر فرازؔ نے شاعر کو باآوازِ بلند مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کی کتاب کا نام سورۃ یٰسین ہونا چاہیے۔‘‘ یہ سن کر شاعر جو ابتداً مسکرا رہے تھے، جھنجلا گئے اور یہ کہتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گئے ’’میں اتنے عالی مرتبت شاعر کے سامنے کلام سنانے کی جسارت کر رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اب میں احمد فرازؔ صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اپنا کلام سنائیں۔‘‘ اتنا سننا تھا کہ فرازؔ صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے نہ صرف کھڑے ہو کر بلکہ بعد ازاں شاعر کے پاس جا کر تمام تر متانت سے معذرت کی۔

’’ایسی جملے بازیوں کا مقصد کسی کو بے مزہ کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ ان سے لطف لینا ہوتا تھا۔ وہ بس ایسے ہی تھے۔ خالص، کھرے‘‘ افتخار بخاری صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

’’وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور کئی نوجوان شعرا کو بھرپور داد دے کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مشاعرے میں فرازؔ کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔

جھانکتا ہوں جب کبھی خود میں لرز جاتا ہوں میں
اپنے اندر کھینچتی ہے میری گہرائی مجھے

اُس پر انھوں نے مجھے بہت داد دی۔ مشاعرے کے بعد کہنے لگے کہ تمھارے اِس شعر سے مجھے فلسفی نیٹشے کا جملہ یاد آ گیا ہے۔

when you look deep into an abyss, the abyss also looks into you.

(جب تم خلا میں جھانک کر گہری نظر سے دیکھتے ہو تو خلا بھی تمھیں ایک گہری نظر سے دیکھتا ہے)

بخاری صاحب نے ایک اور واقعہ سنایا۔

’’واہ کینٹ میں ایک مشاعرے میں راول پنڈی کے قریباً سبھی اہم شعرا مدعو تھے۔ فرازؔ صاحب نے اپنی ایک مشہور نظم کا شعر پڑھا۔

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہرے پہ آبلے ہیں
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

مشاعرے کے اختتام پر چائے کی میز پر میں نے فرازؔ صاحب سے پوچھا۔ ’’کیا خواب دیکھنے کے لیے آنکھیں ضروری ہوتی ہیں؟‘‘ وہ سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے۔ ’’یہ بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں۔‘‘ اس کے بعد قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔ ’’ویسے اِس شعر پر داد بہت ملتی ہے۔‘‘

گرچہ آبلے تو فرازؔ کے چہرے پر بھی آ گئے تھے لیکن اُس شاعرِ اُمید نے خواب دیکھنے نہ چھوڑے تھے۔ ایک سہ پہر جب ابھی پرندے گھونسلوں کو لوٹنا شروع نہ ہوئے تھے اور سورج کی نرم روشنی آسمان کے گنبدِ نیلوفری پر عکس ڈالتی تھی کہ میں، فرازؔ اور احمد ندیم قاسمی صاحب ’مجلس‘ کے قدیم وکٹورین دفتر کے ٹھنڈے نیم اندھیرے میں باتیں کرتے تھے۔ لمبے آہنی راڈ سے لٹکتے پرانے پنکھے کی ہلکی گھُر گھُر ماحول میں قدامت کا احساس گھول رہی تھی۔ میں نے فرازؔ صاحب کے ایامِ اسیری اور جلاوطنی کا تذکرہ کر دیا۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گئے اور اپنا دل میرے سامنے کھول دیا۔ احمد ندیم قاسمی اُن کے رازداں اور ہم دردی کا چھلکتا پیمانہ تھے۔

’’ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں جمہور کی آواز تھا اور عوام میں سے تھا سو اُن کی آواز بول رہا تھا۔ مزاحمتی شاعری لکھ رہا تھا اور پڑھ رہا تھا۔ ضیاء الحق کو میری آزادیٔ گفتار اور نمایندگیٔ جمہور نہ بھائی۔ ایک دن مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور مجھے فوجی جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ مجھے شہر ہی میں کہیں لے جا رہے ہیں۔ جیپ کافی دیر چلتی رہی تو مجھے احساس ہوا کہ ہم شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد جیپ ناہموار رستے پر چلنے لگی۔ اُس کی رفتار آہستہ ہو گئی اور بلندی پر چڑھنے لگی۔ چڑھتے چڑھتے وہ ڈھلان پر اُترنے لگی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کسی پہاڑی مقام پر سفر کر رہے ہیں۔ خاصی دیر سفر کرنے کے بعد جیپ ایک مقام پر رُک گئی۔ مجھے اُتارا گیا، ہاتھ کی بندشیں کھولی گئیں اور آنکھوں سے پٹی اُتاری گئی۔ مجھے شک تھا کہ وہ اٹک کا قلعہ ہے۔ جب میری آنکھیں ماحول سے مانوس ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ قلعۂ اٹک نہیں تھا۔ وہ تو بلندی پر واقع ہے اور اُس سے نیچے بل کھاتی سڑک نظر آتی ہے۔ اس مقام پر سڑک سطحِ زمین سے برابر گزرتی تھی۔ بعد میں ایک فوجی نے بتایا کہ وہ مانسر کیمپ تھا۔ وہاں پر ایک میجر مجھے ’وصول‘ کرنے پر مامور تھا۔ جیپ سے اُترنے کے بعد وہ خاصی دیر مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر اُس نے سوالیہ انداز میں پوچھا ’احمد فرازؔ؟‘ اس پر میں نے اُسے جواب دیا کہ اُسے بہتر معلوم ہونا چاہیے۔ میجر نے کہا کہ اُسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میں آ رہا ہوں بلکہ کہا گیا تھا کہ ایک ملک دشمن ایجنٹ کو لایا جا رہا ہے۔‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘ میرے سوال میں تشویش تھی۔

’’قید سے رہائی کے بعد میں جلاوطنی میں در بہ در ہوتا رہا۔ میں نے چھ برس انگلینڈ اور دوسرے ملکوں میں گزارے۔ کوئی باقاعدہ ملازمت تو تھی نہیں چناں چہ خاصی مشکل رہتی۔‘‘

’’انگلینڈ میں کوئی غم خوار ملا؟‘‘

’’لندن میں زہرا نگاہ نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ میرے حالات سے واقف تھی سو مجھے زبردستی اپنے گھر لے جاتی، خوب خاطر مدارات کرتی، اچھے کھانے کھلاتی اور مجھے حوصلہ دیتی۔ بہت اچھی عورت ہے۔‘‘ فرازؔ نے اپنائیت اور ممنونیت سے کہا۔

اس شب خون، قید اور جلاوطنی نے فرآز میں حد درجہ کڑواہٹ بھر دی تھی۔ وہ جمہور کی آواز سے ہٹ کر، ذاتی صدموں کی وجہ سے غضب ناک ہو جاتے۔

قدرت کے بھی عجیب سلسلے ہیں کہ اُسی فرآز کے بیٹے سعدی نے فوج میں کمیشن لیا۔

وقت نے فرآز کے زخم خاصی حد تک مندمل تو کر دیے، مکمل بھرے نہیں۔ یہ اس حد تک مندمل ہو گئے کہ پرویز مشرف کے دورِ اقتدار میں فرآز نے باقاعدہ سرکاری عہدہ قبول کیا۔ ایک مرتبہ اس بارے میں لاہور میں ایک اتفاقی ملاقات کے دوران بات ہوئی تو انھوں نے مشرف کی اُن پالیسیوں کی تعریف کی جو معاشرے میں اعتدال لانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ایک فوجی حکومت میں ملازمت کے حوالے سے محتاط الفاظ میں ایک دوست نے پوچھا تو اُن کا کہنا تھا۔ ''اچھا کام کسی بھی دور میں کرنے کی کوشش کرنا ایک قابلِ قدر بات ہے۔ اگر سبھی کام کے لوگ ایک مخصوص دور میں خاموش اور کنارہ کش ہو جائیں گے تو میدان ابن الوقتوں اور ناکارہ لوگوں کے لیے خالی ہو جائے گا۔'' اُن کا یہ کہنا بھی تھا کہ لازم نہیں کہ ایک سرکاری ملازم حکومتِ وقت کی پالیسیوں سے مکمل طور پر متفق ہو۔ اس معاملے میں فیضؔ صاحب کی مثال دی جنھوں نے برطانوی فوج میں ملازمت کی تھی۔ پابلو نیرودا جیسے شہرۂ آفاق مزاحمتی شاعر نے بھی ایک آمرانہ حکومت کے دور میں ملازمت اختیار کی تھی۔ گو فرآز صاحب کے دلائل منطقی تھے لیکن اُن کا لہجہ مضبوط نہ تھا۔ وہ شاید خود اپنے دلائل سے مطمئن نہ تھے۔

بعد ازاں فراز نے مشرف حکومت سے نہ صرف اپنے رستے الگ کر لیے بلکہ عدلیہ کی آزادی کی تحریک میں حکومت کے خلاف متحرک کردار ادا کیا۔ اسی تحریک کے دوران ایک واقعہ ہوا۔ اس کے راوی فرآز کے قریبی دوست نوید زیدی ہیں۔

فرآز صاحب ایک احتجاجی کیمپ میں شرکت کے لیے اپنے چند دوستوں کے ہم راہ جا رہے تھے۔ سامنے سے جنرل حمید گل اپنے اہلِ خانہ کے ہم راہ آتے دکھائی دیے۔ اُن جنرل کا افغان جہاد میں کلیدی کردار رہا تھا۔ فرآز کو دیکھ کر وہ ان کی جانب معانقے کے لیے بڑھے اور بولے کہ گو اِن کے نظریات اور مزاج مختلف ہیں مگر مقاصد مشترک ہیں۔ فرآز ایک جانب ہو کر اُن کی بغل سے چھوتے ہوئے یہ کہہ کر نکل گئے ''چھوڑیں گلے کیا ملنا۔ آپ نے آمرانہ حکومتیں اور اتحاد تخلیق کیے اور ان کا ساتھ دیا۔''

فرآز صاحب بھٹو صاحب کے نزدیک رہے اور بے نظیر بھٹو کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیرِ اعظم بنے تو ان سے یہ کہتے ہوئے ناراض ہو گئے ''جتوئی نے بے نظیر بھٹو کی جگہ لی ہے۔''

فرآز سرد و گرم چشیدہ اور وقت کے جوار بھاٹے کے نباض رہے تھے سو نوواردانِ سیاست کو زیادہ اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ ایک روز میریٹ ہوٹل اسلام آباد کی لابی میں چند دوستوں کے ہم راہ جا رہے تھے کہ رحمان ملک صاحب سے سامنا ہو گیا۔ فرآز صاحب انھیں پہچانے نہیں اور رسمی سلام دعا کے بعد جانے لگے تو رحمان ملک صاحب نے ان سے آیندہ دنوں میں ملاقات کی درخواست کی۔ انھوں نے ملک صاحب کا موبائل فون نمبر محفوظ کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے موبائل کے چند نمبر دبائے اور رخصت ہو گئے۔ بعد میں دوستوں نے اُنھیں بتایا کہ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے ایک اہم عہدے دار مشیرِ داخلہ رحمان ملک تھے۔

چند روز بعد دونوں کی پھر ملاقات ہوئی تو رحمان ملک صاحب نے دوبارہ ملاقات کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے پچھلی مرتبہ میرا نمبر صحیح طرح محفوظ نہیں کیا تھا، اب کر لیجیے۔'' فرآز صاحب نے اُن کا نمبر محفوظ کر لیا اور رحمان ملک صاحب کی ذہانت اور یادداشت کے قائل ہوتے ہوئے کہا۔ ''تیز اور ذہین آدمی ہے۔''

ایک مرتبہ عطاء الحق قاسمی صاحب نے مجھے وارث روڈ پر ''معاصر'' کے دفتر میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ میں وہاں پہنچا تو فرآز صاحب کو پہلے سے موجود پا کر خوش گوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اُن چند گھنٹوں کے دوران فرآز صاحب اپنے مزاج کے جوبن پر تھے۔ انھوں نے بے شمار واقعات سنائے، کئی حقائق کا انکشاف

کیا اور سیاست پر رائے کا اظہار کیا۔

گفت گو کے دوران انھوں نے کچھ ڈھونڈتے ہوئے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو ایک چھوٹی سی ڈائری باہر گر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈائری اُنھیں پکڑائی تو مسکراتے ہوئے بولے ”یہ میری سب سے قیمتی چیز ہے۔ جب کبھی سفر میں یا کہیں بیٹھے کوئی شعر ذہن میں آتا ہے تو اس میں لکھ لیتا ہوں۔“ میں نے پوچھا کہ اُن کے کئی اشعار میں ایک صاحبِ مطالعہ شاعر نظر آتا ہے تو انھوں نے بتایا کہ وہ رات گئے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک انٹرویو کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ گنتی کے چند دن کے سوا انھوں نے روزانہ پی ہے، سو یہ مطالعہ کیسا؟ فرازؔ نے سنجیدگی سے بتایا کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ مدہوشی کی حد تک پیتے ہوں، بس دو پیگ پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور پھر مطالعہ کرتے ہیں۔

”یعنی کوئی بُلائے اور پلائے تو آپ حساب نہیں رکھتے۔“ میں نے شگفتہ چوٹ کی تو بولے۔

”میزبانوں کا دل نہیں توڑتا۔“

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایک یونانی کہاوت ہے۔ ”کوئی گیت لمبی عمر نہیں پا سکتا اور زیادہ دیر مسرت نہیں بخش سکتا اگر اُسے کوئی ایسا شاعر لکھے جو پینے میں فقط پانی پیتا ہو۔“ اس کہاوت کا سہرا اُردو کے کئی نام وَر شعرا باندھے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ، جوشؔ، عدمؔ، شیرانیؔ، جگرؔ، فیضؔ، راشدؔ، فرازؔ، منیرؔ اور جونؔ کے علاوہ کئی دیگر شعرا۔

فرازؔ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اُنھیں اُردو پر دست رس، فارسی کی سمجھ کے علاوہ عربی کی اس حد تک سوجھ بوجھ ہے کہ وہ قرآن پاک کی آیات بہ خوبی، بغیر کسی لغت یا ترجمے کے، سمجھ لیتے ہیں۔

شاعری میں زبان پر قدرت اور اُس کی تفہیم جزوِ لازم ہے۔ کوئی شاعر اچھا شاعر نہیں بن سکتا تاوقتیکہ وہ زبان پر اس حد تک عبور نہیں حاصل کر لیتا کہ نئی تراکیب ایجاد کر سکے۔ آڈن نے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ایک شاعر، تمام اوصاف دیگر سے پہلے، زبان سے مجنونانہ عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔“

الفاظ کے صوتی آہنگ اور تاثیر پر قدرت ایک شاعر کو اس حد تک پُر اثر کر دیتے ہیں کہ بہ قول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ”حقیقی شاعری سمجھ آنے سے قبل ہی اثر کر جاتی ہے۔“

اُس ملاقات میں مَیں نے ایک تیکھا تبصرہ کیا کہ اُن کی ایامِ اوائل کی شاعری، تازہ شاعری سے زیادہ مقبول ہے تو بولے۔

”اچھے گلوکار ہی نہ رہے۔ میری تازہ شاعری پہلے کی شاعری سے بہتر ہی ہے۔ انھیں مقبول بنانے والے استاد موسیقار اور گلوکار کہاں سے لاؤں۔“

احمد فرازؔ جنوری 1931 میں کوہاٹ میں اپنے وقت کے مستند ادیب سیّد محمد شاہ برقؔ کے ہاں پیدا ہوئے۔ اُن کا نام سیّد احمد شاہ رکھا گیا اور اُن کے چھوٹے بھائی کا سیّد مسعود کوثر رکھا گیا۔ وہ کُل چار بہن بھائی تھے۔ برقؔ صاحب کیا جانتے ہوں گے کہ دیگر کے علاوہ اُن کا ایک بیٹا شاعری میں دائمی نام پیدا کرے گا اور دوسرا اُسی صوبۂ سرحد کی گورنری پر متمکن ہوگا۔ فارسی اس خاندان کی گھُٹی میں تھی۔ ایڈورڈ کالج سے فرازؔ نے اُردو اور فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فرازؔ نے ادبی ذوق جینیاتی وراثت میں پایا۔ فرازؔ صاحب نے مجھے اپنی شاعری کی ابتدا کے حوالے سے ایک دل چسپ بات بتائی۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اُن کے والد اپنے دونوں بیٹوں کے لیے عید کے کپڑے لے کر آئے۔ فرازؔ کو اپنے کپڑے پسند نہ آئے البتہ اپنے بڑے بھائی کے کپڑے خاصے پسند آئے۔ انھوں نے پہلا شعر اُس موقع پر کہا جس میں اپنے کم تر کپڑوں کے حوالے سے طنز تھا۔

اُن کے والد نے شعر سنا تو ہنس دیے اور انھیں نئے کپڑے لا دیے۔

جو واقعہ فرآز صاحب نے مجھے سنایا، کچھ یوں تھا کہ اپنے طبعی رجحان کے باعث وہ اسکول میں بیت بازی کے مقابلوں میں باقاعدگی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ مقابلے میں خاصے کام یاب رہتے لیکن اپنی ایک ہم جماعت لڑکی سے آخیر میں مقابلہ ہار جاتے۔ بے شمار اشعار کو یاد رکھنے اور ہر حرف سے شروع ہونے والے اشعار فی الفور پڑھ دینے کی دِقّت سے تنگ آ کر فرآز نے فی البدیہہ اشعار تخلیق کر کے کہنے شروع کیے۔ بعد میں اس فن میں مشق کی وجہ سے اتنے طاق ہوئے کہ اشعار کہنا اُن کے لیے مسئلہ نہ رہا۔

ابتدا میں فرآز نے اپنا شعری نام 'شرر برقی' رکھا جسے بعد ازاں احمد فرآز میں بدل دیا۔ وہ نٹ کھٹ طالب علم جو اشعار بیت بازی کے لیے گھڑنا شروع ہوا تھا، بہت جلد تعلیمی اداروں میں شہرت حاصل کرتا علاقائی مدارس سے نکلا اور پہلے شعری مجموعے ''تنہا تنہا'' کے منظر عام پر آنے سے پچاس کی دہائی میں قومی اُفق پر دمکنے لگا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ''تنہا تنہا'' کا عنوان ایک انتر ہوت تنہائی کی علامت ہے جو کسی کسی تخلیق کار کے ساتھ عمر بھر سفر کرتی ہے۔ مغربی شعرا میں سے ایک ییٹس Yeats نے سچے شاعر کے حوالے سے کہا تھا۔ ''ایک سچا شاعر دُور بیں ہوتا ہے اور بھلے دوستوں میں ہو یا نہ ہو، وہ ہر دم ایسا ہی تنہا ہوتا ہے جیسا بسترِ مرگ پر۔'' اُردو زبان میں سرحد کے کسی شاعر نے ایسی عمدہ شاعری نہ کی تھی۔ اردو شاعری پر اب تک اردو اور پنجابی شعرا کی اجارہ داری تھی جسے ایک پختون بچے نے ٹھوکر سے توڑ ڈالا۔ اُس کے ابتدائی سخن سے ایک روایتی شاعری والا دھیما دھیما رومان لہراتا بل کھاتا نمو پاتا تھا۔

سرسبز پہاڑوں، میدانوں اور ویرانوں میں سمٹے کوہاٹ کا بچہ قدرت کی گود میں کھیل کر جوان ہوا۔ چلی کے صاحبِ طرز بڑے شاعر پابلو نیرودا نے کہا تھا ''میں اس بستی میں پیدا ہوا، میری شاعری نے پہاڑوں اور دریاؤں کے درمیان جنم لیا، بارشوں نے اِسے آواز بخشی اور جنگلی لکڑی کی طرح اس نے جنگل کے بیچ پروان چڑھا۔'' ایسے کھلے وسیع ٹیلوں کے بیچ خوش نصیب آدمی قدرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے، آسمانی چھت پر ٹنگے دمکتے بجھتے ستاروں، سیاروں کو چھونے کی جستجو کرتے وسعتِ نظری کا جوہر پا لیتا ہے اور نامعلوم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ''صحرا خانہ بدوش، سمندر ملاح اور لا انتہا شاعر کو بلاتے ہیں۔''

گزرتے وقت کے ساتھ اُس کی سیاسی بصیرت میں اضافہ ہوا اور وہ محنت کش کے ٹوٹتے جڑتے سلسلۂ کسب سے جذباتی سطح پر روشناس ہوا تو اُس کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہوا اور اُس کی شاعری میں مزاحمت کا سرخ رنگ نمایاں ہونے لگا۔ عجیب معاملہ یہ تھا کہ ایسے میں وہ سنجیدگی کا پیراہن اوڑھنے کے بجائے شوخی کا پٹکا پہنے ہوئے تھا۔ وہ ساری عمر اپنے لڑکپن سے نہیں نکلا۔ نوجوانی کے یہی جذبے اُس کی شاعری کو عمر بھر جنون، جذبہ اور توانائی بخشتے رہے۔ اس کی ایک نفسیاتی توجیہ ہو سکتی ہے لیکن وہ بعد میں۔

اس شاعر غنا نے اردو سمجھنے والے کروڑوں لوگوں کے دلوں میں ایسی جگہ بنائی کہ تقسیم کے بعد کے شاعروں میں فیضؔ اور منیر نیازی کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔ چودہ کے قریب شعری مجموعے تصنیف کیے اور آدم جی سے لے کر ستارۂ امتیاز تک ہر قابلِ ذکر ادبی اور سول ایوارڈ حاصل کیا۔

فرآز کا اردو روایتی کلاسیکی شاعری کا مطالعہ قابلِ رشک تھا۔ اس کے علاوہ دینی علوم میں فرآز نے خاص مطالعہ کر رکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی ادب اور تحاریک سے نہ صرف آگاہ تھا بلکہ اُن پر نظر رکھتا تھا۔ ذاتی سطح پر معاصرانہ چشمک برطرف، ادبی قد و قامت وہ خوب جانتا تھا۔ اسی لیے ایک نشست میں مجھ سے مختلف شاعروں کے بارے میں رائے کا بے دھڑک اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے ''اردو میں فیضؔ بلاشک ایک بڑے شاعر تھے۔ احمد ندیمؔ قاسمی اچھے شاعر تھے۔ منیر نیازی کی محدود شعری لفظیات کے باوجود اُسے قابلِ ذکر شاعر مانا جا سکتا ہے۔ اِن سب کا امام غالبؔ تھا۔ میں اُسے بچپن سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ وہ غالبؔ جو مجھے دسویں جماعت میں نظر آتا تھا، ایم اے میں کچھ اور تھا اور آج غالبؔ مجھے ایک نئے رنگ میں نظر آتا ہے۔ وہ میری عمر کے ہر درجے کے ساتھ رنگ بدلتا رہا ہے۔ لاجواب شاعر تھا۔ اُسے ماورا کی راہ نمائی حاصل تھی۔''

فراز کی اپنی شاعری نے جہاں [illegible] بے حد مقبولیت حاصل کی وہیں اُس پر رومان کی چھاپ لگا کر اسے محدود [illegible] سے بھی تعبیر کر دیا گیا۔ ایسے میں اس امر کو نظر انداز کر دیا گیا کہ اُن کے اشعار میں کلاسیکی طرز یوں جا بجا شائستہ و شاداب [illegible] نظر آتی ہے جیسے [illegible] گئی ہوں۔ ناقدین اس حوالے سے بھی بات کرتے نظر آتے ہیں کہ اُن کے ہاں الفاظ و تراکیب کا استعمال کثیر المعانی نہیں بلکہ یک [illegible] ہے کلام میں [illegible] اور فکر میں قدامت ہے [illegible] طرزِ سخن موزوں گوئی کے حصار میں نظر آتی ہے۔ اس تجزیے سے جزوی [illegible] اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس امر کو ملحوظ رکھنا قرینِ حقیقت ہے کہ دل سے اُبلتے اور سینے میں دہکتے اشعار کو کسی کلیے کا پابند کر دینے سے وہ اپنی [illegible] اور قدرتی بہاؤ کھو بیٹھتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ مترنم شعر گوئی فراز کی شناخت کا ایک نمایاں پہلو ہے اور اُس کے حسنِ کلام کا جوہر خاص بھی۔

ایک سہ پہر گفت گو میں فراز نے اپنی ایک دوست کے حوالے سے منفرد واقعہ سنایا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ کئی دہائی پہلے ایک لڑکی فراز کو حد درجے چاہتی تھی۔ یہ بات تو دونوں کے درمیان طے تھی کہ معاملات کسی مستقل بندھن کی جانب نہ جائیں گے۔ چناں چہ ایک اچھا رشتہ ملنے پر اُس لڑکی کی شادی ہوگئی اور فراز کا اُس سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس بات کو کئی دہائیاں گزر گئیں۔ ایک روز اُس لڑکی نے جو اَب تک خاصی عمر کی معزز خاتون بن چکی تھی، فراز سے دوبارہ رابطہ کیا۔ جن صاحب سے اُس خاتون کی شادی ہوئی تھی، وہ ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وقت کے ساتھ اُن کی دولت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس دوران جوڑے کے ہاں اولاد ہوئی۔ وقت گزرتا رہا۔ اولاد بیرونِ ملک جا کر آباد ہوگئی۔ شوہر بھی وقت کے ہم راہ زیادہ دیر چل نہ پائے اور فوت ہوگئے۔ مرتے وقت وہ کافی جائداد چھوڑ گئے۔ اب وہ خاتون پھر سے تنہا رہ گئیں۔ انھوں نے فراز سے دوبارہ رابطہ کیا۔ بات بڑھی اور تعلق جذباتی سطح پر استوار ہوگیا۔ فراز ہی نے تو کہا تھا کہ پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی آ۔ پہلی سی نہج کے تعلقات تو نہ سہی لیکن قلبی تو تھے ہی۔ تعلق گزشتہ اور ہم دمی موجودہ کے باعث اُن خاتون نے مرحوم شوہر سے ملنے والی جائداد میں سے اسلام آباد کا ایک قیمتی پلاٹ فراز کو تحفتاً دے دیا۔ بعد ازاں وہ خاتون بھی راہیِ اَجل ہوئیں۔ فراز نے یہ بات مجھے بتائی تو جہاں اُن کے لہجے میں اپنی رومانوی زندگی کے حوالے سے انبساط تھا وہیں اُن خاتون کے حوالے سے کسک بھی نمایاں تھی۔

کسک ہوتی بھی کیوں نہیں، عشق پیشہ شاعر کی زندگی رومان سے عبارت تھی اور اُس نے رومان عبادت سمجھ کر کیے۔ ہاں، چند معاملات اُدھر کے بھی تھے جو روح کی لامحدودیت سے نکل کر جسم کی محدودیت میں سمٹ آتے تھے۔

فراز بتاتے تھے کہ دل رُبا خوش ادا نازنینیں خود ان کی جانب کھنچی آتی تھیں۔ فراز کی اس بات میں مبالغہ نہ تھا کہ ایک زمانہ اس کا شاہد تھا۔ بامروت شاعر کسی مہ جبیں کو مایوس نہ لوٹاتا تھا۔

پردہ اُٹھتا ہے اور اسٹیج پر دل رُبا شاعر اسپاٹ لائٹ میں آن کھڑا ہوتا ہے۔ ہر سُو اندھیرا ہے جو اُلجھے بالوں اور دل پذیر مسکراہٹ والے البیلے آدمی کو روشنی کے دائرے میں نمایاں کر دیتا ہے۔ مزاحمتی شاعروں پر مسکراہٹ نہیں جچتی، یہ عجب مزاحمت کار ہے جس کا تبسم اُس کی شخصیت نکھار دیتا ہے۔ آج اُس کا دوسرا رخ چراغِ عشق سے فروزاں ہے۔ وہ شعر پڑھنا شروع کرتا ہے۔

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں

لڑکیاں اپنی انگلیاں دانتوں تلے داب لیتی ہیں۔ وہ مسحور ہیں، وہ مجبور ہیں۔ ناگ دیوتا سامنے پھن اُٹھائے پھیلائے جھوم رہا ہے۔ غزالی آنکھوں والی ہرنیاں بے بس اور طلسم زدہ ہیں۔

مگر ہر ایک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گُل زار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

ہر شعر کے اختتام پر داد و تحسین اور آہ آہ کا نغمۂ دل بلند ہوتا ہے اور فضاؤں میں بکھر جاتا ہے۔

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

ہر نازنین دل آرا، دوشیزۂ حسن آرا کا گمان ہے کہ ان اشعار کی مخاطب وہ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ اشعار اُس کا دل جس طرح گدگداتے ہیں کسی اور کی روح کو ایسے نہیں چھوتے ہوں گے۔ شاعر انھیں نظر بھر کے دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں کیسے ہر لڑکی کے لیے ایک ساجذبہ موج زن ہے۔ وہ کئی دل فگار جسموں پر اچٹتی نگاہ ڈالتا ہے۔

فراز پر ایک لڑکی عاشق ہوئی تھی۔ وہ حسین تھی، یہ جذباتی۔ وہ گائیکی میں نام رکھتی تھی، یہ شاعری میں۔ وہ سیدھی، یہ بھی۔ سو بات بڑھ کر شادی تک جا پہنچی۔ فراز تذبذب کا شکار تھے سو اپنے مُربی فیض احمد فیض کے پاس مشورے کے لیے جا پہنچے۔ انھوں نے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سو معاملہ جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ بہت بعد، فیض صاحب کے گزر جانے کے بھی بہت بعد، فراز اُس مشورے پر از حد شکر گزار رہے۔

فراز صاحب من چلے ضرور تھے مگر غیر ذمے دار نہیں۔ ایک لڑکی اُن کی شناسا تھی۔ نوجوان فراز اور اُس لڑکی میں ایک قلبی تعلق قائم ہو چکا تھا۔

ایک دن دونوں سیر کے لیے ایک پہاڑی مقام کو چلے۔ دن بھر وہاں کی سرسبز بلندیوں اور وادیوں میں گھومتے کھیلتے رہے۔ شام کو سرشار ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ ان کی گاڑی کو حادثہ ہو گیا۔ وہ لڑکی آب دیدہ ہو گئی۔ فراز دردمند دل رکھتے تھے، اُسے تسلی دی کہ اس حادثے کے بہ موجب اُس کو پریشانی نہ ہوگی۔ یہ سمجھا کر اُسے شادی کی پیش کش کر دی۔ چناں چہ دونوں بیاہے گئے اور عمر بھر ساتھ رہے۔ یہ فراز کی دوسری شادی تھی۔ اس سے پہلے فراز صاحب کی پہلی شادی علاقائی رواج کے مطابق اپنی برادری میں ہوئی جو ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے کام یاب نہ ہو سکی۔ پہلی شادی سے فراز صاحب کے بیٹے ہوئے۔ وہ ہمیشہ اپنی پہلی بیوی کا بہت عزت سے ذکر کرتے اور کہتے۔

''وہ ایک عظیم عورت ہے۔''

اس تذکرے میں عزت کے بین بین پشیمانی کا رنگ بھی جھلک آتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لڑکی بالیاں انھیں اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے جھجکتی تھیں تو خواتین خود کھنچی چلی آتی تھیں۔ بہ قول اُن کے بارہ کہو کی سرخ پہاڑی پر رہنے والی ایک خاتون، جو ایک معروف سیاست دان کے حوالے سے بھی قریبی حلقوں میں جانی جاتی تھی، فراز کے قرب کی خواہاں ہوئی۔ یہ

تعلق زیادہ عرصے نہ چلا۔ فرآز صاحب کے تجزیے کے مطابق وہ خاتون معروف اور مستحکم مردوں کی قربت کی خواہش مند رہتی تھی۔ اس کا مزاج بھی تحکمانہ تھا۔ فرآز بھی دبنگ آدمی تھے۔ ان کا رعب ایسا تھا کہ بڑی نامی گرامی وزنی شخصیات ان کے مقابل نہ ٹھیرتی تھیں۔ جب تعلق ایسی نہج پر پہنچ گیا جہاں فراز جدائی کے بہانے ڈھونڈنے لگے تو خاتون کی ضد نے فراز کو رستہ دینے سے انکار کر دیا۔ فرآز کی زندگی میں وہ واحد خاتون تھی جس نے انھیں خاصا پریشان رکھا۔

ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ انھیں اپنے ایک قریبی دوست کو فون کر کے کہنا پڑا ''یار اس بیس بائیس سال کی میڈیکل کی لڑکی کو سمجھاؤ۔ میں ستر برس کا آدمی ہوں۔ یہ مانتی ہی نہیں، کہتی ہے کہ محبت کے سفر کا آغاز مجھ ہی سے کرنا ہے۔'' فرآز کی محبتوں میں ازدواجی متعلقات کی جانب سے مداخلت نہ تھی۔ ایسے دبنگ آدمی تھے کہ شاعرانہ اور سیاسی معاملات کے علاوہ گھریلو معاملات میں اُن کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ کسی کو ان کے معاملات حیات میں مداخلت کی جرأت نہ ہوتی۔ اپنی آزادروش اور زندگی کے اس حد تک قائل تھے کہ رات کو مطالعے کے بعد تنہا سوتے۔ غالباً ازدواجی بندشوں سے ذہنی طور پر آزاد ہونے کی وجہ سے اُن میں لڑکپن باقی تھا۔ اُن کی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ اُن کے والد پیشے کے لحاظ سے اکاؤنٹینٹ تھے۔ وہ ایک سخت مزاج اور ڈسپلن برقرار رکھنے والے والد تھے۔ چناں چہ لڑکپن میں ادب کی جانب رجحان ہونے کی وجہ سے فرآز کو دوستوں کی ادبی محافل میں بیٹھنے کا کچھ ایسا لپکا پڑا کہ کبھی گھر لوٹتے ہوئے تاخیر ہو جاتی۔ ان کے والد بیٹے کے انتظار میں ہوتے۔ چناں چہ دروازہ کھولتے ہوئے وہ برخوردار کی نہ صرف باآوازِ بلند سرزنش کرتے بلکہ غصّے میں دست و بازو پر اختیار کھو بیٹھتے۔ والد کی سخت گیری کا اُن کی نفسیات پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ انفرادی شخص آزادی کے نہ صرف اِس حد تک قائل ہو گئے کہ اپنی ذات کے ہو گئے بلکہ گمان ہے کہ اس کا ردِعمل اُن کی شخصیت، شاعری اور نظریات میں بھی نفوذ کر گیا۔ کچھ ایسی متلوّن مزاجی آ گئی کہ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ سخت سے سخت بات کو ہنس کر ٹال دیا اور خفیف سی تنقید پر زود رنجی کا یہ عالم ہوا کہ اُس شخص کو عمر بھر معاف نہ کیا۔ مزاج میں سخاوت آئی تو احباب کے سہرے لکھ ڈالے اور طبیعت منقبض ہوئی تو تلخ نوائی میں دشنام کی آگ بھڑک اُٹھی۔

حاسدین نے کیا کیا الزامات نہ لگائے لیکن خود مست شاعر کبھی کبھار کچھار سے نکل کر دہاڑ تو دیتا تھا دِل کا روگ نہ لگاتا تھا۔ لوگ بھارت نواز ہونے کا الزام لگاتے ہوئے بھول گئے کہ شاعرِ شیر دِل بھارت اور دیگر ممالک جا کر ہندستان پر خوب دہاڑا تھا۔

دیگر ممالک تو فرآز صاحب کا جانا عمر بھر لگا رہا۔ مشاعروں کی دعوتیں امریکا سے لے کر یوگنڈا تک، دنیا کے طول و عرض سے آتیں۔ جس دور میں امریکی ڈالر ایک مستحکم کرنسی تھی اور اسلام آباد میں زمین سستی، فراز صاحب بیرونِ ملک مشاعروں کی آمدنی سے کاروباری سوجھ بوجھ کے ساتھ سرمایہ کاری کرتے۔ پلاٹوں کے معاملات پر ان کی مقدمہ بازی چلتی رہتی۔ عموماً فیصلے ان کے حق میں آ جاتے جن پر بعض بذلہ سنج کہتے۔ ''رند فرآز کے اندر ایک مومن چھپا بیٹھا ہے جس پر خدا اتنا مہربان ہے کہ اُسے خوش کرنے کا سامان دنیا ہی میں مہیا کیے دیتا ہے۔''

عمومی طور پر شعرا دنیاداری کے معاملات میں کام یاب نہیں ہو پاتے۔ البتہ فرآز میں دونوں جہان یک جا ہوتے تھے، جہانِ فن اور جہانِ روزگار۔ کفایت شعاری ان کے مزاج کا مستقل حصّہ تھی اور سادگی طرزِ زندگی کا۔ عجب واقعہ تھا کہ جن حصوں میں سرمایہ کاری کرتے وہ منافع میں چلے جاتے اور جو پلاٹ خرید لیتے، وہ دنوں میں دُگنی چوگنی مالیت کا ہو جاتا۔ یہ صرف قسمت کے معاملات نہ تھے، کاروباری ذہانت کے مظہر تھے۔ یہ باتیں اُن کی ذات سے بڑھ کر دیگر دائرہ ہائے کار میں چلی جاتی تھیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن میں ملازمت اختیار کی، وہ خسارے میں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُسے منافع بخش ادارہ بنا دیا۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر متمکن رہے۔ ان عہدوں پر کبھی ایک روپے کی بددیانتی نہ تو خود کی اور نہ ہی حتی الوسع کسی اور کو کرنے دی۔ اُن کی ذات کا یہ پہلو کم ہی زیرِ غور آیا ہے۔ بک فاؤنڈیشن میں لوگوں کو کتب خریدنے کی ترغیب دیتے۔ کتابیں تحفتاً شاذ و نادر ہی دیتے۔ اسی طرح ادارے کی جانب سے خرید و فروخت اور دیگر مالی معاملات میں بددیانتی ایک زمانے میں تسلیم شدہ حقیقت مانی جاتی تھی۔ اس کا قطعی طور پر نہ تو حصہ بنے اور نہ ہی یہ روایت بڑھائی۔ اسی خوبی نے ان کی شخصیت کو مضبوطی دی۔ وگرنہ

بددیانتی کے مرتکب افراد کم زور اعصاب کے مالک اور بزدل ہوتے ہیں۔

خودداری کا یہ عالم تھا کہ مولانا کوثر نیازی کی وزارت میں اُن کے ماتحت کام کرتے ہوئے اُن کے شعری مجموعے کا دیباچہ لکھنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ انھیں مجموعے کے شاعرانہ معیار پر تحفظات تھے۔ احمد فرازؔ اگر ناقد تھے تو بلا امتیاز ہر پست و بالا کے۔

وضعداری لحاظ کا یہ عالم تھا کہ لندن جلاوطنی کے ایام میں اپنے بھائی کے ہاں قیام رہا۔ وہاں سارا دن باہر رہتے مبادا بھائی پر بوجھ بنیں۔ رات کو سونے کے لیے گھر جاتے۔ آخری دم تک 1983 کی لانسر کار رکھی ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ نئی گاڑی لینے کا سوچا۔ عین وقت پر ذہن بدل گیا۔ گھر کی آرایش بھی بہت سادہ تھی۔ سگریٹ منگواتے اور بقیہ رقم میں ملازم بچے ہوئے سکے لے آتا تو احتیاط سے اُنھیں واپس لے لیتے مبادا ملازم فضول خرچی کی جانب مائل ہو جائے۔ فضول خرچی کو ناقابلِ درگزر جرم جانتے تھے۔ ساری عمر اس علت سے دامن بچائے رکھا۔

وفات کے بعد اُن کے اہلِ خانہ نے گھر کی آرایش جدید تر اور پُرآسایش زندگی کرنے کی خاطر مناسب سلسلہ کیا۔ فرازؔ صاحب کے لیے سب سے بڑی آزمایش عالمِ بالا سے نیچے جھانک کر یہ دیکھنا ہوگا کہ جس گھر میں اُن کی پرانی گاڑی کھڑی ہوتی تھی وہاں عمدہ قیمتی جیپ کھڑی ہے۔

فرازؔ کی شخصیت کا ایک ایسا رُخ بھی تھا جسے انھوں نے تاعمر لوگوں سے چھپا کر رکھا۔ اس کے شاہد اُن کے ذاتی بینکار اور میرے فرازؔ صاحب کے بہ موجب بننے والے دوست نوید زیدی صاحب ہیں۔

نوید زیدی صاحب فراز صاحب کے مالی معاملات دیکھتے اور ان معاملات میں اُن کے مشیر اور رازدار تھے۔

ایک شام کافی پیتے ہوئے ہم حسبِ معمول فرازؔ صاحب کو یاد کر رہے تھے تو بتانے لگے۔ ''فرازؔ من موجی آدمی تھے۔ کبھی لوگوں کو تاڑ دیتے جیسے وہ سوشلسٹ اور اہلِ تشکیک میں سے ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے فرازؔ سے پوچھا کہ پٹھان ہوتے ہوئے تم اتنی اچھی اُردو شاعری کیسے کر لیتے ہو تو اُنھوں نے آسمان کی طرف اُنگلی اٹھائی اور بولے۔ ''یہ اُس کا کرم ہے۔'' شاعری کے علاوہ شخصیت اور کردار کے لحاظ سے فیضؔ کو بہت مانتے اور کہتے ''بہت solid آدمی تھے۔'' زیدی صاحب کے لہجے میں اُداسی تھی۔

''فرازؔ نے مجھے کئی باتیں بتانے سے منع کیا تھا۔ آخری مرتبہ مجھ سے ملے تو مشاعرے میں شرکت کرنے امریکا و کینیڈا جا رہے تھے۔ واپسی پر نامکمل منصوبوں پر سوچ بچار کا پروگرام بنایا اور چلے گئے۔ وہیں بیمار ہوئے۔ گُردوں کا مسئلہ تو تھا ہی، پھسل کر گرنے سے ایسی چوٹ آئی جو کئی قباحتیں ساتھ لے آئی۔ ہسپتال داخل کرایا گیا۔ چند روز بعد وطن واپسی کی ضد کرنے لگے۔ ''مجھے واپس لے چلو''۔ جب واپس آ رہے تھے تو وہیل چیئر پر تھے۔ وہ دبنگ فرازؔ ایک بیمار کم زور مریض کی صورت واپس ہوا۔ کوما میں تھا سو اِردگرد سے بے نیاز تھا۔ واپسی پر فوٹو گرافروں کو اُن کی تصاویر بنانے سے منع کر دیا گیا۔ ہم بنگ اور شرارتی فرازؔ کا تاثر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وہ فرازؔ جو اُردو شاعری کا دل کش جسم بھی تھا اور اس کی مضطرب روح بھی۔''

''اسی لیے فرازؔ کے اُن لمحات کی تصاویر ریکارڈ پر نہیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ زیدی صاحب بولے۔

''اُن کا بہت کچھ ریکارڈ پر نہیں۔ فرازؔ کی عمومی شہرت ایک کفایت شعار آدمی کی تھی۔ دبئی میں اُن کے ایک قریبی دوست تھے جن ے ہاں وہ ہمیشہ قیام کرتے۔ دوست کے بیٹے سے وہ اپنی اولاد جیسی محبت کرتے تھے۔ اُس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کی خواہش کا ہار کیا۔ دوست نے فرازؔ سے مشورہ مانگا اور اپنی کوتاہ سامانی کا تذکرہ کیا۔ فرازؔ نے اُسی وقت پچیس لاکھ روپے کا چیک کاٹا اور دست خط ر کے دوست کو یہ کہتے ہوئے دے دیا کہ بچے کے لیے اُس کی حسبِ خواہش تعلیم بہت ضروری ہے۔ اخراجات فرازؔ صاحب اُٹھائیں گے۔''

''واقعی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں دوست نے چیک واپس لوٹا دیا'' زیدی صاحب نے وضاحت کی۔

''فرازؔ کے بھائی مسعود کوثر صوبہ سرحد کے گورنر رہے۔ فرازؔ نے کبھی اپنے بھائی کے حوالے سے مالی منفعت کی کوئی بات نہ کی۔''

''ایک مرتبہ سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک نے فرازؔ کے ساتھ آواری ہوٹل لاہور میں ایک پُرتکلف تقریب کا اہتمام کیا۔ جب تقریب کی

کمپیئرنگ کی بات آئی تو انھوں نے ایک دوست کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کے پس پردہ اُس دوست کو مالی فائدہ دینے کا خیال تھا چوں کہ اُسے اُن دِنوں چند معاملات میں معاشی وسائل کی ضرورت تھی۔ فرازؔ اُس تقریب میں اپنے جوبن پر تھے۔ انھوں نے چٹکلے، واقعات، خیالات اور اشعار کی رنگا رنگ پھوار سے ماحول کو ہولی رنگ کر دیا۔ یہ اُسی تقریب کا واقعہ ہے کہ دانش ور، سیاست دان اور قانون دان اعتزاز احسن اُٹھ کر آئے اور ان کے قدموں کو محبت اور احترام سے چھو لیا۔“

فرازؔ کی روزمرہ زندگی کی ایک چھوٹی سی عادت اُن کی ذات کے شبستان میں ننھے جگنو کی طرح دمکتی ہے۔

اُن کے ہاں ایک میاں بیوی کا جوڑا ملازم تھا۔ جوڑے کا مُنا سا اکلوتا بیٹا سماعت و گویائی سے محروم تھا۔ جب کبھی فرازؔ گھر آتے تو وہ ننھا سا گونگا بہرہ بچہ بھاگتا ہوا اُن کی جانب لپکتا اور فرازؔ جیب سے کبھی ٹافی تو کبھی کوئی میٹھی شے اُسے شفقت سے تھما دیتے۔ وہ بچے کے لیے ہر مرتبہ اہتمام سے کوئی شے لے کر گھر جاتے اور اُسے معصومانہ مسرت کا اظہار کرتے دیکھ کر کھل اُٹھتے۔

اُس شام زیدی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے گویا ایک راز بتانے کا فیصلہ کر لیا، وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

”فرازؔ ہوتے تو ناراض ہوتے۔ ایسے معاملات دوسروں کے لیے مثال بنتے ہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔ ایک غریب صحافی زاہد* ان کے ارادت مندوں میں سے تھا۔ ایک برسات میں ایسی موسلا دھار بارشیں ہوئیں کہ زاہد کے گھر کی چھت اور ایک دیوار گر گئی۔ وہ پریشانی میں پھر رہا تھا کہ فرازؔ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جب فرازؔ صاحب نے اُس کی پریشانی کا احوال سنا تو اُسے آٹھ لاکھ روپے کی بلا شرط امداد دے دی اور مجھے منع کر دیا کہ کسی سے تذکرہ نہ کروں تا کہ غریب صحافی کی خودداری پر حرف نہ آئے۔ بھلے وقتوں میں آٹھ لاکھ روپے، بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔“

زیدی صاحب نے بات جاری رکھی۔

”میرے پاس فرازؔ صاحب کے اکاؤنٹس کا حساب رہتا تھا۔ وہ کئی بیواؤں اور ضرورت مندوں کی باقاعدہ امداد کرتے تھے۔ اُن کے ماہانہ وظیفے بندھے ہوئے تھے جو فرازؔ صاحب کے اکاؤنٹ سے باقاعدہ طور پر منہا ہوتے رہتے تھے۔ میں ان کا مکمل حساب رکھتا تھا۔“

فرازؔ کا بینکار یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو مجھے فرازؔ کی ایک بات یاد آ گئی جو انھوں نے، اگست 2008 میں اپنی وفات سے بہت پہلے، مجھے کہی تھی۔

”سچا آدمی ہی بہادر آدمی ہوتا ہے۔“

میری یادداشت کے پاتال سے اُن کے قہقہوں کی گونج سنائی دی۔

”میں ایک کام یاب سرمایہ کار ہوں۔“

وہ شاید واقعی ایک کام یاب سرمایہ کار تھے۔ شاعری، مستحقین کی امداد اور سچائی میں سرمایہ کاری کرنے والے انوکھے اور دلیر آدمی۔

سپاٹ لائٹ شاعر کی آواز کی تیز ہوتی لے کے ساتھ تیز ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مقام پر آ کر شاعر آخری شعر پڑھتا ہے اور حاضرین کی طرف دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ سامعین پر گویا سکتہ طاری ہے۔ شاعر کھڑا ہوتا ہے، مڑتا ہے، دھیرے دھیرے مخصوص چال چلتا ہوا پردے کے پیچھے گم ہو جاتا ہے۔ سامنے صرف پردہ رہ جاتا ہے یا اُس پر سپاٹ لائٹ کا گول دائرہ۔ سامعین ہوش میں آ جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ تالیوں کی گونج بڑھتے بڑھتے ہر جانب پھیل جاتی ہے۔ سامنے اسٹیج پر کرسی خالی ہے۔ شاعر پردے کی دوسری جانب ایک نئی محفل سجانے کی تیاری کر رہا ہے۔

---

* زاہد۔ فرضی نام

کمپیئرنگ کی بات آئی تو انھوں نے ایک دوست کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کے پس پردہ اُس دوست کو مالی فائدہ دینے کا خیال تھا چوں کہ اُسے اُن دِنوں چند معاملات میں معاشی وسائل کی ضرورت تھی۔ فرازؔ اُس تقریب میں اپنے جوبن پر تھے۔ انھوں نے چٹکلے، واقعات، خیالات اور اشعار کی رنگا رنگ پھوار سے ماحول کو ہولی رنگ کر دیا۔ یہ اُسی تقریب کا واقعہ ہے کہ دانش ور، سیاست دان اور قانون دان اعتزاز احسن اُٹھ کر آئے اور ان کے قدموں کو محبت اور احترام سے چھولیا۔"

فرازؔ کی روزمرہ زندگی کی ایک چھوٹی سی عادت اُن کی ذات کے شبستان میں ننھے جگنو کی طرح دمکتی ہے۔

اُن کے ہاں ایک میاں بیوی کا جوڑا ملازم تھا۔ جوڑے کا مُنا سا اکلوتا بیٹا سماعت و گویائی سے محروم تھا۔ جب کبھی فراز گھر آتے تو وہ ننھا سا گونگا بہرہ بچہ بھاگتا ہوا اُن کی جانب لپکتا اور فرازؔ جیب سے کبھی ٹافی تو کبھی کوئی میٹھی شے اُسے شفقت سے تھما دیتے۔ وہ بچے کے لیے ہر مرتبہ اہتمام سے کوئی شے لے کر گھر جاتے اور اُسے معصومانہ مسرت کا اظہار کرتے دیکھ کر کھل اُٹھتے۔

اُس شام زیدی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے گویا ایک راز بتانے کا فیصلہ کر لیا، وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

"فرازؔ ہوتے تو ناراض ہوتے۔ ایسے معاملات دوسروں کے لیے مثال بنتے ہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔ ایک غریب صحافی زاہد* ان کے ارادت مندوں میں سے تھا۔ ایک برسات میں ایسی موسلادھار بارشیں ہوئیں کہ زاہد کے گھر کی چھت اور ایک دیوار گر گئی۔ وہ پریشانی میں پھر رہا تھا کہ فرازؔ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جب فرازؔ صاحب نے اُس کی پریشانی کا احوال سنا تو اُسے آٹھ لاکھ روپے کی بلاشرط امداد دے دی اور مجھے منع کر دیا کہ کسی سے تذکرہ نہ کروں تاکہ غریب صحافی کی خودداری پر حرف نہ آئے۔ بھلے وقتوں میں آٹھ لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔"

زیدی صاحب نے بات جاری رکھی۔

"میرے پاس فراز صاحب کے اکاؤنٹس کا حساب رہتا تھا۔ وہ کئی بیواؤں اور ضرورت مندوں کی باقاعدہ امداد کرتے تھے۔ اُن کے ماہانہ وظیفے بندھے ہوئے تھے جو فرازؔ صاحب کے اکاؤنٹ سے باقاعدہ طور پر منہا ہوتے رہتے تھے۔ میں ان کا مکمل حساب رکھتا تھا۔"

فرازؔ کا بینکار یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو مجھے فرازؔ کی ایک بات یاد آ گئی جو انھوں نے، اگست 2008 میں اپنی وفات سے بہت پہلے، مجھے کہی تھی۔

"سچا آدمی ہی بہادر آدمی ہوتا ہے۔"

میری یادداشت کے پاتال سے اُن کے قہقہوں کی گونج سنائی دی۔

"میں ایک کام یاب سرمایہ کار ہوں۔"

وہ شاید واقعی ایک کام یاب سرمایہ کار تھے۔ شاعری، مستحقین کی امداد اور سچائی میں سرمایہ کاری کرنے والے انوکھے اور دلیر آدمی۔

سپاٹ لائٹ شاعر کی آواز کی تیز ہوتی لے کے ساتھ تیز ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مقام پر آ کر شاعر آخری شعر پڑھتا ہے اور حاضرین کی طرف دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ سامعین پر گویا سکتہ طاری ہے۔ شاعر کھڑا ہوتا ہے، مڑتا ہے، دھیرے دھیرے مخصوص چال چلتا ہوا پردے کے پیچھے گم ہو جاتا ہے۔ سامنے صرف پردہ رہ جاتا ہے یا اُس پر سپاٹ لائٹ کا گول دائرہ۔ سامعین ہوش میں آ جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ تالیوں کی گونج بڑھتے بڑھتے ہر جانب پھیل جاتی ہے۔ سامنے اسٹیج پر کرسی خالی ہے۔ شاعر پردے کی دوسری جانب ایک نئی محفل سجانے کی تیاری کر رہا ہے۔

---

* زاہد۔ فرضی نام

کاہن

مستنصر حسین تارڑ

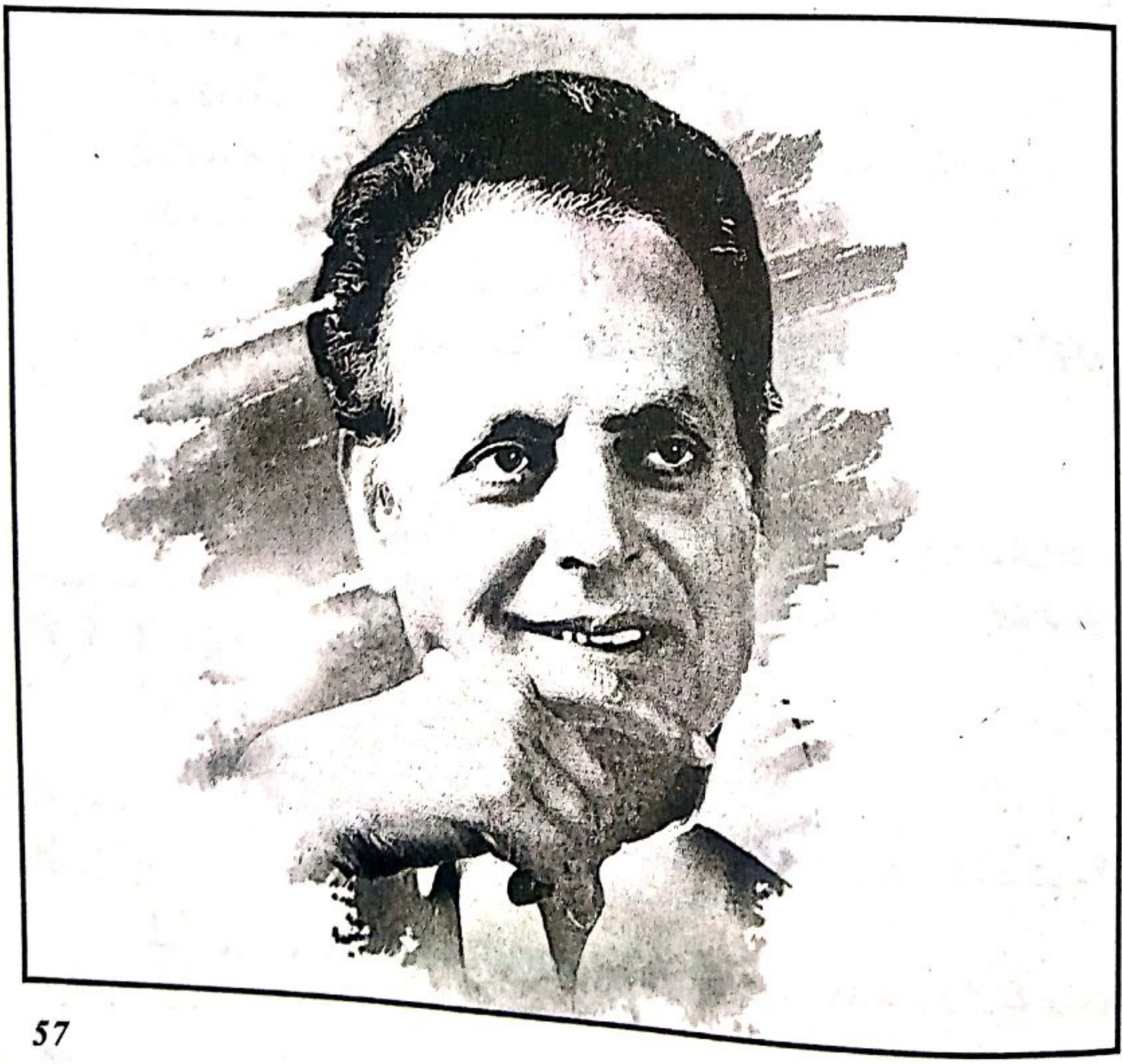

آسمان کی نیلی ململ سے شام کا سُرمئی غبار رس رہا تھا۔

نیچے شہر سیالکوٹ کے گردونواح میں پھیلے سرسبز کھیتوں سے دھند اٹھ رہی تھی۔ کھیتوں کے بیچ میں اناج کے بیجوں کی طرح بکھرے اِکا دُکا گھروں میں روشن ہوتی بتیاں موتیے کی جھاڑی میں ٹمٹماتے جگنوؤں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ انھی کے بیچ ایک شان دار اور وسیع و عریض کارخانے کا سرسبز لان شہرِ پراگ کی طرز کے لیمپ پوسٹوں کے بیچ میں لیٹا جگمگا رہا تھا۔ لان کے گرد قدیم اور جدید یورپئین طرز کی دل کش عمارات کہیں گردن اٹھائے اور کہیں سر نیہواڑے کھڑی تھیں۔ اس فیکٹری کو بیرونی دنیا سے تعلق رکھنے والے اہلِ ذوق صحیح طور پر آرٹ کا نمونہ کہتے تھے۔

آج یہاں دعوت تھی۔ سفید دستانے اور وردیاں پہنے ویٹر ہاتھوں میں سلور ٹرے تھامے میزوں کے بیچ میں مستعدی سے حرکت میں تھے۔ چند مہمان آچکے تھے۔ ایک کونے میں ایک جرمن خاتون ایک امریکی تاجر سے محوِ گفتگو تھی۔ دوسری جانب چند یورپئین حضرات ایک پاکستانی صاحب کی کسی بات پر مسکرا رہے تھے۔

ایک کونے میں فیکٹری کا جواں سال مالک انتظامات کو آخری شکل دے کر تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے ایک گہری سانس بھری اور مسکرانے لگا۔ اس کا شمار شہر کے صفِ اول کے کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔ وہ فرانس اور جرمنی کو فیشن گارمنٹس کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہونے کی ٹرافی کئی برس سے جیتتا آیا تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ میری جانب مُڑا اور مخاطب ہوا۔

”تمھیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ آج ایک راز کی بات بتاؤں؟“

میری آنکھوں میں سوال پڑھتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

”میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ ایک شخص کی وجہ سے ہے۔ مستنصر حسین تارڑ“

میری حیرت کو بھانپتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہوگئی اور وہ ایک مہمان کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

”باقی کھانے کے بعد بتاؤں گا“

کچھ ہی دیر میں لان ایک متمول شخص کے پیٹ کی طرح، مہمانوں سے پُر ہوگیا۔

دعوت کے دوران میں مختلف ملکوں کے مہمانوں سے خوش گپیاں اور اپنے پاکستانی دوستوں سے کاروباری حالات پر گفتگو تو کرتا رہا مگر میرا ذہن میزبان کی بات میں اٹکا رہا۔

دعوت خوب جمی۔

رات گئے جب سب مہمان رخصت ہوگئے اور ویٹر میز پوشوں کو تہہ کرنے اور کرسیوں کو اٹھانے لگے تو وہاں صرف میں اور میزبان رہ گئے۔ اپنے ایک بازو پر اوس کی نمی کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے اس نے مجھے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سگار سلگا لیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا

”پھر کیسی رہی؟“

”بہت شاندار۔“ میں نے جواب دیا

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”لَو یُو“ اور بات جاری رکھی ”مجھے معلوم ہے کہ میری وہی بات تمھیں بے چین کر رہی ہے۔“

مجھے متجسس پا کر اس نے سگار کا دھواں شب کی تاریکی میں چھوڑا اور اسے تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر پَر پھڑپھڑاتی آبیٹھی۔

”یہ اُس دور کی بات ہے جب میں ابھی کالج میں داخل ہوا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ مجھے اپنا خاندانی مصالحہ جات کا بیوپار کرنا ہے۔ ایک روز کالج کی لائبریری میں میرے ہاتھ تارڑ کی ایک کتاب لگی ”پیار کا پہلا شہر“۔ کتابیں پڑھنے کا تو مجھے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ وہ کتاب بھی ایک کورس کی کتاب ڈھونڈتے ہوئے میرے ہاتھ آ گئی۔ میں نے جب اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا چلا گیا۔ وہ کتاب مجھے خوابوں کی ایک سحر انگیز دنیا میں لے گئی۔ جہاں تارڑ کی جگہ میں تھا اور سامنے پاسکل تھی۔ اُس مین کلیساؤں کی گھنٹیاں بھی تھیں اور اسٹیمر کے بھونپو کی آواز بھی۔ پس میں ایک گلابی دھندلکے میں کھو کر رہ گیا۔ ابھی بمشکل اس سے باہر آنے کی کوشش میں تھا کہ تارڑ کی ایک اور کتاب ”نکلے تیری تلاش میں“ نے مجھے زُلیخا کی طرح پُشت سے پکڑ کر واپس اُس رنگین غبار میں کھینچ لیا۔ مجھے پر گویا سحر پھونک دیا گیا۔ میں نے عہد کیا کہ میں کوئی ایسا کاروبار کروں گا جس میں میرے پیر اجنبی دیسوں کی زمینوں کو چوم سکیں اور میں زندگی کے ان دیکھے جزیروں پر پڑاؤ کروں۔“

یہاں پہنچ کر اس نے مزید کچھ دھواں اُگلا اور بولا

”عہد کرنا تو آسان کام ہے۔ اسے نبھانا بہت مشکل کام ہے۔ سب نے نادان کہا۔ اس دور میں یہاں برآمد کا کاروبار عام نہ تھا۔ میں نے وقت مانگا اور یورپ چند سیمپل لے کر چل دیا۔ قریہ قریہ پھرا۔ کئی بار نڈھال ہو کر واپسی کا سوچا۔ سیاحت کی لذت اور شے ہے اور معاش کی فکر قطعی مختلف۔ ایسا بھی ہوتا کہ دروازوں پر دستک دیتے دیتے اور چل چل کر پیروں میں آبلے پڑ جاتے۔ یخ بستہ موسم میں بارش کا پانی جوتوں میں آ کر پیروں کی جلد کو خستہ کر دیتا۔ مگر تارڑ کے پھونکے سحر نے جنون کو زندہ رکھا۔ کئی ماہ کی شہر گردی کے بعد مایوس ہو کر واپس ہو لیا۔ واپسی کے سفر میں ایک جرمن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ایسا ہی کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ طے ہوا کہ میں اسے چند اور نمونے بھیجوں گا۔ بس وہ دن اور آج کا دن کہ میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔“

یہاں پہنچ کر اُس نے مجھے دیکھا اور پوچھا

”کبھی تارڑ سے ملے ہو؟“

میں نے جواب دیا ”ملتا رہتا ہوں۔“

اس کی آواز میں جذبات بھر آئے اور وہ بولا

”یار تارڑ کو میرا ایک پیغام دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے فوری پیشکش کی۔

اس نے توقف کیا اور پھر بولا

”اسے میری طرف سے کہنا ”شکریہ“۔“

زندگی کا پہیہ اُلٹی سمت گھومتا ہے اور زندگی کئی برس پیچھے چلی جاتی ہے۔

کراچی کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے۔ اپنے بچپن کا ابتدائی کچھ دورانیہ برطانیہ میں گزارنے کے بعد میں ایک طویل وقفے کے بعد بیرونِ ملک جا رہا ہوں۔

استنبول میری منزل ہے۔

ائیر پورٹ کے نئے ٹرمینل کا بین الاقوامی معیار اور جگمگاہٹ دل کو موہ لیتی ہے۔ میں اپنا دستی سامان لاؤنج کی ایک سیٹ پر رکھ کر اور ساتھ میں بیٹھ کر سامنے لگے جہازوں کی آمد و رفت والے بورڈ کو دیکھنے لگتا ہوں۔ ابھی میں بورڈ دیکھنے میں محو ہوں کہ ایک آواز میری توجہ کے آئینے میں بال ڈال دیتی ہے۔

”سرکار۔ کدھر جا رہے ہیں؟“

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ تھری پیس سوٹ پہنے ایک نوجوان میری جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ میری قریبی نشست پر براجمان ہے۔ میں اس کے کوٹ کے کالر پر لگے پھول کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی منزل کا نام بتا دیتا ہوں۔ وہ غالباً کسی وسطی ایشیائی ریاست کی جانب گامزن ہے۔

ہم دونوں کی پروازوں میں کافی وقت ہے سو بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔

اس کا تعلق لاہور سے ہے اور وہ اندرون شہر کا کھلا ڈلا لاہوریا ہے۔

لاہوریوں میں ایک خوبی یا خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کوئی بات یا راز اپنے پیٹ میں رکھ نہیں سکتے۔ سو وہ بھی جلد ہی بے تکلف ہو جاتا ہے۔ جب گفتگو ابتدائی تکلفات سے بے تکلفی کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہے، کوٹ کی سامنے کی جیب سے سرخ رومال نکالتا ہے، ماتھا پونچھتا ہے اور رومال کا گولا بنا کر اسے پتلون کی جیب میں ٹھونستے ہوئے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی میں پوچھتا ہے۔

’’ٹرکی کا ویزہ آپ کا بھلا کتنے میں لگا تھا؟‘‘

میں غور سے اسے دیکھتا ہوں اور ویزہ فیس کا بتا دیتا ہوں۔

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے

’’نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ایجنٹ کو آپ نے کتنے پیسے دیے تھے؟ بھلا یورپ میں داخل ہونا کوئی آسان بات ہے۔‘‘

اب حیران ہونے کی باری میری ہے۔ مجھے اپنے حلق سے آواز برآمد ہوتی سنائی دیتی ہے۔

’’بس ویزہ فیس ہی دی تھی اور میرا ترکی کے رستے یورپ داخل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔‘‘

وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتا ہے اور کہتا ہے

’’سبھی یوں ہی کہتے ہیں۔ چلیں جو آپ کی مرضی۔‘‘

کچھ دیر ہم دونوں خاموشی کی چادر اوڑھے رکھتے ہیں۔ پھر وہ بات جاری کرتا ہے۔

’’بھائی صاحب، ہم تو سچ بولیں گے۔ ہم دراصل یورپ جا رہے ہیں۔‘‘

’’لیکن آپ کی پرواز تو یورپ کی نہیں؟‘‘ میں پوچھتا ہوں

’’ایجنٹ نے سب انتظام کر دیا ہے۔ وہاں سے یورپ ہی داخل ہونا ہے۔‘‘ وہ بے ساختگی سے سچ بول دیتا ہے۔

آپ ایران اور ٹرکی کے راستے یورپ کیوں نہیں گئے؟ وہاں سے تو زیادہ آسان ہے۔‘‘

جب میں یہ پوچھتا ہوں تو وہ سنجیدہ شکل بنا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے

’’دو مرتبہ کوشش کی تھی۔ دونوں دفعہ پکڑے گئے۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’پھر کیا۔ انہوں نے واپس کر دیا۔ ایرانی اچھے لوگ ہیں۔ ان کی پولیس بھی اچھی ہے۔ مارتی بھی نہیں اور گالیاں بھی فارسی میں دیتی ہے۔ اب ہمیں فارسی تو آتی نہیں۔ اس لیے بے عزتی بھی محسوس نہیں ہوتی۔‘‘ وہ میرے سوال کا جواب دیتا ہے اور بات جاری رکھتا ہے۔

’’یہ سارے مسئلے تو ہماری پولیس کے ہیں۔‘‘

اس کے بعد باتوں کا رخ دوسری جانب ہو جاتا ہے۔ ایک سوال مجھے دیر سے تنگ کر رہا ہے۔

’’آپ یورپ پیسے کمانے کے لیے جانا چاہتے ہیں؟‘‘

''پیسے۔ وہ تو ہم یہاں بھی کما سکتے ہیں۔'' وہ جواب دیتا ہے۔

''پھر؟''

میرے اس سوال پر وہ مجھے غور سے دیکھتا ہے، لمبی آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے

''مولا نے ایک ہی زندگی دی ہے اور اتنی کھلی زمین سامنے اس طرح بچھا دی ہے جیسے قالین، چاہے اس پر چلو اور چاہو تو لوٹنیاں لگاؤ۔ بس اس چھوٹی سی زندگی کو ہم ایک کنویں میں کیوں گلا دیں۔ کیوں نہ دنیا کے نظارے کریں۔ ہم اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔''

''خاصی گہری باتیں کرتے ہیں'' میں مسکراتے ہوئے کہتا ہوں۔

''مستنصر تارڑ سے سیکھی ہیں۔'' وہ جواب دیتا ہے۔

وقت کا پہیہ کچھ اور پیچھے کی جانب گھومتا ہے۔

لاہور جل رہا ہے، کالی ماتا ناچ رہی ہے۔

لوگ ابھی راتوں کو اپنے گھروں کی چھتوں پر سوتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک بچہ بھی ہے۔ لاہور کا آسمان تمام رات کو روشن رہتا ہے اور اس آسمان پر شاہ عالمی میں جلنے والے ہندوؤں کے بھاری بھرکم بہی کھاتوں کے اوراق اُڑتے، پھڑپھڑاتے، چھتوں پر آن اُترتے ہیں۔

صبح جب لوگ جاگتے ہیں تو ان اوراق کی راکھ ان کے لباسوں اور جسموں پر ٹھہری ہوتی ہے۔

وہ لوگ ایک دوسرے کے راکھ آلود چہروں کو دیکھتے ہیں۔ شائد کچھ شرمندہ شرمندہ بھی ہیں، مگر شائد!

وہ بچہ بھی اپنے لباس اور جسم پر سے راکھ جھاڑتا اٹھتا ہے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھتا ہے۔ یہ راکھ اوپر سے تو جھڑ جاتی ہے مگر اس کے دماغ کے جاندار پانیوں کی تہہ میں یوں جمتی جاتی ہے کہ بہت بعد تک اسے ستاتی رہتی ہے۔

وہ بچہ نیکر پہنے لکشمی مینشن میں اپنے دوستوں یاروں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتا ہے۔

شاموں میں قریبی بازار میں خوب گہما گہمی اور رونق ہو جاتی ہے۔ جب رات اترتی ہے تو لوگ سونے کا انتظام شروع کر دیتے ہیں۔

ایک رات لکشمی مینشن کی سیڑھیوں پر وہ سفید لباس میں ملبوس ایک شخص کو بیٹھے دیکھتا ہے۔ وہ شخص سعادت حسن منٹو ہے۔ یہ اس شخص کو سہارا دیکر اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں اس کی بیوی صفیہ اسے 'وصول' کرتی ہے۔ منٹو اسے ''اچھا بچہ'' کا خطاب دیتا ہے۔ بچہ تو پھر بچہ ہے۔ شرارت اس کی رگ رگ میں پارے کی طرح متحرک رہتی ہے۔

ایک روز منٹو رات گئے گھر لوٹتا ہے تو یہ بچہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سامنے والے فلیٹ کی سیڑھیوں پر دھرے خوشنما گملے منٹو کے فلیٹ کی سیڑھیوں پر منتقل کر دیتا ہے۔ اگلی صبح اس فلیٹ کی مالکن خوب شور مچاتی ہے کہ ہو نہ ہو یہ سب کیا دھرا اُس منٹو کا ہے جو رات کو کچھ مخمور گھر لوٹتا ہے۔ منٹو ابھی اپنی صفائیاں پیش کر ہی رہا ہوتا ہے کہ ایک اور شرارت اس کی خواب گاہ میں دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ لڑکا اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر پانی کی ایک پائپ کو منٹو کے کمرے میں ایک سوراخ سے داخل کر دیتا ہے۔ جب رات کو منٹو مخمور حالت میں گھر میں داخل ہوتا ہے اور بستر پر سو جاتا ہے تو یہ لڑکے پانی کی پائپ کو سرکاتے ہوئے منٹو کے پلنگ تلے دھکیل کر تھوڑا سا پانی کھول دیتے ہیں۔ اگلی صبح صفیہ منٹو سے جھگڑتی سنی جاتی ہے کہ یہ پانی رات کو منٹو نے نشے میں خود کر دیا ہوگا۔ منٹو کو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے سنا جاتا ہے 'صفیہ مجھ سے قسم لے لو میں نے یہ نہیں کیا'

وقت چند کروٹیں اور بدلتا ہے۔

یہ لڑکا اب بلوغت کے زمینوں پر پاؤں رکھ چکا ہے اور ایک لڑکی سے اس کی معصومانہ 'گپ شپ' بھی چل رہی ہے۔

جہاندیدہ منٹو یہ سب بھانپ لیتا ہے اور لاہور کی ایک تپتی دوپہر میں جب یہ لڑکا دہی کا کٹورہ تھامے بیڈن روڈ سے آ رہا ہوتا ہے اسے روک کر پیسٹری کھانے کی دعوت دیتا ہے۔

'پیسٹری' اُس دور میں ایک رومانوی لفظ سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف صاحب لوگوں کے کھانے کی شے ہے۔ یا پھر بیڈن روڈ پر واقع بیرٹ پارسی کی نیم تاریک ٹھنڈی برطانوی راج کے دور کی بیکری کے شوکیسوں میں جواہرات کی طرح سجی نظر آتی ہے۔

لڑکے کا جی للچا جاتا ہے اور وہ منٹو کے ساتھ بیکری چلا جاتا ہے۔ وہاں پیسٹری کھاتے ہوئے منٹو لڑکے سے اس لڑکی کے متعلق پوچھتا ہے۔ لڑکا گڑبڑا کر کسی بھی ایسی لڑکی کے وجود سے انکار کر دیتا ہے۔ منٹو لڑکی کے ہاتھ سے لکھا محبت نامہ اس کے سامنے لہرا دیتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ اس لڑکے پر مرتی ہے۔ پھر بہت شفقت سے پوچھتا ہے۔

"یہ تمہارے اوپر مرتی ہے، نیچے مرتی ہے یا درمیان میں مرتی ہے؟"

لڑکے کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ وہ جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ خلاف توقع اسے اجازت مل جاتی ہے۔ منٹو اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے چلتے پھرتے افسانے کو جاتے دیکھتا رہتا ہے۔

اب تک لاہور کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ کالی ماتا خاموش کھڑی ہے مگر اینجلا ناچ رہی ہے۔ وہ ریگل چوک کے پار 'سٹینڈرڈز' ہوٹل کی چھت پر ناچ رہی ہے۔

منٹو اب بیمار رہتا ہے۔

اب بھی کبھی کبھار اسے اس لڑکے کے سہارے کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔

مگر اب وہ اسے اچھا بچہ نہیں بلکہ اچھا لڑکا کہتا ہے کیونکہ ایک تو وہ جانتا ہے اور دوسرے اس بچے نے بھی نیکر کی جگہ پتلون پہننا شروع کر دی ہے۔

ایک روز منٹو اُس لڑکے کو بہت شفقت سے روکتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔

"میں نے وہ خط۔۔۔ وہی خط۔۔۔ اُسی روز پھاڑ کر پھینک دیا تھا، فکر نہ کرنا"

دن شاہ عالمی کے بہی کھاتوں کے جلتے اُڑتے اوراق کی مانند اُڑ بکھر جاتے ہیں۔

منٹو اب بیمار نہیں رہتا اور جانتا بھی نہیں۔

منٹو اب مر چکا ہے اور یہ جانے بغیر مر چکا ہے کہ اپنے وقت کا سب سے بڑا افسانہ نگار جس لڑکے کے کندھوں کا سہارا لے کر لکشمی مینشن کی سیڑھیاں چڑھ لیا کرتا تھا وہ آنے والے وقت کا اس ملک کا بڑا ناول نگار اور سفرنامہ نگار ٹھہرے گا جسے زبانِ خلق مستنصر حسین تارڑ کے نام سے پکارے گی۔

چند چیزیں ہیں جو انسان کو بار بار اپنی طرف چھل پیری کی طرح بلاتی ہیں۔

انہی چیزوں میں بچپن کی یادیں بھی ہیں۔ وہ سکول بھی ہے جہاں چھٹی جماعت کا ایک طالب علم سر جھکائے ایک کتاب پڑھنے میں مشغول ہے۔ ابھی پرائیویٹ سکولوں کا لاہور میں اتنا رواج نہیں۔ یہ ایک پرائیویٹ سکول ہے جہاں برطانوی طرزِ تعلیم متعارف کروایا گیا ہے اور زیادہ طالب علمِ مکس بلڈ پاکستانی ہیں۔ وہ طالب علم کتاب پڑھنے میں مشغول ہے اور سامنے ایک استاد گیلس لگائے، آنکھیں موندے

گویا کسی سحر کے زیر اثر چارلس ڈکنز کے ناول ’’اے ٹیل آف ٹو سٹیز‘‘ کا ابتدائی حصہ دہرا رہا ہے۔

’’وہ بہترین وقت تھا، وہ بدترین وقت تھا، وہ دانائی کا دور تھا، وہ حماقت کا دور تھا۔۔۔‘‘

اس طالب علم کی یادداشت کے کسی نہاں خانے میں آج بھی وہ موندی آنکھوں والا استاد، لکڑی کے فرنیچر کی مخصوص مہک، روشن دان سے آتی سورج کی ترچھی شعائیں اور وہ الفاظ منجمد ہیں۔

یہ سب میرے تحت الشعور میں کچھ ایسے سرائت کر گیا کہ وہ لمحہ کئی برسوں پر محیط ہو گیا۔ ایسے ہی تارڑ کے ناول راکھ کے ابتدائی جملے میرے اندر گھس بیٹھے ہیں۔

’’چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں۔۔۔ ان میں ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس۔۔۔ اور وادی سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے۔۔۔ اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے۔۔۔ اور چوک چکلہ ہے۔‘‘

یہی نہیں، ناولوں کے کئی اور ابتدائی جملے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی دمکتی لہراتی تلوار کی طرح آنکھوں کی یادداشت میں اپنی کاٹ اور چمک کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور یقیناً ایسی یادداشت کا آنکھوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں کہ جب آنکھوں میں اندھیرا اُتر بھی آئے اور سانس چلتا ہو، تو نظریں یہ یادداشت دماغ کو مکمل طور پر سونپ دیتی ہیں۔

ایسا ہی خداوندِ ادب ٹالسٹائی کے لازوال شاہکار ’اینا کرانینا‘ کا ابتدائی جملہ ہے۔

’’مسرور خاندان ایک جیسے ہوتے ہیں، ہر ناخوش خاندان کی ناخوشی کا انداز جدا ہوتا ہے۔‘‘

اور یقیناً ٹالسٹائی ازدواجی مسرت سے محروم زندگی گزارنے کے باعث ناخوشی کا نباضِ باکمال تھا۔

یا پھر گرٹروڈ سٹین کے ناول ’’دا میکنگ آف امیریکنز‘‘ کا ابتدایہ مکافات عمل کا آئینہ دار ہے:

’’ایک مرتبہ غیظ و غضب کا شکار ایک شخص اپنے باپ کو اپنے باغ میں گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔ ’’رُک جاؤ‘‘ بالآخر بوڑھا باپ چلا اٹھا ’’رُک جاؤ‘‘ میں نے بھی اپنے باپ کو صرف اس درخت تک ہی گھسیٹا تھا۔‘‘

اسی طرح کوئی بھی ادیب کتنی ہی منقبض شخصیت کا حامل کیوں نہ ہو، اپنی تحریروں میں عُریاں ہو جاتا ہے۔ تارڑ بھی عُریاں ہو جاتا ہے حالانکہ وہ منقبض طبیعت کا ہرگز مالک نہیں۔

لوگ دو طرح کی فطرت و مزاج کے ہوتے ہیں۔ ایک گربہ فطرت اور دوسرے سگ مزاج۔ بلی جگہوں اور مقامات سے وابستہ رہتی ہے جبکہ سگ کی فطرت لوگوں سے وابستگی کی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو قدیم اجڑی حویلیاں پرانے شہر اور محلے اپنی گرفت میں رکھتے ہیں جبکہ دوسری طرح کے لوگ، گزر گئے لوگوں کے کے بیچ میں زندہ رہتے ہیں۔ یقیناً تارڑ کی ناڑو ماحول اور مقامات سے بندھی ہے۔ یہ قادر آباد ہو، وادی سوات ہو، کامران کی بارہ دری یا چوک چکلہ ہو۔ یا یہ کے۔ ٹو کا بیس کیمپ اور اس کے گرد پھیلی سفیدی ہو، سوکھے ہوئے دریا سرسوتی کے بنجر پاٹ کی سنسانی ہو، پہاڑوں کے چٹخے پتھروں کی دراڑوں کی اندھی گہرائی ہو یا چولستان کی پُر ہیبت رات ہو، تارڑ ان میں بھٹکتی رُوح کی طرح بے چین پھرتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ نیند میں ہوتا ہے تو اس کی روح نامعلوم گزرگاہوں پر رواں ہوتی ہے۔ مقامات کا ناسٹلجیا اس کی ذات کے پاتال سے یوں ابھرتا ہے جیسے اندھے کنویں میں دی گئی صدا اس کی دیواروں سے سر ٹکراتی گونجتی باہر کو ابل آتی ہے۔ اگر وہ لکھتا نہ ہوتا تو شائد زندہ نہ ہوتا۔

وقت کا ایک نامعلوم لمحہ ہوتا ہے جب کینسر کسی کے بدن میں اپنا بیج بوتا ہے اور وہ شخص اپنے بدن کی کوکھ میں موت کو زندگی دیتے ہوئے نہیں جانتا، ہرگز نہیں جانتا۔ وقت کا نہ جانے وہ کون سا نامعلوم لمحہ تھا جب تارڑ کے اندر تخلیق کے شعور نے تحت الشعور کے گدلے پانیوں سے یوں سر نکالا جیسے مچھلی سانس لینے کو سطح آب پر لحظہ بھر کے لیے ابھرتی ہے۔ شائد دیوانگی اور وحشت جب تنہائی میں اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو

وہ اسے الفاظ کے خوش نما سانچوں میں ڈھال کر کتھارسس کرتا ہے۔ اس کے اندر کی دیوانگی اس بدن پر ظاہر نہیں ہوتی جو قدرت نے اس کی ذات کو اوڑھایا ہے۔ تخلیقی وفور کبھی کج روی کا رستہ اختیار کر کے کالرج کو منشیات کا سہارا لینے پر مجبور کرتا ہے، ایڈگر ایلن پو کو شراب میں غرق کر دیتا ہے، چیٹرٹن کو خودکشی پر آمادہ کرتا ہے، لارڈ بائرن کو جنسی بیتابی کے باعث تقدس کی عصمت دری پر بے چین کرتا ہے، منٹو کو مشروب مرغوب میں غوطے دلاتا ہے، میراجی کو ‘دست کاری’ کا رستہ دکھاتا ہے، راشد کو چتا پر جلاتا ہے، صغیر ملال کو زندگی دھوئیں میں اڑا دینے پر مائل کرتا ہے اور منیر کو اپنی ذات کا پجاری بنا دیتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تارڑ صراط مستقیم، جو پل صراط سے زیادہ دشوار ہے’ پر چلتا ہے، ڈانواں ڈول سہی، پر اب تو چلتا ہے۔ یا شائد نہیں چلتا۔ یہ وہی جانتا ہے۔

وہ ایسا ساحر ہے کہ جنہوں نے اس کی کتابوں میں دیس دیس کی سیاحت کی اور پھر وہ خود ان نگریوں کی سیاحت کو نکلے تو بھی اس کی تحریروں کی جادوئی عینک نہ اتار پائے۔ ایسے موقع پر جارج آرویل جیسے نکتہ داں کی بات یاد آتی ہے

”بچپن میں پڑھی گئی کتابیں انسان کے ذہن میں دنیا کا ایک ایسا تصوراتی خاکہ بناتی ہیں، مختلف ملکوں کی ایسی تخیلاتی دنیا آباد کرتی ہیں کہ انسان بعد کی زندگی کی ہماہمی میں ان میں عافیت کے لیے پناہ لیتا ہے اور اگر کبھی ان حقیقی زمینوں کی سیاحت کرے تو بھی ان کو اس تخیلاتی آنکھ ہی سے دیکھنے پر مجبور پاتا ہے۔“

ایک مرتبہ میں نے تارڑ صاحب سے پوچھا کہ وہ اپنی خودنوشت کیوں نہیں تحریر کرتے کہ یہ نہ صرف ان کے سفروں بلکہ ٹی۔ وی کی رنگین زندگی، متنوع کرداروں، دلچسپ واقعات، فکری پختگی کے سفر اور پردہ نشینوں کا احاطہ کرے گی۔

یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں دیگر کے علاوہ ان کی حقیقی زندگی کی ‘ہسکی آواز میں رات گئے فون کرنے والی پردہ نشین بھی تھی جس کا ذکر ‘قربتِ مرگ میں محبت’ میں آیا ہے۔

میرے استفسار پر انہوں نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بس اتنا کہا

”یار میری زندگی میری کتابوں میں بکھری پڑی ہے، وہاں سے چن لو۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے شہہ پاروں کے بہت سے کردار انہوں نے اپنی حقیقی زندگی سے اٹھائے ہیں۔ بھلے وہ ‘ڈاکیا اور جولاہا’ کی نتالیہ ہو یا ‘پیار کا پہلا شہر’ کی پاسکل۔ ‘راکھ’ کا مشاہد ہو یا ‘کے۔ ٹو کہانی’ کا مطیع الرحمان۔ یا پھر اس کے سفرناموں میں بکھرے مٹی کے مختلف باوے۔ سب نرالے، بہت سے اصلی، بولتے بھگوان۔ نتالیہ یقیناً ایک حقیقی لڑکی ہے۔ جس کے ہاتھ کے لکھے خطوط آج بھی لاہور کی ایک کوٹھی کی بیلوں میں ڈھکی، بین الاقوامی مصوروں کی شاہکار پینٹنگوں سے سجی، نفیس صاف ستھری روشن روشن اسٹڈی میں محفوظ ہیں۔ مضبوط ہاتھوں میں محفوظ ہیں۔ یہ وہ لڑکی ہے جو اپنے اردگرد پھیلی حسین چیزوں، سرسوں کے کھیت، کیکر پھلاہی شیشم اور سرس کے درختوں اور ہوا کے جھونکوں میں بسی ان کی مہک، ان کی شاخوں پر کوکتی فاختاؤں کی سوز و سکون بھری آوازوں، سبز کھیتوں اور مٹیالے میدانوں میں بل کھاتی پگڈنڈیوں، مویشی چراتے لوگوں، بے فکری اور آسودگی سے چرتی گائیوں، کنویں پر پانی بھرتی عورتوں، تسلے سروں پر رکھے گوبر چنتے بچوں اور فصل کاٹتی عورتوں کو صبح کی دودھ سفیدی اور شام کو اس میں کولا کی سی گھلتی نیم سیاہی میں دیکھ کر اُکتاتی ہے اور رودین کے فراخ سینے میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ آستانہ رومی میں ہے بھی اور نہیں بھی۔

یہ بے چین لڑکی اپنے معصوم معمولات رودین لکھ بھیجتی ہے۔ سویرے سڑک سے اونٹوں کے قافلوں جو گندم اٹھائے ہوتے ہیں، کی گھنٹیوں کی جلترنگ، کالی شاما چڑیوں کی سیٹیوں، ننھی چڑیوں کے شور، مرغ کی بانگوں، فاختاؤں کی اُداس کوکوں، لوگوں کے جاگنے کے شور اور مویشیوں کے کھولنے باندھنے کی آوازوں سے جاگ اٹھنے سے شبنم آلود گھاس پر شلوار کے پائینچے اٹھا کر ننگے پیر پھرنے تک، اپنے بابا کی کریمیں چوری استعمال کرنے سے غم حسین میں رو دینے تک ہر بات لکھ دیتی ہے۔ وہ ناول بھی لکھتی ہے جو شائد شائع نہیں ہوتا۔

رودین، دوستووسکی کے ناول کا رودین جو قلعوں، مسجدوں کے گنبدوں، میناروں، عطر کی دکانوں، گلابوں کی پتیوں اور تاریک حجروں، مزاروں کی سبز چادروں والے شہر لاہور کا تارڑ ہے بہت بعد میں، جب اسے یقین ہے کہ فاختہ کی طرح معصوم نتالیہ اب نانی دادی ہو چکی ہوگی، ان خطوط کو فن پارے کا روپ دے دیتا ہے۔ اپنے ہاتھ آئے مقدس سنگ مرمر کو تراش کر دیوی کا روپ دیتا ہے، ایسی ملکوتی حسن والی دیوی جسے پوجنے کو مومن کا جی بھی للچائے۔

یہ خطوط میں نے خود دیکھے اور تارڑ کی نم ہوتی آنکھوں کے سامنے اس کے کانپتے ہاتھوں میں دیکھے۔

آخر یہ عمر بھی اچھے خاصے آدمی کو کمزور کر دیتی ہے۔

میں نے پوچھا ”کبھی یاد آتی ہے؟“

تارڑ نے باہر باغیچے میں دیکھا، جہاں ابھی اہل خانہ کے قدموں کے نشان تازہ تھے

پھر میری طرف دیکھ کر سر نفی میں ہلا دیا۔ یہی تقاضائے دانائی بھی ہے۔

نہ جانے اس فراخ سینے میں، استنبول کے آرمینیائی مسیحوں کے مجسمہ مجسمہ قبرستان کی طرح، کتنی مورتیاں سجی ہیں۔ چلتا پھرتا مندر ہے تارڑ۔

پاسکل۔ سورج کبھی اپنے آپ کو منوانے کے لیے جتن نہیں کرتا۔ بس ابھر آتا ہے۔

پاسکل۔ ’پیار کا پہلا شہر‘ کی پاسکل افسانوی کردار سہی مگر جس مٹی سے اسے ڈھالا گیا ہے وہ نسوانی مٹی یقیناً حقیقی زمین سے اٹھائی گئی ہے۔

نسوانی نرم ہاتھوں والے تارڑ صاحب سے نوے کی دہائی کے اواخر میں ہونے والی، ان کی صاف ستھری نتھری روشن اسٹڈی میں، پہلی ملاقات فقط ایک تاثر کی شکل میں میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

وہ اتنے نرم لچکیلے ہاتھوں کے مالک ہیں کہ اگر جیب تراش ہوتے تو خاصے کامیاب ہوتے۔

اس ملاقات میں ایک تکلف تھا، میری طرف سے ایک جھجک تھی کہ یہ ملاقات ایک طفل مکتب کی ایک دیوقامت ادیب سے تھی۔

بعد میں جب کوٹھا ٹپنیوں کی طرح تکلف کا کوٹھا ٹاپ کر میں بے تکلفی کے احاطے میں کودا تو بظاہر اس پراسرار جہاں گرد کی شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ اس کے کرزما کی دُھند میں چھپی شخصیت اس طرح نمایاں ہوگئی جیسے سینٹ پیٹرز برگ کی عمارتوں کے سنہری کلس سرد دوپہروں کو کُہرے کے چھٹ جانے اور سورج کے عُریاں ہو جانے پر چمک کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

بڑے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلی طرح کے لوگ پہلی ملاقات میں بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔ یہ تاثر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زائل ہو جاتا ہے اور دیوقامتی کے مجسمے کے پیچھے چھپا عام انسان سامنے آجاتا ہے۔ دوسری طرح کے لوگ پہلی ملاقات میں بہت بھرپور تاثر تو نہیں چھوڑتے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ایک پائیدار گہرا اور وسیع نقش مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ تارڑ صاحب دوسری طرح کے لوگوں میں آتے ہیں۔ اگر کوئی نکتہ چیں ان سے ملاقات میں یہ توقع کرے کہ وہ سجی سجائی گفتگو میں دانائی کے پیوند لگا کر اس کے ذوق سلیم کی تشفی کریں گے تو وہ شائد مایوس ہو۔ وہ عام بول چال میں اجنبی پر گہرا تاثر نہیں چھوڑتے۔ مگر اپنے بے تکلف احباب کے لیے ان کی صحبت ایک خوشگوار اور خیال آفریں تجربہ ہوتی ہے۔ وہ دھیمے لہجے کی گفتگو میں مختلف موضوعات پر واقعات، نفسیاتی توجیہات اور قطعی منفرد اور سچی سوچ کا ایسا تڑکا لگاتے ہیں کہ ان کا مخاطب یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ اس موضوع کا اس طرح کیوں تجزیہ نہ کر پایا۔ یا شائد وہ بھی ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن اسے اس کا شعور نہ تھا۔ میلان کنڈیرا کے الفاظ میں

”ایک تخلیق کار کا مطمع نظر اپنے پیش رووں سے بہتر کر دکھانا نہیں ہوتا بلکہ وہ دیکھنا اور کہنا ہوتا ہے جو وہ نہ دیکھ سکے اور نہ ہی کہہ سکے۔“

اس امر کو میلان کنڈیرا جیسے ذہین اور دردوں بیں نکتہ داں سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے۔

کتنے واقعات ہیں اور کتنی ہی باتیں۔

ایک روز ہماری گفتگو سرمایہ دارانہ نظام کی گود میں پلنے والے میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ طور پر عام انسانی المیے کو کمرشل ازم کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیچنے کے ناقابل فروگزاشت موضوع پر جاری تھی۔ تارڑ صاحب نے سگریٹ سلگایا، چند کش لیے، اس کے سلگتے سرے کو کلپر سے کاٹا، بقیہ سگریٹ کو سگریٹ کیس میں رکھا اور کہنے لگے۔

''یار اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جان ایف کینیڈی کا بھائی مر رہا تھا اور اس کے گرد رپورٹر اور کیمرہ مین یوں گھیرا ڈالے کھڑے تھے جیسے تماشائی موت کے کنویں کے گرد کھڑے ہوتے ہیں۔ اِدھر اسے موت گھسیٹے اپنی کچھار میں لیے جا رہی تھی، اُدھر کیمرے کلک کر رہے تھے، فلیش چمک رہی تھی اور ریکارڈنگ جاری تھی۔ اس کی بیوی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور بے بسی میں مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ میڈیا پر برس پڑی کہ ایک طرف اس کا شوہر مر رہا ہے اور دوسری طرف اس کی جان بچانے کی بجائے فوٹو گرافر، رپورٹر اس کی کوریج میں مصروف ہیں۔ یہ سن کر فلم بناتے ایک کیمرہ مین نے سر اٹھایا اور اس کی بیوی سے فقط اتنا کہا ''خاتون! ہم اس وقت تاریخ ریکارڈ کر رہے ہیں۔''

ایک روز تارڑ صاحب نے مجھ سے پوچھا

''سب سے بے لوث رشتہ کون سا ہوتا ہے؟''

میں نے بلا تردد جواب دیا

''ماں باپ کا''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولے

''دادا دادی نانا نانی کا۔ ماں باپ کو تو پھر اولاد سے کوئی غرض یا امید ہو سکتی ہے۔ ان رشتوں کو نہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ جب تک چھوٹے نواسے پوتے جوان ہوں گے تب تک شائد وہ زندہ ہی نہ رہیں۔''

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر بولے

''اسی لیے یہ رشتے ذمہ داری سے بھی مبرا ہوتے ہیں۔

یہ اس حقیقت کا دوسرا دلچسپ رُخ ہے۔''

مجھے ذاتی طور پر دستووسکی کی زندگی کا ایک واقعہ ہانٹ کرتا ہے

ایک مرتبہ اسے ساتھیوں سمیت حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ اس نے بغاوت کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی تھی سو بے فکر تھا کہ چند ہی روز میں چھوٹ جائے گا۔ چند روز بعد حکومتی اہلکار اسے اس کے ساتھیوں کے ہمراہ جیل سے لے گئے۔ سب نے جیل سے آزادی پر سکھ کا سانس لیا۔ حکومتی اہلکار انہیں شہر کے مرکز میں لے گئے اور کھلی فضا میں چھوڑ کر اعلان کیا کہ انہیں سرعام گولی ماردی جائے گی۔

یہ حکم سنا کر دو قیدیوں کے چہروں پر غلاف چڑھا دیئے گئے اور ان کا رُخ ایک دیوار کی جانب کر دیا گیا۔ دستووسکی کا نمبر بعد کا تھا۔

وہ خواب کی کیفیت میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔

بندوقیں تان دی گئیں اور شست باندھ لی گئی۔

ابھی گولیاں چلنے ہی کو تھیں کہ ان سب کی معافی کا اعلان آ گیا۔

پس اس ایک لمحے نے دستوئیسکی کی سوچ بدل دی اور اس کے سامنے زندگی کی حقیقت اور تصورات کی معنویت بے حد گہری کردی۔

''میں ایک مرتبہ سفر میں تھا۔ ہم لوگ بس میں تھے اور یورپ کی طرف سفر کر رہے تھے۔ نہ جانے بس کس طرح سڑک پر سے پھسلی اور گہری کھائی میں گرنے لگی۔ وہ چند لمحے تھے جب میں نے موت کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھ پر زندگی اور موت کے درمیان باریک سی لکیر کا فرق واضح ہوگیا۔

ایک ثانئے میں بس بجری میں جا گری اور اُلٹ گئی۔ چند مسافر جاں بحق ہوئے اور مجھ سمیت باقی سبھی زخمی۔''

''اس طرح میں بے شمار مرتبہ موت کے سیاہ حلق میں سر ڈال کر زندہ لوٹ آیا۔ میری زندگی میں متنوع واقعات یوں تسلسل سے رونما ہوئے ہیں کہ میں کسی ایک واقعے یا تجربے کو سوچ کے زاویے بدل دینے والا قرار نہیں دے سکتا۔''

☆

ایک شام جب آسمان پر روشنی اپنا عکس ڈالتی تھی اور فضا میں پرندوں کا شور معمول سے کچھ بڑھ کر تھا کہ تارڑ صاحب نے محبت کے حوالے سے قصوں کی پنڈاری کھولی۔

''تمھیں معلوم تو ہے کہ میں نے شمالی علاقہ جات اور پہاڑی علاقوں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔''

کچھ توقف کے بعد بولے

''ایک مرتبہ میں سفر میں تھا۔ میں اتفاق سے جس جیپ میں سوار تھا غالباً اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی یا پھر ہم کچھ دیر کے لیے ستانے کے لیے گلگت کے قریب ایک جگہ رُک گئے۔ وہاں ہیبت ناک پہاڑوں کے بیچ میں گونجتے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہوتی تھی تو سرکتی ہوا کی آواز تھی۔ اُس زوال کے وقت دھوپ کی تمازت اپنے ساتھ روشنی کو بھی مدھم کرتی تھی اور دھوپ پہاڑوں کے قدموں سے ان کی چوٹیوں کی جانب سفر کر رہی تھی۔ ہم کسی ٹھیٹھ پنجابی دیہاتی لڑکی کی چوٹی کی طرح گتھی، گندھی اور لمبی سیاہ سڑک پر ٹیک لگائے ستا رہے تھے کہ وہاں کے ایک مقامی شخص نے میرے سامنے ایک کچے دھول اڑاتے رستے کی طرف اشارہ کر کے ایک عجیب کہانی سنائی۔''

اب میں پوری طرح کہانی میں کھویا ہوا تھا۔

''یہ اُس دور کی بات ہے جب پاکستانی فوج شاہراہ ریشم کی تعمیر پر کام کر رہی تھی۔ کام جاں گسل تھا اور جذبہ جوان۔ اس سڑک کی تعمیر میں بے شمار جوانوں کا لہو شامل ہے۔ ایک ٹیم کی قیادت ایک کپتان کر رہا تھا۔ اوپر جلتے توے جیسا سورج اور نیچے سلگتے سنگلاخ پہاڑ۔ ایک روز مشقت سے نڈھال اور پیاس سے بے حال ٹیم جب نیم جان ہوگئی اور پینے کا پانی ختم ہوگیا تو پانی کی تلاش میں کپتان چند ایک ساتھیوں کے ہمراہ زیرِ تعمیر سڑک سے کافی دُور چلا گیا۔ وہاں پانی کا ایک ذخیرہ تھا جہاں گرد و نواح سے لوگ پانی بھرنے آتے تھے۔ اس ذخیرے کو دیکھ کر کپتان اور ریکی ٹیم خوشی سے سرشار ہوگئے۔''

یہاں پہنچ کر تارڑ صاحب نے الفریڈ ہچکاک کی طرح 'بامعنی توقف' کیا اور بولے۔

''اُسی مقام پر محبت کی ایک لازوال داستان نے جنم لیا۔ یہ مکمل طور پر سچا واقعہ ہے۔ وہاں قریبی آبادی کی چند لڑکیاں پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ کپتان اور اس کے ساتھی ان لڑکیوں کے جانے کے انتظار میں ایک جانب کھڑے ہوگئے۔ جب لڑکیاں لوٹنے لگیں تو ایک لڑکی کی نظروں سے ناگاہ کپتان کی نظریں چار ہوئیں۔ قدرت کی تمام تر رعنائیاں اس حسن بلاخیز میں مجسم تھیں۔ دمکتے چہرے پر نظر نہ ٹھہرتی تھی اور اس کی جھلملاتی نیلی آنکھوں سے پھوٹتی شعائیں سحر پھونکتی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن لاہور، جو ابھی متمول خاندانوں کی آماجگاہ تھا، کا پروردہ کپتان اس کے دام میں ایسا اسیر ہوا کہ روزانہ وہاں آنے لگا۔ چند روز بعد اس نے بلا تعارف اس لڑکی سے شادی کا ارادہ باندھا اور اپنے انچارج کرنل

کو اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ جہاندیدہ کرنل نے اسے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی لاحاصل سعی کی اور بالآخر اس کا ساتھ دینے کا عندیہ دے دیا۔“

تارڑ صاحب مزے سے کہانی سنا رہے تھے۔

”اب یہاں ایک فلمی موڑ آتا ہے۔ لڑکی کا گاؤں زیرِ تعمیر مرکزی شاہراہ سے کافی ہٹ کے تھا۔ جب کپتان اور کرنل رشتہ لینے لڑکی کے گھر پہنچے تو اس کے چچا نے ایک شرط رکھ دی۔ شرط یہ تھی کہ مرکزی شاہراہ کو گاؤں سے ملایا جائے تاکہ مریضوں، ضرورت مندوں اور مسافروں کو آمدورفت میں آسانی رہے۔ اب شاہراہ کا بنیادی پلان تبدیل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس گاؤں کو ایک ذیلی سڑک کے ذریعے مرکزی شاہراہ سے ملا دیا جائے۔ کپتان کے ساتھیوں نے اسے اپنی بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ شام کو جب عملہ اپنے سرکاری کام سے فارغ ہو جاتا تو کپتان کے ساتھی اس ذیلی سڑک کی تعمیر میں جت جاتے۔ کپتان کبھی خود اپنے ہاتھوں سے مزدوری کرتا اور کبھی اپنی زیر نگرانی رستہ ہموار کراتا۔ یہاں تک کہ کئی ہفتوں کی ان تھک محنت کے بعد ذیلی سڑک قابل استعمال حالت میں معرضِ وجود میں آ گئی۔ اب وعدے کے مطابق کپتان کی اس لڑکی سے شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد کپتان نے اپنی بیوی کو لیا اور لاہور میں اپنے گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی شادی کی اطلاع اہل خانہ کو دی تو سب سناٹے میں آ گئے۔ اس کے والدین نے اس رشتے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب ان کا سامنا دلہن سے ہوا تو اس کے خیرہ کن حسن کی تاب نہ لا کر انہوں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ ’پاکستان ٹائمز‘ ایوب دور میں انگریزی کا سب سے اہم اور معیاری اخبار مانا جاتا تھا۔“

پاکستان ٹائمز کے بے موقع تذکرے پر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے الجھن میں دیکھ کر تارڑ صاحب گویا ہوئے

”والدین کو آمادہ کر کے نیا نویلا شادی شدہ جوڑا ہنی مون کے لیے مری کی جانب روانہ ہوا اور جی۔ ٹی روڈ پر ایک ٹرک سے حادثے میں مارا گیا۔ ان کی محبت، شادی اور المناک موت کی خبر پاکستان ٹائمز نے نمایاں سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی تھی۔“

بات مکمل ہونے پر میں نے تاسف سے گہری سانس لی تو تارڑ صاحب بولے

”بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔“

میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ گویا ہوئے

”ہم جہاں ستانے کو بیٹھے تھے اس کے سامنے والی سڑک ’عاشق سڑک‘ کے نام سے آج بھی مشہور ہے اور یہ وہ سڑک ہے جو کپتان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔“

تارڑ صاحب کے اندر سے قصوں کا چشمہ اُبل رہا تھا۔

”دو کردار ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دونوں اندرون شہر لاہور میں رہتے ہیں اور محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایوب دور کا قصہ ہے۔ ابھی محبت کی شادی کو معاشرتی رسوائی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ سو وہی ظالم سماج والا قصہ دہرایا جاتا ہے۔ لڑکی کے ہاں سے انکار ہو جاتا ہے۔ لڑکی اور لڑکے میں ہر قسم کا رابطہ ختم کر دیا جاتا ہے اور ان کی کسی بھی طور ملاقات کو بعید از امکان بنا دیا جاتا ہے۔ لڑکی گھر والوں کو فیصلہ سنا دیتی ہے کہ یا تو وہ اسی لڑکے سے بیاہ کرے گی یا پھر کنواری رہے گی۔ گھر والے بھی ہٹ پر قائم رہتے ہیں۔ کئی برس بیت جاتے ہیں۔ لڑکی کے سبھی چھوٹے بہن بھائی بیاہ کر اپنے گھروں کو بسا لیتے ہیں۔ اس دوران لڑکی کا باپ بھی موت کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ چند سال اور گزر جاتے ہیں۔ اب گھر میں لڑکی اور اس کی بوڑھی بیمار ماں رہ جاتے ہیں۔ بوڑھی ماں دن رات بیٹی کے غم میں مبتلا رہنے لگتی ہے۔ اس یہ فکر دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بیٹی کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ وہ بیٹی کو شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بیٹی اُسی رَٹ کو دہرا دیتی ہے کہ وہ اسی لڑکے، جو اب ایک پختہ عمر مرد بن چکا ہوگا، سے شادی کرے گی۔ ماں اسے سمجھاتی ہے کہ وہ

لڑکا اب کئی بچوں کا باپ بن چکا ہوگا۔ لڑکی تیقن سے کہتی ہے کہ اس کی محبت ماں کے دودھ کی طرح کھری ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ بالآخر ماں آمادہ ہو جاتی ہے لیکن ایک شرط رکھتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ لڑکی کو فوری شادی کرنا ہوگی کیونکہ ماں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور وہ اپنی بیٹی کو مرنے سے پہلے دُلہن بنتے دیکھنا چاہتی ہے۔ لڑکی کسی طرح لڑکے سے رابطے کا ذریعہ تلاش کرتی ہے اور اسے لڑکے کا فون نمبر مل جاتا ہے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے'' تارڑ صاحب نے مجھ سے سوال کیا'' کہانی کیا رُخ لے گی؟''

مجھے خاموش دیکھ کر ان کے اندر کا بے چین داستان گو کروٹیں بدلنے لگا

''اس صبح لڑکی نے دل تھام کر لڑکے کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے کسی مرد نے فون اٹھایا۔ وہ مرد وہی لڑکا تھا۔ دو دہائیوں کے وقفے کے بعد یہ ان دنوں کا پہلا رابطہ تھا۔ لڑکی کو اپنی محبت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے لڑکے سے اس کی شادی کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور بس یہ پوچھا کہ وہ اس کے ہاں بارات کب لا سکتا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا'' آج شام۔''

''اُسی شام اُن دونوں کی شادی ہوگئی'' تارڑ صاحب نے قصہ سمیٹا۔

امریکی نکتہ سنج مارک ٹوئن نے جب یہ کہا تھا تو کیا یہ بصیرت افروز نہ تھا'' سچائی فکشن سے زیادہ عجیب شے ہے۔ آخر فکشن کو قابل یقین ہونا ہوتا ہے۔''

ارنسٹ ہیمنگوے تخلیقی جمود کو توڑنے کے لیے قریہ قریہ خاک چھان کر ان میں سے کہانیوں کے بیج یوں چن لاتا تھا جیسے ابتدائی نو آبادیاتی دور میں یورپی باشندے سونے کے ذرات کی تلاش میں امریکہ کے ویرانوں پر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کی فکشن کا فلک بوس نابغہ سمرسٹ ماہم کہانیوں کی تلاش میں مشرقی ایشیا کے جزائر کا رُخ کرتا تھا۔ بلکہ اس کے ایک افسانوی مجموعے کی کہانیاں مشرقی ایشیا کی ہی کہانیاں ہیں۔

پچیس کروڑ کی تعداد میں بکنے والی کتابوں کے مصنف جیفری آرچر کی کہانیوں کی کتاب ''اینڈ دیئر بائی ہینگز اے ٹیل'' کی سبھی کہانیاں اس کی سفری داستانیں ہیں۔ اور سبھی حقیقی!

تارڑ کہانیوں کی تلاش میں پہاڑوں کا رُخ کرتا ہے اور وہاں سے ایسے ہوش رُبا اور دل پذیر واقعات گٹھڑی میں باندھ کر لاتا ہے جو زندگی کے متنوع رنگوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس کی زود نویسی پر حیران ہوتے ہیں نہیں جانتے کہ اس کی زنبیل میں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کی زندگی میں آنے والی طرح دار نازنینوں کی طرح حیران کُن۔

بے چین پانیوں، ازل سے منجمد برفوں، کنوارے جنگلوں، وحشی ہواؤں اور برہنہ پتھروں سے ایک کہانی اور پھوٹتی ہے۔ ترچ میر سے وابستہ کہانی۔ اس کہانی سے آگے نامعلوم کا وہ پیچدار رستہ ہے جس پر چلنے والے سودائی، گیانی کہلائے۔

تارڑ کی آواز پھر گونجی، پردہ حیرت پھر چاک ہوا اور اُدھر کا منظر جاگا

''پہاڑوں کے سامنے تین نقطے ابھرے اور پہاڑوں کی جانب بڑھنے لگے۔ جب وہ قریب آئے تو ان کی ہیئت واضح ہونے لگی۔ ان میں ایک بوڑھا شخص تھا ساتھ میں جوان لڑکا اور لڑکی تھے۔ لڑکی دھیرے دھیرے چلتی تھی۔ کچھ آگے بڑھ کر بوڑھا اور جوان چند لمحوں کے لیے رُک جاتے تا کہ لڑکی ان کو آلے۔ پھر تینوں چلنے لگتے۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی کی ہمت جواب دے گئی اور وہ سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ ایک بڑے سے ملائم پتھر پر بیٹھ کر ستانے لگی۔ اس کے دونوں ساتھی پریشانی میں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ بالآخر جوان آگے بڑھ گیا اور اِدھر اُدھر ٹٹولتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسی تلاش کے دوران اس کی نظر ایک خیمے پر جا پڑی۔ خیمے میں فوج کا ایک بوڑھا صوبیدار چولہے پر المونیم کی

سیاہ ہوتی پتیلی میں کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ جوان نے صوبیدار سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ جوان اور اس کے ساتھی ہسپانوی تھے اور اسپین سے سفر کرتے ہوئے ترچ میر پہاڑ کی چوٹی سر کرنے آئے تھے۔ پہاڑی سلسلے کے راستے میں لڑکی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور اسے بخار نے آلیا تھا۔ اب نقاہت کے مارے لڑکی سے آگے بڑھا نہ جا رہا تھا۔ ہسپانوی جوان نے بوڑھے صوبیدار کو بتایا کہ چونکہ وہ لوگ کئی سالوں کی جمع پونجی کے ساتھ اس مہم پر نکلے تھے اس لیے واپس لوٹنا انہیں گوارا نہ تھا۔ اس نے صوبیدار سے استدعا کی کہ وہ لڑکی کو اپنے خیمے میں جگہ دے دے۔ واپسی پر وہ جوان جو لڑکی کا منگیتر تھا اور بوڑھا جو لڑکی کا باپ تھا، اس لڑکی کو لے لیں گے۔

کافی سوچ بچار کے بعد بوڑھے صوبیدار نے ہامی بھر لی۔ اب لڑکی کو خیمے میں چھوڑ کر اس کا باپ اور منگیتر ترچ میر چوٹی کو سر کرنے چل دیئے۔ صوبیدار نے لڑکی کو چارپائی پر لٹایا اور خود نیچے زمین پر بچھونا بچھا کر اس پر لیٹ گیا۔ رات گئے لڑکی کی حالت غیر ہونے لگی اور اس پر سرسامی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے بوڑھے صوبیدار سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ بستر میں آجائے۔‘‘

تارڑ کی آواز میں داستان گوؤں سے مخصوص ایسا زیر و بم تھا جو مخاطب کو متجسس رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

’’صوبیدار جوان لڑکی کے ساتھ اس کے بستر میں آ گیا؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’یہاں بھی انسانی نفسیات کی مختلف جہتوں کی کئی گرہیں کھلتی ہیں۔‘‘ تارڑ صاحب نے جواب دیا اور بات بڑھائی۔

’’جب بوڑھا صوبیدار شفیق محبت سے اس لڑکی کے ساتھ آ لیٹا تو لڑکی اس سے لپٹ گئی۔ لڑکی نے صوبیدار کو بتایا کہ اس طرح اس کا احساس تنہائی کم ہوا ہے اور اسے حوصلہ ملا ہے۔ لڑکی رات بھر مدہوشی اور نیم ہوشی کی کیفیات میں ہلکورے لیتی رہی۔ کبھی وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگتی اور بیشتر گفتگو وہ ہسپانوی میں کرتی رہی۔ اس نے اپنے گھر، شہر اور ماں کی باتیں بتائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے منگیتر سے بہت پیار کرتی ہے اور جلد ہی وہ شادی کر لیں گے۔ آہستہ آہستہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اور صبح تک وہ مر گئی۔‘‘

اب ہمارے درمیان ایک پُر معانی خاموشی معلق ہوگئی۔

’’جب صوبیدار کی سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو اس نے لڑکی کی لاش کو اس کے سلیپنگ بیگ میں ڈالا اور کاندھے پر ڈال اس کے منگیتر اور باپ کی تلاش میں چل دیا۔ تھوڑی ہی دُور اسے لڑکی کا باپ اور منگیتر سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ صوبیدار کو دیکھ کر وہ دُور سے خوشی میں نعرے لگانے لگے کہ وہ چوٹی کو سر کر آئے ہیں۔ جب وہ قریب آئے اور ان پر حقیقت آشکار ہوئی تو وہ فرط غم میں گریہ کرنے لگے۔ روتے پیٹتے جب وہ نڈھال ہوگئے تو انہوں نے مردہ لڑکی کو دفنانے کی جانب توجہ کی۔ نیچے ترچ گاؤں میں ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ وہ کوئی باقاعدہ قبرستان نہ تھا بلکہ ایک چٹیل میدان میں پہاڑی پتھروں کے بیچ میں قبریں کھود کر ان میں مردوں کو دفنا کر ان پر بھربھری مٹی اور روڑے پتھر ڈال کر انہیں برابر کر دیا جاتا۔ تعویز کی جگہ مختلف نوعیت کے پتھر بطور نشانی کھڑے کر دیئے جاتے۔ ہیبت ناک پہاڑوں کے بیچ ہولناک سناٹے میں موجود یہ پُر وحشت جگہ رات کو پہاڑی نالے کے پُر شور پانیوں میں عجیب یاسیت کی علامت بن جاتی۔ بس اسی جگہ لڑکی کو ایک تابوت میں دفنا کر وہ دونوں مرد گریہ وزاری کرتے وہاں سے لوٹ گئے۔ کچھ ہی عرصے میں ترچ گاؤں کے قبرستان میں ایک یورپی لڑکی کی قبر باقی قبروں میں یوں رَل مِل گئی کہ وہاں کے لوگ اس واقعے کو بھول گئے۔‘‘

’’واقعی بہت دلگیر قصہ تھا۔‘‘ میں نے تارڑ صاحب کی بات میں اپنی بات ملائی۔

اس پر تارڑ صاحب کے اندر موجود مشاق قصہ گو نے انگڑائی لی اور انہوں نے کہا

’’حیران کن بات تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔‘‘

میری آنکھوں میں حیرت اور چہرے پر تجسس پڑھتے ہوئے وہ گویا ہوئے

''اس واقعے کو کئی برس گزر گئے۔ وہاں کے مقامی لوگ اس حادثے کو بھول گئے۔ ایک روز ایک یورپین بڑھیا وہاں آئی اور اس صوبیدار کا پوچھنے لگی۔ وہ صوبیدار اب ریٹائر ہو کر وہیں قیام پذیر تھا۔ جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو بڑھیا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے صوبیدار کو بتایا کہ وہ اس ہسپانوی لڑکی کی ماں تھی اور اس کو لینے آئی تھی۔ اس نے صوبیدار کو بتایا کہ وہ لڑکی اسے بے حد عزیز تھی اور جب اس کی موت کی خبر وہاں ماں تک پہنچی تو وہ بے حال ہو گئی۔ غریب عورت تھی۔ ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی اور کئی برس کی محنت کے بعد اتنی رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ پاکستان آنے کا اور بیٹی کا تابوت لے جانے کا انتظام کر سکے۔''

یہاں پہنچ کر تارڑ صاحب نے سوگ میں نہائی آواز میں بات ختم کی

''جب ترچ گاؤں کے اس صوبیدار نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو اس کی آنکھیں یہ بتاتے ہوئے بھیگ گئیں کہ ماں جب بیٹی کا تابوت ساتھ لیے جا رہی تھی تو اس نے تشکر بھرے مطمئن لہجے میں فقط اتنا کہا تھا کہ کم از کم اب اس کی بیٹی ماں کے قریب تو ہوگی۔''

عام انسانی زندگی میں توجیہ اور دلیل سے ماورا واقعات سن کر اور دیکھ کر انسان تحیر میں بتلا نہ ہو تو اپنے فہم کو مطمئن کرنے کا کیا سامان کرے۔

بڑا ادیب اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے۔ اسی لیے تاریخی ناول لکھنے والے یا دیو مالائی طلسماتی قصے تخلیق کرنے والے بہر حال ادب کی صف دوم میں ہی جگہ پاتے ہیں۔ جارج برنارڈ شا جیسا ذہین ڈرامہ نگار اور حاضر جواب و بذلہ سنج تخلیق کار جب یہ کہتا ہے ''وہ شخص جو اپنے بارے میں اور اپنے دور کے بارے میں لکھتا ہے درحقیقت سب لوگوں کے بارے میں اور سب زمانوں کے بارے میں لکھتا ہے'' تو اس کی پُر وزن بات کو آسانی سے جھٹلانا ممکن نہیں۔ تارڑ نے جو کچھ بھی لکھا اس میں ان کا دور اور اس دور سے متعلق کرداریوں صحیح بیٹھتے ہیں جیسے ایک جگ سا پزل کے ٹکڑے۔ چند استثنیات ہیں لیکن ان کی ٹھوس وجوہات ہیں۔

اس کے سفرناموں کے کردار، ناولوں کے لوکیل اور تحریروں میں رقم زمانے سب اس کے اپنے ہیں۔ یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کی متفرق معاشرت کی پچی کاری جس طرح تارڑ نے اپنی تحریروں میں کی ہے کسی اور پاکستانی ادیب نے نہیں کی۔ اس کے سفرناموں کے شمالی علاقہ جات اور پشتون علاقے، خس و خاشاک زمانے کا پنجاب، 'راکھ' کا لاہور، کراچی اور لاہور کے گرد و نواح، 'ڈاکیا اور جولاہا' کا جنوبی پنجاب، 'بہاؤ' کا سرسوتی اور چولستان، سفر گردی کے احوال میں بلوچستان سے ایران کا راستہ ہو یا گندھارا تہذیب، کالموں میں سندھو سائیں کے کردار ہوں یا 'قربتِ مرگ میں محبت' کا پوٹھوہار اور پنڈی اور مری کو جوڑتا لوکیل، سب تارڑ کے تیار کردہ تنجن میں بہار دکھاتے ہیں۔

یقیناً تارڑ پاکستان ہے۔

مجھے تارڑ کی دو باتیں حیران کرتی ہیں۔ حیران تو اور بھی بہت سی باتیں کرتی ہیں مگر دو باتیں زیادہ حیران کرتی ہیں۔

ایک تخلیق کار جب تنہائی میں کوئی شاہکار تخلیق کرتا ہے تو اسے اپنی ذات کی سرنگ اترنا پڑتا ہے۔ ایسے میں ایک انترہوت اُداسی، اس کا گھیراؤ کر لیتی ہے۔ فرانز کافکا کے الفاظ میں 'لامحدود تنہائی، ذات کے اندھے پاتال میں اُتر جانے'' کے مترادف تنہائی کے وہ لمحات جب اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، اس کی سنجیدگی کے سلیٹی رنگ کو سیاہ کرتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہزاروں خالی صفحات میں رنگ بھرنے والا تارڑ اپنے مزاج کی شوخی اور انداز کی برجستگی کو برقرار رکھے ہے۔ اتنی شدید تنہائی تو اپنے یخ پانیوں میں کئی وجودوں کو جما سکتی ہے۔

عام زندگی میں بہت نارمل اور بے تکلف تارڑ اپنے ماحول کی جزئیات پر ایسی گہری نظر رکھتا ہے جیسی چوٹی پر بیٹھا ایک عقاب وادی میں بہتے دریا کے کنارے بیٹھے شکار پر رکھتا ہے۔ اگر ماحولیاتی جزئیات تک بات محدود ہو تو بھی قابل فہم ہے مگر انسانی نفسیات کے گورکھ الجھاوؤں میں بھٹکتے پر اسرار عوامل کو احاطہ فہم میں لے آنا اسی کا کمال ہے۔

دروازے

گرمیوں کی ایک بھکر دوپہر کو ہم ایک ریستوران کے خنک نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ٹھنڈے مشروبات سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ دوپہر سہ پہر میں تبدیل ہورہی تھی اور ریستوران میں لوگوں کا رش کافی گھٹ گیا تھا۔ گپ شپ کے دوران کہنے لگے کہ ہر حال میں شکرادا کرنے کی تلقین کرنے والے بنیادی انسانی نفسیات سے ناواقف ٹھہرتے ہیں۔ اسی حوالے سے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح ایک عورت کا اکلوتا جوان بیٹا راہ اجل پر چلا گیا۔ جب پرسہ دینے والوں نے اسے کہا کہ وہ صبر وشکر کرے تو ماں نے غم گین نگاہوں سے ایسے رسمی پرسہ داروں کی جانب دیکھا اور بولی ''صبر تو شائد کرلوں مگر شکر نہیں۔''

اسی طرح بات ان خواتین کی جانب چل نکلی جو رشتۂ جسم وجان قائم رکھنے کے لیے جسم کا رستہ اختیار کرتی ہیں۔ میرا موقف تھا کہ یہ بہرحال ایک حقیقت ہے اور غربت اور دیگر معاشرتی عوامل کی وجہ سے اس میں اضافہ ہورہا ہے۔ اگر اس صورت حال کا سدباب نہیں ہوسکتا، پھر کیا بنیادی انسانی جبلت کے خلاف اس کا سدباب جو دیگر معاشرتی منفی عوامل کی نمو و پرداخت کرسکتا ہے، کے پیش نظر اس کو تسلیم کرلینا قرین فہم نہیں۔ اس ملک میں جہاں جانوروں کے حقوق ہیں، کتابوں میں سہی، وہاں ایسی خواتین کو کسی نوعیت کا تحفظ دینا تو کجا ان کو تسلیم نہ کرنا کیا بالائے فہم نہیں۔ بات اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی جب اس غیر انسانی سلوک کی جانب چلی گئی جس کا ان خواتین کو بھی سامنا کرنا پڑتا ہے تو تارڑ صاحب نے حسب عادت بجھے سگریٹ کو کیس میں واپس رکھا اور سمجھانے کے انداز میں گویا ہوئے۔

''دیکھو تمہاری بات نصابی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جسم فروش عورت کو بُرے سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ عموماً ایسی عورتوں کو غیر انسانی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو ایک باقاعدہ منظم گینگ کا حصہ ہوں کیونکہ انہیں اپنی پشت پر کافی سہارا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عام چلتی پھرتی سڑک پر کھڑی جسم فروش عورتیں زیادہ تشدد کا سامنا کرتی ہیں کیونکہ ان سے استفادہ کرنے والا انہیں بے سہارا جان کر اپنی تمام تشنہ خواہشات ان سے پوری کرنا چاہتا ہے۔ ایسے میں ان کا ظالم مردوں سے بھی پالا پڑجاتا ہے۔''

انہوں نے زور دے کر کہا

''اگر اس موضوع کو فکشن میں استعمال کیا جائے تو تشدد سہارنے والی عورتوں کی بہ نسبت جبر کرنے والے مرد زیادہ طاقتور موضوع بن سکتے ہیں۔ عام طور پر جنسی طور پر کمزور یا غیر فعال مرد اپنی مایوسی کا انتقام تشدد کی شکل میں لیتے ہیں۔ ان کا نفسیاتی تجزیہ زیادہ کارآمد موضوع ہوسکتا ہے۔''

جب میں نے ان سے پوچھا کہ ایک صدی پہلے پیدا ہونے والا منٹو اس بنیادی انسانی جبلت پر اتنا لکھ گیا تو آج کا ادیب کیونکر اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ٹھٹھک جاتا ہے تو انہوں نے معاشرتی عوامل کے ادیب پر طاقت ور اثر کو اس کی بنیادی وجہ قرار دیا۔

جدید مغربی ادب میں خواتین ادیبوں نے حال ہی میں جنسی موضوعات پر جس تخلیقی فعالیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ حیران کن ہے اور توجہ طلب بھی۔ ان میں بکر انعام جیتنے والی خواتین سے لیکر پاپولر ادب تخلیق کرنے والی خواتین، سبھی اس موضوع کے دام کی اسیر نظر آتی ہیں۔ شائد یہ ان کی جانب سے اپنے وجود کے جنسی پہلو کو منوانے کی پُرزور سعی ہے۔ جہاں ایک جانب آرٹ کی فرانسیسی نقاد کیتھرئن ملٹ نے اپنی کتاب ''دی سیکسوئل لائف آف کیتھرئن ایم'' کے ادبی معیار سے انڈیپینڈنٹ اور دی اسکاٹسمین جیسے اخبارات کو متوجہ کیا۔ تو دوسری جانب ''ان بیڈ ود'' میں علی سمتھ جیسی مستند ادیبہ دیگر ادیباؤں کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھا کر ادبی دنیا میں ہلچل مچاتی ہیں۔ 'مائی ہوریزنٹل لائف' کی تخلیق کار چیلسی ہینڈلر بھی کہاں کسی سے پیچھے رہنے والی ہیں۔ ہیلن سمپسن کا 'فور بیئر لیگز ان اے بیڈ' پر سنڈے ٹائمز کا ایوارڈ جیتنا بھی زیادہ پرانی بات نہیں۔ پچھلی دو دہائیوں میں خواتین ادیباؤں کی جانب سے متواتر ایسی تحریریں سامنے آئی ہیں کہ شاید انسانی تہذیب نے پھر سے مادری نظام کی جانب چھوٹے چھوٹے قدموں سے واپسی کا سفر شروع کیا ہے۔

تارڑ صاحب کے ہاں بنیادی انسانی جنسی جبلت کو ناولوں میں یوں سمویا گیا ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں۔

اُسی سہ پہر بتانے لگے کہ اپنی ابتدائی تحریروں میں کہیں وہ اپنے چند ازدواجی مسائل کا ذکر کر بیٹھے تو ان کی بیویوں نے انہیں خاصے آڑے ہاتھوں لیا۔ بس تب سے کھل کر لکھتے ہوئے قلم میں جھجک در آتی ہے۔

تارڑ شائد ایک شریف آدمی نہیں اور نارمل تو بالکل نہیں اسی لیے ایک بہت بڑے ادیب ہیں۔

”شریف آدمی بڑا ادیب نہیں ہوسکتا۔“ ایک روز انہوں نے میرے سامنے حتمی اعلان کیا۔

”عرفان، میں تو شروع سے کہتا آیا ہوں کہ ایک شریف آدمی بڑا ادیب نہیں ہوسکتا۔ ایک مرتبہ اس پر اشفاق احمد سے خاصی بحث ہوگئی۔ وہ میری بیوی سے کہنے لگے ’میمونہ یہ کہتا ہے کہ شریف آدمی بڑا ادیب نہیں ہوسکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مجھے بڑا ادیب نہیں مانتا۔‘ میں نے جواب دیا کہ ’میں آپ کو بڑا ادیب تو مانتا ہوں مگر شریف آدمی نہیں۔ اگر اجازت دیں تو آپ کی تحریروں سے حوالے نکال لاؤں۔“

تارڑ صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے

”بس پھر کیا تھا۔ اشفاق صاحب بوکھلا گئے اور انہوں نے موضوع بدل دیا۔“

ایک شام، اپنی اسٹڈی روم کی بتیاں روشن کرتے ہوئے کہنے لگے

”میری بیوی بہت باہمت عورت ہے۔ بھلا کوئی عام عورت میرے جیسے سیلانی مزاج، مشکل آدمی کے ساتھ گزارہ کرسکتی تھی۔ اب میں شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد یورپ کی جانب نکل گیا۔ راستے میں بیروت پہنچ گیا۔ وہاں پی۔ ایل۔ او کے دفتر چلا گیا اور اسے جوائن کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے انٹرویو لے کر انکار کر دیا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے استفسار کیا

انہوں نے جواب دیا۔

”وہ شادی شدہ لوگوں کو بھرتی نہیں کرتے تھے۔ جہاں گردی کا سودا سر میں ایسا سمایا کہ منزل کا تعین کیے بغیر کئی ماہ بھٹکتا رہتا۔ اس کا بھی اپنا لطف تھا۔ ہچ ہائکنگ کے دوران نامعلوم منزلوں کی جانب روانہ ہوجاتا۔ ایک روز یورپ میں یونہی سڑک پر کھڑا تھا کہ ایک شخص نے بتایا کہ وہ ہیمبرگ جارہا ہے۔ میں ساتھ چل دیا۔“

کچھ توقف کر کے مسکرائے اور بولے

”جہاں گردی اب بھی کرتا ہوں مگر ذرا سمجھدار ہوگیا ہوں۔ منزل کا تعین ضرور کرلیتا ہوں۔ شمالی علاقہ جات اور پہاڑی سلسلوں کے پندرہ سے زیادہ سفر کیے ہیں اور سب میں منزل پہلے سے متعین تھی۔“

میری طرف غور سے دیکھا۔

”بھلا میدانوں سے آنے والے کسی شخص کا پہاڑوں سے ایسا عشق نارمل تھوڑا ہی ہے۔ میں نارمل کہاں ہوں۔ پہاڑوں سے مجھے اب بھی بلاوے آتے ہیں۔ پہاڑ مجھے بلاتے ہیں۔ ان میں ایک مقناطیسی کشش ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ تب میں آس پاس سے بیگانہ ہوجاتا ہوں اور ان سے ہمکنار ہونے کی خواہش مجھے بے اختیار کردیتی ہے۔ ابتدائی ازدواجی زندگی میں کافی مشکلات پیش آئیں۔ آخرکار میری بیوی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑا۔ اس زمانے میں بیویاں حالات سے سمجھوتا کرہی لیتی تھیں۔“

تارڑ صاحب کی ذات کے بارے میں ایک راز ہے جو شائد بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

وہ دلچسپ، خبطی اور غیر معمولی لوگوں کی یادیں اکٹھی کرتے ہیں اور ان کو اپنے ذہن کے کسی نہاں گوشے میں محفوظ کرلیتے ہیں۔ شائد اسی لیے عام روٹین کی زندگی گزارنے والے لوگوں میں جلد ہی دلچسپی کھو دیتے ہیں۔ ایسے میں یہ بات میرے لیے باعث

تجسس ہے کہ میری ذات کی کس کجی نے ان کی دلچسپی کا رُخ میری جانب کر دیا کہ اتنے تپاک سے ملتے بھی ہیں اور باقاعدگی سے ملتے ہیں۔

ان کے دوستوں میں ایک دوست مطیع الرحمان بھی تھا جو دست شناسی کو بطور پیشہ اپنائے ہوئے تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنے سفرنامے ''نانگا پربت'' میں بھی کئی مرتبہ کیا ہے۔ وہ ہم دونوں کا مشترکہ دوست تھا اور بہت رنگین کردار۔ زندگی سے بھرپور مطیع الرحمان کی اچانک وفات پر میں نے تارڑ صاحب کو بہت سوگوار دیکھا۔ اس کی وفات کے بعد جب میں تارڑ صاحب سے ملنے گیا تو وہ بہت دیر تک مطیع الرحمان کا ذکر کرتے رہے اور اس سے وابستہ دلچسپ واقعات سناتے رہے، بلکہ انہوں نے اس پر کالم بھی لکھا۔ اس روز باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ کس طرح ایک رات اچانک تارڑ صاحب کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ جب وہ باہر نکلے تو سامنے مطیع الرحمان تھا۔ وہ کچھ جلدی میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندہ تھا۔ پلندہ تارڑ صاحب کو تھما کر اس نے درخواست کی کہ وہ بھی اس مسودے کو ایک نظر دیکھ لیں۔

جب تارڑ صاحب نے اس کے بارے میں مزید استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ایک ناول کا مسودہ تھا جو مطیع الرحمان نے لکھا تھا اور جس پر اسے ادب کا نوبل انعام ملے گا۔ اس نے انتہائی یقین سے یہ بات کہی گویا کہ نوبل کمیٹی نے یہ فیصلہ کر لیا ہو اور بس میڈیا کو اطلاع دینی ہو۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں نے تارڑ صاحب کو بتایا کہ ان دنوں اس نے مجھے بھی بتایا تھا کہ وہ ایک ایسا ناول لکھ رہا ہے جسے نوبل انعام ملنا ہے۔ پھر میں نے تارڑ صاحب سے پوچھا۔

''کیسا تھا ناول؟''

''ناول تو پتا نہیں وہ تھا یا نہیں لیکن جو کچھ بھی تھا، دلچسپ اور مختلف تھا۔'' انہوں نے جواب دیا

اُسی نشست میں وہ بتانے لگے کہ کس طرح مطیع الرحمان ان سے رقعہ لے کر اپنے ایک دوست پرویز کے ساتھ ہندوستان میں قراۃ العین حیدر سے ملنے پہنچ گیا، پھر امرتا پریتم اور امروز سے ملا اور بالآخر بمبئی کے ایک مشہور زیر زمین ڈان سے تعلق نکال کر اس کی محفلوں میں شریک ہونے لگا جہاں ایک محفلِ رقص میں ایک معروف رقاص لڑکے سے محبت میں مبتلا ہو گیا۔

مطیع الرحمان کی رنگین ذات ایک مکمل خاکے کی متقاضی ہے۔ تارڑ صاحب کے تتلی گھر میں ایسی کئی تتلیوں کی ممیاں محفوظ ہیں۔ ان دنوں وہ اپنے مشاہدے کی وسعت کے لیے ان لوگوں کو زیادہ استعمال کرتے ہیں جو ان کے ساتھ صبح کی سیر کرتے ہیں یا پھر سفروں پر نکلتے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ناسٹیلجیا کا شکار ہوں اور مجھے اپنا بچپن، پرانے گھر بہت ہانٹ کرتے ہیں۔ ''مجھے بچپن نے کبھی اپنی طرف نہیں کھینچا۔'' انہوں نے کئی مرتبہ اس بات کا اظہار کیا ہے۔ ''میں کبھی بچپن سے اس طرح محظوظ نہیں ہوا جس طرح اور بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔

گوکہ میں اپنے خاندان میں پہلا اور سب سے بڑا بچہ ہونے کے باعث سب سے لاڈلا بھی تھا۔ پھر میرے والد صاحب کا کاروبار بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ان کا کاروبار ہندوستان کی حدود سے نکل کر سری لنکا وغیرہ تک پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے برطانیہ اپنے خرچے پر بھیجا تھا اور اس دور میں یہ اچھی خاصی مہنگی عیاشی کے درجے میں آتا تھا۔ آج میں جس گھر میں گلبرگ جیسی مہنگی جگہ پر رہتا ہوں، یہ پلاٹ بھی انہی کا خریدا ہوا ہے۔''

''پھر کیا وجہ ہے کہ بچپن جیسا معصوم اور بے فکر دورِ زندگی آپ کو اس طرح متاثر نہیں کرتا جیسے دیگر کئی ادیبوں اور لوگوں کو کرتا ہے؟''

''شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا لڑکپن اور جوانی، بچپن سے زیادہ خوبصورت تھے۔ ان سنہری ایام کی اوٹ میں میرا سادہ سا بچپن چھپ کر رہ گیا یار، ویسے بھی بچپن حیرت کا دوسرا نام ہے جب آپ ہر شے کو حیرانی سے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، کئی تجربات سے پہلی مرتبہ گزر رہے ہوتے ہیں۔ میری تو حیرت آج بھی باقی ہے۔ مجھے آج بھی کئی مناظر اور کئی تجربات بچے کی طرح ایکسائٹ کرتے

ہیں۔ راکاپوشی پر پہلی نظر بے طرح ایکسائٹ کرتی ہے۔ سو شائد آج بھی میں بچپن سے نکل نہیں پایا۔ ایک طرح سے اپنے بچپن میں زندگی گزار رہا ہوں۔‘‘

یہ ان کا اپنی ذات کے حوالے سے نفسیاتی تجزیہ تھا۔ ان سے ہونے والی نشستوں میں وہ ایسے نفسیاتی نکتے لاتے رہے ہیں جو منفرد اور اور جنل ہوتے ہیں یہی ان کی تخلیقی فعالیت کی دلیل بھی ہے اور شائد ان کی بہت سی تحریروں کا خمیر اسی سے اٹھتا ہے۔

’’ایک عورت ایک ہی وقت میں دو مردوں سے بیک وقت یکساں شدت سے محبت کر سکتی ہے۔ مکمل خلوصِ دل کے ساتھ!‘‘ ایک روز انہوں نے اعلان کیا۔

’’یہ ایک تاریخی مغالطہ ہے کہ انسان کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ محبت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی مغالطہ ہے کہ آپ ایک وقت میں ایک ہی انسان سے محبت کر سکتے ہیں۔‘‘

انہوں نے میز پر ہاتھ مارا۔

’’تم عورت کو مرد کی نظر سے نہ دیکھو۔ اس کے اندر اتر کر دیکھو۔ میں نے عورت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ عورت زندگی کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ جب میں یورپ کے سفر پر گیا تو کم لوگ باہر جاتے تھے۔ جو جاتے تھے وہ واپسی پر اپنے تجربات تحریر نہیں کرتے تھے۔ تب پاکستان کو یا تو لوگ کم جانتے تھے یا جو جانتے تھے ان کے ذہن میں اس کا تاثر ایک ابھرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ملک کا تھا۔ ایک لڑکے اور لڑکی کا باہمی تعلق وہاں کے کلچر کا حصہ تھا۔ چنانچہ جب واپسی پر میں نے اپنے تجربات اور مشاہدات سفرنامے کی شکل میں لکھے تو بہت سے نکتہ چینوں نے ان میں مبالغہ ڈھونڈ نکالا۔ اس امر سے قطع نظر، میرے ابتدائی سفروں نے میرے ذہن میں عورت کا یہاں پر مروجہ تصور توڑ ڈالا۔ وہاں کی عورت چونکہ نسوانی آزادی کے رستے پر گامزن تھی اسی لیے زیادہ بولڈ تھی۔ وہ ان موضوعات پر بھی آسانی سے اظہار خیال کر لیتی تھی جن پر بات کرتے ہوئے یہاں کے مردوں کی زبانیں بھی تالو سے چپک جاتی تھیں۔ وہ عورت عملی طور پر بھی کچھ کر گزرنے سے نہ ہچکچاتی تھی۔ اس ماحول نے میرے ذہن کو ایک ایسی وسعت دی جو یہاں رہتے ہوئے حاصل کرنا ممکن نہ تھی۔‘‘

تارڑ صاحب گہری سوچ میں غوطہ زن ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد متذبذب لہجے میں کہنے لگے

’’دیکھو، اگر یہ عورتیں میری زندگی میں نہ ہوتیں تو شائد میری تحریر سپاٹ اور بیان بے رنگ ہوتا۔ عورت نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میری تحریر کو رنگ، میرے ذہن کو وسعت، میرے جذبات میں گہرائی اور میری شخصیت میں اعتماد۔ ان سب میں عورت کا بہت اہم کردار ہے۔ میرے ناول ’’بہاؤ‘‘ کی پاروشنی کو بیک وقت دو مردوں سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ عین قرین حقیقت ہے۔ ’’جپسی‘‘ میں نسوانی کردار اصلی ہے۔ بلکہ جب سلجوق پیدا ہوا تو اس نے اس کے لیے تحائف بھی بھیجے تھے۔ ’’پیار کا پہلا شہر‘‘ کی پاسکل واقعی اپاہج تھی گو اس میں، میں نے رنگ آمیزی کی ہے مگر اسے تم فقط فرنی پر لگے چاندی کے ورقوں کی طرح سمجھو۔ ’’قربت مرگ میں محبت‘‘ کی تینوں خواتین حقیقی ہیں۔ میں نے عورت کو اتنے قریب سے اور اتنے مختلف رُوپوں میں دیکھا ہے کہ یہ تجربات حیرت کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ہم منافق لوگ ہیں۔ جھوٹ کے شفاف لبادے کو اوڑھ کر سمجھتے ہیں کہ ہمارا ننگا بدن لوگوں سے چھپ گیا ہے۔ میں ایک بہادر آدمی ہوں۔ میں نے یہ سب اپنی تخلیقی تسکین کے لیے لکھا ہے۔ مجھے لوگوں کا کوئی ڈر نہیں۔ میں نے بس میمونہ کو اعتماد میں لیا اور وہ بہت جلد سمجھ گئی کہ ادیبوں کی زندگیاں عام ڈگر پر نہیں چلتیں۔ اس نے سمجھوتا کر لیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اُس کی وجہ سے ہوں اور اس کا شکر گزار ہوں۔‘‘

’’تارڑ صاحب آپ ابھی اپنے صنف مخالف کے حوالے سے مشاہدے اور تجربے کا ذکر کر رہے تھے۔‘‘

’’عرفان، میں بیس فیصد عورت ہوں۔‘‘

جب تارڑ صاحب نے یہ جملہ کہا تو مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آ گئی کہ تارڑ کے ہاتھوں سے عورت لکھتی ہے اور عبداللہ حسین

کے ہاتھ مرد کے ہاتھ ہیں۔ تارڑ کی ریشمی تحریر بھی سجائی، نفیس اور موزوں ہوتی ہے جبکہ عبداللہ حسین مرد کی طرح اُکھڑ اُکھڑ جاتا ہے، کھردرا ہوجاتا ہے۔

''ایک ادیب کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ خانقاہ سے لیکر طوائف کے کوٹھے تک ہو۔ ہر بڑے تخلیق کار میں نسوانیت کا مختلف تناسب سے جوہر ایک جزوِ لازم ہے۔ یہ صرف ادیبوں میں نہیں، موسیقاروں اور مصوروں میں بھی ہوتا ہے۔ میں نے جب ایک مخصوص وقت اور مقام پر ایک عورت کو دیکھا تو وہ مجھے واجبی شخصیت اور شکل کی مالک نظر آئی۔ جبکہ کسی دوسرے موقعے پر اسی عورت نے مجھے اپنے حسن اور شخصیت سے بہت متاثر کیا۔ عورت کی بے شمار پرتیں ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ مختلف لوگوں پر مختلف طرح سے مختلف اوقات میں کھلتی ہیں۔ اب جب ''بہاؤ'' میں پاروشنی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اور میں نے وہ سارا منظر بیان کیا تو لوگوں نے مجھ سے پوچھا 'یہ سب اتنا اصلی ہے، آپ نے کہاں سے لیا؟' میں نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ وہ سب لکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود زچگی کے مراحل سے گزر رہا ہوں۔''

یہ سن کر میری یادداشت کے کسی نہاں گوشے سے امریکی ادیب نارمن ملر کی بات اُبھری کہ کسی مرد کا کوئی کتاب تخلیق کرنا زچگی کے مراحل سے گزرنے کے قریب ترین مماثل تجربہ ہوسکتا ہے۔

تارڑ صاحب آج خلاف معمول کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آرہے تھے۔

''جب میں یورپ کے سفر سے واپس آیا تو وہاں کے ماحول کا عادی ہوچکا تھا۔ نوجوانی کا دور تھا۔ میں سفید لٹھا تھا۔ کوئی بھی رنگ جلد چڑھ جاتا تھا۔ ایک روز میری ایک عزیزہ اپنی بیٹی کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں۔ کئی سالوں بعد بات ان سے ملاقات ہورہی تھی۔ جب پچھلی مرتبہ ان کی بیٹی کو دیکھا تھا تو وہ دس بارہ برس کی تھی۔ اب سترہ اٹھارہ برس کی ہوچکی تھی اور خاصی قبول صورت تھی۔ چنانچہ میں نے عام مغربی انداز میں اپنی والدہ اور ان عزیزہ کے سامنے لڑکی کی تعریف کردی 'خالہ یہ تو اتنی بڑی اور خوبصورت ہوگئی ہے کہ اس سے تو باقاعدہ محبت کی جاسکتی ہے۔' مجھے توقع تھی کہ وہ خوش ہوجائیں گی۔''

''انہوں نے شرارت سے مجھے دیکھا اور بولے

''وہاں تو اچھی خاص مصیبت بن گئی۔''

''شکر کریں لڑکی کے والد ہمراہ نہ تھے وگرنہ بہت سی خواتین گھنگھریالے بالوں اور گندمی رنگت والے خوش شکل لڑکے کی قربت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاتیں۔''

ایک سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا، چنانچہ میں نے تارڑ صاحب سے بے تکلفی سے وہ سوال کردیا

''کرزما انگریزی کا لفظ ہے، صنف مخالف کی شخصی مقناطیسیت جس کی ایک قسم اور قریب ترین مترادف اُردو ترکیب ہوسکتی ہے۔ آپ نے رنگ رنگ کے لوگ دیکھے اور ہر طرح کی زمینوں کی سیاحت کی۔ کیا کبھی کسی ایسے انسان سے آپ کی ملاقات ہوئی؟''

انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

''میں ٹی۔ وی پر مارننگ شو کرتا تھا۔ شو خاصا مقبول تھا۔ اکثر شو کے بعد اسٹوڈیو کے باہر چند ایک چاہنے والے مل جاتے۔ ایک روز شو کے بعد مجھے بتایا گیا کہ ویٹنگ روم میں ایک خاتون مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ سامنے صوفے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے مجھے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ واجبی شکل کی لڑکی تھی۔ لیکن اس نے جس انداز سے مجھے دیکھا اس نگاہ نے مجھے جکڑ لیا۔ بیبا کی مناسب لفظ نہیں۔ ایک مقناطیسی بلاوا تھا اس کی نظروں میں۔ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کوئٹہ سے تعلق

رکھتی ہے اور نوکری کی تلاش میں ہے۔ فی الحال اس کا مسئلہ رہائش کا تھا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ اگر ممکن ہوا تو میں کوشش کروں گا۔ اس پر اس نے میرے ساتھ میرے کمرے میں ٹھہرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے معذرت کرلی۔ جتنی دیر یہ بات چیت ہوتی رہی وہ صوفے پر بیٹھی رہی اور میں بُت بنا اس کے سامنے کھڑا رہا۔ میڈیا اور عام زندگی میں بے شمار خواتین سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر میں ان لمحات کو اب تک نہیں بھولا جب اس لڑکی نے مجھ پر سحر پھونک دیا تھا۔ دیکھو یہ وحشی مقناطیسیت عورت ہی میں نہیں بلکہ مرد میں بھی ہوتی ہے۔ عموماً مرد کے لیے عورت میں اور عورت کے لیے مرد میں ہوتی ہے۔ چند مرد ایسے بھی دیکھے جو مجھے بظاہر عام سے مرد نظر آئے مگر عورتیں ان کی جانب یوں کھنچی چلی آئیں جیسے شکار اژدھے کی نظروں میں نظریں ڈال کر اس کی جانب بے قابو کھنچا آتا ہے۔''

تارڑ صاحب ایک ایتھلیٹ کا سا اسٹیمنا رکھتے ہیں۔ جب ماڈل ٹاؤن پارک میں واک کرتے ہیں تو کئی جوانوں سے زیادہ متحرک ہوتے ہیں۔ ایک روز ان کے ساتھ واک کرتے ہوئے میں نے تھک کر بینچ پر بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب تک واک کے دوران ان کو کئی جاننے والے مل چکے تھے۔ کسی کو ہاتھ ہلا دیتے تو کوئی ان سے مصافحہ کرنے چلا آتا۔ وسیع و عریض پارک کے کنارے ترشی ترشائی باڑھ کے ساتھ میں نصب بینچ پر بیٹھ کر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتیں جرائم کی جانب چلی گئیں۔ ان دنوں لاہور میں اسٹریٹ کرائم کا بڑھتا ہوا رجحان عام شہریوں کو کافی پریشان کر رہا تھا۔

میں نے تارڑ صاحب سے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جرم یقیناً ایک اخلاقی برائی ہے۔ مگر کیا مجرم کے ذہن میں صحیح طرح سے جھانکنے اور اس کی نفسیاتی گرہوں کو کھولنے کے لیے ایک بڑے ادیب کے اپنے اندر ایک چھوٹا موٹا مجرم ہونا ضروری نہیں۔ او ہنری، ولیم بورو، آسکر وائلڈ سے لے کر جیک لنڈن تک بے شمار بڑے ادیب اخلاقی جرائم میں سزا یافتہ تھے اور ہیں۔''

تارڑ صاحب جو ابھی سانس درست کر رہے تھے، نے پُر زور انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور بولے

''بالکل! لیکن یہ ضروری نہیں کہ ادیب عملی طور پر مجرم ہو۔ اس کی خفتہ مجرمانہ ذہنیت بھی بہت کافی ہے۔ جرائم کے سدباب کے مغربی اداروں میں مجرم ذہنیت کے ادراک کے لیے دستووسکی کی 'کرائم اینڈ پنشمنٹ' اور وکٹر ہیوگو کی 'لامزریبلز' آج بھی نصاب کا حصہ ہیں۔''

میں نے سوال کیا۔

''کیا آپ میں ہے؟''

انہوں نے بے تکلفی سے جواب دیا

''شاید، ہاں۔ یار میرے اندر بہت چھوٹا مجرم بیٹھا ہے۔ شائد اسی لیے میری تحریروں میں تمہیں کوئی نمایاں مجرم کردار نہیں ملیں گے۔''

اب چونکہ بات کھل کر ہو رہی تھی اس لیے میں نے ایک اعتراض داغ دیا

''ٹی۔ وی پر کام کرنا ایک تخلیقی کام ہے۔ آپ نے جب شادی آن لائن، جیسا پروگرام کیا تو کیا یہ آپ کے معیار سے نچلے درجے کا کام نہیں تھا؟''

''تخلیقی کام کے لیے ذہنی یکسوئی ضروری ہوتی ہے اور اس میں معاشی آسودگی کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے، خاص طور پر فکشن تحریر کرنے جیسے صبر آزما کام میں۔ عملی زندگی کے شروع میں میں ایک ایسے دوراہے پر آن کھڑا تھا جہاں مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ آیا میں کاروبار کروں یا پھر لکھنے کا روزگار اپناؤں۔ میری بیوی بہت سمجھدار اور شاکر عورت ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اگر میں کاروبار کروں گا تو مجھے کبھی بھی اصل ذہنی و روحانی خوشی نہیں ملے گی۔ کچھ کھو دینے کا احساس ہمیشہ میرے اندر زندہ رہے گا۔ اگر میرا کاروبار کامیاب ہو بھی گیا تو میں

ایک ناخوش کاروباری شخص کی حیثیت سے زندہ رہوں گا۔ تب میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لکھنے کے کام کو یکسوئی سے اختیار کروں۔ اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا بھی یقین دلایا۔ یقین جانو اس نے آج تک کبھی مجھ سے پیسے کی کمی کی شکایت نہیں کی۔ کبھی زیور یا جائداد کی خواہش نہیں کی۔ میرے اندر ایک ذمہ دار شوہر اور محبت کرنے والا باپ ضرور زندہ رہا۔ چنانچہ میں نے میڈیا کا رستہ اختیار کیا۔ اگر میں یہ رستہ اختیار نہ کرتا تو معاشی بدحالی کا شکار ہو جاتا۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہتا۔ میری کتابوں نے مجھے مالی خوشحالی نہیں دی بلکہ یہ ٹی۔ وی ہے جہاں سے مجھے قابل ذکر آمدنی ہوتی رہی۔ اس کے نتیجے میں، میں بہتر ادب تخلیق کر پایا۔ یعنی تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میرے اندر کے ادیب کو ٹی۔ وی نے طاقت دی اور فعال کیا۔‘‘

’’کیا کبھی ساتھی ادیبوں کی جانب سے اس حوالے سے تنقید کا سامنا رہا؟‘‘

’’ایک مرتبہ ممتاز مفتی نے مجھے سمجھایا کہ میڈیا میرے اندر کے ادیب کو کھا جائے گا۔ جب میں نے اپنی مجبوری بتائی تو بھی ان کا اصرار جاری رہا کہ میں ٹی۔ وی چھوڑ کر یکسوئی سے ادب تخلیق کروں۔ میں نے ٹی۔ وی نہ چھوڑا۔ اس پر وہ باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ اب وہ کہیں ملتے تو منہ دوسری جانب کر لیتے۔ مفتی جی بڑے دلچسپ اور انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ اکثر ڈرامہ کرتے تھے۔ جھوٹ موٹ میں ناراض ہو جاتے۔ اس مکالمے کے بعد بہت عرصہ ناراضگی کا ڈرامہ کرتے رہے۔ کہیں ملتے تو سلام نہ لیتے۔ پھر ایک روز ان کا خط ملا، انہوں نے میرا ناول ’’بہاؤ‘‘ پڑھا تھا۔ ان کے خط نے مجھے آبدیدہ کر دیا۔‘‘

’’کیا لکھا تھا خط میں؟‘‘

’’انہوں نے لکھا تھا ’میں نے تم سے جھوٹ اور غلط کہا تھا کہ میڈیا تمہاری تخلیقی صلاحیتوں کو کھا جائے گا۔ میں اس غلط بیانی پر تم سے معافی مانگتا ہوں۔‘‘

’’مفتی جی کے بارے میں اور ان کی تقریباً سب ہی تحریریں پڑھی ہیں۔ احمد بشیر بھی ان کا بہت ذکر کیا کرتے تھے۔ کاش میں کبھی ان سے مل پاتا۔‘‘ میں نے حسرت سے اپنی تشنہ خواہش کا اظہار کیا۔

’’یہ مفتی جی جیسے لوگ نئے زمانے کے ٹکسال سے نکلنا بند ہو گئے ہیں۔ اپنی طرز کے واحد آدمی تھے۔ عشق رسول ﷺ ہم دونوں میں دیگر کے سوا ایک اور قدر مشترک تھی۔ میرے اندر اپنے رسول ﷺ سے اتنا عشق بھرا ہوا ہے جو ناقابل اظہار ہے۔ ان کو روحانیت سے بھی لگاؤ تھا جبکہ میں اس جانب کبھی اپنی طبیعت کو زیادہ مائل نہیں کر سکا۔ ایک مرتبہ مجھے کہنے لگے ’یہ تو سیدھا لکھتا تھا۔ اب اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ یہ تو نے کہاں سے سیکھا ہے؟‘ میں نے جواب دیا کہ پہلے اتنی خود اعتمادی نہیں تھی۔ اب کچھ بڑھ گئی ہے۔ اس لیے نئے تجربے کر لیتا ہوں۔ یہ سن کر بولے ’یہ فن تو نے کہیں پروفیسر احمد رفیق اختر سے تو نہیں سیکھا؟‘ میں پروفیسر صاحب کے علم اور بیان کو بہت مانتا ہوں مگر چونکہ میں نے یہ ان سے نہیں سیکھا تھا سو واضح انکار کر دیا۔ اب کیا تھا، وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ ایک روز ہم تینوں ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو مفتی جی پروفیسر صاحب سے کہنے لگے ’یہ آپ کو پیر نہیں مانتا۔‘ پروفیسر صاحب نے یہ سن کر جواب دیا ’اللہ کا شکر ہے۔ جہاں سے عقیدت شروع ہوتی ہے وہیں سے جہالت بھی شروع ہوتی ہے۔‘ ویسے پروفیسر صاحب بہت پیارے آدمی ہیں اور دیگر علوم کے علاوہ علم الاعداد پر ان سے زیادہ مہارت میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔‘‘

☆

تارڑ صاحب سے میری غیر رسمی نوعیت کی دوستانہ ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک روز میں نے ان سے فون پر کہا کہ میں نے ایک بڑا ادیب اور شفیق دوست جان کر ان کے ساتھ سینکڑوں گھنٹے گزارے ہیں لیکن کبھی ان کے تخلیق ادب کی روٹین کے حوالے سے بات نہیں

ہوئی۔ اس پر فون میں ان کی آواز گونجی۔

''آج کچھ فارل نہیں ہو رہے۔ ابھی کیا کر رہے ہو؟''

میں نے جواب دیا کہ فارغ ہوں تو کہنے لگے 'ابھی آ جاؤ' تھوڑی دیر کے لیے۔'

تھوڑی دیر کے بعد میں اور وہ آمنے سامنے، ان کی اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سگریٹ سلگا رکھی تھی اور میں نے گرم چائے کا مگ تھام رکھا تھا۔۔ وہ بول رہے تھے۔

''میرے اندر ابھی بہت creative juice ہے۔ سفرناموں اور ناولوں کے علاوہ سینکڑوں کالم چھپ چکے ہیں۔ تیس چالیس برس تک باقاعدہ ڈائری لکھتا رہا ہوں۔ وہ میں نے ضائع کر دی ہیں۔ خطوط اُن کے علاوہ ہیں۔''

میرے ذہن میں مختلف ادیب تھے۔ ان کے لکھنے کی روٹین تھی۔ ان میں سے اورحان پامک جیسا متنازعہ نوبل انعام یافتہ ادیب بھی تھا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جب کبھی کسی نئے اہم شہر کے سفر پر نکلوں تو اس شہر سے متعلق کسی اہم ادیب کی ادبی تخلیق کو ساتھ میں لے لوں۔ استنبول کے سفر میں پامک کی استنبول اور پیرس کے سفر میں ہیمنگوے کی 'اے مووایبل فیسٹ' لندن پر تو بے شمار کتابیں ہیں اور نیویارک پر نیویارکر جیسے اعلیٰ معیار کے جریدے کا خاص نمبر۔ شمالی علاقہ جات کو تارڑ کی آنکھ سے دیکھا ہے تو لاہور کو چاچا ایف ای چودھری کے منیر احمد کو انٹرویو اور اے۔ حمید کی کتابوں سے۔ کتابیں بہت ہیں اور زندگی کے دن کم۔ اورحان پامک باقاعدہ ارادہ اور پلاننگ کر کے لکھتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے اور گراف پیپر استعمال کرتا ہے۔ بہت سے نئے ادیبوں کے برعکس تخلیقی تحریر کے لیے کمپیوٹر کا استعمال نہیں کرتا۔ ایک تحریر کو تین سے چار مرتبہ لکھتا ہے۔ بکر انعام یافتہ مائکل اونڈاٹجی کا لکھنے کا انداز نرالا ہے۔ وہ لکیردار کاغذ پر لکھتا ہے۔ ابتدائی تین، چار مسودے ہاتھ سے تحریر کرتا ہے۔ پھر قینچی پکڑ کر ان مسودوں کے کئی اقتباس کاٹ کر دوسرے اقتباسات کے ساتھ چسپاں کر دیتا ہے۔ وہ اقتباسات، اور بعض اوقات پورے ابواب کی ترتیب تبدیل کرتا رہتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنا معروف ناول 'انگلش پیشنٹ' دو تصوراتی جھلکیوں کی شکل میں نظر آیا تھا جن کو اس نے لفظی بنت سے جوڑ کر ناول کی شکل دے دی۔ ''ریمینز آف دی ڈے'' جیسے اعلیٰ پائے کے انعام یافتہ ناول کا مصنف کازواُاشی گرو چھے ناول لکھ چکا ہے۔ وہ دو سال ناول پر ریسرچ کرتا ہے اور ایک سال اسے لکھنے میں صرف کرتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے تحریر کرنے والا یہ مصنف باقاعدہ سائنسی انداز میں فلو چارٹ بنا کر ہر کردار اور سچوئیشن کے علیحدہ فولڈر بناتا ہے۔

تارڑ صاحب کو میں نے کئی مرتبہ اپنے سامنے کوئی مسودہ مکمل کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنی اسٹڈی کی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ ایسے میں ایک ٹیبل لیمپ ان کے دائیں ہاتھ ہوتی ہے جو بوقت ضرورت وہ روشن کر لیتے ہیں۔ ان کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور وہ کرسی پر بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے بارے میں میں نے پڑھا تھا کہ وہ بچوں کے شور وغل میں صوفے پر ٹیک لگا کر بھی لکھ لیتی رہی ہیں۔ کچھ لوگ فرشی نشست پر بھی لکھتے ہیں۔ تارڑ صاحب کے ابتدائی مسودے کی تحریر رواں اور شکستہ ہوتی ہے اور اس میں کاٹ چھانٹ کم ہوتی ہے۔ وہ ایک مسودے کو دو سے تین مرتبہ درست کرتے ہیں۔

اس روز میں نے کہا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کہتے تھے کہ ادیب کے لیے تسلسل سے لکھنا بہت ضروری ہے۔ بھلے وہ بعد میں غیر معیاری یا غیر ضروری تحریروں کو ضائع کر دے۔ تارڑ صاحب نے اس بات سے اتفاق کیا اور کہنے لگے۔

''لکھتے رہنا اہم ہے کیونکہ اس سے قلم رواں رہتا ہے۔ جب میرا تخلیقی جذبہ عروج پر تھا تو میں نے ابتدائی کتابیں چیمبرلین روڈ اور گوالمنڈی کے شور وغل میں دکان پر بیٹھ کر لکھیں۔ بعد میں یہی کتابیں میرا ابتدائی تعارف بنیں۔ اگر آپ کی تخلیقی قوت طاقتور ہے تو آپ کہیں بھی بیٹھ کر لکھ سکتے ہیں۔ میں نے شروع کی کتابیں 'التحریر' والوں کو دیں۔ 'سنگ میل پبلشرز' کے نیاز صاحب ان دنوں درسی کتابیں چھاپتے تھے

اور ادبی کتابیں چھاپنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے کشور ناہید کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے ’التحریر‘ والوں سے کتابیں لیکر ان کو دینے سے اخلاقی بنیادوں پر معذوری ظاہر کی لیکن اگلی کتاب کا وعدہ کر لیا۔ یہ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب نے میری اگلی کتاب ’’خانہ بدوش‘‘ کے لیے مجھے پچیس ہزار روپے کی خطیر رقم کی پیشکش کی جو اس زمانے میں کسی بھی کتاب کے لیے دی جانے والی سب سے بڑی رقم تھی۔ یہ اس دور میں میری کتابوں کی مقبولیت کا ایک پیمانہ بھی تھا۔ میرے کوئی معاشی مسائل نہ تھے۔ میں ایک ایسا سیاح تھا جو ہر وقت دنیا کی مسافتوں کے لیے بے چین رہتا تھا۔ قریہ قریہ پھرتا، شہر شہر خاک چھانتا، رُک سیک اٹھائے پھرتا، سلیپنگ بیگ میں سو جاتا، کچھ مل جاتا تو کھا لیتا وگرنہ بھوکا رہ لیتا۔ طرح طرح کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا اور ہر رنگ کے آدم سے ملتا۔ متنوع بولیاں سنتا اور کئی لبوں کو چومتا منزل پر منزل فتح کرتا جاتا۔ واپسی پر یہ سب خزانہ کاغذ پر الٹ دیتا۔ انسان کو ایک مرتبہ زندگی ملتی ہے۔ بند کمروں میں کیوں گزار دے۔ زمین بہت وسیع ہے۔ یہ اس کے لیے میدان دعوت ہے۔ سو کیوں نہ اس کے اسرار کو کھولے۔

جب میں ابتدائی سفروں پر نکلا تو حقیقی کہانیاں اور ان کے زندہ کردار مجھے قدم قدم پر ملے۔ میں نے انہیں صرف تراش خراش کر کاغذ پر لکھ دیا۔ شائد اسی لیے مجھے کبھی writers block کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں بعض اوقات کوئی خاص سچوئشن قابو میں نہیں آتی یا پھر کوئی آئیڈیا ذہن سے نکل گیا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن ماؤف ہو گیا ہو۔ اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور کانوں کو تیز رکھو تو مشاہدے اور تجربے کے بل پر جلد جان جاؤ گے کہ اس دنیا میں ہر طرف بے شمار کہانیاں اور کردار بکھرے پڑے ہیں۔ تمہیں انہیں اس طرح چننا ہے جیسے لندن کے فواروں کے گرد کبوتر دانہ چنتے اور چگتے ہیں۔ ایسے میں سفر اور تجربہ بہت اہم ہے۔ دیگر تہذیبوں سے واسطہ تو تخلیقی صلاحیت کو نئی جہتیں عطا کرتا ہے۔‘‘ تارڑ صاحب کی بات کے حق میں یہ دلیل کافی ہے کہ عبداللہ حسین کی سیاحت اور مغرب میں قیام اور قراۃ العین حیدر کا مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے ذریعے ان کی تہذیب کے جائزے نے ان کے اعلیٰ ادب کو تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعروں میں اقبال، فیض اور راشد کی مثالیں کافی ہیں۔

’’اُردو زبان کا سب سے زیادہ بکنے والا اور مشہور ہونے والا ناول ’پیار کا پہلا شہر‘ جس کے پچپن سے زیادہ ایڈیشن بک چکے ہیں پہلے سے میرے اندر موجود تھا۔ سرور سکھیرا نے مجھ سے ’’دھنک‘‘ کے لیے کوئی تحریر مانگی۔ مجھے یورپ جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا کہ کتنے دن ہیں۔ انہوں نے بارہ روز بتائے۔ میں نے بارہ دنوں میں ’پیار کا پہلا شہر‘ لکھ کر ان کے حوالے کیا اور یورپ نکل گیا۔ واپسی پر اس تحریر کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔‘‘

’’عمر کے ساتھ تخلیقی فعالیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟‘‘ یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں جمیل احمد تھے جن کا ناول ’دی وینڈرنگ فالکن‘ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اپنا یہ پہلا ناول انہوں نے اٹھہتر برس کی عمر میں مکمل کیا۔ اس کے علاوہ جوزے ساراما گو کی بین الاقوامی پذیرائی والی تحریریں اُس نے بہت میچورٹی کی عمر میں لکھیں۔ ان کا جواب تھا۔

’’انسان کسی بھی عمر میں تخلیقی طور پر فعال ہو سکتا ہے۔ میرے وہ ناول جن پر مجھے ادبی وقعت دی گئی ’راکھ‘ جسے وزیر اعظم ادبی ایوارڈ ملا اور ’’بہاؤ‘‘ جسے اعلیٰ ادبی شہہ پارہ مانا گیا، میں نے پچاس برس کی عمر کے بعد لکھے۔ دیگر ناول تو اس کے بھی بعد لکھے۔ ہاں وہ سفرنامے جن سے مجھے شہرت ملی، میں نے اپنے ابتدائی زمانے میں لکھے۔ اس لیے اعلیٰ ادبی تخلیق کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔‘‘

مجھے ذاتی طور پر ان کا ناول ’’ڈاکیا اور جولاہا‘‘ بھی بہت پسند ہے۔ میرے لیے یہ بات آج بھی معمہ ہے کہ اسے وہ پذیرائی نہیں ملی جس کا یہ مستحق تھا۔

’’کسی بھی ادیب کی شہرت اور پہچان عموماً اس کی ایک ناول بنتا ہے۔ قراۃ العین کی پہچان ’’آگ کا دریا‘‘ عبداللہ حسین کا تعارف ’’اُداس نسلیں‘‘ بانو قدسیہ کو شہرت ’’راجہ گدھ‘‘ سے ملی۔ میرا تعارف تو پھر دو ناول ہیں ’راکھ‘ اور ’بہاؤ‘۔ اب میں تمہیں ایک

اور ادبی کتابیں چھاپنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے کشور ناہید کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے ’التحریر‘ والوں سے کتابیں لیکر ان کو دینے سے اخلاقی بنیادوں پر معذوری ظاہر کی لیکن اگلی کتاب کا وعدہ کرلیا۔ یہ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب نے میری اگلی کتاب ’’خانہ بدوش‘‘ کے لیے مجھے پچیس ہزار روپے کی خطیر رقم کی پیشکش کی جو اس زمانے میں کسی بھی کتاب کے لیے دی جانے والی سب سے بڑی رقم تھی۔ یہ اس دور میں میری کتابوں کی مقبولیت کا ایک پیمانہ بھی تھا۔ میرے کوئی معاشی مسائل نہ تھے۔ میں ایک ایسا سیاح تھا جو ہر وقت دنیا کی مسافتوں کے لیے بے چین رہتا تھا۔ قریہ قریہ پھرتا، شہر شہر خاک چھانتا، رُک سیک اٹھائے پھرتا، سلیپنگ بیگ میں سو جاتا، کچھ مل جاتا تو کھالیتا وگرنہ بھوکا رہ لیتا۔ طرح طرح کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا اور ہر رنگ کے آدم سے ملتا۔ متنوع بولیاں سنتا اور کئی لبوں کو چومتا منزل پر منزل فتح کرتا جاتا۔ واپسی پر یہ سب خزانہ کاغذ پر الٹ دیتا۔ انسان کو ایک مرتبہ زندگی ملتی ہے۔ بند کمروں میں کیوں گزار دے۔ زمین بہت وسیع ہے۔ یہ اس کے لیے میدان دعوت ہے۔ سو کیوں نہ اس کے اسرار کو کھولے۔

جب میں ابتدائی سفروں پر نکلا تو حقیقی کہانیاں اور ان کے زندہ کردار مجھے قدم قدم پر ملے۔ میں نے انہیں صرف تراش خراش کر کاغذ پر لکھ دیا۔ شائد اسی لیے مجھے کبھی writers block کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں بعض اوقات کوئی خاص سچوئشن قابو میں نہیں آتی یا پھر کوئی آئیڈیا ذہن سے نکل گیا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن ماؤف ہوگیا ہو۔ اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور کانوں کو تیز رکھو تو مشاہدے اور تجربے کے بل پر جلد جان جاؤ گے کہ اس دنیا میں ہر طرف بے شمار کہانیاں اور کردار بکھرے پڑے ہیں۔ تمہیں انہیں اس طرح چننا ہے جیسے لندن کے فواروں کے گرد کبوتر دانہ چنتے اور چگتے ہیں۔ ایسے میں سفر اور تجربہ بہت اہم ہے۔ دیگر تہذیبوں سے واسطہ تو تخلیقی صلاحیت کو نئی جہتیں عطا کرتا ہے۔‘‘ تارڑ صاحب کی بات کے حق میں یہ دلیل کافی ہے کہ عبداللہ حسین کی سیاحت اور مغرب میں قیام اور قراۃ العین حیدر کا مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے ذریعے ان کی تہذیب کے جائزے نے ان کے اعلیٰ ادب کو تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعروں میں اقبال، فیض اور راشد کی مثالیں کافی ہیں۔

’’اُردو زبان کا سب سے زیادہ بکنے والا اور مشہور ہونے والا ناول ’پیار کا پہلا شہر‘ جس کے پچپن سے زیادہ ایڈیشن بک چکے ہیں پہلے سے میرے اندر موجود تھا۔ سرور سکھیرا نے مجھ سے ’’دھنک‘‘ کے لیے کوئی تحریر مانگی۔ مجھے یورپ جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا کہ کتنے دن ہیں۔ انہوں نے بارہ روز بتائے۔ میں نے بارہ دنوں میں ’پیار کا پہلا شہر‘ لکھ کر ان کے حوالے کیا اور یورپ نکل گیا۔ واپسی پر اس تحریر کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔‘‘

’’عمر کے ساتھ تخلیقی فعالیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟‘‘ یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں جمیل احمد تھے جن کا ناول ’دی وینڈرنگ فالکن‘ بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ اپنا یہ پہلا ناول انہوں نے اٹھہتر برس کی عمر میں مکمل کیا۔ اس کے علاوہ جوزے سارا ماگو کی بین الاقوامی پذیرائی والی تحریریں اُس نے بہت میچورٹی کی عمر میں لکھیں۔ ان کا جواب تھا۔

’’انسان کسی بھی عمر میں تخلیقی طور پر فعال ہوسکتا ہے۔ میرے وہ ناول جن پر مجھے ادبی وقعت دی گئی ’راکھ‘ جسے وزیراعظم ادبی ایوارڈ ملا اور ’’بہاؤ‘‘ جسے اعلیٰ ادبی شہہ پارہ مانا گیا، میں نے پچاس برس کی عمر کے بعد لکھے۔ دیگر ناول تو اس کے بھی بعد لکھے۔ ہاں وہ سفرنامے جن سے مجھے شہرت ملی، میں نے اپنے ابتدائی زمانے میں لکھے۔ اس لیے اعلیٰ ادبی تخلیق کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔‘‘

مجھے ذاتی طور پر ان کا ناول ’’ڈاکیا اور جولاہا‘‘ بھی بہت پسند ہے۔ میرے لیے یہ بات آج بھی معمہ ہے کہ اسے وہ پذیرائی نہیں ملی جس کا یہ مستحق تھا۔

’’کسی بھی ادیب کی شہرت اور پہچان عموماً اس کی ایک ناول بنتا ہے۔ قراۃ العین کی پہچان ’’آگ کا دریا‘‘ عبداللہ حسین کا تعارف ’’اُداس نسلیں‘‘ بانو قدسیہ کو شہرت ’’راجہ گدھ‘‘ سے ملی۔ میرا تعارف تو پھر دو ناول ہیں ’راکھ‘ اور ’بہاؤ‘۔ اب میں تمہیں ایک

دلچسپ بات بتاؤں کہ جب مجھے ''راکھ'' پر ایوارڈ ملا تو اس فیصلہ کرنے والی جیوری میں شوکت صدیقی بھی تھے۔ ایوارڈ کے بعد میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ انہوں نے تو راکھ کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ لیکن چونکہ ایوارڈ ناول کو ملنا تھا اس لیے ''راکھ'' کو ملا۔ میں نے ازراہ تجسس پوچھا کہ انہوں نے کس کتاب کو ووٹ دیا تھا تو وہ بولے ''پاک سرائے''۔ یہ بھی میری ہی کتاب تھی۔ چنانچہ مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔''

جب میں نے ان کے کرداروں کی ساخت اور چناؤ کے حوالے سے استفسار کیا تو ان کا جواب تھا

''میرے بیشتر کردار حقیقی زندگی سے اٹھائے گئے ہیں۔ بڑے ناولوں کے وہ کردار زیادہ طاقتور ہوتے ہیں جو حقیقی زندگی سے اٹھائے گئے ہوتے ہیں۔ ''خس و خاشاک زمانے'' میں ایک کردار امیر بخش کا ہے۔ یہ کردار میرے والد کا ہے۔ وہ بہت آزاد خیال شخص تھے۔ ان کے فلسفۂ زندگی کا ایک اہم ستون یہ نکتہ تھا کہ اس دنیا میں زور آور ہی سب کچھ ہے۔ اس کے سامنے مذہب، قبیلے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔''

تارڑ صاحب کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اپنے والد کو یاد کر کے وہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ میں نے عام زندگی میں قریبی رشتوں کے حوالے سے ان کو بہت رقیق القلب پایا۔ ایک مرتبہ بتانے لگے کہ جب سے ان کے بھائی کی وفات ہوئی ہے وہ کوئی پرانا غمگین نغمہ نہیں سن سکتے۔ ان کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ وہ ایک مکمل خاندانی آدمی ہیں۔ ایسا سیلانی طبع آدمی اپنے بیٹے سلجوق کو سال ہا سال اسکوٹر پر خود سکول چھوڑنے جاتا رہا، بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور قابلِ ذکر معاشرتی مقام دلایا، بیٹی کو اعلیٰ ترین میڈیکل کالج سے ڈاکٹر بنایا اور اس کے ذکر پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کہ وہ امریکہ میں ہے۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ توازن نے ان کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے وہ بیک وقت تخلیقی اور خاندانی امور میں متاثر کن حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

''سفرنامہ جہاں آپ کی ایک طاقتور پہچان ہے وہیں کمزوری کا باعث بھی ہے کہ آپ کے ناولوں میں بھی در آتا ہے۔''

میرے اس اعتراض پر انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرے ناولوں کے لوکیل اور کردار متنوع رہیں۔ یہ کثیر الجہتی ہیں۔ یہ میرے وسعت مشاہدہ کی دلالت کرتے ہیں۔ ان میں اور سفرنامے میں بہت فرق ہے۔ یہ قطعی طور پر مختلف چیزیں ہیں۔''

ان کی اس بات سے مجھے اپنے پسندیدہ شاعر پابلو نرودا کی وہ بات یاد آ گئی جس میں اس نے کہا تھا کہ کسی ملک کی صحیح نمائندگی کرنے کا حق ایسے ادیب کو ہی ہو سکتا ہے جو اپنے ملک کے موسموں اور درختوں کو اس طرح جانتا ہو جیسے اپنے ہاتھ کی پشت کو۔

جب میں نے ان کی لکھنے کی روٹین کے بارے میں سوال کیا تو وہ بولے

''کالم اور ہلکی پھلکی تحریریں دن میں لکھتا ہوں۔ سنجیدہ ادب جیسے ناول رات کو آٹھ بجے سے بارہ بجے تک لکھتا ہوں۔ میں ناول پر دن میں کام نہیں کر سکتا۔''

میں نے بات کاٹی

''کیا کبھی ایسا ہو کہ آپ ایک سین یا کردار کو لکھ رہے ہیں اور صبح ہو گئی ہو؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا

''نہیں۔ میرے لیے جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند ہونا بہت ضروری ہے۔ میری صبح کو واک کی روٹین ہے۔ اور میں اس کو تبدیل نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں لکھتے لکھتے کبھی ایک ماحول اور کردار کو اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتا ہوں کہ اس کے ٹرانس میں چلا جاتا ہوں۔ اب یہ ٹرانس طویل بھی ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ ٹرانس نہیں ٹوٹتا تب تک میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولے

”تم نے مشاہدے کے حوالے سے بات کی تھی۔ اب تو میڈیا اس طرح اپنے ناظر کو گھروں کے اندر تک لے جاتا ہے کہ آپ کو وہیں سے مشاہدے کے لیے بہت کچھ دستیاب ہو جاتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ زندگی کے متفرق رنگوں کو دیکھنے کے لیے آپ کو ہر اس مقام سے ہو آنا چاہیے جسے چاہے معاشرہ ناپسندیدہ جانے۔“

”یعنی دیوار کی دوسری جانب کود جانا چاہیے۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں۔“ انہوں نے قطعیت سے کہا۔

”آپ نے کبھی نوٹس لیے؟“ میرا اگلا سوال تھا۔

”نکات نوٹ کر لیتا ہوں مگر باقاعدہ نوٹس نہیں لیتا۔ بس لمحۂ موجود میں رہنے کی دانستہ کوشش کرتا ہوں۔ اس سے مشاہدے میں گہرائی بھی آ جاتی ہے اور جزئیات یادداشت کی دیوار پر نقش بھی ہو جاتی ہیں۔“

تارڑ صاحب نے بات ختم کی۔

”میں ایک عام دیسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ گھرانہ خاص مذہبی نہ تھا۔ شائد اس لیے مذہب کی جانب خصوصی رغبت پیدا نہ ہوئی۔ یہ صرف رب کا کرم ہے کہ مجھ ناچیز سے اُردو ادب کے لیے چند چیزیں لکھوالیں۔ میں نے دوحہ، قطر میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کی تقریب میں رب کی خاص مہربانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا 'وگرنہ میری اوقات تو یہ تھی کہ میری بیوی نے شادی کے پندرہ بیس روز بعد ہی اپنے میکے میں جا کر کہہ دیا تھا کہ اس شخص کی عزت کرنے کی خاص ضرورت نہیں کیونکہ یہ کوئی قابل ذکر بندہ نہیں۔'“

☆

زوال پذیر تہذیبوں کی زبوں حال زبانوں کے قدآور ادیب بھی بالآ خاک میں مل کر خاک ہوتے ہیں۔ ڈسٹ اِن ٹو ڈسٹ اینڈ ایشز اِن ٹو ایشز۔ جو چند خوش گمان احباب کہتے ہیں کہ وقت آنے پر بڑے ادیب کا تعین خود بخود ہو جاتا ہے. جی کے خوش کرنے کو اچھا سامان کرتے ہیں۔ اپنے وقتوں کی عظیم زبانیں رومن اور سنسکرت اپنے بڑے دماغوں کے ساتھ پیوند خاک ہوئیں۔ ایک چھوٹے سے جزیرۂ انگلشیہ کے دکانداروں کی اکھڑ زبان انگریزی معتبر ٹھہری اور اس کا ایک اوسط دماغ بھی عظیم ٹھہرایا گیا۔ استثنٰی فقط ان تخلیقات کو حاصل ہے جو زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر محفوظ ہوئیں۔

اُردو کی سی رواں، وسیع جُثہ اور ریشمی زبان کی بدقسمتی کہ اس کو ایک ایسی زوال آمادہ تہذیب نصیب ہوئی جو اب تک نہ تو تہذیب کے تمام عناصر ترکیبی پر پورا اُتر پائی ہے اس لیے شائد اب تک ایک مکمل تہذیب بن ہی نہیں پائی اور نہ ہی مستقبل قریب میں مواصلات کے ذرائع میں ترقی کے بموجب دیگر زبانوں کی غیر معمولی ترویج کے باعث اس کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

اس زبان کا بھرپور ادبی ذخیرہ چند نسلوں کی ذہنی آبیاری کر کے مستقبل کے لیے فقط چند محققین کے شوقِ تحقیق کا سامان رکھتا ہے۔ اپنے عروج کے زمانے میں بھی اس کے ادیب کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا جو عبرتناک ہے۔ اس کا عدو خود اس کے اندر ہے۔ یہ ایک ایسا کنواں ہے کہ جو اس سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے دوسرا ادیب اس کی ٹانگ کھینچ کر اسے اندر گھسیٹ لیتا ہے۔ زوال آمادہ، خودشکن، بدبودار، متعفن معاشرت میں یہ چلن عام ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب منٹو مرا تو ایک بیان نے اخبارات کی سرخیوں میں جگہ پائی ”ایک فحش نگار مر گیا تو اس میں دکھ کس بات کا۔“

یہ معاشرہ اس نقال کی طرح لاچار ہے جو اپنے سے برتر تہذیب کی ناکام نقالی کر کے خود تضحیکی کا سامان کرتا ہے۔

ایک روز تارڑ صاحب حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہنے لگے

”یار یہ جب سے میں نے ڈان اخبار میں انگریزی میں کالم لکھنا شروع کیا ہے مجھے کئی لوگ ملے ہیں جو کہتے ہیں 'تارڑ صاحب آپ تو پڑھے لکھے آدمی نکلے۔“

جب تارڑ صاحب نے نیم خندہ لہجے میں یہ بات کی تو میری نظروں کے سامنے سے ان کے کئی درجن اُردو نثری شہہ پارے گزر گئے۔ وہ تو یہ بات ہنستے ہوئے کہہ گئے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں دبا کر مسل ڈالا ہو۔ ہم احساس کمتری کے مارے وہ لوگ ہیں جو شکستہ اُردو بولنے میں عزت سمجھتے ہیں اور غلط انگریزی بولنے والے کو ناقابل معافی جانتے ہیں۔ ہم عجیب لوگ ہیں۔

موت کے درمیان میں مبتلا اور مسحور تارڑ صاحب ایسے کاہن ہیں جو بے جان الفاظ کو چھو کر زندگی دیتے ہیں۔ ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کو جاننے کے لیے یہی بہت ہے کہ اُردو کا سب سے زیادہ معروف ہونے اور بکنے والا ہلکا پھلکا رومانوی ناول ”پیار کا پہلا شہر“ انہوں نے فقط بارہ دن میں لکھا تھا۔ سنجیدہ ادب میں تارڑ صاحب کے خزانے میں بین الاقوامی معیار کی بے شمار اعلیٰ ادبی تحریریں ان کے قد آور اور ہمہ جہت ہونے کی دلالت کرتی ہیں۔

میں تارڑ صاحب سے فقط اتنا کہنا چاہتا ہوں

'تارڑ صاحب! آپ تو پھر خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنی زندگی میں اتنی شہرت اور تھوڑی معاشی آسودگی مل گئی ورنہ یہاں تو حبیب جالب اور کئی ادیب عسرت کے ہاتھوں مر گئے۔ ساغر صدیقی فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑتا مر گیا اور جوش جس کو لینے نہرو ننگے پیر بھاگا چلا آتا تھا، ایک فلیٹ میں کسمپرسی میں مر گیا۔ آپ تو پھر خوش قسمت ہیں۔

تارڑ صاحب! مگر آپ اتنے بھی خوش قسمت نہیں۔ آپ کو تحریر نے فقط شہرت دی، معاشی خُوش حالی نہیں۔ بہت سے لوگوں کو آپ کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرتے سنا۔ آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی ان بوزنوں کا ذکر آپ سے اس لیے نہیں کیا کہ آپ کا دل نہ دُکھے۔ آپ بہت حساس انسان ہیں۔ آپ کے منہ سے میں نے بیش تر لوگوں کا ذکر محبت اور عزت سے سنا۔ لیکن ان لوگوں کا کیا کروں جو آپ کے تخلیقی مقام کے اعتراف میں بُخل سے کام لیتے ہیں۔ جب میں ان سے استفسار کرتا ہوں کہ اگر تارڑ پاکستان کا سب سے ہمہ جہت اور وسیع ترین حلقہء اثر والا بڑا ناول نگار اور سفر نامہ نگار نہیں ہے تو پھر کون ہے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

تارڑ صاحب! میری ہم دردی آپ کے ساتھ ہے۔ آپ سے کہیں کم معیار کے لکھنے والے لاطینی امریکی، مشرقی یورپی ادیب ان ملکوں میں سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں اور اپنی زندگی ہی میں ان ممالک کا تہذیبی چہرہ قرار پاتے ہیں۔“

ہم وہ لوگ ہیں جو کڑاہیوں اور کبابوں پر ہزار ہا روپیہ لٹا دیتے ہیں لیکن کتابوں پر چند روپے خرچ نہیں کرتے بلکہ بسوں، اسٹیشنوں اور حجاموں کی دکانوں میں دو چار روپے کے اخبار کے حصے بخرے ایک دوسرے سے چھینتے نظر آتے ہیں۔ ہم لچر اسٹیج ڈراموں سے محظوظ ہوتے ہیں اور بے ہودہ جگتوں پر بدبودار قہقہے لگاتے ہیں۔ وہ تہذیبی شائستگی جو ہماری پہچان تھی دو چار نسل پہلے ہی ختم شد ہوئی۔ جو باقی تھی وہ ٹیلی ویژن کے مختلف مباحثوں میں چاک ہوئی۔ ہمارے اندر کوئی ایک ایسی Sadistic Instinct ہے جو ہمیں کسی دوسرے کی عوامی توہین پر محظوظ ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے دور میں تارڑ جیسا شائستہ شخص اور قد آور ادیب اپنی نسل کے آخری لوگوں میں سے ہے۔

ہم جو تابناک مغلیہ اسلامی تہذیب اور رنگین ہندوستانی اساطیری روایات کے امین تھے، خود تخریبی کے اس مقام افسوس پر کھڑے

ہیں جہاں اعلیٰ تہذیبی و تخلیقی دانش کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہم لڑنے والوں کے ناموں سے چوکوں اور سڑکوں کو موسوم کرتے ہیں اور کسی ادیب کو مقام عزت و مرتبت پر فائز کرنے کے لیے اس کی موت کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ فرانس نہیں جہاں سارتر کے مرنے پر پیرس کی تاریخ کا دوسرا بڑا جنازہ اٹھایا جاتا ہے اور فرانس ماتم میں ڈوب جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ مشاہدے اور تجربے کے ان گھنے جنگلوں سے گزرا ہے کہ اس کے بالوں میں تخلیق کے جگنو دمکتے ہیں، ایسے جگنو جو شائد الفا کے پرستانوں کی پریاں ہیں۔

اگر کبھی کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجھے دوبارہ زندگی گزارنے کا موقع ملے تو میں کیسی زندگی کی خواہش کروں تو میں بلاتردد کہہ دوں گا

"تارڑ جیسی۔"

باگھ

عبداللہ حسین

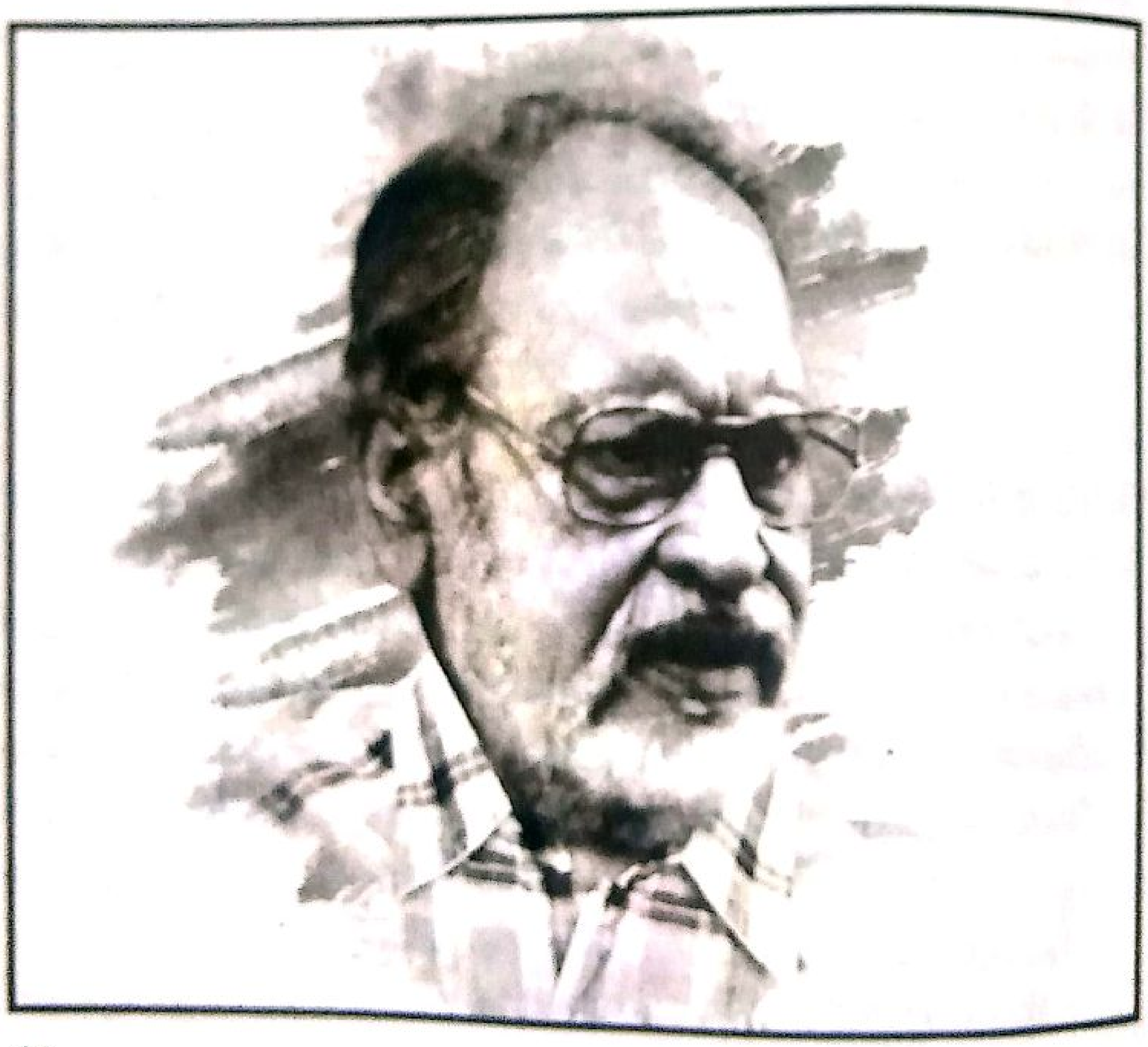

اپنے یورپین طرز کے نفیس فرنیچر سے آراستہ کمرے میں بیٹھے لمبے چوڑے گورے چٹے عبداللہ حسین ٹی وی پر نشر ہونے والا براہِ راست میچ انہماک سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے ”ادیب کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں بھرپور دل چسپی رکھتا ہو۔ یہ اُس کی تحریر میں تجربہ، طاقت اور تازگی لے کر آتے ہیں۔ گوشہ نشینی اسے فراریت اور ذہنی انجماد کی جانب لے جاتی ہے۔“

”کس طرح کے معاملات میں دل چسپی؟“ میں نے پوچھا۔

”کھیل، سیاست، ادب، فلم، ذائقے دار پکوان، محبتیں اور معاشی معاملات، سبھی۔“

اِن ملاقاتوں سے پہلے اُن کے بارے میں سن رکھا تھا کہ گوشہ نشین ادیب ہیں۔ بیسویں صدی کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے آخری عمر میں دعوتوں میں جانا قریباً ترک کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ رسل سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اُس نے کہا ”تقاریب کا مصنوعی ماحول اور رسمی دعوتیں وقت کا ضیاع ہیں۔ اونچی سوسائٹی کے لوگ اُوپری گفت گو کرتے ہیں جو بنیادی فہم سے خالی ہوتی ہیں چناں چہ وقت ضائع ہونے کے ساتھ اشرافیہ کی سطحی گفت گو سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔“

کچھ ایسا ہی معاملہ داغستان کے نابغۂ روزگار شاعر رسول حمزہ توف کے ساتھ درپیش رہا۔ انھوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب ”میرا داغستان“ میں اپنے بین الاقوامی مرتبے کے پیشِ نظر دی جانے والی اعلیٰ ملکی اور غیر ملکی ادبی و سفارتی دعوتوں سے لوٹ کر اپنے سادہ، محنت کش، نیم شہری قصباتی لوگوں میں واپسی روح کو سرشار کرنے والے تازہ اور خالص انسانی ماحول میں واپس آنے سے مماثل قرار دی۔

گو عبداللہ حسین نے کھل کر تو کوئی ایسی بات نہ کہی لیکن اُن کے مزاج نے کچھ ایسے ہی معاملات کی خبر دی کہ وہ بھی شاید بے معنی گفت گو پر تنہائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ قریباً چالیس برس برطانیہ میں گزار کر وطن واپس آنے والے، اُردو کے اہم ناول و افسانہ نگار نے ایک گفت گو میں مجھ سے کہا ”جب میں ایسے خوب صورت لوگوں میں ہوتا ہوں جو میری طرف متوجہ ہوں تو میں محفل میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے خود سے بھی باتیں گھڑ لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی مخصوص دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے اور گویا مجھے نصیحت کرنے لگے ”اگر آپ کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں تو جہاں اُس کی شخصی و فنی خوبیوں کا تذکرہ کریں، وہیں شخصی و تخلیقی کم زوریوں پر بھی لکھیں۔ اِس سے آپ کی تحریر میں غیر جانب داری اور توازن پیدا ہوگا۔ مجھ پر لکھیں تو میری خامیوں کا بھی ضرور تذکرہ کریں۔ اس سے مجھے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ مجھے جو کام یابی یا ناکامی ملنا تھی، زندگی ہی میں مل گئی۔ البتہ یہ بات آپ کی تحریر کو تیکھا کر کے نکھارنے کا باعث بنے گی۔“

بعد ازاں انھوں نے اپنی شخصی کم زوریوں پر سیر حاصل گفت گو کی۔

وقت کے فریم دھندلا جاتے ہیں اور بائس کوپ میں ایک منظر اُبھر آتا ہے۔

کراچی میں سمندر کنارے انگریزی راج کے انداز کا بیچ لگژری ہوٹل رات کے اندھیرے میں یوں دمک رہا تھا جیسے کسی شہزادی کی سیاہ زلفوں پر ہیرے کا تاج۔ اس کے پہلو سے گزرتی آبنائے عرب پر واقع بندرگاہ کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور ملحقہ باغ میں ایستادہ قناتوں میں عروس البلاد کی اشرافیہ ہاتھوں میں مشروبات لیے گپ شپ میں مصروف تھی۔ زیادہ تر مرد عمدہ و نفیس سوٹوں اور خواتین دیدہ زیب ساڑھیوں میں تھیں۔ شہر بھر کے اہم سفارت کار مختلف گوشوں میں کھڑے سیاست و ثقافت پر بات چیت کر رہے تھے۔ یہ تقریب برطانوی سفارت خانے کی معاونت سے دنیا بھر سے آئے اہم ادیبوں کے اعزاز میں سجائی گئی تھی۔ اس تمام رونق سے علیحدہ ایک طویل القامت دانش ور خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا۔ میزبان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُن صاحب کی جانب اشارہ کر کے کہا ”وہ رہے عبداللہ حسین صاحب۔ آپ کے ساتھ ہونے والی نشست کے مہمانِ خصوصی۔“

اُس ادبی میلے میں عبداللہ حسین کے ساتھ ایک پروگرام کی نظامت مجھے کرنا تھی۔ کتابوں کے حوالے سے انھیں خوب جانتا تھا مگر شخصیت کے بارے میں بہت کم۔ سو اُس شب عبداللہ حسین ناول و افسانہ نگار کے قد آور ادبی پورٹریٹ کے پیچھے بیٹھے اصلی اور خالص انسان،

باگھ

گجرات میں پیدا ہونے والے آدمی سے ملاقات یادگار رہی۔ صرف وہی ملاقات نہیں، بعد میں کئی ادبی میلوں، کانفرنسوں، ان کے بنگلے، ہوٹلوں، سمندر میں بہتی کشتی اور میرے گھر پر بھی ملاقاتیں رہیں۔

اُس میلے کی اگلی صبح، اُن کے ساتھ نشست سے قبل اُن سے ملنے ہوٹل پہنچا تو سویر کا ہوش مند ماحول رات کے خواب ناک شبستان کی جگہ لے چکا تھا۔ راتیں رومان اور قدرے سرمئی، قدرے سیاہ دھند لکے سے عبارت ہوتی ہیں۔ دن کھرے، ٹکسال میں ڈھلے چاندی کے چھنچھناتے سکوں کی طرح حقیقی ہوتے ہیں۔ رات کے قدرتی خمار میں دل پذیر سانولی قرن ہا قرن کے بوسیدہ سورج کی مضمحل روشنی میں بے کشش پھیکی ناری نظر آتی ہے۔ کمال نظر کا نہیں، مقام اور وقت کا ہے۔ رات کے پُرتکلف اسکالر کی جگہ اُدھڑتے جاگرز اور ورزشی پاجامہ پہنے ایک بے تکلف، نکھرا، نتھرا آدمی بیٹھا تھا۔ میں نے اُس نکھرے آدمی کو تجویز دی کہ بیٹھک سے پہلے لباس تبدیل کر لیا جائے تو اُس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے میری گزارش رد کر دی اور بولا ''کیا فرق پڑتا ہے، کپڑے نہیں، اُن کے اندر کا آدمی اہم ہوتا ہے۔''

محفل میں اُس آدمی کی بے لاگ، سادہ اور علمیت میں رچی بسی گفت گو لوگوں کی عمومی مصنوعی گفت گو سے علیحدہ خالص اور چوکھی لگی۔ جو معلوم نہ تھا، اعتراف کیا اور جو نقطۂ نظر تھا، اُسے بے لاگ بیان کر دیا۔

ایک مرتبہ ایک تقریب میں اُن سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی اونچی، چھ فٹ چار انچ کی جسمانی قامت کے کیوں کر ہیں تو پلٹ کر انھوں نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنے والدین کا خوب سوچ سمجھ کر انتخاب کیا تھا۔ دونوں خاصے لمبے تھے۔''

آدم جی ایوارڈ، حاصل کرنے والے ناول ''اداس نسلیں'' کے مصنف، ''باگھ''، ''نادار لوگ''، ''رات''، ''قید'' جیسے شاہ کار ناول اور ''نشیب'' اور ''فریب'' جیسے یادگار افسانوی مجموعے تخلیق کرنے والے عبداللہ حسین، محمد خان کے نام سے پختون بنوں سے ہجرت کر کے پنجابی گجرات میں آباد ہونے والے ایک زمیں دار اور سرکاری ملازم کی پانچویں اور آخری بیوی سے پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت اُن کے والد جو اُن کے بہ قول 'میرے دادا بھی ہو سکتے تھے' باون برس کے تھے۔ اُن سے بڑی تین بہنیں تھیں اور وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ وہ چھ ماہ کے تھے کہ والدہ فوت ہو گئیں۔ سب سے چھوٹا، اکلوتا بے ماں کا بیٹا باپ کے لیے بے حد عزیز ٹھیرا۔ والد ننھے محمد خان کے لیے تشویش آمیز تحفظانہ رویہ رکھتے تھے۔ ابتدائی چار جماعتیں گھر ہی میں پڑھائی گئیں۔ بعد ازاں اسکول جانا شروع کیا تو ایک ملازم ساتھ اسکول لے جایا کرتا اور ساتھ واپس لاتا۔ بچپن کے ابتدائی نقوش میں اپنے ہم عمروں سے دوری کے ورثے میں والد سے دوستی کی یاد نے رنگ بھرے۔ والد اُسے اپنے ہم راہ شکار اور زمینوں پر لے جایا کرتے تھے۔ دونوں کھیتوں میں سیر کرتے۔ اسکول میں داخلے کے بعد ایک ہندو لڑکا بل دیو کرشن اُس کا گہرا دوست بنا۔ بل دیو کی بہن پشپا محمد خان کی کلائی پر راکھی باندھا کرتی۔ گویا ان میں بہن بھائی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ''میں مسلمان ہونے کی وجہ سے اُن کے باورچی خانے میں نہ جا سکتا تھا۔'' عبداللہ حسین یاد کر رہے تھے۔ ''میرے ہم جولیوں کی مائیں تھیں، میں اپنی ماں کی کمی بہت محسوس کرتا تھا۔ اسی لیے میں بہت شرمیلا بچہ بن گیا، خود مگن!''

''چھ ماہ کا تھا تو میری ماں کا ایک آپریشن ہوا جو کام یاب نہ ہو سکا، وہ وفات پا گئیں۔ بڑی بہن، جو اُس وقت سترہ برس کی تھیں، نے مجھے پالا۔ ہم سادہ لوگ تھے، درمیانے درجے کے زمیں دار۔ خاندان میں زیادہ تر لوگ سرکاری ملازمت میں تھے۔ چند ایک کی زمینیں تھیں، وہ بھی اوسطاً پچیس تیس ایکڑ تک۔ والد ایکسائز انسپکٹر تھے۔ میں بیس برس کا تھا تو وہ بھی 72 برس کی عمر میں وفات پا گئے۔''

والد کی وفات نے نوجوان محمد خان کو اِس حد تک متاثر کیا کہ اُس پر نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا اور اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ داخلی تنہائی اور دُکھ زندگی بھر کے اس کے ساتھی رہے۔

عبداللہ حسین ایک نادیدہ خول میں بند رہتے تھے۔ جذباتی سطح پر کوئی ان سے زیادہ قریب مشکل ہی سے ہو پاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ بچپن میں اُن کا اپنی ذات میں سمٹ جانا تھا۔

اپنے ایامِ طالب علمی کا تذکرہ یوں لاتعلقی سے کرتے تھے جیسے وہ دور کسی اور پر گزرا ہو۔ ”میں ایک عام طالب علم تھا۔ سترہ برس کی عمر تک میری قد وقامت بھی دیگر طلبہ جیسی تھی۔ یک دم یہ بڑھنا شروع ہوئی اور انیس برس کی عمر تک میں اپنے موجودہ قد کو پہنچ گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ میرا قد بڑھتا دیکھ سکتے تھے۔“

ایک دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ حسین نے ادب میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی بلکہ اس سے بہت مختلف شعبہ چنا۔

”میں نے گجرات میں زمیں دار کالج سے گریجویشن کے بعد سیمنٹ کے کارخانے میں بہ طور کیمسٹ ملازمت اختیار کی۔ تین سال ملازمت کے بعد ایک اور سیمنٹ فیکٹری میں نو برس نوکری کی۔ اسی دوران کولمبو پلان کے تحت کینیڈا جانے کا موقع ملا جہاں سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے چار مختلف شہروں کی سیمنٹ فیکٹریوں میں مختصر تجرباتی کام کر کے پاکستان واپسی ہوئی۔“

”اس سارے دور میں ادب کہاں تھا؟“

یہ سن کر وہ مسکرا کر بولے۔ ”مجھے ادب وراثت میں نہ ملا، بلکہ یہ وقت گزاری کا ایک مشغلہ تھا۔ میری ماں کے رشتے داروں میں رفیع پیر ایک مشہور اور کام یاب فلم اور ڈراما نگار اور میرے حقیقی کزن تھے۔ اُن کی اور میری والدہ سوتیلی بہنیں تھیں۔ اب اُن کے بیٹے رفیع پیر تھیٹر بہت کام یابی سے چلا رہے ہیں۔“

”آپ نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ آپ نے بوریت سے تنگ آ کر لکھنا شروع کیا۔ جب تک انسان میں بنیادی جوہر نہ ہو وہ، ایک اچھا خط نہیں لکھ سکتا، اہم ناول تو بڑی بات ہے۔“ میں نے رائے کا اظہار کیا تو سنجیدگی سے کہنے لگے۔ ”ایسا ہی ہوگا۔ البتہ شعوری طور پر نہ تو میں اُردو ادب کے اساتذہ میں بیٹھا اور نہ ہی مجھے یہ جینیاتی وراثت میں ملا۔ میں داؤد خیل کی سیمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ اجاڑ بیابان علاقہ تھا، وہاں آٹھ گھنٹے کام کرنے، آٹھ گھنٹے سونے کے بعد بھی آٹھ گھنٹے بچ رہتے تھے۔ اُس دور میں ٹی وی میڈیا یا کوئی اور دل چسپی کا سامان نہ تھا۔ سو میں نے وقت گزاری کے لیے لکھنا شروع کیا۔ جب ابتدائی چند صفحات لکھ ڈالے تو کہانی بننا شروع ہوگئی اور اُس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اردو کی ادبی زبان میں میری تربیت نہ ہوئی تھی۔ اپنی اس کمی کا ازالہ کرنے کے لیے میں چھوٹے چھوٹے جملے لکھتا تھا، واقعات اور ماحول کے شیش محل کو ان چھوٹی چھوٹی کانچ کی ٹکڑیوں سے تعمیر کرتا تھا۔ ایک وقت تو ایسا آیا، میں ناول میں اِس حد تک ڈوب گیا کہ اِس کے ایک کردار سے ملنے گجرات کے ایک دور افتادہ قصبے میں گیا۔ اُس کا نام صوبے دار خداداد خان تھا۔ اُسے پہلی جنگِ عظیم میں وکٹوریا کراس ملا تھا۔ میں ایک چھوٹے برانچ لائن ریلوے اسٹیشن پر اُترا، تانگا لیا اور اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اُس کے گھر تک کچا رستہ بھی نہ جاتا تھا۔ چناں چہ کھیتوں کے بیچ چلتا ہوا اُس تک جا پہنچا۔ اُس سے مجھے پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں بالواسطہ قیمتی تجربات اور معلومات کے علاوہ کئی کتب ملیں۔ ان میں سے اُس دور کے ماحول اور زمانے کو اپنے ذہن میں نقش اور بیان کرنے میں کام یاب ہوگیا۔ اگر میں لاہور میں ملازمت کر رہا ہوتا تو شاموں کو کافی ہاؤس، ریسٹورنٹ یا دیگر تفریحی معاملات میں مشغول رہتا۔ یوں اپنے اندر موجود ادیب جسے میں نے داؤد خیل کے بیاباں میں دریافت کیا، لاہور کی پُر رونق زندگی میں خوابیدہ ہی رہتا۔“

محمد خان نامی سیمنٹ فیکٹری کے گم نام کیمسٹ نے ایک روز اپنا ناول مکمل کیا اور اُسے چھپوانے کے لیے لاہور چلا آیا۔ یہاں اُس کی ملاقات ”سویرا“ کے مدیر اور ”نیا ادارہ“ کے ناشر چودھری نذیر احمد سے ہوئی۔ اس ادارے کے تحت ”نیا ادارہ“ نامی معروف طباعت گھر سے نمایاں کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ مدیر نے کیمسٹ سے چند روز بعد آنے کا کہا۔ مسودے کو حنیف رامے، شیخ صلاح الدین اور محمد سلیم الرحمان نے پڑھا۔ چند روز بعد محمد خان کی سلیم الرحمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اُس ناول کی بہت تعریف کرتے ہوئے شائع کرنے کی نوید سنادی۔ اب دو مسائل آن کھڑے ہوئے۔

اس زمانے میں کرنل محمد خان نام کے ایک معروف ادیب ادب کے میدان میں متحرک تھے۔ ایک نووارد محمد خان کا سامنے آنا

قارئین کے لیے الجھن کا باعث بنتا۔ چناں چہ ایک قلمی نام کی ضرورت تھی۔ سیمنٹ فیکٹری میں محمد خان کا ایک طاہر عبداللہ حسین نامی ساتھی تھا۔ اُس کا نام انھیں خاصا پسند تھا۔ پس اُس کے نام سے عبداللہ حسین کا لاحقہ لے کر محمد خان نے اپنا قلمی نام پالیا۔

دوسرا مسئلہ ادبی شناخت کا تھا۔ عبداللہ حسین کو ادب میں کوئی نہ جانتا تھا۔ اس مسئلے کا ایک حل یہ تجویز ہوا کہ یہ چند افسانے لکھ کر چھپنے کے لیے دیں جن سے ان کا ادبی حلقوں میں تعارف ہو جائے۔ عبداللہ حسین چند روز بعد افسانے لے کر ''سویرا'' کے دفتر پہنچے۔ افسانے اگلے شماروں میں نہ صرف شائع ہوئے بلکہ ایک اہم ادیب کی آمد کے پیغام بر بھی ثابت ہوئے۔ ادب میں عبداللہ حسین ملکی و غیر ملکی تجربات و مشاہدات کے پھولوں سے کشید کیا جانے والا عطر بلوریں بوتلوں میں سجا کر لائے تھے۔

پس اس کے بعد اُن کا ناول ''اداس نسلیں'' کے عنوان سے شائع ہوا اور انگریزی محاورے کے مطابق ''اس کے بعد سب تاریخ کا حصہ ہے۔''

یہ اُسی دور کا واقعہ ہے کہ اِدھر ''اُداس نسلیں'' چھپتا ہے اور ایک برس بعد اُدھر ارجنٹینا کے، بعد میں اندھے ہو جانے والے لائبریرین، لوئی بورخیس کی "Labyrinths" (بھول بھلیاں) سامنے آتی ہے جو "Magical Realism" (طلسماتی حقیقت کشائی) اور Meta Fiction (حدِ اختراع) کا دروازہ بین الاقوامی ادب میں کھول دیتی ہے۔

''اداس نسلیں'' میں تقسیم، فسادات، جنگ، محبت جیسے آفاقی موضوعات برتے گئے تھے۔ ٹالسٹائی کے ناول ''اینا کیرانینا'' میں شادی شدہ اینا کی کاؤنٹ ورانسکی سے محبت، ''وار اینڈ پیس'' ایسے جنگ کے وسیع کینوس پر جنگ کی تاب ناک عکاسی کرنے والے عظیم ناول سے لے کر دستووسکی، شولوخوف، ہیمنگوے، مارکیز بھی آفاقی موضوعات چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اِدھر منٹو تقسیمِ ہند پر لکھتا ہے اور اُدھر خوش ونت سنگھ "A Train to Pakistan" (ریل گاڑی بہ منزل پاکستان) لکھ کر میدانِ ادب و صحافت میں اُترتا ہے اور احمد ندیم قاسمی پرمشیر : برمید سنگھ کو کھلے کیسوں کے ساتھ جہانِ افسانہ میں اُتارتا ہے۔

عبداللہ حسین حقیقت نگار ہیں یا نہیں، نثر میں مبالغہ آمیز فسوں سازی کے قائل ہیں یا نہیں، 'اُداس نسلیں' میں سانحۂ جلیانوالہ باغ کے حوالے سے موت کا ایک منظر ہے...... ''پھر اور گولیاں اور ایک قلابازی، اور اس طرح جب سرکس کے مسخرے کی طرح کرتب دکھانے کے بعد وہ زمین پر آیا تو کب کا مر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جوش و خروش تھا اور وہ بدشکل نہ ہوا تھا۔ کیوں کہ اُس نے موت دیکھی ہی نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب موت تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم گرتی ہوئی لاشوں میں چھپ گیا۔ یہ سارا قصّہ چند لمحے کا تھا۔''

اس منظر میں نہ تو موت سے وابستہ رومان ہے، نہ مرنے والے کے آخری ڈائلاگ اور نہ ہی اُس کی نظروں کے سامنے گھومتے ماضی کے مناظر۔ فقط ایک جان دار کی موت، مرغابی یا بٹیر کی موت، غزالِ شب کی خاموش اور اُداس موت، اچانک خاتمہ۔ البتہ ناول میں نعیم کا کردار، ''آگ کا دریا'' کے گوتم نیلمبر، ''راکھ'' کے مشاہد، دستووسکی کے ''جرم و سزا'' کے رسکولینکوف، ولیم تھیکرے کے ''وینٹی فیئر'' کی بیکی شارپ، مارکیز کے ''تنہائی کے سو برس'' کے کرنل آریلیانو اور موراکامی کے ''نارویجئین وُوڈ'' کی میڈوری کے ہم راہ لازوال کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔

پہلی ملاقات کے کئی ماہ بعد اُسی بیچ لگژری ہوٹل کے ایک کمرے میں سمندری ہوا میں پھڑ پھڑاتے پردوں کی جانب پشت کیے عبداللہ حسین کو میں نے ان کے اندازِ تحریر پر ایک باریک بیں قاری اور ادیب کا جملہ سناتے ہوئے کہا ''آپ کی نثر کھٹاک سے آکر لگتی ہے اور دل و دماغ پر جم جاتی ہے۔ یہ سادہ، موثر اور کچھ حد تک مردانہ ہاتھوں سے لکھی گئی نا ملائم زبان ہے۔ جب آپ نے لکھنا شروع کیا تب ریشمی زبان کا رواج تھا۔''

خان صاحب نے پنجابی میں چند غیر مبہم الفاظ بولے اور کہنے لگے ''مجھے اپنی زبان کے بارے میں شروع سے یہ خیال رہا ہے کہ

اسے موثر اور آلایشوں سے پاک ہونا چاہیے۔ ہر جملہ کہانی میں کوئی اضافہ کرتا ہو۔ میں اپنے ذہن میں ایک مکمل تصویر بناتا ہوں اور اُسے لفظوں میں کاغذ پر لکھ لیتا ہوں۔ باقی یہ مردانہ اور ریشمی والی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔”

میں نے لقمہ دیا۔ “منٹو بھی ایسا موثر اور براہِ راست اظہار کرتا تھا۔”

عبداللہ حسین بولے “منٹو کی زبان صحافیانہ تھی۔ اس کی نثر میں کئی بنیادی خامیاں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس نے بڑے اعلیٰ افسانے لکھے۔ عمومی طور پر اُس کی کہانیاں معاوضے کی خاطر عجلت میں لکھے گئے افسانے ہوتے تھے۔ اُس کے سیکڑوں افسانوں میں سے درجن بھر افسانے عمدہ ہوں گے، بقیہ اُس کے تخلیقی اور ادبی مرتبے سے کم تر ہیں۔ دراصل اُسے غربت اور شراب نے بہت خراب کیا۔ وہ ایک بوتل کے پیسوں کے لیے جو بھی ممکن ہو، عجلت میں لکھ ڈالتا، نہ اُسے دوبارہ دیکھتا اور نہ ہی اس میں ترامیم کرتا۔ بس پبلشر کے پاس جانے کی کرتا۔ چناں چہ اُس نے بہت لکھا، سیکڑوں کہانیوں میں سے درجن بھر اچھی کہانیاں لکھ لینا بڑی بات نہیں۔ اس کی ذہانت اور فن پر دست رَس کوزودنویسی کھا گئی۔ میں غلام عباس کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اس کے ہاں فن پر دست رس، مضبوط کہانی، رواں پلاٹ اور خوبیٔ بیان ہے، موضوعاتی تنوع ہے۔ اُسے پڑھ کر ایک عمدہ ادیب کو پڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔”

ایک روز میرے استفسار پر انھوں نے کہا۔ “میری نظر میں قراۃ العین حیدر اُردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہے۔ اُس کی زبان کی ثقافت اور قدامت نئے قارئین کے لیے ناآشنا سہی، بہرحال اُس کا مقام طے ہے۔ افسانہ نگاری میں چیخوف کا کوئی ہم سر نہیں۔ اُس کی تحریر میں خاص اداسی ہے، کہانی قاری کے اندر اُتر جاتی ہے اور اس کی ذات کا حصہ بن جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر دستووسکی بے مثال ادیب ہے، وہ عظیم ہے۔ لیو ٹالسٹائی اُس سے اس درجے متاثر تھا کہ جب گھر سے نکلا اور دربہ در ہو کر ایک اسٹیشن پر سردی میں ٹھٹھرتا مردہ پایا گیا، تو اپنی اسٹڈی میں دستووسکی کا ناول “برادرز کرامازوف” پڑھتا اوندھا رکھ کر گیا تھا۔ یہ میرا بھی پسندیدہ ناول ہے۔”

ایک کہاوت ہے کہ دنیا دو طرح کے لوگوں میں تقسیم ہے۔ پہلے وہ جو دستووسکی کو عشق کی حد تک پسند کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اُسے فقط پسند کرتے ہیں۔

خان صاحب امر ہو جانے والے خیالات کو لغو مانتے ہیں۔

“میرے مرنے کے بعد بھلے میری کتابیں کچرے دان میں پھینک دی جائیں، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے قطع نظر، ایک تحریر کا درست مقام وقت ہی متعین کرتا ہے۔”

اس گفت گو سے چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک ادبی محفل کے دوران ایک صاحب نے ان سے ذو معنی سوال کیا کہ وہ لندن میں قیام کے دوران روزگار کے لیے لوگوں کے ہاں گھروں پر مشروباتِ پُرخمار فراہم کیا کرتے تھے۔

عبداللہ حسین نے صاف گوئی اور معصومانہ دیانت داری سے اُن صاحب کی بات کی تصحیح کی۔ “یہ غلط ہے۔ لندن میں تو میری اپنی بار تھی۔ لوگ خود چل کر میرے پاس آیا کرتے تھے۔”

یہ اُسی محفل کا تذکرہ ہے کہ انھوں نے ایک اعتراف کر کے سامعین کو متحیر کر دیا۔

“مجھے اُردو لکھنی نہیں آتی۔ میں سادہ زبان اور چھوٹے جملے لکھتا ہوں۔ میں اپنے تجربات، مشاہدات اور خیالات کو فکشن میں سیدھے حقیقی انداز میں لکھتا ہوں جس سے ایک تصویر بنتی جاتی ہے۔ ابتدا میں نقاد میری زبان پر تنقید کیا کرتے تھے۔ ناقدین کی نظر میں ماضی کی میری وہی خامی اب میری خوبی بن چکی ہے۔ وقت کے ساتھ دورِ ماضی کے اہم ادیبوں کی ثقیل اور پرشکوہ الفاظ والی رسمی زبان غیر معروف ہوگئی ہے۔ آج لوگ ایسی ہی سادہ اور حقیقی زبان میں فکشن پڑھنا چاہتے ہیں۔”

ادیبوں کے لیے مخصوص کمرے میں چائے پیتے ہوئے میں نے اس جانب اشارہ کیا کہ خود اُن کا شمار بھی اُردو کے صفِ اول کے

باگھ

بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے تو میری بات رَد کرتے ہوئے بولے ’’میں کوئی بڑا اور، عظیم وظیم ادیب نہیں، بڑے تو ٹالسٹائی، دستووسکی، چیخوف اور اس قبیل کے دوسرے ادیب تھے۔ میں اُنھیں پڑھتا ہوں تو صحیح معنوں میں بڑا ادب پڑھتا ہوں۔ ہماری اوقات کیا ہے، تیسری دنیا کے ایک غریب ملک کی زبان کے ادیب۔‘‘

کراچی میں لبِ سمندر واقع ہوٹل کے کمرے کی جنوبی سمت کھلتی کھڑکی سے آتی بحیرۂ عرب کی نمکین ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے انڈا پھینٹے دودھ کی سی رنگت والی شام کو مجھے بتانے لگے۔

’’میں نے اپنی زندگی کی کئی دہائیاں انگلینڈ میں گزاری ہیں۔ وہاں لوگوں میں وضع داری ہے، نام ور اور بڑا ادیب شستہ مزاج اور عاجز ہوتا ہے۔ نمود و نمایش کو ستا پن مانا جاتا ہے، جب کہ خود نمائی ہمارے ہاں عام ہے۔ اپنی عظمت کے گن گانا اور خود کو بڑھا کر پیش کرنا پس ماندہ معاشرت کی علامات ہیں۔‘‘

یہ کیسے ممکن ہے کہ برطانیہ میں طویل قیام کی وجہ سے مزاج میں روایتی انگریزی رنگ نہ چڑھ آیا ہو۔ امجد اسلام امجد نے ایک مرتبہ ڈیفنس لاہور میں اپنے گھر چند احباب کو کھانے پر مدعو کیا۔ عبداللہ حسین کو انھوں نے خاص دعوت دی۔ دونوں کے گھر پیدل فاصلے پر ہیں۔ گھر کا پتا پوچھنے پر امجد صاحب نے رستہ سمجھاتے ہوئے روایتاً کہہ دیا کہ اُن کا گھر بس قریباً چالیس گھروں کے فاصلے ہی پر ہے۔ دعوت کے وقت پر عبداللہ حسین صاحب کا انتظار شروع ہو گیا۔ دیر ہو گئی اور وہ نہ آئے تو امجد صاحب نے اُن کے گھر فون کیا۔ فون عبداللہ صاحب ہی نے اٹھایا۔ امجد صاحب نے حیرت سے کہا کہ سب ان کے انتظار میں ہیں اور وہ اب تک گھر سے روانہ ہی نہیں ہوئے۔ عبداللہ صاحب نے کہا کہ انھوں نے پورے چالیس گھر گِنے اور دائیں بائیں دیکھا۔ آس پاس کوئی گھر مطلوبہ پتے کا نہ تھا، سو وہ واپس لوٹ آئے ہیں۔

عبداللہ حسین کے مزاج بارے میں ایک بات سے جب میں آگاہ ہوا تو میرے دل میں اُن کی عزت مزید بڑھ گئی۔

وہ نہ تو کسی سے زیادہ دیر تک ناراض رہ سکتے تھے اور نہ ہی کر سکتے تھے۔ اگر کبھی کسی سے ناراض ہو کر غصے سے بات کر بھی لیتے تو جلد منا لیتے۔ ایک مرتبہ اصغر ندیم سیّد صاحب سے کچھ ناراض ہوئے تو اگلے روز اُنھیں گل دستہ بھجوا کر منا لیا۔

[illegible] ؟

بیاسی تراسی سالہ بیمار تنہا ادیب کس اُداسی میں زندگی بسر کرتے ہوں گے، صرف وہی جان سکتے تھے۔ بڑھاپے میں مختلف عوارض کے ہاتھوں پریشان شخص کے لیے کبھی کبھار چڑچڑا ہو جانا عین فطری ہے مگر اپنے سے جونیئر اور کم عمر شخص سے معذرت کر کے اُسے منا لینے کے لیے بہت دل گردہ چاہیے۔

میں ایک ادنیٰ آدمی، مشتِ غبار مانند ہوں جسے اُن جیسے چند بڑے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ رِکارڈ کے لیے ایک قطعی ذاتی نوعیت کی بات بیان کر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر تشریف لا کر مجھے سرفراز کرتے رہے۔ ایک مرتبہ وہ تشریف لائے تو میں اُن کی مدارات کے لیے پُر جوش تھا۔

میری مسلسل آمد و رفت پر انھوں نے بے تکلفی سے مجھے ڈانٹ کر اٹھا دیا۔ جاتے ہوئے غالباً میرا اُترا چہرہ دیکھ کر مجھے سینے سے لگایا اور بعد ازاں ایک برقی نامہ (e-mail) بھیجا۔ وہ اپنا نام عام رواج Hussain سے مختلف Hussein لکھتے تھے۔ abdullahhusseinpk@yahoo.com سے 2 فروری 2014 (بہ روز اتوار) 12 بج کر 5 منٹ کی اُن کی بے شمار e-mails میں سے جب میں یہ e-mail پڑھتا ہوں تو بے اختیار میری آنکھیں بھر آتی ہیں اور میں اُن کی عظمت اور اپنی نالائقی کے بوجھ تلے دب جاتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں۔

’’میں تین ہفتے سے مسلسل بیمار، اُداس ہوں اور ہر وقت بڑھاپے اور موت کا سوچتا رہتا ہوں۔ درحقیقت میں تم دونوں (مراد: میں اور میری بیوی) کو اپنا حقیقی رشتے دار سمجھنے لگا ہوں جیسے بیٹا، بیٹی یا بھتیجا، بھتیجی۔ یہ ایسا نازک مقام ہوتا ہے جہاں آپ چھوٹوں پر اپنا حق سمجھنے لگتے

ہیں۔ اس روز نادانستگی میں تمھیں پریشان کر دیا جس کا مجھے افسوس ہے۔ کسی اجنبی کو دکھ دینا تو درکنار، میں تمھیں کوئی دکھ کیوں کر دوں گا۔ خدانخواستہ اگر میں کبھی نادانستگی میں (کسی کو) دکھ دے بھی دوں تو مجھے عمر بھر یہ خلش رہتی ہے۔ دیکھو، میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، اِن الفاظ کو ایسے شخص کی بات مت جانو جسے زمانہ عبداللہ حسین کے نام سے جانتا ہے بلکہ یہ ایک بیاسی سالہ بوڑھے شخص کے الفاظ ہیں۔ تم اس بات کو تبھی سمجھ پاؤ گے جب میری عمر کو پہنچو گے اور آگے مستقبل کی جانب بہ دِقت دیکھ پاؤ گے۔ وہاں تمھیں اندھیرے کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دے گا۔ پیار۔“

ادبی و تخلیقی معاملات پر صائب صلاح دیتے اور دیانت دارانہ راہ نمائی فرماتے۔ میں نے اوائلِ جوانی کے چند افسانے پیش کیے تو اُن کا خط وصول کر کے مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے انتہائے محبت سے راہ نمائی کی خاطر میری تحریر کی چند سطریں بھی نقل کی تھیں۔

9 مارچ 2013 کے خط میں اُن کی بڑی بڑی شکستہ تحریر میں رقم ہے۔

”ڈیئر عرفان! افسانوی ادب کا سب سے بڑا جزو اِس کی نثر ہوتی ہے۔ نثر کے اعداد اس کے جملے اور اُن کی ساخت ہوتے ہیں۔ جملے ایسے ہونے چاہئیں کہ صاف طور پر پڑھنے والے کی نہ صرف سمجھ میں آئیں بلکہ اُس کی عقل میں بھی بیٹھیں تاکہ وہ ان کا قائل ہو جائے۔ یہی بلاغت کا اصول ہے۔ مزید، حتیٰ الامکان جملے طویل نہیں ہونے چاہییں۔

طوالت کی مثال

”سیاہ ہوتی دیواروں اور زنگ آلود پنکھوں والے وارڈ میں کھانستے کراہتے نیم جاں مریضوں کے بیچ سے گزرتے اور اُن کے پھل کے چھلکے فرش پر بکھیرتے، مٹیالی چائے اور رنگین شربت کے چھینٹوں کی خستہ چادروں پر بوچھاڑ کرتے اور گٹھڑیاں سنبھالے میلے سے تیمارداروں کو پھلانگتے ہوئے جب وہ وارڈ کی بھنبھناہٹ سے باہر کھلی تازہ فضا میں آنکلا تو اُس نے اپنے بیٹے شاہ دین سے دو ہی باتیں کہیں۔“

یہ جملہ طویل اور گنجلک ہے اور اس میں clause اور sub-clause کا کوئی فرق نہیں رکھا گیا، نتیجے کے طور پر یہ پڑھنے والے کو اپنی حقیقت کا قائل کرنے کے بجائے اِسے کنفیوز کرتا ہے۔

ساخت کی مثال

”مُنا ہڑبڑا کر کراہا اور نیند کے خمار میں پھر سے گُم ہو گیا اور وہ باہر برآمدے میں لٹکتے پلاسٹک فریم میں جڑے شیشے میں دیکھ کر تیل میں چپڑے بالوں میں کنگھا کرتے شاہ دین سے لڑ پڑا جس کی وجہ سے اُس کی نماز قضا ہو گئی تھی۔“

اس کے بجائے

”مٹا ہڑبڑا کر کراہا اور نیند کے خمار میں پھر سے گم ہو گیا۔ باہر برآمدے میں لٹکتے پلاسٹک فریم میں جڑے شیشے میں دیکھ کر شاہ دین تیل میں چپڑے اپنے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ امام دین باہر نکل کر شاہ دین سے اِس بنا پر اُلجھ پڑا کہ اُس کی بے پروائی کی وجہ سے اُس کے باپ کی نماز قضا ہو گئی تھی۔“

ویسے اسی طرح ہی چلنے دیں تو بھی ٹھیک ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔ کئی لکھنے والے ایک خاص طبقے میں بے حد مقبول ہوتے ہیں مگر سنجیدہ قاری اور نقاد حضرات اُنھیں خاطر میں نہیں لاتے۔ آخر کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی۔“

اردو کے ناقدین کے حوالے سے وہ ہمیشہ شکوہ کناں رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ نقاد جدید ادب نہیں پڑھتے اور گزشتہ کے مطالعے کی بنیاد ہی پر جگالی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ حقیقی معنوں میں تحقیقی و نکتہ رس تنقید نہیں کرتے۔

لاہور ڈیفنس میں اُن کے خوب صورت بنگلے میں بیٹھے ایک مرتبہ میں نے اُن سے گزارش کی ”میرے محدود مطالعے نے مجھے تین ناقدین کو دیگر سے ممتاز کرنے پر مجبور کیا ہے۔“

وہ توجہ سے سُن رہے تھے۔

''محمد حسن عسکری کی تنقید نہ صرف دل و دماغ پر اثر کرتی ہے بلکہ سوچ کے نئے زاویے سے بھی روشناس کرتی ہے۔ اُن کی تجزیاتی تحریر مسرت بخشتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور عین اُسی نکتے کو مرکزِ توجہ بناتے ہیں جس کی کوکھ سے متذکرہ تحریر کی کونپل نے سَر نکالا ہوتا ہے۔ وہ سات پردوں میں چھپی بات کو دیکھ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ممتاز شیریں، منٹو کی تحریر کے پسِ پردہ نفسیاتی عوامل اور ان کے تجزیاتی مطالعے پر جس آسانی سے پہنچ کر اُس کا مدلل ابلاغ کرتی ہیں، وہ قابلِ ستائش ہے۔''

اس پر عبداللہ حسین نے اس طرح منہ بنایا جیسے دانت تلے کڑوا بادام آ گیا ہو یا زبان پر کونین کی گولی گھل گئی ہو۔ انھوں نے ناقدین کو اپنے مخصوص انداز میں خوب صلوٰاتیں سنائیں۔ اُن کو شکوہ تھا کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ چار پانچ دہائی پرانی کتابوں ''نشیب'' اور ''اُداس نسلیں'' پر رُک جاتے ہیں۔ اُس کے بعد ان کے ناولوں اور کہانیوں کی کتاب ''فریب'' پر کوئی بات نہیں کرتا۔ فرضیکہ اُنھیں ان کے معیار پر اعتراض ہے تو کم از کم اس کا حوالہ جاتی اظہار کریں۔

اس کے بعد انھوں نے محمد حسن عسکری کی بے حد تعریف کی اور بولے کہ وہ واقعی ایک پڑھے لکھے اور متاثر کن ناقد تھے۔ شمس الرحمان فاروقی کو بھی انھوں نے ''بڑا اور پڑھا لکھا آدمی'' قرار دیا۔ ممتاز شیریں کے حوالے سے اُنھوں نے اعتراف کیا کہ اس حوالے سے اُن کا مطالعہ قابلِ ذکر نہیں البتہ تعریفی تذکرہ کیا۔

''اُداس نسلیں'' اُن کے لیے نازک الفاظ تھے۔ اِدھر ''اُداس نسلیں'' کا ذکر آیا، اُدھر ان کا پارا چڑھنے لگا۔ کراچی آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں امجد طفیل صاحب نے اُن کے ناول ''باگھ'' پر سیر حاصل بات کی تو خوشی سے اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں نے اُسی تقریب میں بہ طورِ خاص اُن کی کہانیوں کی مجموعے ''فریب'' کا ذکر کیا تو حسبِ معمول میرے کندھے کا سہارا لے کر چلتے ہوئے کہنے لگے ''یار توں اَج 'فریب' دا ذکر کر کے چنگا کیتا۔ ایہ کیہ گل ہوئی کہ جدوں میرے افسانیاں دا ذکر ہوندا اے لوکاں نوں 'نشیب' دے علاوہ کجھ نظر نئیں آؤندا''

(تم نے آج 'فریب' کا تذکرہ کر کے اچھا کیا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جب میرے افسانوں کا ذکر ہوتا ہے لوگوں کو ''نشیب'' کے سوا کچھ نظر نہیں آتا)

پھر ایک بات سنائی۔ ''پچھلے دنوں میرا ایک کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک دانش ور میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اُس نے کھانا کھاتے ہوئے مجھ سے کہا 'آپ کے ناول 'اداس نسلیں' کا اتنا ذکر ہوتا ہے جب کہ ''نشیب'' بھی ہمارے افسانوی ادب کا سرمایہ ہے'۔ اُس کا خیال تھا کہ اپنی تعریف سن کر میں خوش ہو جاؤں گا'۔ میں نے سوچا 'اس کا مطلب ہے کہ میں نے اِن دو کتابوں کے بعد اپنی زندگی کے پچاس برس ضائع کر دیے۔''

ایک مرتبہ ہنستے ہوئے بتایا 'میرا ناول ''اُداس نسلیں'' کا نام اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ میں نے پچھلے دنوں اخبار اُٹھایا تو اُس کے اندر ایک فیچر کا عنوان تھا ''اُداس نسلیں۔'' میں نے سوچا کہ شاید میرے ناول پر ہے۔ چناں چہ اُسے پڑھنے لگا۔ اُس میں لکھا تھا کہ آج کل کی نوجوان نسل محنت نہیں کرتی، والدین کی عزت نہیں کرتی اور تعلیم پر توجہ نہیں دیتی۔ اس لیے یہ کام یابیاں حاصل نہیں کر پاتی۔ سو مایوس ہو جاتی ہے۔ یہ دور ایسی ہی 'اداس نسلیں' پیدا کر رہا ہے۔ میں نے اپنے ناول کے عنوان کا ایسا حشر کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

میں نے اُن کی دل آزاری اور اپنی سرزنش کے خوف سے کبھی اُن کے سامنے اعتراف نہ کیا کہ مجھے بھی اُن کی تمام تصانیف میں اولاً نشیب اور ثانیاً اُداس نسلیں زیادہ پسند ہیں۔ اُن کا خاکہ لکھا تو اُس کا عنوان بھی اُن کے اپنے پسندیدہ ناول ''باگھ'' کے نام پر رکھا۔ خاکے کا مسودہ اُنھیں حقائق کی درستی کے لیے بھیجا تو چند اعتراضات سے ہٹ کر اُنھیں اس کا عنوان خاصا پسند آیا۔

اُنھیں ''اداس نسلیں'' سے گویا ایک چڑ سی ہوگئی تھی۔ چڑ کے حوالے سے مشہور دینی راہ نما اور سیاست دان مفتی محمود مرحوم کا ایک دل چسپ واقعہ سینہ بہ سینہ سفر کرتا ہوا مجھ تک پہنچا۔ اس کے راوی غالباً نامی گرامی سیاست دان جاوید ہاشمی ہیں۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک مرتبہ مفتی محمود دیگر چند سیاست دانوں کے ہم راہ پابندِ سلاسل تھے۔ اُن کی بھاری سیاسی شخصیت، مذہبی مقام اور تدبر کی وجہ سے خاص عزت تھی۔ البتہ دیگر سیاسی قیدی اِک دوجے سے خوب چہلیں کرتے۔ انھوں نے وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کو مختلف نام دے کر ان کی چھیڑیں بنائی ہوئی تھیں۔ مفتی صاحب یہ سب دیکھتے اور حیران ہوتے۔ ایک روز بول اُٹھے ''بھئی یہ سب جعلی نام ہیں۔ آپ لوگ اِن سے اتنا چڑتے کیوں ہیں، نظر انداز کر دیا کریں۔'' اگلے روز ایک قیدی اُن کی بیرک میں آیا اور مودبانہ گزارش کی ''مفتی صاحب ذرا سوئی دھاگا عنایت کیجیے گا۔'' مفتی صاحب بولے ''بھائی میرے پاس سوئی دھاگا نہیں۔'' چند لمحے بعد دوسرا قیدی آیا اور بولا ''مفتی صاحب ذرا سوئی دھاگا عنایت کیجیے گا۔'' مفتی صاحب بولے '' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے پاس سوئی دھاگے کا کیا کام؟'' تھوڑی دیر میں تیسرے قیدی نے وہی سوال دہرایا تو مفتی صاحب جھلا کر بولے ''بھائی کوئی دین کی بات ہو یا شرعی مسئلہ ہو تو پوچھیے۔ ایک عالم کے پاس سوئی دھاگے کا کیا کام؟'' جب چوتھے قیدی نے بھی وہی بات دہرائی تو کچھ غصے سے بولے ''میرے پاس سوئی دھاگا نہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔'' غرضیکہ یہ گردان جاری رہی۔ جب دسواں، گیارہواں قیدی مفتی صاحب کی بیرک میں داخل ہوا تو مفتی صاحب بھرے بیٹھے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی پھٹ پڑے ''تمھیں بھی سوئی دھاگا ہی چاہیے ہوگا۔ کیوں بے، اپنی کسی عزیزہ کے اعضاء کی سلائی کرنی ہے۔'' (الفاظ کو دائرۂ شائستگی میں لانے کی خاطر بدل دیا گیا ہے) یہ سن کر باہر اکٹھے ہوئے قیدیوں کے بلند بانگ قہقہے چھوٹے تو مفتی صاحب اصل ماجرا سمجھ کے خفیف ہو کر رہ گئے۔

عبداللہ حسین صاحب کو اواخر میں لفظ چوراسی "84" سے بھی چڑ ہو گئی تھی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب میں نے اُن کے حوالے سے خاکہ نُما یادداشتیں لکھیں تو انھوں نے مسودے پر دو بنیادی اعتراضات کیے۔ ایک تو اُن کی عمر کے حوالے سے تھا جو تراسی برس چند ماہ تھی۔ دوسرا اعتراض اختتامیے پر تھا۔

پہلے اعتراض پر وہ غصے میں پھٹ پڑے ''بھئی میری عمر 83 برس ہے۔ تُم نے جگہ جگہ 84 برس لکھا ہے تاکہ پڑھنے والے یہ تاثر لیں جیسے میں کوئی بہت بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے یہ غلط گردان بالکل پسند نہیں آئی۔''

چناں چہ میں نے سوائے ایک دو جگہ کے یہ تذکرہ ہی حذف کر دیا۔ معاملہ اعداد کا نہیں، کچھ اور تھا۔

وہ خود نمائی سے گریزاں تھے چناں چہ ایسے لوگوں کو زیادہ پسند کرتے جن کی تخلیق بولتی تھی بجائے ان کے جو خود بولتے تھے۔ البتہ اس معاملے میں ایک انحراف یہ تھا کہ جب ''اُداس نسلیں'' کے ابتدائی ایڈیشن چھپے تو ان پر ''اُردو کا عظیم ناول'' لکھا گیا تھا۔ غالباً یہ پبلشر کی ضرورت تھی۔ بلاشبہ بین الاقوامی معیار کے اہم ناولوں کے پر توصیفی رائے رقم ہوتی ہے۔ دوستووسکی سے لے کر ٹالسٹائی اور میلان کنڈیرا تک اہم ادیب عموماً اپنی تخلیقات کے معیار پر نہ تو شرمندہ رہے ہیں اور نہ ہی متذبذب۔ اسی لیے وہ ان کی خوبیوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

اُن کے مزاج کے حوالے سے اُن کی تحریر کا نمونہ ہے جو انھوں نے میرے لکھے خاکوں پر رقم کیا۔ ابتدائی چند جملوں کے بعد وہ رقم طراز ہیں۔

''جن ادیبوں پر انھوں نے کاوش کی ہے اُن میں سے مجھے دو میں زیادہ دل چسپی پیدا ہوئی ہے۔ اوّل عاصم بٹ، جو واقعتاً ایک بند کوزے کے مانند ہیں۔ جس طرح عرفان جاوید نے اُن کے ایک ایک پَت کو چھیل کر اُن کا باطن ظاہر کیا ہے، ایک معرکے سے کم نہیں۔ اب جب بھی میں عاصم بٹ کا خیال کروں گا وہ ایک ادھ چھلے پیاز کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ دوم نصیر کوی صاحب۔ ان کی روداد نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ تنگ دستی میں گزارا کرتے رہے، صلہ کچھ طلب نہ کیا، عقیدہ کسی حالت میں ترک نہ کیا اور آخر میں گم نامی کی موت

مرے۔ یہ ایک عام آدمی کے Heroism کی کہانی ہے۔ میرے نزدیک نصیر کوّی ایک یونانی المیے کے کردار ہیں جو نامساعد حالات کے مقابل اپنے اصول ترک کرنے سے انکار کرتے کرتے ڈھیر ہو گئے۔ ایک معمولی آدمی کو نام ور لوگوں کے برابر کھڑا کر کے عرفان جاوید نے انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔''

عبداللہ حسین صاحب نے نسبتاً غیر معروف ادیبوں کو مشہور اور اہم ادیبوں پر فوقیت دی۔ محمد عاصم بٹ ''دائرہ''، ''ناتمام'' اور ''اشتہار آدمی اور دیگر کہانیاں'' جیسے عمدہ ناولوں اور افسانوں کے خالق اور نصیر کوّی پنجابی زبان کے شان دار شاعر اور ''ہر گھر سے بھٹو نکلے گا'' جیسی نظم کے خالق، محنت کش فن کار!

ایک مرتبہ کراچی مجھے، اُنھیں اور مستنصر حسین تارڑ صاحب کو انگریزی کے نوجوان ناول نگار اور ایشیا کے اعلیٰ ڈی ایس سی ادبی ایوارڈ یافتہ مصنف ایچ ایم نقوی اور ان کی ہارورڈ جیسی اعلیٰ ترین درس گاہ میں پڑھانے والی باوقار بیگم نے اپنے وسیع نوابی انداز کے بنگلے میں کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں شہر کی منتخب اشرافیہ جس میں بیرونی فلم سازوں، امریکی اور یورپی جرائد کے نمایندوں کے علاوہ زندہ دل اور دل کش خواتین موجود تھیں۔ ایک جانب قدیم طرز کے آلاتِ موسیقی دھرے تھے۔ نقوی کو ساٹھ اور ستر کی دہائی کے اَن دیکھے کراچی کی یادوں سے عشق ہے۔ اُس کے ہاں جا کے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی اُسی دور میں چلا گیا ہو۔ ابھی گراموفون بند کر کے ریڈیو کھولا جائے گا اور فیلڈ مارشل ایوب خان کی براہ راست تقریر ریڈیو فریکوینسی میں کھڑکھڑاہٹ کے معمولی خلل کے ساتھ بھرپور مردانہ آواز میں گونجنے لگے گی۔ جیسے میٹروپول کے قریب واقع مے کدے سے ہجوم رنداں برآمد ہو گا اور صدر کے ایرانی ہوٹلوں سے چلّو کباب کھا کر گھروں کا رخ کرے گا۔ جیسے مولانا مودودی کے استقبال کو آنے والا ٹھاٹھیں مارتا سمندر شہرِ کراچی کے انتخابی چہرے پر جماعت اسلامی کی سبز مہر ثبت کر دے گا۔ گویا یہ ماضی کی کسی گم گشتہ دہائی میں عبداللہ حسین سے مختصر سی بات چیت تھی، حال کی گفت گو تھی جس میں ماضی کی گونج تھی۔ ایک dejavu تھا، التباس تھا۔

عمومی طور پر بین الاقوامی سطح کے نمایاں ناول نگار کہتے آئے ہیں کہ اُس موضوع پر لکھنا چاہیے جس کے بارے میں مشاہدہ یا تجربہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُن ناولوں کو اپنے دور کی نمایندہ دستاویزی تحریریں بھی جانا جاتا ہے۔ اِس بارے میں خان صاحب کا کہنا تھا کہ آج تک کے تمام ناولوں میں لیو ٹالسٹائی کا معرکہ آرا ناول ''وار اینڈ پیس'' (جنگ و امن) کو بلا مبالغہ اعلیٰ ترین تصنیف مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں نپولینک جنگوں کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے، وہ جنگیں ٹالسٹائی کی پیدائش سے انیس برس قبل لڑی گئی تھیں۔ ان میں آسٹریالیز کی جنگ کی ایک چشم کشا منظر نگاری ملتی ہے جیسے کتاب کے صفحات سے ابھی تک گرم توپوں کا تازہ بارودی دھواں اُٹھ رہا ہو۔ تخلیقی وفور کو زمانے کے بند سے نہیں باندھا جا سکتا۔ یہ تحیّر آمیز اور پراسرار تجربہ ہے۔

''پاکستان میں ابتدائی وقت گزار کر جب آپ برطانیہ جا آباد ہوئے تو بھی آپ کی کہانیوں میں دیسی خمیر کی نمکین مہک اٹھتی نظر آتی ہے'' میں نے رائے دی تو بولے۔ ''یہ سب تخلیقی انفعالیت اور تصور کی لامحدودیت کے کرشمے ہیں۔ فرانسیسی نابغہ مارسل پرُوسٹ وہاں کے سماج کا مشاہدہ کر کے اٹھارہ برس کی عمر میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اُس نے کنارہ کشی کے دور میں فرانسیسی معاشرے کی اپنے طویل ناول "Remembrance of things past" ''یادِ سامانِ ایامِ گزشتہ'' میں تاب ناک عکاسی کی۔ اُس سے پُوچھا گیا تو وہ حیرت سے بولا ''کیا اٹھارہ برس ایک سماج کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے کافی نہیں۔'' جب میں برطانیہ گیا تو پاکستان میں خاصا وقت گزار چکا تھا۔ یہاں کی معاشرت میرے شعور کے تار و پود میں رچ گئی تھی۔ میں نے کچھ لکھنا ہوتا، میں اس ذخیرے میں سے چند خوشے چن لیتا۔ میں عموماً زیادہ بہتر انھی چیزوں یا تجربات کے بارے میں لکھ سکتا ہوں جنھیں میں نے سونگھا، چکھا، چھوا ہو یا جن مشاہدات و تجربات سے میں واقف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت کی بہتر عکاسی جزئیات میں ہوتی ہے۔''

احمد فراز سے پوچھا گیا کہ وہ خودنوشت کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے کہا ''اگر اپنی سوانح لکھوں گا تو سچ لکھوں گا، اس سے کئی

شادیاں ٹوٹنے کا اندیشہ ہے، سواسے نہ لکھنا بہتر ہے۔"

محبت کے معاملات کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں "میں ایک باوقار آدمی ہوں اور وہ خواتین بھی باعزت ہیں۔ ایسے معاملات کا بیان اور اظہار سستا پن اور اوچھی حرکت سمجھتا ہوں۔"

انھوں نے ایک جگہ لکھا تھا: "عورتیں بے وطن ہوتی ہیں۔ جہاں بیٹھنے کی جگہ مل جائے، وہی ان کا وطن ہوتا ہے۔ عورت آباد کرنا جانتی ہے مگر اجاڑ دینے پر بھی قادر ہوتی ہے۔"

تصدق سہیل اور عبداللہ حسین پرانے دوست اور لندن کے ساتھی تھے۔ دونوں عمر رسیدگی میں وطن لوٹ آئے۔ عبداللہ حسین نے لاہور میں سکونت اختیار کی، تصدق سہیل نے کراچی میں۔ ایک اُردو کے بڑے ادیب تھے اور دوسرے معروف مصور ہیں۔ تصدق صاحب نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں افسانے بھی لکھے جو مستند ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ میرا تصدق صاحب سے خاصا اچھا تعلق ہے۔ انھوں نے جہاں خان صاحب کے لندن قیام میں اُن کی ذہانت، علمی گہرائی اور حاضر دماغی کی تعریف کی، وہیں ایک آدھ معاملے میں رقابت در آنے پر رنجیدگی کا بھی اظہار کرتے ہوئے کہا "وہ میرا دوست تھا، کوئی اور ہوتا تو دُکھ نہ ہوتا۔"

یہ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے۔ تصدق صاحب کی زندگی آرٹ اور برطانوی نازنینوں میں گزر رہی تھی۔ وہ مکمل برطانوی اطوار ہائے زندگی اختیار کر چکے تھے۔ اپنی ہمدردانہ توجہ، اٹکھیلیوں اور بانک پن کی وجہ سے لڑکیوں میں خاصے مقبول تھے۔

ان دنوں پاکستان سے برطانیہ جا کر قیام کرنا امرِ واقعی ایک ثقافتی دھچکا ہوتا تھا۔ دونوں معاشروں میں قطبین کا فرق تھا۔ چناں چہ عمومی یورپی روایت کے تحت کسی گندمی رنگت اور سیاہ بالوں والے پاکستانی لڑکے کا انگریز میموں میں مقبول ہونا عین فطری تھا۔ البتہ یہاں پر احباب ایسے واقعات اور تجربات کو دروغ گوئی پر محمول کرتے۔

قصہ مختصر، تصدق سہیل لندن کی بہار کی دمکتی صبحوں کو اپنا پینٹنگ کا سامان لے کر سرسبز پارکوں میں چلے جاتے جہاں انگریز اور دیس دیس کے کالے، گندمی، زرد اور سفید مرد عورتیں، لڑکے لڑکیاں اور بچے رنگین پھول دار کپڑے پہنے ہنس کھیل رہے ہوتے۔ وہاں کی تازہ خنک ہوا میں کسی ایسے گوشے میں جہاں دھوپ بدن کو حرارت بخش رہی ہوتی، وہ دانہ چگتے پرندوں کے بیچ ایزل، کینوس، رنگ اور برش وغیرہ لے کر بیٹھ جاتے اور پینٹ کرنا شروع کر دیتے۔

اس معمول کی وجہ سے اُن کی کئی آرٹسٹ لڑکیوں، سیاح عورتوں اور تھک کر ستانے والی دوشیزاؤں سے ملاقات ہو جاتی۔ بیش تر سے یہ ملاقات سرسری، چند ایک سے دوستانہ اور کسی کسی سے رومانی رنگ اختیار کر لیتی۔

فرانسیسی چنچل شیری بھی ایسی ہی لڑکیوں میں سے ایک تھی جس سے جوان مصور کی دوستی رومان میں بدل گئی۔ درحقیقت وہ تصدق کے دوست اور رُوم میٹ ٹونی کی دوست تھی جسے وہ تصدق کی تصویریں اپنی کہہ کر متاثر کرتا تھا۔ لڑکی ذہین تھی سو ایک روز ٹونی سے پوچھنے لگی "تمھیں کون سا آرٹسٹ پسند ہے؟"

ٹونی نے پکاسو اور ڈالی کے نام لے دیے۔ اُسے یہی دو نام آتے تھے۔

شیری نے معنی خیز انداز میں اگلا سوال کیا "تمھیں Utrilo کی عریاں عورتوں کی تصویریں پسند ہیں یا Modigliani کی عمارتوں والی؟"

دل چسپ امر یہ ہے کہ Utrilo نے کبھی عریاں اور Modigliani نے عمارتوں کی تصویریں نہیں بنائیں۔

"مجھے Utrilo کی عریاں تصویریں پسند ہیں" ٹونی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے، شیری مسکرا کے رہ گئی۔

اِدھر شیری کو تصدق سہیل کی تصاویر بہت پسند آئی تھیں۔ اُدھر ٹونی کی پرانی گرل فرینڈ آن ٹپکی۔ اس پر ٹونی نے تصدق سے کہا ”لڑکی ذہین ہے، تم اسے سنبھالو۔“

سو اس طرح ان دونوں میں تعلق بڑھا۔ تصدق شیری کی ذہانت اور مطالعے سے اور وہ ان کے ٹیلنٹ سے متاثر ہوئی۔

وہ فرانسیسی، یونانی، ہسپانوی اور ہالین زبانیں روانی سے بول سکتی تھی اور روسی، چینی اور جاپانی زبانیں سیکھ رہی تھی۔

”مجھے ہسپانوی مرد اچھے لگتے ہیں، اسی لیے ان کو رجھانے کے لیے میں نے Spanish زبان سیکھی“ اُس نے سادگی سے اعتراف کیا۔

یہ تعلق بڑھتے بڑھتے برسوں پر محیط ہوگیا۔ شیری کا بہ یک وقت کئی لڑکوں سے رومانی تعلق تھا۔ یہ تصدق کے مزاج پر یوں گراں نہ گزرتا کہ اولاً ان کا تعلق دوستانہ رومان کا تھا اور شیری نہ صرف انھیں اپنی فتوحات کے قصے سناتی بلکہ کھلکھلاتے ہوئے یہ بھی بتاتی کہ اُس نے کس طرح ایک بوائے فرینڈ کے دوست کو اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اُس کے سامنے رجھالیا۔ ثانیاً اُن کا تعلق سمجھوتے کا تھا۔ چناں چہ دونوں ایک دوسرے کے تعلقاتِ دِگر پر معترض نہ ہوتے۔

اب کہانی میں عبداللہ حسین داخل ہوتے ہیں۔

عبداللہ حسین ایک اونچے لمبے، وجیہ، باوقار اور بھرپور مرد تھے۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور مطالعہ جھلکتا تھا۔ وہ ساقی فاروقی اور تصدق صاحب کے مشترکہ دوست تھے۔

ایک سہ پہر تین بجے تصدق کو عبداللہ حسین کا فون آیا۔ وہ ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ جب تصدق نے انھیں شیری کا بتایا تو انھوں نے اس سے بھی ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دونوں دوستوں میں اس سے پہلے بھی شیری کا ذکر ہو چکا تھا۔

شیری اور تصدق کے بیچ بوریت اور اُچاٹ پن کا دور گزر رہا تھا۔ عبداللہ حسین کے آجانے سے تازگی اور تبدیلی آجاتی۔

جب عبداللہ حسین آئے تو شیری غسل کر کے اپنے لمبے گہرے بادامی بالوں کو جھٹکتے ہوئے داخل ہوئی۔ اُس کے خوب صورت چہرے پر پانی کے قطرے تھے۔ وہ عبداللہ حسین کو دیکھ کر مرعوب ہوگئی۔

دونوں کے بیچ ادب اور فلسفے پر بات چیت شروع ہوئی تو شیری خاصی متاثر ہوئی۔

کچھ دیر بعد تصدق اپنی پینٹنگ بنانے میں مشغول ہوگئے۔ شیری اور عبداللہ حسین اِس طرح ایک دوسرے میں مگن ہوگئے کہ تصدق کی موجودگی سے گویا غافل ہو چکے تھے۔

شیری بات بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ یہ دیکھ کر تصدق صاحب کے دل میں رقابت کی چنگاری بھڑک اُٹھی۔

ایک اور بات نے اس چنگاری کو ہوا دی۔

عبداللہ حسین شیری کے ساتھ بات چیت میں ایسے محو ہوئے کہ چار گھنٹے گزر گئے، جب کہ وہ دو گھنٹے کے لیے آئے تھے۔ عبداللہ حسین کی گفت گو ادبی، علمی اور دِل نشین تھی۔

شام کو شیری نے تصدق سے کہا کہ وہ لوگ عبداللہ حسین کو کھانے پر لے چلتے ہیں۔ تصدق نے طوعاً و کرہاً آمادگی ظاہر کردی۔

وہ لوگ لندن کے علاقے گولڈرز گرین کے ایک خوب صورت چینی ریستوران میں چلے آئے۔

وہاں پر تینوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے اور گپ شپ کرنے لگے۔ یک دم عبداللہ حسین صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ تصدق صاحب سمجھ گئے کہ شیری نے میز کے نیچے سے عبداللہ حسین صاحب کو آمادگی کا واضح اشارہ دے دیا ہے۔ یہ دیکھنے کے باوجود تصدق صاحب اَن جان بنے خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اُن کا منصوبہ ساز ذہن ایک کہانی کا پلاٹ بُن رہا تھا۔

اگلے روز تصدق صاحب نے عبداللہ حسین کو صبح سویرے فون کر دیا۔

انھوں نے فون پہلی گھنٹی پر ہی اُٹھا لیا جیسے وہ فون کال کے منتظر ہوں۔ تصدق صاحب کی آواز سنتے ہی انھوں نے شیری کی تعریف شروع کر دی۔ تصدق صاحب نے بات بناتے ہوئے کہا ''شیری کو تم خاص پسند نہیں آئے۔ وہ کہتی ہے کہ تمھارا دوست مجھ سے بے وجہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا ہے۔''

یہ سن کر عبداللہ حسین سناٹے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولے ''وہ جھوٹ بولتی ہے۔ سب پیش قدمی اُس کی جانب سے تھی۔ یہ وہی تھی جس نے میرے گھٹنوں کو دبایا تھا۔'' پس جس بات کا تصدق صاحب کو شک تھا، اُس کی تصدیق ہو گئی۔

یہ علیحدہ معاملہ ہے کہ اُسی شام تصدق صاحب نے شیری سے قطع تعلق کر لیا۔ البتہ یہ پیوستہ معاملہ ہے کہ عبداللہ حسین ایسے خوددار اور وضع دار دوست نے بعدازاں ایک طویل خط کے ذریعے تصدق صاحب سے معذرت چاہی اور اظہار ندامت بھی کیا۔ اس چھوٹی سی غلط فہمی کے باعث اُن کے بیچ ہلکی سرد مہری بھی در آئی۔

''آج جب میں اُس واقعے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو خود ہی شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ بے وفائی شیری کا جوہر عام تھا۔ مجھ سے پہلے اور میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ بے وفائی کی باقاعدہ مرتکب ہوئی تھی۔ ویسے بھی میں اُس سے وفا کی اُمید نہ کرتا تھا۔ ہم دونوں دو علیحدہ ملکوں میں رہتے ہوئے دوسرے لڑکے، لڑکیوں سے اپنی اپنی جگہ نجی تعلقات رکھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو آزادی دے رکھی تھی۔ ہم تو اکٹھے بھی کبھی کبھار ہوتے تھے۔ میں عبداللہ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ واقعی ایک شریف اور باوقار دوست تھا۔ اسی لیے اب میں اُسے محترم عبداللہ حسین صاحب ہی کہہ کر بلاتا ہوں۔'' تصدق سہیل نے لمبی سانس بھرتے ہوئے مجھ سے حالِ دل بیان کیا۔

ایک مرتبہ عبداللہ حسین کراچی آ رہے تھے۔ میں نے تصدق صاحب سے تذکرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے خان صاحب سے تذکرہ کیا تو وہ بھی پرانے دوست کو ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ تارڑ صاحب انھیں پیدائشی نام محمد خان کی رعایت سے خان صاحب کہتے تھے۔ خان صاحب کی مصروفیات میں شریک ہونے کے باعث میں بھول ہی گیا تھا کہ انھوں نے تصدق صاحب سے ملاقات یاد دلائی۔ میں نے مصور کو فون کر کے وقت کا تعین کیا اور چند گھنٹے چرا کر عبداللہ حسین صاحب کو تصدق صاحب کے فلیٹ کے نیچے کافی شاپ میں لے گیا۔

تصدق صاحب منتظر تھے۔ وہ اِٹھلاتے ہوئے، گیلس لگا کر، سر پر ہیٹ پہنے سیڑھیاں اُترے اور بے قرار ہو کر خان صاحب سے ملے۔ خان صاحب بیماری اور گھٹنوں کی کم زوری کی وجہ سے سیڑھیاں نہ چڑھ سکتے تھے۔ کئی دہائیوں کے بعد یہ دو اہم دوستوں کی ملاقات تھی۔ خان صاحب نے تصدق صاحب کو پنجابی میں کافی پینے کی دعوت دی تو وہ شرارت سے دبی دبی ہنسی ہنسے اور بولے ''اب میں کچھ اور نہیں پی سکتا۔ بھلے وہ کافی ہی ہو۔''

دو پرانے دوستوں کے راز و نیاز میں زیادہ دیر مخل نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اجازت لی اور چند گھنٹوں کے لیے چلا آیا۔

ملاقات کے بعد تصدق صاحب بہت سرشار تھے۔ چند روز بعد ملاقات میں گویا ناچتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ''آپ نے میری عبداللہ سے ملاقات کرا کے بہت اچھا کیا۔ مجھے اُس سے پھر سے پہلے والا پیار ہو گیا ہے۔ اب میری اُس سے کوئی ناراضگی نہیں۔ آیندہ جب بھی میرے سامنے اُس کا نام لیں تو 'جناب عبداللہ حسین صاحب' کہیں۔''

یہ کہہ کر کچھ دیر توقف کیا، چہرے پر تشویش طاری کرنے کی اداکاری کی اور بولے۔ ''میرا دوست بیمار رہنے لگا ہے اور کم زور ہو گیا ہے۔ اس کا ایک علاج میرے پاس موجود ہے۔''

میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

بولے۔ ''اسے اچھی اور خوب صورت خواتین کی صحبت مل جائے تو پھر سے جوان ہو جائے گا۔ بڈھوں کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی بیماریاں سن سن کر خود بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے میں جوانوں میں رہتا ہوں۔''

یہ تجویز میں نے خان صاحب تک پہنچائی تو وہ جھنجلا سے گئے۔ ''اِک تے تصدق دے حواس جواب دے گئے نیں'' (ایک تو تصدق کے حواس جواب دے گئے ہیں)۔

عبداللہ حسین صاحب کی شادی اپنی بڑی بہن کے سسرال میں ہوئی۔ بہن کے دیور کی بیٹی سے، عمر میں اِن سے تین برس چھوٹی تھیں۔ بچپن سے یہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اِس شادی سے ان کے ہاں بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئے۔ برطانیہ قیام کے دوران جب خان صاحب مختلف ذرائع معاش سے وابستہ تھے، ان کی بیگم وہاں ڈاکٹر کے طور پر فرائض سرانجام دیتی رہیں۔

''میری بیوی بہت اعلیٰ ظرف، بڑے حوصلے اور دل کی مالک ہے۔ اُس نے میری بے اعتدالیوں سے سمجھوتا کیا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی علیحدہ زندگی بسر کرنا شادی کو مضبوط کرتا ہے۔ اِس طرح شادی بھی برقرار رہتی ہے اور اِنسان اپنے ادبی و دیگر مشاغل بھی قائم رکھ سکتا ہے۔''

''گجرات میں اوائلِ جوانی میں مَیں خاصا خوب صورت نوجوان تھا۔ مجھے نہ صرف لڑکیوں کی توجہ ملتی تھی بلکہ بہت سے مرد بھی میرے پیچھے ہوتے تھے۔'' خان صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے تھے۔

وطن واپسی پر خان صاحب اپنی بیٹی کے گھر سے ملحق خوب صورت انیکسی میں قیام رکھتے تھے۔ بیگم مقامِ دیگر پر سکونت پذیر رہیں۔ خان صاحب کے حوالے سے ایک خود مگن شخص کا تصور سامنے آتا رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو یا تو قریبی اقارب کے معاملے میں زیادہ جذباتی نہیں یا اِس کا اظہار نہیں کرتا۔ انھیں میں نے اپنے رشتوں خصوصاً بیٹی کے معاملے میں بہت جذباتی اور حساس پایا۔ اُن کی ذاتی گفت گو میں بیٹی کا تذکرہ کسی طور آ ہی جاتا تھا۔ بیٹی لاہور میں ایک ریسٹورنٹ کی مالکہ ہیں اور باپ سے عشق کرتی تھیں۔

ایک دفعہ بتانے لگے۔ ''میں خاصا بیمار رہنے لگا ہوں۔ میری بیٹی کہتی ہے کہ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو لوگ ایک بڑے ادیب سے محروم ہو جائیں گے۔ اصل نقصان میرا ہو گا۔ میرا باپ، میرا عشق ہے۔ میری زندگی اس کے بغیر نامکمل ہو گی۔''

میں نے چراغ سحری کی مدھم لَو میں، آخری دَور میں جب ے خانۂ حیات سے درماندگان ہست و بود تھکے بھکتے قدموں نکلے چلے آتے ہیں، قد آور ساقی کو دیکھا۔ سو یہ قصے محدود وقتوں کے ہیں۔

طویل القامت ادیب کندھے جھکا کر چلتے، کسی کو دیکھتے تو چند لمحوں بعد ہی آنکھوں میں شناسائی کی چمک آتی، سگریٹ پیتے تو دُور سے ایش ٹرے میں راکھ پھینکتے، وہ باہر بکھر جاتی تو اسے نظر انداز کر کے گفت گو میں مشغول ہو جاتے۔ بیٹے کا بھی سرسری تذکرہ ہوتا جو برطانیہ میں مقیم ہے۔

عجب معاملہ یہ ہے، گو اُردو ادب میں اُن کا تذکرہ اہم ترین لوگوں میں ہوتا ہے، اُن کے بچوں اور نواسے نواسیوں میں اُردو کا وہ ذوق پیدا نہ ہو پایا۔ شاید اس کی وجہ اُن کا برطانیہ میں طویل قیام تھا۔ اسی لیے اُن کے لاہور میں مقیم نواسے نے اپنے نانا کا محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ''میرے نانا ایک مشہور آدمی ہیں جن کی تصویریں اخباروں میں چھپتی ہیں۔ وہ ایک ایسی زبان میں لکھتے ہیں جسے میں پڑھ نہیں سکتا۔''

عمدہ کھانے کے بہت شائق تھے۔ گھر میں کھانا خود بھی پکاتے تھے۔ لذیذ کھانے کا ایک لقمہ چکھتے ہی اس کی تعریف کرتے۔ بسیار خور نہ تھے۔ ایک مرتبہ ہمیں ایک کھانے میں جانے کو اس لیے تاخیر ہو گئی کہ احمد شاہ صاحب کو اُن کی مصنوعی بتیسی لانے میں دیر ہو گئی۔ دانت یا تو جھڑ چکے تھے یا پھر کم زور ہو چکے تھے۔ اچھے جملے پر بچے کی طرح قہقہہ لگاتے جو خاصی دیر تک جاری رہتا۔ مزاج میں زندگی آمیز حرارت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ کھیلوں، کھانوں، موسیقی، کتابوں اور عورتوں میں دل چسپی رکھتے۔

خواتین سے جلد افلاطونی جذباتی وابستگی اختیار کر لیتے اور حقیقی طور پر ان کے خیر خواہ ہو جاتے۔ یہ عین قرینِ فطرت ہے۔

فکری سطح پر بین الاقوامی آفاقی نظریات کے حامل تھے۔ جغرافیے اور زمانے کے بلبلے سے آزاد تھے۔ چناں چہ اُن کے فلسفیانہ خیالات کا یہ کوتاہ نظر معاشرہ فی الحال متحمل نہیں ہو سکتا۔ چند نمونے پیش ہیں۔

وہ مذہب کے حوالے سے تشکیک کا شکار نہ تھے۔ اوائل عمری میں تقسیم کے فسادات نے اُن کا ذہن اِس حد تک متاثر کیا کہ وہ مقامی دتاریخی اور مذہبی اخلاقیات کے محور سے آزاد ہو کر بنیادی انسانی آفاقی اقدار کے مدار میں چلے گئے، یک زوجگی کو قطعی طور پر انسانی فطرت کے خلاف قرار دیتے اور اسے “عمر قید” سے تعبیر کرتے رہے۔ “جب انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو آزاد زندگی گزارے۔ شوہر اور بیوی کا ایک دوسرے کو شادی کے ادارے میں رہتے ہوئے آزاد کر دینا نہ صرف اُن کے درمیان رشتے صحت مند کرتا ہے بلکہ بنیادی انسانی جبلت کے بھی عین مطابق ہے۔ اس طرح ان میں محبت بھی بڑھتی ہے۔”

اہلِ خانہ سے محبت کی رنگین ڈور سے وابستہ ہونے کے باوجود شادی کے قائل نہیں تھے۔

“شادی اِنسان کی صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے۔” (اس بات سے اتفاق کرتا ہوں)۔

یک زوجگی اور اسی سے تا عمر بندھے رہنے کو تجرباتی تنوع کے لیے بڑی رکاوٹ مانتے ہوئے کہتے تھے “ایک تخلیق کار کا سب سے بڑا دشمن بچے کا پنگھوڑا ہوتا ہے۔ سائرل نامی مصنف نے اپنے وقت کی ایک معروف کتاب "Enemies of Promise" (صلاحیت کے بیری) لکھی تھی جس میں ثابت کیا تھا کہ بہت سے ایسے باصلاحیت نوجوان جو بھرپور تخلیقی قوت کے ساتھ ابھرے، فقط شادی کے ادارے کی وجہ سے وقت سے بہت پہلے ختم ہو گئے۔ ازدواجی بندھن انسان کو جسمانی اور ذہنی طور پر (مرد و زن دونوں پر منطبق) مقیّد کر دیتا ہے۔ اس سے ذہنی پرواز کوتاہ ہو جاتی ہے اور بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی بقیہ صلاحیت بھی موقوف ہو جاتی ہے۔”

عبداللہ حسین صاحب نے یہ بات کہی تو ٹالسٹائی سے لے کر جس نے ناکام ازدواجی زندگی گزاری کہ اُس کی بیوی بھری محفل میں گرم شوربے کی قاب اُس پر انڈیل دیتی تھی، ریمنڈ کارور تک یاد آتے ہیں جس نے پہلی شادی میں ناکامی کے بعد اپنے آپ کو شراب میں دھت رکھا (شادی کی ناکامی کی وجہ شراب میں دھت رہنا بھی ہو سکتا ہے، فریقین کے بیانات متضاد وجوہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں)۔ اسی طرح بہت سی خواتین ادیب اور شاعر شوہروں کی طرف سے مسائل کا شکار رہیں۔

خان صاحب اس بارے میں کہتے۔ “میری جتنی بھی شادی شدہ خواتین سے بے تکلفانہ گفت گو رہی، نوے فی صد سے زیادہ کو میں نے ازدواجی زندگی میں ناخوش پایا۔”

ذہن کا کیا کیجیے کہ اُس جانب بھی چلا جاتا ہے جدھر کام یاب تخلیق کاروں نے پُر مسرت اور بھرپور ازدواجی زندگیاں بسر کیں۔

بہر طور اس تعلق کے زاویے لامحدود ہیں اور کام یابی اور ناکامی کی وجوہ متنوع اور بعض صورتوں میں ہنوز نامعلوم ہیں۔ نٹشے بیان کرتا ہے “ناکام شادیوں کی بنیاد میں عدم محبت نہیں بلکہ دوستی کا فقدان ہوتا ہے۔” دونوں فریقین کی توقعات کے حوالے سے آئن سٹائن کہتا ہے “مرد عورت سے شادی کرتے ہوئے توقع رکھتا ہے کہ وہ شادی کے بعد ویسی ہی رہے گی، عورت مرد سے توقع رکھتی ہے کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائے۔ عموماً دونوں کو مایوسی ملتی ہے۔” معروف فلسفی سقراط نے تو ایک قدم بڑھ کر اور مشورہ دیا تھا “میرا مشورہ ہے کہ تم شادی کرو۔ اگر تمھیں اچھی بیوی مل گئی تو تم خوش گوار زندگی گزارو گے بہ صورت دیگر فلسفی تو بن ہی جاؤ گے۔”

خان صاحب اپنے خیالات میں آفاقیت اور مقام و زمانے کی حدود سے ماورا ہیں۔

جیفری آرچر بیسویں صدی کے مقبول ترین ادیبوں میں شامل ہے۔ وہ پاپولر ادب کا سرخیل ہے۔ اس کی کتابیں دسیوں کروڑ کی

تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں۔ وہ برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کا نائب چیئرمین بھی رہا۔ خاندانی امیر اور کامیاب سیاست دان ادیب لارڈ جیفری آرچر ایک بیسوا کے ساتھ مبینہ تعلقات کی وجہ اور نتیجتاً بدنامی سے بچنے کے لیے جعلی کاغذات تیار کر کے موقع سے عدم موجودگی ثابت کرنے کے الزام میں دو برس کے لیے جیل چلا گیا۔

یہ خبر دنیائے سیاست و ادب میں تہلکہ مچا گئی۔

جب متعلقہ طوائف سے پوچھا گیا کہ اُس کے پاس زیادہ تر کیسے لوگ آتے ہیں تو اُس نے بلا جھجک کہا ''شادی شدہ۔''

اس سے سوال کیا گیا کہ کیا شادی شدہ مردوں سے تعلقات استوار کر کے وہ شادیوں میں رخنہ ڈالنے کا سبب بننے پر شرمندہ نہیں ہوتی تو اُس نے سادگی سے جواب دیا ''یہ ہم بیسوائیں ہیں جو شادیاں برقرار رکھتی ہیں ورنہ جانے کتنی شادیاں ٹوٹ جائیں۔''

مغربی معاشرت میں دونوں فریقین کے مساویانہ حقوق کی بات ہوتی ہے، دیسی معاشرت میں مرد کو فوقیت حاصل ہے اور کثرت ازواج کی قانونی و شرعی اجازت۔ چناں چہ دونوں کا موازنہ ایک مدلل تحقیق کا متقاضی ہے۔

ایک رات فون پر معمول کی بات چیت کرتے ہوئے میں نے ایسا سوال کر ڈالا جو میں کسی عام ذہنی سطح کے شخص سے نہ کر سکتا تھا۔ میں نے عرض کیا۔

''خان صاحب ہمارا معاشرہ پدرسری Patriarchal ہے۔ مرد کا کثرتِ زن کا تصور تو سمجھ میں آتا ہے مگر کیا مرد، عورت کو جسمانی اور ذہنی طور پر آزاد کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ آپ اِس معاملے میں خود کو کہاں پر کھڑا پاتے ہیں؟''

دوسری جانب خاصی دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد وہ کھنکھار کر بولے ''ہماری طرح کے پابند اور مقید معاشروں میں فی الوقت ایسا ممکن نہیں۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے۔ میں علمی اور فکری طور پر اس سوچ کا قائل ہوں۔ عملی طور پر اپنے آپ کو ابھی پوری طرح آزاد نہیں سمجھتا۔''

وہ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کے لیے کلیشے پھوڑنا پڑتے ہیں۔ پرانی سوچ کے ملبے سے جہان تازہ جنم لیتا ہے، اُس کی تعمیر ہوتی ہے۔

مکالمے بند معاشروں میں نہیں ہوتے۔ حقیقی زندگی میں اُردو کے دیو قامت ادیب کو میں نے اکثر و بیش تر تنہا کسی گوشے میں بیٹھے دیکھا۔ ہجومِ یاراں کا رُخ بریانی کے کھوکھوں یا پردۂ سیمیں کے چہروں کی جانب ہوتا تھا۔ گو اداکاروں کے گرد پرستاروں کا غول صحت منداور ثقافتی طور پر متحرک معاشروں کی علامت ہوتا ہے۔ تہذیبی طور پر فعال معاشروں میں تو ادیب بھی سٹار ہوتا ہے، شاید سب سے بڑا اسٹار۔

ایک ادیب اور شاعر معاشرے کو کچھ دیتا ہے۔ وہ زندہ، سوچنے اور محسوس کرنے والے معاشرے کی علامت ہوتا ہے۔ وہ ممالک جہاں اُسے مناسب معاوضہ نہیں دیا جاتا، کم از کم عزت ہی دی جائے۔ وہ لوگ قابلِ رحم ہیں جو ادیبوں کے کردار اور تخلیقات کا ذاتی سطح پر اُتر کر اوچھے انداز میں احتساب کرتے ہیں۔ حساب تو اُس شے کا لیا جاتا ہے جو دی جائے۔ سیاست دان، سرکاری ملازم یا حکومتی اہل کار کا احتساب درست سہی، بے چارے ادیب کو عزت ہی دے دی جائے۔ وہ سخی تو بلا قیمت اپنے خونِ جگر سے سوسائٹی کو زندگی بخشتا ہے۔

عبداللہ حسین سرکاری اعزازات کے خواہش مند نہ تھے۔ وہ کہتے تھے ''مالی فائدے کے بغیر اعزاز بے معنی ہے۔ اگر عسکری، سرکاری اور دیگر اداروں کے ملازمین کو مربعے پلاٹ اور دیگر مراعات دی جاتی ہیں تو کم از کم نمایاں ادیبوں کو قابلِ ذکر رقم دی جانی چاہیے۔ میرے مرنے کے بعد اگر کسی چوک کا نام میرے نام سے منسوب کر دیا جائے تو مجھے کیا حاصل۔ میرے لیے اہم تو وہی شے ہے جو زندگی میں میرے لیے سُود مند ہو۔''

تحریر کے حوالے سے صلاح مشورہ کرتے۔ اپنی انگریزی کتاب An Afghan Girl کا مسودہ رائے کے لیے معروف اور جوان انگریزی ادیبوں محمد حنیف اور ایچ ایم نقوی کو بھجوایا۔ نقوی نے اپنے اگلے انگریزی ناول کا مسودہ اُنھیں پڑھنے کے لیے پیش کیا تو انھوں نے نہ صرف اسے بغور پڑھا بلکہ خاصی تعریف کی۔

ایک روز میں، مستنصر حسین تارڑ صاحب اور خان صاحب اکٹھے گاڑی میں جا رہے تھے۔ کسی بات پر ہنستے ہنستے عبداللہ حسین صاحب یکا یک چپ ہو گئے۔ چلتی گاڑی میں لحوں سکوت طاری رہا، پھر خان صاحب ہولے سے بولے ''بلھیا میں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور۔''

تارڑ صاحب کسی کو خاطر میں کم ہی لاتے ہیں، عمر کے ساتھ در آنے والی عبداللہ حسین کی بے وجہ کی ناراضی کی گفت گو ہنستے ہوئے سن لیتے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ گزرتی عمر کے ساتھ انسان کے مزاج میں درشتی اور تلخی آ ہی جاتی ہے۔

عموماً خان صاحب روزمرہ بول چال میں پنجابی، رسمی گفت گو میں اردو اور برہمی میں انگریزی بولتے تھے۔ انھیں اکھنڈ بھارت میں ختم ہوتی اردو کا بہت دکھ تھا۔ چند کوتاہ نظر نہیں جانتے کہ اگر پاک وطن وجود میں نہ آتا تو بھلے مسلمان اکھنڈ بھارت میں کتنی ہی بڑی اقلیت کیوں نہ ہوتے، ان کی زبان و ثقافت ویسے ہی معدوم ہوتی چلی جاتی جیسی کہ دنیا بھر میں اقلیتوں کی روایت رہی ہے۔

بڑھتی عمر نے اُن کے حافظے پر خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ کسی موقع پر گزشتہ ملاقاتوں سے متعلقہ جزئیات کا تذکرہ کر کے اُن میں سے کوئی ایک موضوع چُن کر اُس پر اظہارِ خیال شروع کر دیتے۔

ایک شام ہم اکٹھے کراچی میں کھانے پر جا رہے تھے۔ میں گاڑی چلا رہا تھا، عبداللہ حسین اگلی نشست پر بیٹھے تھے، مستنصر حسین تارڑ، اُن کی اہلیہ میمونہ اور میری بیوی پچھلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ہم شارع فیصل پر رواں دواں تھے جہاں زندگی پوری طرح تاب ناک تھی۔ گاڑی کے اندر قہقہے چھوٹ رہے تھے اور کراچی، لاہور کے موازنے، زندگی کے تجربات اور مختلف شخصیات کے بارے میں آراء کے حوالے سے گفت گو کی جا رہی تھی۔

عبداللہ حسین خاصی دیر سے خاموش تھے۔ میں نے اُن سے پنجابی میں پوچھا۔ ''خان صاحب! خیریت ہے، آپ بیچ لگژری ہوٹل سے اب تک خاموش ہیں، ہمیں جس دوست کے ہاں جانا ہے وہاں بڑے زندہ دِل لوگ ہوں گے، عمدہ لذیذ کھانا ہوگا اور اعلیٰ موسیقی کا انتظام ہے۔ پھر یہ اُداسی کیسی؟''

اُنھوں نے نیم دِلی سے قہقہہ لگایا اور بولے۔ ''کل صبح لٹریچر فیسٹیول میں اپنے سیشن کے دوران مجھے احمد شاہ ایسے بے باک اور جملے باز آدمی کا سامنا کرنا ہے۔ سوچ رہا ہوں اسے کس طرح سنبھالنا ہے۔'' اس کے بعد معصومیت سے بولے۔ ''اِک تے آصف (آصف فرخی) نے مینوں اوہدے سامنے پاڈِتا اے کہ آ جا بھئی، جو کرنا اے کر لے۔ میں سوچیا اے کہ اوہدی ہر گل تے کہواں گا کہ تُسی ٹھیک کہ رہے او۔ بس اوہ آپے ای ٹھیک ہو جاوے گا۔''

(ایک تو آصف (آصف فرخی) نے مجھے اُس کے سامنے ڈال دیا ہے کہ آ جا بھئی، جو کرنا ہے کر لے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ اُس کی ہر بات پر کہوں گا کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ بس وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا)

اس پر میں نے عرض کیا۔ ''خان صاحب فکر نہ کریں۔ شاہ صاحب دل کے صاف آدمی ہیں اور آپ سے تو باقاعدہ محبت کرتے ہیں۔ بس وہ تو سیشن کو دل چسپ بنانے کے لیے شرارتیں کر لیتے ہیں۔''

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کون سے پہلے حسین ہیں، اس سے پہلے بھی تو ایک حسین (اشارہ مستنصر حسین تارڑ کے اسلام آباد کے گزشتہ ادبی میلے میں احمد شاہ کے ساتھ گرما گرم اور دوٹوک سیشن کی جانب تھا) اُن کا سامنا کر چکے ہیں۔''

باگھ

اس پر عبداللہ حسین نے سینے سے اُبلتا ہوا ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور شگفتہ لہجے میں بولے۔

''کتنا ہی اچھا ہو اگر انتظار حسین کی بھی باری آ ہی جائے۔ ایک مرتبہ تو احمد شاہ اُنھیں بھی برابر کر ہی دے۔''

وقفے کے بعد بولے۔ ''مگر آصف فرخی ایسا کبھی نہیں کرے گا۔''

اس دوران کار بازو کی ایک سڑک پر مڑ گئی اور موضوع بدل گیا۔

وہ قہقہہ اُن قہقہوں میں سے ایک تھا جو عبداللہ حسین اپنے قریبی رفقا میں سرسری انداز میں کہی گئی کسی شگفتہ بات پر لگاتے تھے۔

وہ صاحبِ فراش تھے، میں ان کی عیادت کو گیا تو شکوہ کرتے ہوئے کہنے لگے ''نہ جانے مجھ سے کون کون سی بڑی سی بیماریاں چپک گئی ہیں۔ ادھر میری عمر ہی کیا ہے، فقط 83 برس۔ اُدھر 90,90 برس کے بابے بھاگے پھرتے ہیں۔'' غالباً اُن کا اشارہ انتظار صاحب کی جانب تھا جو نوے برس کے قریب کی عمر میں بھی پوری طرح فعال تھے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ادبی میلوں کے حوالے سے آزردہ ہو کر کہنے لگے ''اُردو ہماری زبان ہے۔ ہمارا بہترین ادب اُردو ہی میں تخلیق ہوا ہے۔ اِن ادبی میلوں کا ایک بڑا المیہ انتظامیہ میں انگریزی زبان کے ادب کی غیر معمولی پذیرائی ہے۔ ہمارا انگریزی ادب ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور ہماری جغرافیائی سیاسی اہمیت کی وجہ سے اِن دنوں مرکزِ توجہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو کے نام ور اور اہم ادیبوں کو ذیلی حیثیت دے کر انگریزی کے لوگوں کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ نئے لکھنے والوں کو فنکشن کے مرکزی مقام پر بٹھایا جائے اور اُردو کے اہم ادیبوں کو چھوٹے چھوٹے کمروں میں دھکیل دیا جائے۔ یہ اجتماعی قومی احساسِ کم تری کی علامت ہے۔''

اُن کی شخصیت میں دو متضاد جذبات واضح طور پر پوری قوت سے موجود ہوتے۔ مجھے اِس کا دل چسپ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ کراچی لٹریری فیسٹیول میں انتظار صاحب نے مرکزی لان میں منعقد ہونے والی افتتاحی تقریب کی صدارت کی۔ اُس چمکیلی صبح کولونیل انداز کے بیچ لگژری ہوٹل کا سرسبز لان اور نمکین بحری ہوا میں پھڑ پھڑاتی قناتوں کے پس منظر میں نیل گوں سمندر یوں جاذبِ نظر ہو رہا تھا جس طرح اُس میں نیلاہٹ اُنڈیل دی گئی ہو۔ اُس پر چند سمندری پرندے نیچی پرواز کرتے تھے اور قریب میں ایک گھنا سمندری جھاڑیوں کا جزیرہ نما اُسے دل کشی عطا کرتا تھا۔ ایسے میں سٹیج پر انتظار صاحب خطاب کر رہے تھے۔ سامنے برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر ممالک کے عمائدین صبح کی چمکیلی دھوپ کی تمازت میں اپنے سرخ ہوتے گورے چہروں پر آئی نمی کی بوندیں پونچھتے اور اخباری پنکھے جھلتے تھے۔ انتظار صاحب کے قدموں کے سامنے قد آور اور باوقار عبداللہ حسین بیٹھے تھے۔ اُن کی خواہش پوری ہو رہی تھی کہ اُردو کے ادیب کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ مگر عبداللہ حسین کے چہرے پر مسرت مترشح نہ تھی۔ البتہ منتظم و مہتمم آصف فرخی نے تعارفی کلمات میں دانائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامنے بیٹھے عبداللہ حسین کی ایک تحریر کا حوالہ دیا تو عبداللہ حسین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''آصف نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ اس نے سب لوگوں کے سامنے میری تعریف کر دی۔ اب سب ادیب میرے دشمن ہو جائیں گے۔''

گویا اپنا مرکزِ نگاہ ہونا ان کے مزاج بے اعتنا پر بھاری پڑ رہا تھا۔

برطانوی محاورے کے مطابق وہ تیز ناک کے مالک تھے اور اُن کا تجربہ اور چھٹی حس عموماً درست ثابت ہوتے تھے۔ جلد رائے قائم نہ کرتے اور جب قائم کر لیتے تو عموماً وقت اسے درست ثابت کر دیتا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کو ''بیبا بندہ'' (شریف آدمی) اور شکیل عادل زادہ صاحب (گو ان سے کم ملاقات رہی) کو ''چنگا بندہ'' کہتے تھے۔ تارڑ صاحب کو بے حد عزیز جانتے تھے مگر دو اعتراضات کرتے تھے۔ پہلا اعتراض اُن کے حج کے سفرنامے اور دیگر اُن تصانیف پر کرتے تھے جن میں مذہبی رنگ غالب آ گیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ دائیں بازو کے رجحان والے لوگوں نے اعلیٰ ادب کم تخلیق کیا، یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کے اہم ناموں میں واضح مذہبی رجحان والے لوگ خال خال نظر آتے

ہیں۔ دوسرا اعتراض تارڑ صاحب کی زود نویسی پر ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تارڑ صاحب کی نثر کہیں کہیں پٹڑی سے اُتر جاتی ہے اور اس میں غیر ضروری الجھاؤ اور تفصیلات دَر آتی ہیں۔ ان دو معمولی اعتراضات سے ہٹ کر وہ تارڑ صاحب کو اپنا دوست، اہم ادیب اور خیر خواہ سمجھتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

تارڑ صاحب ادب، صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کی معروف ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ اس کے برعکس طویل غیر ملکی قیام اور کچھ افتادِ طبع کی وجہ سے لوگ عبداللہ حسین کے چہرے سے خاص واقف نہیں تھے۔ چناں چہ ایک ادبی میلے میں تارڑ صاحب کے پرستار اُن سے ملنے کے لیے سندھ کے دُور دراز حصوں اور کراچی کے مختلف گوشوں سے آئے۔ اُن میں سے چند لوگ تحائف بھی لائے۔ ان کے چاہنے والے اس کے علاوہ ان کے لیے عمدہ دعوت اور کشتی پر سمندر کی سیر وغیرہ کا بھی خوب اہتمام کرتے۔

سارا دن تارڑ صاحب اور عبداللہ حسین صاحب کی سرپرستانہ رفاقت میں گزار کر شام کو میں تازہ دَم ہو کر ان کے ہاں دوبارہ پہنچا تو عبداللہ حسین، تارڑ صاحب کے کمرے میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ باتیں کرتے کرتے تارڑ صاحب نے ان تحائف کو بہت محبت سے سنبھالنا شروع کر دیا۔ سندھی اجرک، سُوٹ کا عمدہ کپڑا، سجاوٹ کا سامان اور خوردنی سوغاتیں۔

غرضیکہ تارڑ صاحب تحائف کو سنبھال رہے تھے اور عبداللہ حسین صاحب کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ اپنی پوری زندگی ادب کو دینے والے عبداللہ حسین کے چہرے پر حسرت تھی، بے اعتنائی یا کوئی اور جذبہ میں اُسے درست طرح سے سمجھ تو نہ پایا لیکن اُن کے چہرے پر ایک رنگ واضح طور پر آ کر گزر گیا۔ (عبداللہ [illegible]؟)

ایک محفل میں لوگ چند ایسے اہم ادیبوں، ڈراما نگاروں اور شاعروں کے گرد جمگھٹا لگائے ہوئے تھے جو ٹی وی کے معروف چہرے بھی تھے۔ عبداللہ حسین ایک جانب تنہا بیٹھے یہ سب دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں چائے کا کپ تھامے ان کے پاس جا بیٹھا اور گپ شپ کرنے لگا۔ جب میں نے بعد کی ایک ملاقات جو اُن کی لاہور کے گھر پر ہوئی تھی، اُن کا نام اور کام معروف اور چہرے کے نسبتاً کم معروف ہونے کا تذکرہ کیا تو وہ قہقہہ لگا کر بولے ''میں بہت معروف ہوں۔ محلے بھر کے نوکروں میں مشہور ہوں، صبح سیر کے لیے نکلتا ہوں تو اِن سے خوب گپ بازی رہتی ہے۔ اپنے مالکوں کے گھریلو معاملات جی کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے ان سے کئی کہانیاں مل جاتی ہیں۔''

بعد میں سنجیدہ ہو کر بولے ''اس طرح میں اپنی آزادی کا لطف لیتا ہوں۔''

اسی طرح کراچی پریس کلب میں ایک تقریب کے دوران جب ''آج'' رسالے کے مدیر اجمل کمال صاحب سے اُن کا تعارف کروایا گیا تو وہ بے اختیار اسٹیج سے بول اٹھے ''اچھا آپ ہیں 'آج' کے مدیر اجمل کمال، جنھوں نے میرا افسانہ ترامیم اور نظرِ ثانی کے لیے واپس کر دیا تھا۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی، ہاہاہا۔''

عرصہ بعد مجھ سے کہا کہ اہم ادیبوں کی تحریروں کا نظرِ ثانی کے لیے واپس ہونا معمول کی بات ہے۔

سر ولیم گولڈنگ اپنے لافانی ناول 'لارڈ آف فلائیز' کی وجہ سے زیادہ معروف ہیں۔ انھیں اپنی وفات سے دس برس قبل 1983 میں نوبل انعام دیا گیا۔ ''لارڈ آف فلائیز'' کو اپنی پہلی اشاعت سے قبل بیس مختلف پبلشرز نے رَد کیا۔ اس کتاب کا ایک دل چسپ پہلو اس میں عورتوں کا عدم وجود ہے۔ سر ولیم اپنے ناقدین سے اس حد تک برگشتہ تھے کہ اپنے کسی بھی نئے ناول کی اشاعت کے موقع پر ملک چھوڑ جاتے تھے۔ نوبل انعام ملنے کے نتیجے میں انھیں مزید عالمی شہرت ملی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک تخلیق پبلشر کو بھجوائی تو اس نے اسے نظرِ ثانی کے لیے لوٹا دیا۔

''اداس نسلیں'' لکھنے کے بعد انھوں نے قریباً ڈیڑھ دہائی انتظار کیا۔ جب ایک خیال نے انھیں تخلیقی طور پر متاثر کیا تو اگلا ناول ''باگھ'' لکھا۔ باگھ چیتے کے لیے ایسا لفظ ہے جو برصغیر میں، جہاں ہر چند میل بعد لہجہ اور زبان بدل جاتے ہیں، ہندوکش سے بحیرۂ عرب تک

مستعمل ہے۔ خان صاحب درحقیقت 'باگھ' کو اپنا سب سے اہم کام قرار دیتے ہوئے یقین سے کہتے تھے "ایک اہم ادبی کہاوت ہے، ناول نگار کے صحیح مقام کا تعین اُس کا دوسرا ناول کرتا ہے۔ دوسرا کامیاب ناول دوسری شادی کی طرح زیادہ سوچا سمجھا گیا ہوتا ہے، اسی لیے دوسری شادی کی طرح دیرپا بھی۔"

گویا پہلا اچھا ناول لکھ لینا اتفاقیہ یا حادثاتی فعل ہوسکتا ہے۔ فن کارانہ چابک دستی دوسرے ناول میں سامنے آتی ہے۔

ناول میں باگھ ایک کردار ہے جو آزاد جموں وکشمیر کے پہاڑوں میں دہاڑتا ہے تو اُس کی گونج دل دہلا دیتی ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ایک معما ہے، اسرار کی دُھند میں دُور سے لشکارے کا گمان کراتا نامعلوم کا استعارہ۔ جس طرح عبداللہ حسین نے اپنے آپ کو عوامی شہرت سے دور، ذاتی زندگی کے محفوظ حصار میں گوشہ نشین رکھا۔ پس اپنے قلم کی خیرہ کن جولانیوں کے ساتھ میدانِ ادب میں پُر وقار چال چلتے ہوئے داخل ہوئے اور تمکنت سے شہ نشین ہوئے وہ ان کے تحت الشعور سے بہ صورتِ باگھ تخلیقی سانچے میں ڈھل کر نمایاں ہوا، ایک پُرشکوہ اور بارعب کردار، ادب میں "باگھ" کا زندہ استعارہ۔ ایک ایسے زندگی سے بھرپور ادیب جو مستقبل کی جانب نظر رکھتے تھے۔ اس معاشرے میں جہاں بہت سے لوگ ساٹھ برس کی عمر کے بعد اپنے ایامِ گزشتہ کو دیمک زدہ لہجے میں حسرت سے یاد کرنے لگتے ہیں عبداللہ حسین دوسری طرح کے آدمی تھے۔ ایک مخملیں رات آب نائے عرب میں سمندری جھاڑیوں کے قریب سے ہوکر گہرے پانیوں میں جاتی کشتی میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے "میں ایک تحریر لکھ کر اُسے سسٹم سے باہر نکال دیتا ہوں اور آگے چل دیتا ہوں" اس کے بعد اپنی مخصوص ہنسی ہنسے اور بولے "میرا ایک انگریزی ناول مکمل ہوا ہے، میں چند اور موضوعات پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، ابھی کافی کچھ کرنا ہے۔" بات مکمل کر کے وہ دُور دیکھنے لگے۔ شاید کوئی اور فن پارہ اُنھیں دُور دھندلکوں سے نمایاں ہوتا نظر آ رہا تھا۔ کشتی نے رخ موڑ کر زور پکڑا اور تیزی سے گہرے پانیوں کی جانب روانہ ہوئی تو چاند کی روپہلی کرن سطحِ آب سے منعکس ہوئی اور رات کے اندھیرے میں روشنی جھلملانے لگی۔

وہ روشنی حیات آمیز نہ تھی۔ فلک پر تلوارِ قضا لہرائی تھی۔ سو عبداللہ حسین صاحب نے چند ماہ بعد عالمِ افلاک کا قصد کیا اور جہانِ خاکی سے جہانِ بالا کو انتقال کیا۔

انھوں نے اپنی وفات سے چند روز پہلے تاسف بھرے لہجے میں ایک اعتراف کیا۔ "مجھے ایک افسوس ہے۔ میں نے اپنی مرضی کے مطابق ایک بھرپور زندگی گزاری ہے، اپنے حصّے کی شہرت کمائی ہے، کامیابیاں حاصل کی ہیں تو ناکامیاں بھی پائی ہیں، پر ایک غلطی ایسی ہے جسے میں اب درست نہیں کرسکتا، اسی کا افسوس ہے۔"

اُردو کے ہمہ گیر وقد آور ادیب نے توقف کیا اور بولے "میں اپنے اہلِ خانہ کو پوری توجہ نہیں دے پایا۔"

کُہن سالہ فن کار کی سُرمئی افسردگی کے پیچھے ایک کہانی تھی اور ایک عالم گیر حقیقت بھی!

جب وہ بیمار ہوئے تھے تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ مزید ٹیسٹ ہوئے تو خوف ناک تشخیص سامنے آئی، اُنھیں کینسر تھا۔ لاہور میں وہ گھنٹوں ڈاکٹر کے کلینک، اسپتال اور لیبارٹری کے باہر بیٹھے رہتے۔ کئی مرتبہ مجھ سے جھلائے لہجے میں کہا۔ "اِس عمر میں اتنا انتظار نہیں ہوتا۔"

اُنھی دنوں مستنصر حسین تارڑ بیمار ہوکر آپریشن کے لیے اسپتال گئے تو عبداللہ حسین کی پریشانی دیدنی تھی۔ بار بار بے چین ہوکر اُن کی خیریت دریافت کرتے۔ اپنی فیس بک پر بھی سب کو اُن کی صحت کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی۔ اُن کا والہانہ جذبہ غیر معمولی تھا۔

اُدھر مستنصر حسین تارڑ کے بچے بیرونِ ملک سے باپ کی عیادت اور خدمت کو بھاگے چلے آئے۔ ڈاکٹر بیٹی، آپریشن کے دوران تھیٹر میں باپ کے ساتھ رہی۔ بڑا بیٹا اقوامِ متحدہ کی اہم ذمہ داریاں چھوڑ کر پائنتی سے لگ کر بیٹھ گیا اور چھوٹا بیٹا دن رات خدمت کرنے لگا۔ اُن کی بیگم بھی پورے دل وجان سے اُن کی صحت کے لیے دعا گو رہیں۔

اِدھر کینسر کی تشخیص کے بعد عبداللہ حسین صاحب کی بیگم اور بیٹا، گو اُن کے لیے جذبۂ ہم دردی میں پیش پیش تو رہے مگر تیمارداری

میں بڑھ نہ پائے۔ کینسر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ تخلیق کار تنہائی کا شکار ہو گئے۔ پس اُن کی بیٹی، جو اُن کا عشق بھی تھی، بیٹوں سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔ چند جگہیں تو پُر ہوئیں مگر بہت سی خالی رہ گئیں۔ انھوں نے لاشعوری طور پر اپنا موازنہ کیا اور خاندان کے ترازو میں تارڑ صاحب کا پلڑا بھاری پایا۔ تبھی وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

’’مجھے ایک افسوس ہے۔ میں نے اپنی مرضی کے مطابق بھرپور زندگی گزاری ہے، اپنے حصے کی شہرت کمائی ہے، کامیابیاں حاصل کی ہیں تو ناکامیاں بھی پائی ہیں۔ پر ایک غلطی ایسی ہے جسے میں اب درست نہیں کر سکتا۔ میں اپنے اہلِ خانہ کو پوری توجہ نہیں دے پایا۔‘‘

اپنی تنہائی کا احساس فزوں تر تھا۔ ان کے تحت الشعور میں زندہ رہنے کی خواہش بے پناہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر لمحے کا حساب رکھتے تھے۔ گویا 83/84 کی تکرار عددی مسئلہ نہیں تھا، ہاتھ سے بہتا پھسلتا عمر کا پارا تھام رکھنے کا معاملہ تھا۔ ایک بار کہنے لگے ’’کسی پر لکھی تحریر ایسی ہونی چاہیے جو فوت ہوئے شخص کو زندہ سامنے لے آئے۔ ایسی نہ ہو جو زندہ کو اُداسی میں دُھندلا دے۔‘‘ وہ بہ ظاہر کہتے تھے کہ انھیں جو کچھ کرنا تھا، کر لیا، اب چلے جانے کا وقت آنے کو ہے۔ درحقیقت ان میں زندگی کی خواہش بھرپور توانائی سے ہمہ وقت موجود تھی۔

اُن کی وفات کے کئی روز بعد میں تارڑ صاحب کے پاس اُن کی اسٹڈی بیٹھا عبداللہ حسین کو یاد کر رہا تھا تو وہ بولے۔ ’’عبداللہ کا آخری دنوں مجھ سے والہانہ تعلق میرے لیے بھی حیران کن تھا۔ ہم دوست تو ضرور تھے مگر اپنے خون کے رشتوں سے بڑھ کر میرے لیے اُن کا فکرمند ہونا اچنبھے کی بات تھی۔‘‘

تارڑ صاحب نے گہری سانس لی اور بولے۔

’’انھیں شاید مجھ میں اپنی موت نظر آ رہی تھی۔ وہ میری بیماری میں اپنا عارضہ دیکھ رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ معین اختر کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک انٹرویو میں کہہ دیا کہ آیندہ شاید میں ناول نہ لکھوں۔ مجھ میں ہمت نہیں۔ میرا انٹرویو پڑھ کر معین اختر نے مجھے فون کیا۔ اُس کا اور میرا تعلق رسمی تھا۔ اُس روز وہ بہت اپنائیت سے دیر تک بات کرتا رہا۔ دلاسا دیتا رہا کہ مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ابھی تو میری بہت عمر پڑی ہے۔ میں اِس طرح اُس کے اچانک فون پر حیران رہ گیا۔ اُس فون کے دس پندرہ روز بعد وہ خود فوت ہو گیا۔‘‘

کمرے کی سوگ وار خاموشی کے دوران میں نے پوچھا ’’آپ نے اتنے روز اسپتال میں پے در پے آپریشن کروانے میں، بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے بیچ گزارے ہیں۔ آپ کے سے نکتہ رس نے کوئی نئی بات سیکھی؟‘‘

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ’’یہ شہرت، مقبولیت، نام، مقام سب نظر کا دھوکا ہے۔ It is all an illusion جو چیز اہم اور حقیقی ہے، وہ آپ کے خون کے رشتے اور چند ہمدرد دوست ہیں۔ باقی سب فریبِ نظر ہے۔‘‘

چند روز بعد ایک چائنیز ہوٹل میں تپتی دوپہر سے عافیت میں کھانے کھاتے ہوئے میں نے یہ مکالمہ امجد اسلام امجد اور اصغر ندیم سیّد جیسے دانش مندوں کے سامنے دہرایا تو وہ بے اختیار یک زبان بول اُٹھے ’’کھرا سچ ہے۔ بے شک یہی سچ ہے۔‘‘

یقیناً عبداللہ حسین صاحب حقیقت آشنا تھے، سچ جانتے تھے اور سچ کے علم بردار تھے۔ اسی لیے شہرت اور مقبولیت کے فریب میں نہ آئے۔ زندگی بھر اس سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ کھری بے لوث اور تخلیقی طور پر بھرپور زندگی گزاری۔

اِس وقت رات کے پچھلے پہر جب لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند کے مزے لے رہے ہیں اور سڑک پر کتوں کے بھونکنے اور چوکی دار کی سیٹی کی آوازیں خاموشی کے چہرے پر خراشیں ڈالتی ہیں، میں ٹیبل لیمپ جلائے لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ الفاظ نظروں کے سامنے نمی کے باعث دھندلا جاتے ہیں۔ میرے کانوں میں جیتے جاگتے، مخصوص ہنسی ہنستے، عام باتوں کے بیچ بین الاقوامی کلیے اور ادب سے چنیدہ جملے ٹانکتے، سرپرستانہ انداز میں ڈانٹتے، اس منافقانہ معاشرت میں ٹھک سے کھری بات داغتے، محبت بھرے عبداللہ حسین آ جاتے ہیں۔ عام بول چال میں پنجابی، غصے میں انگریزی اور رسمی گفت گو میں اُردو بولتے آدمی۔ عمر کے ماہ و سال گزرنے کے ساتھ غالبؔ دل کے اور قریب ہوتا

باگھ

جاتا ہے اور اس کے اشعار کی تفہیم بڑھتی جاتی ہے۔ اُس نے فلک سے شکوہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا۔ کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور۔

مذہب کی جانب اُن کا رجحان قابلِ رشک نہ تھا اور خواب و اسرار کو وہ انسانی تحت الشعور کی خامہ فرسائی اور وہم سمجھتے تھے۔ وفات سے چند روز پہلے انھوں نے اپنا ایک خواب سنایا، وہ متذبذب، حیران اور بھیگے لہجے میں بولے:

’’کل رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب میں مَیں نے سمندری چٹان پر تین سی گل (سمندری بگلے) دیکھے۔ اُن پاکیزہ پرندوں کے سفید بدن اور پروں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ اُن میں ایک جانب کے پرندے نے درمیان کے پرندے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ’یہ تمھاری ماں ہے‘ میں نے درمیانی پرندے کو بغور دیکھا۔ اُس نے مجھے پیار سے اپنے پروں میں لے لیا جہاں مجھے بے پناہ شفقت اور محبت محسوس ہوئی۔‘‘

اگلے روز میں نے یہ خواب آصف فرخی کو سنایا اور ہم دونوں اداس اور افسردہ ہو گئے۔ ہوتے بھی کیوں نہ۔ عبداللہ حسین صرف چھ ماہ کے تھے جب اُن کی ماں فوت ہو گئی تھیں۔ ماں کی کمی کا احساس اور ماما کے لیے تڑپ ننھے محمد خان (عبداللہ حسین) کی عمر بھر کی ساتھی رہی۔ اُنھوں نے یہ کمی اپنے باپ میں پوری کی۔ دونوں گجرات کے قریب کھیتوں، جنگلوں، دریا کنارے بیلے میں نکل جاتے، لمبی سیریں کرتے، پرندے تکتے اور شکار کرتے۔ جب عبداللہ حسین کی عمر بائیس چوبیس برس کی تھی تو والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ حساس اور تنہا عبداللہ حسین کو باپ کی موت گویا کھا ہی گئی۔ پس وہ گوشہ نشین ہو کر نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئے۔

وہ نروس بریک ڈاؤن سے تو نکل آئے لیکن گوشہ نشینی اور تنہائی اُن کے عمر بھر کے رفیق رہے۔ اس تنہائی میں اُن کی رغبت ادب کی جانب بڑھی، مطالعہ ادراک کا دروازہ بھی تھا اور فرار کا رستہ بھی۔ اپنے مشاہدات کے حوالے سے عبداللہ حسین نے بیان کیا۔

’’میں پیچھے مڑ کر دور ایک صبح کو دیکھتا ہوں جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ میں ساری رات مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا تھا۔ صبح سویرے ہم لڑکوں نے اسکول جانے کے بجائے سائکلوں پر ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ بنوں سے ہندوؤں اور سکھوں کو ہندوستان لے جانے والی ٹرین کو ہمارے اسٹیشن پر قبائلیوں نے روک لیا تھا۔ وہ قبائلی کشمیر میں لڑنے کے لیے جاتے ہوئے ہمارے شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے ٹرین کے مسافروں کو ذبح کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے شہر کے لوگ بھی جوش و جذبے سے اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم نے اپنے ڈرائنگ کے استاد کو دیکھا۔ وہ شاعر اور گلوکار تھا اور ہمارا مثالی استاد بھی۔ اُس نے ایک نہتے موٹے شخص کو گتھم گتھا ہو کر زمین پر گرا لیا اور بے دردی سے اُس پر ایک بڑی قینچی کے وار کرنے شروع کر دیے۔ اُس نے کُرتے کو سامنے سے چیر کر اُس کی صدری کی جیبیں پھاڑ ڈالیں۔ اُن میں کرنسی نوٹ اور سونے کے زیورات تھے۔ ماسٹر سرور نے لوٹ مار کا سامان سمیٹا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر وہاں سے بھاگا۔ پلیٹ فارم لاشوں اور زخمیوں سے اَٹا پڑا تھا۔ میں سولہ برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ پس وہ نہ صرف ہمارے خوابوں کا خاتمہ تھا بلکہ دنیا سے بھی ہمارا رومان ختم ہو گیا۔ بعد میں ہم میں سے بہت سے گوشہ نشین اور کئی جلاوطن ہو گئے۔ ہم جہاں کہیں بھی گئے، ناخوش رہے۔ ہم ایک مضطرب اور گم شدہ نسل کے لوگ ہیں۔‘‘

میں نے اُن سے کئی مرتبہ پوچھا کہ وہ برطانیہ میں اتنی دہائیاں گزار کر واپس کیوں چلے آئے تو مختلف وجوہ بیان کیں۔ یہ ایک شام کا واقعہ ہے کہ مجھ سے کہنے لگے ’’تم پوچھتے رہتے ہو کہ میں واپس کیوں چلا آیا۔‘‘

پھر خاصی دیر بعد بولے ’’اخیر میں بندے کو واپس آنا ہی ہوتا ہے۔‘‘

عبداللہ حسین نے اپنی لازوال کرداری کہانی ’’جلاوطن‘‘ میں لکھا تھا ’’جلاوطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا، چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔‘‘

اور اُس ٹھٹھرتی اداس رات میں جب اوس کھڑکیوں کے شیشے کو دھندلاتی تھی، مجھ سے ایک راز بیان کیا۔ کہنے لگے کہ انھوں نے اپنی قبر کے کتبے کے لیے شعر وصیت کر رکھا ہے۔ میرے سوال پر شعر پڑھ دیا۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

اِس مرتبہ وہ اپنی معمول کی ہنسی نہ ہنسے۔ گم سم رہے، میں بھی چپ رہا۔ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آہستہ آہستہ یہ خاموشی دھواں دھواں کمرے سے نکلی اور شہر بھر میں پھیل گئی۔

وفات سے ایک ماہ قبل میری اُن سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ افسانے کے امام انتون چیخوف کا افسانہ ‘‘عورت اور اس کے ہم راہ کتا’’ "The Lady with the Dog" دوبارہ پڑھ رہے تھے۔

‘‘اس افسانے کی زیریں سطح پر بہنے والی اداسی مجھے ہانٹ (Haunt) کرتی ہے’’ انھوں نے بتایا تھا۔ یہ وہ شاہ کار افسانہ ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اپنے وقت کے جینئس روسی ادیب ‘‘لولیٹا’’ ایسا ہنگامہ خیز شاہ کار لکھنے والے ولادیمیر نوبوکوف نے اُسے عالمی ادب کی اعلیٰ ترین کہانیوں میں شمار کیا تھا۔ اسی گفت گو میں انھوں نے پھر ہدایت کی ‘‘دوستوو سکی کا ناول ‘‘برادرز کرامازوف’’ ضرور پڑھو۔ اسے پڑھنے کے بعد تمھیں پھر کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔’’

ایک شام میرے ادیب دوست محمد عاصم بٹ کو فون کیا اور کہنے لگے ‘‘مجھ سے بہت لوگ رابطہ کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے طویل انٹرویو اور ادب پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا آخری انٹرویو تمھیں دوں گا۔’’ عاصم نے یہ بات اپنی بیوی کو بتائی تو وہ رونے لگی۔

عبداللہ حسین نے کئی نسلوں اور لاکھوں لوگوں کو متاثر کیا، اُن کو پڑھے بغیر اُردو ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ چناں چہ جب وہ فوت ہوئے تو الیکٹرانک اور سوشل میڈیا تعزیت اور افسوس کے پیغامات سے متحرک ہوگیا۔ ہزاروں کی تعداد میں برقی پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ صدر اور وزیر اعظم نے دلی افسوس اور تعزیت کا اظہار کیا۔ سب ہوائی تھا، سو ہوائی رہا۔ افسوس ناک حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کے جنازے میں مٹھی بھر لوگ شریک ہوئے اور تدفین میں گنتی کے لوگ۔ یوں تہذیبی اور علمی طور پر بے حس ہوتی ہماری قوم نے عظیم ادیب عبداللہ حسین کے جنازے کے ساتھ بالآخر اپنے انجام کی بھی خبر دے دی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کامریڈ

احمد بشیر

نیلم احمد بشیر سے میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ اپنے مرحوم والد سے متعلق اُن کے ذہن میں پہلا تاثر کیا آتا ہے۔ وہ بلاتوقف بولیں ”جلال“۔

”اُنھیں مرضی کے خلاف بات پر غصہ آجایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے گاڑی خریدی۔ دنیوی معاملات میں وہ بے وقوفی کی حد تک سادہ تھے، ایک شناسا نے ٹوٹی پھوٹی کھٹارا گاڑی لے دی جس میں بے شمار نقائص تھے۔ اب کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُن سے شکایت یا اُسے تبدیل کرنے کی بات کرتا۔ جب برداشت نے جواب دے دیا تو میں نے ایک رقعہ لکھا جس میں محتاط لفظوں میں گاڑی بدلنے کا لکھا اور ان کے سامنے رکھ کر بھاگ گئی۔ وہ رقعہ لے کر خاموش رہے۔ بعدازاں انھوں نے گاڑی بیچ دی۔“

”ایک مرتبہ حکم دیا کہ گھر میں زردہ پلاؤ بنے گا، سو روزانہ گھر میں وہی پکتا رہا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کا حکم ٹالے۔ اسی طرح ایک روز گھر آکر اعلان کیا کہ بادشاہ جہاں گیر قیمے میں موتیے کے پھول ڈلوا کر پکواتا تھا۔ گھر میں موتیا قیمہ بنے گا۔ ہم نے احتیاطاً ساتھ میں دال بھی بنالی۔ اب جو موتیا قیمہ بن کر سامنے آیا اور انھوں نے پہلا لقمہ لیا تو منہ بنایا۔ لقمے خاصے کڑوے تھے۔ ہم نے تو دال کھانی شروع کردی۔ وہ کچھ دیر بادلِ نخواستہ موتیا قیمہ کھاتے رہے، پھر بولے ’ذرا یہ دال بھی چکھا دینا‘ اور بڑی رغبت سے دال کھانے لگے۔ ہم نے کچھ نہیں کہا، دل ہی دل میں ہنستے رہے۔“

”اماں بتاتی ہیں کہ ایک مُنڈا (لڑکا) اُنھیں اکثر ملنے آیا کرتا تھا لیکن پھر وہ نہ تو اُن کے جنازے میں آیا اور نہ ہی بعد میں۔ ارے، تو وہ تُم تھے۔ کہاں کھو گئے تھے؟“

نیلم احمد بشیر نے یہ پوچھا تو مجھے احمد بشیر سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ تب تو وہ رقیق قلبی کی حد تک نرم خو اور شگفتہ مزاج تھے۔ غصہ تو اُنھیں جیسے چھوا تک نہ ہو۔ جب بھی ملے، اُن کے پاس داستانیں ہوتیں اور چونکا دینے والے تاریخی انکشافات۔ ممتاز مفتی، کرشن چندر، میرا جی، قدرت اللہ شہاب، ابن انشا، حفیظ جالندھری، صفدر میر، مولانا حسرت موہانی، چند خواتین اور اِن سب سے بڑھ کر چراغ حسن حسرت کے تذکرے۔

سردیوں کی اُس ٹھٹھرتی شام لاہور میں بارش کی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گر کر مٹی پر پانی کے گنبد نما بلبلے بنارہی تھیں۔ لبرٹی مارکیٹ گل برگ لاہور میں موسلادھار بارش کے دوران دکانوں، گاڑیوں اور سڑکوں کی رنگارنگ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ قریب ریستورانوں، دکانوں اور ہوٹلوں میں لوگوں کی چہل پہل تھی۔ سردیوں کی راتوں میں ویسے بھی ریستورانوں میں رش بڑھ جاتا ہے۔ کسی ریستوران کا دروازہ کھلتا تو سرد کٹیلی ہوا اندر کو لپکتی اور لوگوں کے قہقہوں کی گونج اور عمدہ گرم کھانوں کی اشتہا آمیز مہک باہر کو اُبلتی۔ زندگی اپنی جولانیوں کے ساتھ مچلتی تھی۔

لاہور کے سب سے فیشن ایبل، مہنگے اور پُررونق مرکز کی بغل میں اُسی شام ایک سرسبز سڑک پر واقع کوٹھی کے ایک کشادہ کمرے میں، مَیں احمد بشیر صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ کمرے میں نرم حدت تھی، حزن تھا اور ایک لفظ تھا جو گونجتا تھا ”میلہ“۔

ابھی میں نے اُن کا سوانحی ناول ”دِل بھٹکے گا“ تازہ تازہ پڑھا تھا اور اُس کے سحر میں گرفتار تھا۔ ناول بھی کیا تھا، خودنوشت ہی تھی۔ ایک مونتاج تھا۔ منظر نگاری، واقعات، شخصیات اور اعترافات کے رنگوں سے مصور کی گئی ایک تصویر، ہمہ گیر و ہمہ جہت داستان۔ اُس لذت آمیز اور آگہی آموز سرگزشت پڑھنے کے کچھ ہی عرصے بعد ایک مشترکہ شناسا کے باعث ملاقات کی صورت بن گئی۔

اُس ابر آلود شام کو جب میں احمد بشیر صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے داماد کی کوٹھی پر پہنچا جہاں وہ قیام پذیر تھے اور اندر پیغام بھجوایا تو وہ میرے ہی منتظر تھے۔

اُن کے کمرے میں چاروں طرف کمیونسٹ رہنماؤں اور فلسفیوں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ کارل مارکس، لینن، اسٹالن، ماؤ اور دیگر کمیونسٹ اکابر چاروں جانب سے جھانک رہے تھے۔

دانش ور، ادیب، صحافی، ہدایت کار، سوشلسٹ اور متحرک سماجی کارکن، معروف افسانہ نگار نیلم احمد بشیر اور ٹیلی وژن اسکرین کے نام ور چہرے بشریٰ انصاری اور دیگر باصلاحیت بیٹیوں اور ایک بیٹے کے والد احمد بشیر 24 مارچ 1923 کو ایمن آباد میں پیدا ہوئے، سری نگر سے گریجویشن کی اور ایک دل چسپ واقعے کے نتیجے میں صحافت میں آئے۔ اُردو اور انگریزی صحافت سے وابستہ رہے۔ اپنے بے باک اور استدلالی انداز کی وجہ سے شہرت پائی۔ اسی دوران قریباً تمام مایہ ناز ادیبوں سے ذاتی تعلق رہا جنھیں خاکوں کی صورت میں قلم بند کیا۔ بعدازاں یہ خاکے ''جو ملے تھے راستے میں'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ انگریزی تحقیقی مضامین "Dancing with wolves" کے نام سے کتابی صورت میں آئے۔ اردو کالموں کو ''خونِ جگر ہونے تک'' کا کتابی نام دیا۔ ایک طویل سوانحی کلاسیکی ناول ''دل بھٹکے گا'' کے عنوان سے لکھا۔ اس کے علاوہ بے شمار کالم اور مشاہیرینِ ادب کے ساتھ خطوط کتابی صورت میں ہنوز تشنۂ اشاعت ہیں۔ وہ باغیانہ حد تک انقلابی، بائیں بازو کے نظریات کے پیرو اور عملی زندگی میں انھی پر کار فرما، کھرے دانش ور اپنی طرز کے انوکھے شخص تھے۔

میں نے اُن کی کتابوں میں درج واقعات اور کرداروں کے حوالے دیے تو خوش ہوئے اور جوش میں آ کر بہت سی بیان کردہ باتیں دہرانے لگے اور کئی نئے موضوعات چھوئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اتنی بھرپور زندگی صحافت، ادب، فلم، سیاحت، سیاست اور تحقیق میں گزار کر اور نابغۂ روزگار لوگوں کے بیچ رہ کر وہ اپنی زندگی کو مڑ کر کیسے دیکھتے ہیں؟ مسکرائے اور بولے۔ ''میلہ۔ میں زندگی میں ایسے داخل ہوا جیسے بچہ میلے میں داخل ہوتا ہے۔ میلہ عروج پر ہے۔ ایک جانب بندر کا تماشا ہو رہا ہے تو دوسری جانب موت کے کنویں میں بغیر سائلنسر موٹر سائکل دوڑ رہی ہے۔ ایک شامیانے کے پیچھے جل پری ہے تو رستے میں توتے کی فال والا بیٹھا ہے۔ سامنے جھولے ہیں تو پیچھے تازہ گرما گرم قتلمے۔ اچانک ایک طرف بین کی لے پر جھومتا سانپ اپنی جانب متوجہ کرتا ہے تو سوانگ بھرے ایک بہروپیا سامنے سے گزر جاتا ہے۔ ایک طویل قطار کا نظروں سے تعاقب کرتے ہیں، وہ تو ایک وسیع پنڈال میں لگے سرکس سے شروع ہوتی ہے۔ میٹھے لچھوں والا چلا آتا ہے تو کبھی مرونڈوں والا۔ رنگینی ہے، موسیقی ہے، تماشا ہے اور عجائبات ہیں۔ بچہ حیرت اور شوق سے یہ سب دیکھتا چلا جا رہا ہے کہ یک دم میلے کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ اتنا وقت گزر گیا، اُسے پتا ہی نہ چلا۔ اب اُسے میلے سے باہر نکلنا ہے۔ بس میں بھی زندگی کے میلے کی رنگینی میں ایسا منہمک ہوا کہ وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا اور باہر نکلنے کا مقام اور وقت آ گیا۔ میلہ چلتا رہے گا، بس میں نہ ہوں گا۔''

اُن کی زندگی واقعی ایک میلے کی طرح آتشی انار رنگوں، دمکتی روشنیوں، لبھاتی خوشبوؤں، گلابی رُومانوں، للچاتے ذائقوں اور جادو اثر موسیقی سے عبارت تھی۔ بعد کی کئی نشستوں میں انھوں نے اپنی زندگی ورق ورق کھولی، کچھ جانی کچھ ان جانی باتیں کہیں۔ اُن کی آواز آج بھی میری سماعت میں زندہ ہے۔

باہر بارش کے موٹے موٹے قطرے گہرے بادلوں سے نمودار ہو کر زمین پر گر کر پھٹ رہے تھے اور ٹھنڈ میں اضافہ کر رہے تھے۔ اندر کوٹھی کے ایک کمرے کے ماحول کو ایک بوڑھا انقلابی گرما رہا تھا۔

احمد بشیر صاحب نے اپنے چاروں طرف آویزاں کمیونسٹ لیڈروں کی تصاویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ اچھے لوگ تھے۔ عظیم لوگ تھے۔ عام انسان کی بھلائی کے نظریے میں کیا خرابی ہے؟ اگر اس نظریے سے لادینیت نکال دی جائے تو یہ ایک عمدہ فلسفۂ اقتصادیات و معاشرت ہے۔ انسانی بھلائی کا عمدہ نظام ہے۔''

اس کے بعد انکشاف کیا۔ ''میں نے اپنا سوانحی ناول 1971 میں لکھنا شروع کیا، بیس برس لکھتا رہا۔ روس میں کمیونزم کا خاتمہ ہوا تو دِل ٹوٹ گیا۔ خود نوشت کا تانا بانا اسی نظام کے گرد بُنا گیا تھا۔ ساری محنت رائگاں گئی۔ یہ موجودہ کتاب تو میں نے چند ماہ میں لکھ ڈالی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کیپیٹل ازم کے غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام کو وقتی کام یابی پاتا دیکھ کر جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ سچ پوچھو تو ایک شدید ڈپریشن میں چلا گیا۔''

اُن کی آواز میں مایوسی دَر آئی۔ ''مُلّا، جاگیردار اور صنعت کار کے گٹھ جوڑ سے وجود میں آنے والا استعماری نظام تادیر قائم نہیں رہے

گا۔ غریب مزدور اور کسان پھر اُٹھے گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا، خاک میں مل کر اسی طرح خاک ہو جاؤں گا جیسے چرند و پرند اور نباتات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں مگر اِس دُنیا کا مظلوم سوشلزم کا اس سورج کو پھر اُبھرتے دیکھے گا جو فی الحال غروب ہو گیا ہے۔‘‘

میں نے پوچھا کہ کس شخصیت نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا تو بولے۔ ’’کارل مارکس۔ سپر جینئس آدمی تھا۔ وہ ایک فردِ واحد تھا جس کی تحریروں نے دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اُس نے اِنسانی بھلائی کا ایک جامع نظام دیا تھا۔ میرے جیسا اُس کا پرستار بھی اُسے پوری طرح سمجھ نہ پایا۔ اُس کی تحریر گنجلک اور پیچیدہ ہے۔ وہ یورپی تاریخی حوالوں میں گندھی ہوتی ہے، اُسے سمجھنے کے لیے یورپی تاریخ، اقتصادیات، فلسفہ اور سماجیات پر قابلِ رشک دسترس ضروری ہے۔ ہمارے ہاں کے قد آور سوشلسٹ لوگوں نے بھی مارکس کو پوری طرح سمجھ کر نہیں پڑھا۔‘‘

میں نے سجاد ظہیر، سبطِ حسن وغیرہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ گو ان دانش وروں نے کچھ حد تک یہ نظریہ سمجھا تھا مگر پوری طرح اپنی گرفت میں نہ لا پائے تھے۔

احمد بشیر صاحب اس موضوع پر بات کر رہے تھے تو مجھے وہ دن یاد آ گئے جب میں گورنمنٹ کالج لاہور کا طالبِ علم تھا اور دوپہر میں انارکلی کے تقسیمِ ہند سے قبل کے قائم شدہ ایک مخصوص ہوٹل میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ میرے رستے میں قانون کی کتب کا ایک کتب خانہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں وہاں چلا گیا۔ سامنے ہی کارل مارکس کی لازوال کتاب ’’داس کیپیٹل‘‘ کا ظ انصاری کا اُردو میں تلخیص کردہ نسخہ دھرا تھا۔ میں نے خرید لیا اور چند روز ہی میں ختم کر ڈالا۔ تب سے ظ انصاری کا نام میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ جب میں نے اُن کا حوالہ دیا تو احمد بشیر صاحب بتانے لگے کہ وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو داس کیپیٹل کی روح کچھ حد تک گرفت میں لا سکے۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ قدرت اللہ شہاب جیسے صوفی منش اور مذہبی آدمی سے اُن کی کیسے نبھی تو انھوں نے اُن کی شخصیت کے نئے گوشے وا کیے۔ یہ سب بعد میں، پہلے زمانی اور واقعاتی ترتیب۔

میں نے اُن کے سوانحی ناول ’دل بھٹکے گا‘ کے حوالے دیے تو انھوں نے اشتیاق سے پوچھا کہ مجھے اُس میں کون سے حصے سب سے زیادہ پسند آئے۔ میں نے کشمیر، تقسیم، احوالِ ادباء اور منظر نگاری کا تذکرہ کیا۔ اس پر وہ خوش ہو کر بولے کہ وہ سب اُنھوں نے قطعی طور پر سچ لکھا ہے۔ اس کے بعد مزے لے کر اُس میں بیان کردہ کئی واقعات تفصیل سے دُہرائے اور کئی نئے واقعات سنائے۔ اُن کے ہاں سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ وہ اندر آئیں تو خواہش کا اظہار کیا کہ "Dancing with Wolves" کا ایک نسخہ مجھے دیا جائے۔ اُس نسخے پر دستِ خط کرتے ہوئے بتایا کہ اس کتاب پر اُنھیں صحیح معنوں میں فخر ہے۔ پھر تاکید کی کہ میں اس میں تقسیمِ پنجاب پر اُن کا طویل تحقیقی مضمون ضرور پڑھوں۔ یہ انکشاف بھی کیا کہ اس کتاب کے پبلشر نے اسے مارکیٹ میں نہیں آنے دیا تاکہ اپنے آمدنی کے گوشوارے میں خسارہ ظاہر کرے جس کی وجہ سے یہ کتاب بازار میں دست یاب نہیں اور نایاب ہے۔ میں نے کتاب کی ورق گردانی کی تو اہم تاریخی واقعات کا نادر تحقیقی مجموعہ تھی۔

سردیوں کی بارش میں ہونے والی وہ ملاقات بعد کی کئی بے تکلفانہ نشستوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ انھوں نے بے شمار موضوعات پر اظہارِ خیال کیا اور دِل کھول کر کیا۔ وہ بولتے، میں سنتا اور لکھتا۔ وہ اَن مول لمحات آج بھی میرا اثاثہ ہیں۔ یادوں کے جادو گھر میں ہر سُو دمکتے لمحات بکھرے پڑے ہیں۔

ایک شام میں نے کشمیر کا ذکر کیا۔ ’’آپ کی سوانح میں کشمیر کی بہت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔‘‘

’’کشمیر پر لکھتے ہوئے مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کس طرح الفاظ کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ الفاظ جذبات اور مناظر کو حقیقت کے قریب تر بیان نہیں کر سکتے۔ میں امریکا سے لے کر سکینڈے نیویا تک گھوما ہوں مگر کشمیر کی تو بات ہی اور تھی۔ شاید اس میں جوانی کے خمار کا بھی دخل تھا۔‘‘

بات کرتے ہوئے وہ ماضی میں کھو گئے تھے۔

''ایک مرتبہ میں نے ڈونگے پر دریائے جہلم سے جھیل ڈل کا سفر کیا تھا۔ ڈونگا مکانوں، مسجدوں، مندروں، درگاہوں، بازاروں اور دھوبی گھاٹ کے بیچ میں تیرتا ہوا جھیل ڈل کے دہانے تک جا پہنچا۔ دریا کا پاٹ خاصا تنگ تھا۔ ملاح اور اس کے ساتھی اُس کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی زنجیر پکڑ پکڑ کر ڈونگا آگے بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم جھیل میں آ گئے۔ جھیل کے اوپر شفاف اور دمکتی نیلے پانی کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک نور بھرا سکون تھا۔ جھیل ایک پیالے کے مانند تھی جس کے ہر طرف سر سبز گھنے درختوں سے بھرے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ گنجان درختوں سے پرندے اُڑتے اور اُڈاری بھر کر دوسرے حصے میں گم ہو جاتے۔ اُن کی چہچہاہٹ کی دھیمی مدھر آواز لوری کا کام دیتی تھی۔ انھی جنگلوں میں سے چشمے اور جھرنے چاندی کی طرح دمکتے پانی کو جھیل میں نرمی سے اُتارتے تھے۔ جھیل کا پانی بالکل شفاف تھا، پانی میں تہ نظر آتی تھی۔ تہ میں سبز جھاڑیاں اور زیرِ آب رنگ دار اور دل کش پھولوں کی بیلیں تیرتی لہراتی تھیں۔ اس سبزے اور بیلوں میں چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیاں اٹھکیلیاں کرتی تھیں۔ ڈونگے سے یہ سب یوں نظر آتا تھا جیسے وہ سب شفاف شیشے کے نیچے ہو۔ جھیل کی سطح پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں جن پر سیاح لیٹے ہوئے تھے۔ جھیل کے کناروں پر گھاٹوں کے ساتھ ہاؤس بوٹ بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے ریشمی پردے جب ہوا میں لہراتے تو اندر عالی شان پالش شدہ قیمتی لکڑی سے بنے کمرے نظر آتے۔ یہاں زیادہ تر یورپی لوگ سکونت پذیر تھے۔ چند بوٹ ہاؤس ایسے تھے جن پر مرد مختصر لباس میں ارغوانی جام تھامے غسلِ آفتابی کرتے نظر آتے اور ان کی عورتیں سڈول مرمریں بدنوں کے ساتھ چھپاک سے پانی میں اُتر کر مچھلی کی طرح تیرتی نظر آتیں۔ موسم دیکھتے ہی دیکھتے بدل جاتا۔ چمکتا سورج بدلیاں چھپا لیتیں، ٹھنڈی ہَوا کے نرم لپیٹے بدن سہلاتے گزر جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوپہر میں شام کا سماں ہو جاتا۔ ایسا رومانوی ماحول ہو جاتا کہ دل بے وجہ محبت کرنے کو چاہتا۔ ہر شے سے محبت ہو جاتی۔ وہیں مجھے ایک محبت بھی ہوئی تھی۔''

وہ کشمیر کے حسین نظارے اور ماحول میں کھو کر چپ ہو گئے۔

میں نے خاموشی ختم کرنے کے لیے کشمیری کھانوں شب دیگ، میوہ جات اور سماوار میں اُبلتی کشمیری چائے کا تذکرہ کیا تو بولے۔ ''کشمیر کے کھانوں میں کچھ تو وہاں کی پہاڑی ضروریات اور کچھ علاقائی روایات کا حصہ تھا تو وسطی ایشیائی اثرات کو نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ عمدہ اور لاجواب پکوان ہوتے تھے جنھیں پکانے میں ایسی فن کاری چاہیے تھی جیسی ایک مصور یا نقاش میں ہوتی ہے۔ بس ایک خامی تھی۔ وہاں کے لوگ صفائی پسند نہ تھے جس کی وجہ سے گھروں، بستروں اور رضائیوں سے ایک مخصوص بساند اُٹھتی رہتی۔ بیش تر وقت اتنی ٹھنڈ پڑتی اور پانی کی فراہمی کے لیے پہاڑوں پر سفر کرنا پڑتا تھا کہ مقامی لوگ نہانے دھونے میں کفایت شعاری سے کام لیتے۔''

کشمیری کھانے کے تذکرے سے جیسے انھیں گویا ایک اور بات یاد آ گئی۔

''یہ اُس زمانے کی بات ہے جب بچپن میں ایک مرتبہ میں بیمار پڑ گیا تھا اور مجھے علاج کے لیے لاہور لایا گیا تھا۔ میں اندرونِ شہر کے ایک کوچے میں ٹھیرا ہوا تھا اور دن بھر پُر رونق گلی میں دیکھتا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک ریڑھی والا چند ڈبے سجائے ایک گھر کے سامنے آن رُکا، اُس نے ایک عجیب و غریب چولھے پر نیلے رنگ کی آگ جلائی اور ایک پتیلی میں پانی اُبالنا شروع کر دیا۔ جب پانی اُبل گیا تو اُن ڈبوں میں سے کچھ چیزیں نکال کر اُس میں ڈالیں اور ایک پیالی میں بھر کر سامنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔''

''کیا تھا اُس پیالی میں؟'' میں نے تجسس ظاہر کیا۔

''اُس میں لپٹن کی چائے تھی جو ابھی تازہ تازہ پنجاب میں متعارف کروائی گئی تھی۔''

''کہا جاتا ہے کہ یہ ابتدا میں مفت فراہم کی جاتی تھی اور نعرہ بلند کیا جاتا تھا کہ یہ گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اسی لیے کام یاب ہوئی تھی۔''

اُنھوں نے میری معلومات کی تصحیح کی۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ پنجاب میں ٹھنڈک پہنچانے والے بہت سے مشروبات عام تھے۔ لسی، ستو کا شربت، فالسے اور شہتوت کا شربت، کانجی، سکنجبین، بادام کا شربت اور بہت سے ٹھنڈی تاثیر والے مشروبات۔ چائے کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ کلیجا جلا دیتی ہے۔''

انھوں نے گرما گرم چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور بات جاری رکھی۔ ''دراصل لپٹن چائے شروع میں مریضوں کو دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ بازاروں، محلوں میں پیک فریز کے بسکٹ مفت میں دیے جاتے تھے۔ دیسی لوگ یہ سوچ کر چائے پیتے کہ اس کے ساتھ وہ بسکٹ کھانے کو ملیں گے جو گورے کھاتے ہیں۔ ابتدائی برسوں میں بڑی طرح ناکام ہونے کے بعد چائے آہستہ آہستہ پنجاب میں پی جانے لگی اور کئی دہائیوں کے بعد بھی مقبول تو نہ ہوئی مگر قابلِ قبول ہوگئی۔''

چائے کے حوالے سے احمد بشیر کی زندگی ایک اتفاقی معاملے کے نتیجے میں اس ڈگر پر چلی آئی جس پر انھوں نے بقیہ زندگی گزاری۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ احمد بشیر کی ممتاز مفتی اور دیگر اُبھرتے ہوئے ادیبوں سے قریبی دوستانہ تعلق تو ضرور تھا مگر انھوں نے کبھی ادب وصحافت میں آنے کا سنجیدگی سے سوچا نہ تھا۔

ممتاز مفتی اور احمد بشیر اکٹھے رہتے تھے۔ ایک روز ممتاز مفتی نے اخبار میں اشتہار دیکھا کہ ایک نیا اخبار نکلنے والا ہے جسے معروف ادیب اور صحافی مولانا چراغ حسن حسرت نکال رہے تھے اور اُس کے لیے عملے کی ضرورت تھی۔ ممتاز مفتی جو احمد بشیر کی بے روزگاری پر تشویش آمیز ہمدردی میں مبتلا رہتے تھے، نے نوجوان احمد بشیر کو زبردستی اخبار کے دفتر بھیج دیا۔

نوجوان احمد بشیر وہاں پہنچا تو بھاری تن وتوش کے مالک کو مدیر کی کرسی میں دھنسے دیکھا۔ احمد بشیر کو دیکھ کر اُن صاحب نے تشریف آوری کا سبب پوچھا تو احمد بشیر نے سٹ پٹا کر اپنا نام بول دیا۔

اُن صاحب نے احمد بشیر کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ''خوب نام ہے مولانا! فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

تب احمد بشیر کو معلوم ہوا کہ وہ مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔

''انھوں نے آپ کو مولانا کیوں کہا؟'' میرے سوال میں اشتیاق تھا۔

''یہ اُن کا تکیہ کلام تھا'' احمد بشیر نے وضاحت کی۔

احمد بشیر نے ملازمت کی خواہش کا اظہار کیا تو حسرت صاحب نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ تمام آسامیاں پُر ہو چکی ہیں۔ احمد بشیر مایوسی سے لوٹنے لگے تو چپراسی چائے لے کر اندر داخل ہوا۔ چپراسی کے چائے لانے اور حسرت کے چائے تنہا نہ پینے کی عادت نے احمد بشیر کی آنے والی زندگی کے رخ کا تعین کر دیا۔ انھوں نے احمد بشیر کو چائے ساتھ پینے کی دعوت دے ڈالی اور یہ نوجوان سامنے بیٹھ گیا۔ مولانا حسرت اپنے زیرِ تالیف مسودے سے فارغ ہوئے تو احمد بشیر سے اس کے تجربے کا پوچھا۔

احمد بشیر نے صاف بتا دیا کہ صحافت کا کوئی تجربہ نہیں۔

احمد بشیر کو توقع تھی کہ یہ مولانا چائے پی کر اسے فارغ کر دیں گے۔ خلافِ توقع مولانا نے مسکرا کر کہا کہ اُنھیں ناتجربہ کار بندوں کی ضرورت ہے تاکہ انھیں اپنے مطابق ڈھال سکیں۔ مولانا نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔ ''گویا آپ کم وبیش اَن پڑھ ہیں؟''

احمد بشیر نے انھیں بتایا کہ اُس نے کچھ تراجم کر رکھے ہیں جو بمبئی میں رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ معروف ادیبوں جن میں کرشن چندر، میرا جی وغیرہ شامل تھے، کے ہم راہ قیام کیا ہے۔ کچھ بین الاقوامی ادب پڑھا ہے، کوک شاستر پڑھی ہے، موسیقی کی شدبد ہے اور ہندوستان بھر میں آوارہ گردی کی ہے۔

اس پر مولانا حسرت نے بے اختیار کہا ''آپ عجیب آدمی ہیں مولانا! آپ نے ترقی پسند ادیبوں کو پڑھا ہے، جنسی علوم سے واقف ہیں، بین الاقوامی ادب کو بھی دیکھا ہے اور ہند کی آوارہ گردی کی ہے، چائے پیتے ہیں اور شراب بھی پی لیتے ہیں۔ اگر آپ کو اچھی صحبت مل جائے تو آپ نکھر سکتے ہیں۔''

یہاں مولانا حسرت کا اچھی صحبت سے غالباً اپنی جانب اشارہ تھا۔ باتیں کرتے ہوئے انھیں یاد آیا کہ وہ تو احمد بشیر کو ملازمت سے ٹال چکے ہیں چناں چہ دوبارہ معذرت کی۔ احمد بشیر کرسی سے اُٹھنے لگے تو حسرت نے پوچھا۔ ''اب آپ کہاں جائیں گے مولانا؟''

اس پر احمد بشیر نے جواب دیا ''گھر جاؤں گا مولانا!''

مولانا حسرت نے کچھ دیر سوچا اور یہ کہہ کر کہ یہ وقت گھر جانے کا نہیں، اپنے ساتھ وانگا ہوٹل میں چلنے کی دعوت دے دی۔ وہاں جا کر دونوں میں خوب جمی۔

باتوں باتوں میں مولانا حسرت نے احمد بشیر سے حسبِ خواہش تن خواہ کا پوچھا تو احمد بشیر نے پانچ سو روپے بول دیے۔

اتنی تن خواہ تو بہ مشکل مولانا کی تھی۔ حسرت نے چونک کر پوچھا ''اتنے پیسے آپ کو کون دے گا؟''

احمد بشیر نے پٹاخ سے جواب دیا ''تو نہ دیجیے۔ یہ تو فقط میری خواہش ہے، ارادہ نہیں۔''

کافی دیر سے یہ گفت گو جاری تھی کہ مولانا حسرت کو اپنا آرڈر یاد آ گیا اور انھوں نے بیرے کو آواز دی۔

ہوٹل میں سبھی انھیں جانتے تھے اور عزت کرتے تھے۔ منیجر بھاگا ہوا آیا اور پوچھا۔ ''بیرا کون سا تھا، بوڑھا یا جوان؟''

حسرت نے مخصوص مسکراہٹ سے کہا ''جب آرڈر دیا، تب تو جوان تھا۔''

خیر بیرا اُن کا آرڈر لے آیا اور دونوں کافی دیر تک مشروباتِ خمر اور ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

رات گئے مولانا نے احمد بشیر کے ہم راہ ٹھمری سننے معروف طوائف کوثر کے کوٹھے کا رخ کیا۔ وہاں مولانا کی بہت تپاک سے آؤ بھگت کی گئی۔ جب گاؤ تکیے سے ٹیک لگا چکے تو بولے۔ ''دلیس کا الاپ ہو جائے مولانا کوثر صاحبہ۔''

رنگ و موسیقی کی بہار اُس رات اپنے جوبن پر تھی جب اخبار کا چپراسی اخبار کی کچی کاپی لے کر آ گیا۔ مولانا حسرت نے وہیں بیٹھے بیٹھے اُسے درست کیا اور کوٹھے سے اُترنے کا قصد کیا۔ تنگ سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے بولے۔ ''کل دفتر وقت پر پہنچ جایئے گا۔ میں دیر سے آنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تن خواہ آپ کی دو سو روپے ماہوار ٹھہری۔''

یوں احمد بشیر کی بہ طور صحافی اخباری دنیا میں آمد ہوئی۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی بابت شراب کے تذکرے پر انھیں دینی حلقوں کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑا۔

جارج آرویل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک خودنوشت تبھی سچی ہو سکتی ہے جب اس میں مصنف اپنی شخصی خامیوں کا اعتراف کرے۔

برطانوی تاریخ دان فلپ گوڈیلا نے پُرمزاح جملہ کسا تھا کہ خودنوشت ایک ایسی موثر صنفِ اظہار ہے جس میں آپ دوسروں کی خامیاں پوری سچائی اور دیانت سے بیان کر سکتے ہیں۔

احمد بشیر نے اپنے خاکوں اور سوانحی ناول میں اپنے بارے میں ہر سچ بے دھڑک ہو کر لکھ دیا۔ ان کی تحریر میں نہ تو تلقین تھی اور نہ ہی دعوتِ رندی۔ ایک نڈر آدمی کا ادبی رنگ میں اظہارِ حقیقت تھا۔ ان میں بعض اعترافات خوف ناک حد تک سچے تھے۔ اُردو ادب کی کوکھ چند استثنیات کے سوا اس قسم کے صاف اور سچے اظہار سے ویران ہے۔

احمد بشیر صاحب نے جدھر اپنی مے نوشی کا ذکر کیا، وہاں اسے نہ تو باعثِ عزت قرار دیا اور نہ ہی اس پر نادم ہوئے۔ پس اس کا

تذکرہ کرکے آگے بڑھ گئے۔

دوستوں کے ہم راہ جہلم میں ایک عزیز کے پند و نصائح کی ضد میں پہلی مرتبہ جرعہ ہائے آتش نوش کیے تو احمد بشیر کی کیفیت عجب ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے قرب و جوار کی روشنیاں مدھم ہوگئی ہوں اور چاند کچھ بڑا بڑا لگنے لگا ہو۔ ایک ان جانا بوجھ اُتر کر، ہلکے پھلکے ہوکر زندگی میں مزہ بڑھنے کی کیفیت طاری ہوئی۔ منافقت یا دنیاداری کا لبادہ اُترتا معلوم ہوا۔ حجاب اُٹھتے گئے۔ بعد کی تحریروں سے اُس کے تلخ ذائقے کے ساتھ ایک سرور و سرشاری کی کیفیت کچھ ایسی منسلک ہوئی کہ کبھی لباسِ خرد چاک ہوا اور کبھی پاسبانِ عقل رخصت ہوا پر کبھی کبھی، کہ حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ بات جو عموماً کھل کر کہی نہ جاتی تھی، ایسی کیفیت میں سینے سے اُبل کر ہونٹوں تک چلی آتی۔ مزاج میں بغاوت تھی، معاشرتی روایات کے برعکس تجربہ کرنے کی سنسنی رگ و پے میں ارتعاش قائم رکھتی۔ نوجوانی کی عمر تو ویسے بھی زندگی کے ہر نئے ذائقے سے آشنا ہونے کی خواہش سے عبارت ہوتی ہے۔ حسرت کے علاوہ بھی کوٹھے پر جانا ہوا۔ وہ کوٹھا سستے ماحول میں بھیگا ہوا تھا جہاں روایتی رقص و موسیقی کے بجائے عوامی سطح کا مجرا ہوتا تھا۔ وہاں احمد بشیر کا دل بہت خراب ہوا۔ ماحول اجنبی اور مصنوعی تھا۔ تماشائی ٹین کے سپاہی لگے اور طوائف کے پسینے کی بدبو تیز عطر میں مل کر طبیعت بوجھل کر گئی۔

آخری دنوں کی بات ہے کہ مجھ سے کہنے لگے ''جسمانی تکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کوئی بھی دوست اور ساتھی یاد نہیں آتا۔ پس کبھی کبھار چراغ حسن حسرت یاد آتے ہیں جنھوں نے چھ ماہ ہی میں میری اُردو کی تمام غلطیاں نکال کر مجھے زبان میں رواں کر دیا تھا۔ بعد میں مَیں نے ساری زندگی انگریزی میں لکھا لیکن وہ اردو والی مہارت آئی اور نہ اعتماد۔ انگریزی میں صفدر میر (ڈان والے زینو) ذہن میں بجلی کے لشکارے کی طرح کوند جاتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اردو اساتذہ کی زنجیر کی آخری کڑی تھی۔ ان کے بعد تو گویا سلسلہ ہی بند ہوگیا۔''

ممتاز مفتی سے دوستی کا احوال سنایا۔

''میں ایک ملازمت چھوڑ کر گورداس پور میں عزیز کے ہاں چلا آیا۔ ممتاز مفتی اُن کا دوست تھا۔ جب ہماری دوستی ہوئی تو مفتی مجھ سے پندرہ برس بڑا تھا۔ شروع میں میں نے آپ جناب سے بات کرنے کی کوشش کی تو مفتی نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں اُسے نام سے پکاروں۔ گرو آدمی تھا، بہ ظاہر سادہ سا بے کشش آدمی۔ بات کرتا تو اُس کے گُن کھلتے۔ ہماری ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت نام ور ادیب بن چکا تھا۔ بالعموم انسان اور بالخصوص نسوانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا تھا۔''

''خواتین میں خاصے مقبول ہوں گے؟'' میں نے پوچھا تو جواب دیا۔

''بالکل، مقبول تھا مگر بات مقبولیت سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ حد درجے ڈرپوک تھا۔ باتوں میں شیر تھا۔ عمل کی باری آتی تو چہرہ زرد پڑ جاتا اور ہاتھ پیر کانپنے لگتے۔ جو تجزیے تھے، مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر تھے یا دوستوں کے معاملات کے سبب سے۔''

تقسیم کا واقعہ ہے۔ لاہور میں ہر جانب آگ لگی تھی، قتلِ عام ہو رہا تھا اور لوٹ مار جاری تھی۔ نوجوان احمد بشیر خطروں سے کھیلتا ہوا، شام کو میو اسپتال کے چوک سے ہوتا ہوا شاہ عالمی جا پہنچا۔ اسے حویلی سے اپنی ممانی کے گہنے لے کر آنے تھے۔ وہ آنکھ بچا کر حویلی میں داخل ہوا اور متعلقہ کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں سامان الٹا پڑا تھا اور تلائیاں، رضائیاں بکھری پڑی تھیں۔ ممانی کا سامان کہیں نظر نہ آیا۔ وہ سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔ اتنے میں ایک خوب رُو ہندو لڑکی اُسے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سمجھ کر نیچے اُتر آئی۔ اندھیرے میں اُس کے نقوش تو نمایاں نہ تھے البتہ آواز سے نسائیت ٹپک رہی تھی۔

اُس نے احمد بشیر کو ہندو محافظ سمجھ کر اُس کا نام پوچھا تو احمد بشیر نے ایک فرضی نام جے لال بول دیا۔ نام سن کر اُسے خیال آیا کہ کہیں احمد بشیر مسلمان نہ ہو۔ اُس نے چند ایک سوال کیے تو واضح ہوگیا کہ یہ نوجوان ہندو محافظ نہیں بلکہ مسلمان ہے۔ خطرہ بھانپ کر اُس نے دھمکی دی کہ وہ سیٹی بجا دے گی جسے سن کر اس کے ساتھی آجائیں گے۔ اُس نے سیٹی ہونٹوں سے لگائی تو احمد بشیر نے اُس کے ہاتھ مضبوطی سے

پکڑے۔ چوڑیاں ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگئیں۔ وہ سہم گئی تو احمد بشیر نے اُسے بے ضرر جان کر چھوڑ دیا۔ وہ سیڑھیوں کی جانب یہ کہہ کر لپکی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بلاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر سے کنڈا لگا کر چلی گئی۔

احمد بشیر گھبرا کر کسی نئی آفت کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ اتنے میں کرفیو کا سائرن بجا اور رات ڈھلنے لگی۔

رات گئے کنڈا کھلنے کی آواز سے احمد بشیر اپنی اونگھ سے جاگ گیا۔ سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں روٹیاں اور بھاجی تھی۔ اُس نے حقارت سے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ احمد بشیر خالی پیٹ کالی ماتا کی بلی نہ چڑھے۔

اس دوران ان دونوں میں فاصلے پر رہ کر بات چیت ہوئی۔ لڑکی احمد بشیر کی بے وقوفی اور بہادری سے متاثر ہوئی جس سے وہ خطروں کے بیچ اپنی ممانی کا زیور لینے کود پڑا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ اس کے قریب آئی تو معاملات نے اَن ہونا رخ لیا اور ایک کم زور لمحے میں فاصلۂ من وتو ختم ہوا۔

لڑکی نے سسکتے ہوئے رات گزار دی۔ صبح سویرے جب کرفیو کھلا تو احمد بشیر پیچھے دیکھے بغیر خاموشی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔

انسانی فطرت کا تلوّن ہے کہ ایک لمحے کا اوتار دوسرے لمحے کا انسان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاتل گرم پستول تھامے حیرت سے خود کلامی کرتا ہے۔ ”یہ میں نے کیا کر دیا؟“ ریوالور کا ٹریگر انسان کے تحت الشعور نے دبایا ہوتا ہے اور اُس کی دھمک سے اس کا خوابیدہ شعور بیدار ہو کر خود شناسی کے ایک خوف ناک زاویے سے آگاہ ہو کر خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

شاید ایسا ہی کوئی لمحہ تھا جب پشیمانی کے تحت احمد بشیر نے یہ سارا واقعہ ممتاز مفتی سے بیان کر دیا۔

یہ وہی ممتاز مفتی تھا جسے احمد بشیر کا باپ ایک ایسا پختہ عمر شرارتی مرد سمجھتا تھا جو اُس کے بچے کو خراب کرتا تھا۔ مفتی ساری تفصیل سن کر ہنس دیا اور احمد بشیر کو سمجھایا کہ اس نے کوئی قابلِ ندامت حرکت نہیں کی بلکہ لڑکی خود اس قربت کی خواہش مند تھی۔

پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے مفتی اسے اس طرح سمجھاتا ہے جیسے گھر کا کوئی بڑا، بچے کو سمجھاتا ہے کہ اُس لڑکی نے دروازے پر کنڈا لگانے کے باوجود اپنے کسی ساتھی کو اس لیے نہیں بلایا کہ وہ احمد بشیر کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ کھانا لے کر دوبارہ ایک ایسے لڑکے کے پاس آنا جس سے اُسے خطرہ تھا، ظاہر کرتا ہے کہ لڑکی خود اس کی جانب مائل تھی۔

”وہ میری جانب کیوں مائل تھی؟“ احمد بشیر نے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

مفتی اُسے پیار سے سمجھاتا ہے کہ عورت تحفظ کی متلاشی ہوتی ہے۔ وہ بہادر مردوں سے محبت کرتی ہے۔ یہاں احمد بشیر اُس لڑکی کے ساتھیوں سے زیادہ نڈر ثابت ہوا جو یوں خطرات میں کود گیا۔ ایسے میں لڑکی کے مخصوص نسوانی تحت الشعور نے اُسے ایسے بہادر مرد سے قربت پر اُکسایا اور وہ خود ہی اس کے پاس چلی آئی۔ مفتی نے اُسے دھیرے سے سمجھایا ”اُس لڑکی نے رو کر تمھارے جذبۂ مردانگی کو بیدار کیا اور اُکسایا کہ تم اُسے لڑکی سے عورت بنا دو۔ تم نے خود کچھ نہیں کیا۔ فقط اُس کے اشاروں پر چلے۔ لڑکی کسی بہادر مرد سے عورت بننے کی طلب گار رہتی ہے۔ تم نے اس کی خواہش پوری کر دی۔“

تقسیم سے قریباً نصف صدی بعد جب میں نے اس واقعے کی تصدیق چاہی تو احمد بشیر صاحب نے اس کی تصدیق تو نہ کی پر اس میں مبالغے اور افسانہ طرازی کے تڑکے کا اشارہ دیا۔

ذہین ونکتہ رَس احمد بشیر بعد میں شادی کرتا ہے، چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کا باپ بنتا ہے۔ اپنی بیوی سے مثالی محبت کرتا ہے اور بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح پالتا ہے۔ ایک کو شہزادی کہتا ہے تو دوسری کو رانی۔ بیٹیوں کو دیکھ کر آنکھوں میں نرمی ہی نرمی، پیار ہی پیار ہوتا ہے۔ بڑی بیٹی کو ساتھ سلاتا اور تکیہ بیچ میں رکھتا ہے تاکہ کروٹ بدلتے ہوئے بچی کو تکلیف نہ ہو۔ نرم دل اتنا کہ ڈراؤنی فلم دیکھ ہی نہیں پاتا اور یا تو ٹی وی بند کر دیتا ہے یا کمرے سے اُٹھ جاتا ہے۔ کسی فیچر فلم میں غم گین منظر آئے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ وہی احمد بشیر ہے جو عورت کی بے

اندازہ عزت کرتا ہے۔ وہ ہر مظلوم کے ساتھ ہے۔ عورت کو بہت مظلوم جانتا ہے۔ ہر دم اُس کے تحفظ اور اُس کی عزت کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو اتنا اعتماد دیتا ہے کہ نیلم احمد بشیر ادب اور بشریٰ انصاری اداکاری میں نام ور ہوتی ہیں۔

کبھی تحریر کی بات چلی تو میں نے پوچھا کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مشق کرنے ہی سے زبان نکھرتی ہے اور چند معروف ادیبوں کا حوالہ دیا جو کہتے ہیں کہ روزانہ لکھنا چاہیے، اس سے تحریر میں روانی رہتی ہے۔ انھوں نے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہوئے کہا ’’میرا خیال ہے کہ تبھی لکھنا چاہیے جب لکھنے کو کچھ ہو‘‘۔

تخلیقی ارتکازِ توجہ کا ایک دل چسپ واقعہ سنایا۔

’’مرزا ہادی رُسوا کا بنیادی شعبۂ تعلیم کیمیا تھا۔ اس مضمون کا امتحان دینے لکھنؤ سے لاہور آئے تو اُس دور میں شہر میں ہوٹل تو تھے نہیں، چند سرائے تھیں۔ مرزا ہادی رسوا نے اسٹیشن پر اترتے ہی تانگے والے سے کہا کہ اُنھیں لاہور کی سب سے معروف اور بڑی طوائف کے کوٹھے پر لے جایا جائے۔ کوٹھے پر پہنچ کر انھوں نے طوائف کے ہاں سامان اُتارا اور تین روز کا معاوضہ ادا کر کے اُس کے ہاں قیام کیا۔ دن میں امتحان دیتے اور شام کو وقت کوٹھے پر گزرتا۔ تین روز بعد اپنا سامان اٹھایا اور واپس لکھنؤ کو ہو لیے۔ شہر کے معروف تاریخی ورثے دیکھنے کی ذرّہ برابر خواہش نہ کی۔ بعد میں شہرۂ آفاق ناول ’امراؤ جان ادا‘ لکھا اور ادب میں نام امر کیا۔‘‘

لاہور، پنجاب اور پنجابی سے احمد بشیر کے والہانہ قلبی تعلق کے متعلق ایک مکالمہ قابلِ ذکر ہے۔ ہماری پہلی ملاقات کا واقعہ ہے۔ میں نے کراچی میں اُن کے قیام اور اُردو زبان پر دست رَس سے متعلق یہی تاثر اخذ کیا کہ غالباً اُردو اُن کی مادری زبان ہے۔ میں نے اُن سے اس تاثر کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ ’’کیا ایسی رنگین اور زرخیز زبان کوئی غیر پنجابی لکھ سکتا ہے؟‘‘

اس سوال میں اُن کی پنجابی ثقافت سے غیر معمولی محبت اور جانب داری ٹپکتی تھی۔

پنجاب کی تقسیم نے اُنھیں بہت دُکھی کیے رکھا۔ جاٹ اُدھر بھی تھے، اِدھر بھی، کشمیری ہندوستان میں بھی تھے، پاکستان میں بھی، راج پوت ہندو بھی تھے، مسلمان بھی۔

قائداعظم کی بصیرت اور سکھوں کی پنجاب کو بہ طور اکائی رکھنے کی خواہش پر احمد بشیر صاحب کے تاریخی اور اَن جانے انکشافات حیران کن تھے۔ احمد بشیر نے بتایا۔

’’تقسیم سے پنجاب میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کی عمارت کے باہر تلوار لہرا کر اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ گیانی ہری سنگھ کے ماسٹر تارا سنگھ سے تعلق کو دہائی بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ابتدائی گرم جوشی کے تعلقات میں سرد مہری تب در آئی جب گیانی ہری سنگھ نے ماسٹر تارا سنگھ سے کہا کہ سکھوں میں ذات پات کے تعصبات در آئے ہیں جو بابا گورو نانک کی تعلیمات کے منافی ہیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ نچلے درجے سے تعلق رکھنے والے سکھوں کے لیے علیحدہ سے نشستیں مخصوص کی جائیں۔‘‘

احمد بشیر صاحب نے توقف کر کے بات جاری رکھی ’’اب جو فسادات کا آغاز ہوا تو گیانی ہری سنگھ قائداعظم سے ملاقات کے لیے دلّی گئے۔ ان کے ہم راہ ماسٹر ہزارہ سنگھ مجیٹھیا تھے۔ گیانی صاحب کے الفاظ میں ’’جناح صاحب کے ہاں ہمارا خورشید حسن خورشید نے استقبال کیا۔ وہ جناح صاحب کے کمرے میں گئے اور لوٹ کر ہمیں اندر کمرے میں قریباً دھکیل دیا۔ ہمارے سامنے ایک پروقار اور بارعب شخص بیٹھا تھا جس میں خود اعتمادی واضح طور پر نظر آتی تھی۔ جناح صاحب نے بردباری سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ’’ہمارے سکھ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟‘‘ میں نے کہا ’’جناب، سکھ ریاستِ پاکستان میں رہتے ہوئے خودمختاری چاہتے ہیں۔ ہم دنیا میں اپنی واحد ماں دھرتی پنجاب کی تقسیم نہیں چاہتے۔‘‘

’’میں نے گیانی صاحب سے پوچھا کہ کیا انھوں نے انگریزی میں بات کی تھی‘‘ احمد بشیر نے بتایا۔

''اس پر گیانی صاحب کا جواب تھا''نہیں۔ ہم جناح صاحب کی انگریزی دانی کا کہاں مقابلہ کر سکتے تھے۔ ہم نے اردو میں بات کی تھی جو وہ آسانی سے سمجھ گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اس طرح بنگال بھی تقسیم نہ ہوگا اور کشمیر بھی خود بہ خود پاکستان کو مل جائے گا۔ جناح صاحب نے کچھ دیر سوچا اور بولے''آپ بارہ آنے مانگ رہے ہیں جب کہ میں آپ کو پورا روپیا دینا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ مجھ سے پاکستان میں رہتے ہوئے خودمختار ریاست کی خواہش کر رہے ہیں جب کہ میں آپ کو مکمل پھلکیاں ریاست، جالندھر کے ضلعے جہاں سکھ اکثریت میں ہیں، گورداسپور، فیروزپور اور امرت سر کے علاوہ ننکانہ صاحب بھی دینا چاہتا ہوں جس کی راہ داری لاہور اور شیخوپورہ میں ہوگی۔''ہم یہ سن کر دم بہ خود رہ گئے۔ جناح صاحب نے توقف کر کے کہا''ماسٹر تارا سنگھ کو میرا پیغام دے دیں کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہی صحیح معنوں میں سکھوں کی جانب سے مذاکرات کر سکتے ہیں۔ اِس کے لیے میں اُن کے دروازے پر امرت سر جانے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے انھیں یہ تجویز بھجوائی ہے لیکن اُن کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اگر وہ اِس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں، میں اُنھیں دینے کو تیار ہوں۔''

احمد بشیر نے گیانی صاحب کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا''گیانی صاحب کہتے تھے میں یہ تجویز لے کر لوٹ آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ جناح صاحب سے ملاقات کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اُن پر سردار پٹیل کا بہت اثر تھا جو انھیں جناح صاحب سے ملاقات نہ کرنے پر آمادہ و پابند کر چکے تھے۔ واپس آ کر میں کرتار سنگھ کے پاس یہ فیاضانہ پیش کش لے کر گیا اور انھیں اسے قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ میں نے اس تجویز کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کی تمام زرخیز زمین کے مالک سکھ ہیں۔ ہمارے گوردوارے پورے پنجاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر پنجاب تقسیم ہو گیا تو مغربی پنجاب کے ہندو ہجرت کر کے مشرقی پنجاب میں آ جائیں گے۔ اُن ہندو مہاجرین سے ہندو اکثریتی ملک میں ترجیحی سلوک کیا جائے گا۔ ہم ہر صورت گھاٹے میں رہیں گے۔ ہمارے لائل پور (فیصل آباد) شیخوپورہ اور سرگودھا کے معزز سکھوں پر مشتمل ایک جتھے نے ماسٹر تارا سنگھ سے ملاقات کی۔''

ماسٹر تارا سنگھ کے جواب کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن مکالمات کو بیان کرنے لگے''جواب میں ماسٹر تارا سنگھ گیانی صاحب پر غصے میں دہاڑا''تمھیں جناح سے سکھوں کی طرف سے ملنے کی اجازت کس نے دی؟ میں نہ تو مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی جناح سے ملوں گا۔''

''آپ نے وضاحت کرنے کی ہمت نہ کی؟''احمد بشیر صاحب نے گیانی جی سے پوچھا تھا۔

''میں نے ہمت کر کے کہا کہ اس تقسیم کے نتیجے میں ہندو، مسلمان اور سکھ قتل ہوں گے، کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سکھ مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کر کے اُن سے زیادتی کریں گے۔ یوں وہ گورو گوبند سنگھ کی تعلیمات کی نفی کر کے سکھ دھرم سے نکل جائیں گے۔ جواباً مسلمان ایسا سلوک سکھ عورتوں سے کریں گے۔ یوں ہم دونوں صورتوں میں خسارے میں رہیں گے۔'' ماسٹر تارا سنگھ نے پوچھا۔''تم کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟''میں نے بتایا کہ میں امرت سر کے نزدیک ایک گاؤں سے ہوں۔''

''ماسٹر تارا سنگھ نے کہا۔''اسی لیے تم ایسے خیالات رکھتے ہو۔ میں راول پنڈی کے قریب ایک ایسے گاؤں سے ہوں جسے مسلمانوں نے جلا ڈالا۔''

''میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا''ماسٹر جی! یہ ذاتی دشمنی کا معاملہ نہیں۔ سکھوں کے مستقبل اور پنجاب کی تقسیم کا معاملہ ہے۔'' ماسٹر جی غیظ و غضب میں کانپنے لگے اور کرپان پر ہاتھ رکھ کر دہاڑنے لگے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ اُن کے جاں نثار مجھے قتل کر ڈالیں گے چناں چہ مصلحت جانتے ہوئے اجازت لے کر نکل آیا۔''

''ماسٹر تارا سنگھ نے اچھی خاصی پیش کش ضائع کر دی۔''میں نے احمد بشیر صاحب سے کہا تو وہ بولے۔

''بعد میں اس کا ماسٹر تارا سنگھ جی کو بھی احساس ہوا۔''

‘‘وہ کیسے؟’’ میں نے پوچھا۔

انھوں نے اس واقعے کا غیر متوقع انجام سنایا۔

‘‘گیانی جی ماسٹر تارا سنگھ کی مخالفت کی وجہ سے پاکستان چلے آئے اور گوردوارہ ننکانہ صاحب میں قیام پذیر ہو گئے۔ تقسیم کے بعد ماسٹر جی کو اپنی سنگین غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ انھیں اُن کا پنتھ بھی چھوڑ چکا تھا، چناں چہ دو دہائیوں کے بعد اپنے گناہوں کے کفارے کے لیے وہ ننکانہ صاحب آئے۔ گوردوارے کے روایتی طریقے کے مطابق یاتری کو سکھوں کی مقدس مذہبی کتب سے سنانا اور پڑھنا ہوتا ہے جس کے لیے پاکستان میں واحد گرنتھی گیانی جی تھے۔ گیانی صاحب سے حکومتِ پاکستان نے اس کے لیے درخواست کی تو کسی قدر تردّد کے بعد وہ مان گئے۔ ماسٹر جی اور گیانی جی کا آمنا سامنا ہوا تو ابتداً ماسٹر جی انھیں پہچان نہ پائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہچانے تو بری طرح رونے لگے اور بولے ‘‘گیانی! مجھے معاف کر دو، میں نے پنتھ کے خلاف بڑا گناہ کیا ہے۔’’ اس کے بعد انھوں نے گیانی جی کو واپس ہندوستانی پنجاب چلنے کا کہا تو گیانی جی نے یہ کہہ کر اُن سے معذرت کر لی کہ ماسٹر جی کی مجرمانہ حرکت کی وجہ سے ان کے 128 رشتے دار قتل ہو گئے جن کا خون اُن کے سر ہے۔ ماسٹر جی نے ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگی۔ ننکانہ صاحب کے دورے کے ایک برس کے اندر اندر ماسٹر جی سورگ باش ہو گئے۔’’

احمد بشیر صاحب نے یہ داستان ختم کی تو ہم دونوں ایک سوگ وار خاموشی میں کھو گئے۔

‘‘مشرقی پنجاب کے ایک سکھ دانش ور جس ونت سنگھ کنول نے بھی 1981 میں اس سارے معاملے کی میرے سامنے لاہور میں تصدیق کی تھی۔’’ احمد بشیر صاحب نے بتایا۔

‘‘ہمارے ملک میں تحقیقی صحافت کی کوئی جگہ نہیں۔ زندہ قومیں تاریخ پر تحقیق کرتی ہیں۔ ایسے صحافی اور محقق عمدہ معاوضے پاتے ہیں۔ وہ قومیں سوچ بچار کے بعد نئی پالیسیاں اس تحقیق کی روشنی میں بناتے ہیں۔ تحقیق کا بنیادی عنصر ہر دو قسم کی زاویے سامنے رکھ کر درست صورتِ حال سامنے لانا ہوتا ہے جب کہ یہاں کسی غلط العام بات کو دلائل کے ساتھ رد کیا جائے تو گالیوں اور دشنام طرازی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محقق کی نیت پر شک کیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کے پیچھے سازشی کہانیاں گھڑ کے اس سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔’’ احمد بشیر کے لب و لہجے میں دکھ کا گہرا رنگ جھلک رہا تھا۔

‘‘میری وہ تحریریں زیادہ مقبول ہوئیں جو سطحی یا عمومی نوعیت کی تھیں۔ یہی چیز ایک قوم کی ذہنی سطح اور قومی رویے کی عکاسی کرتی ہے۔’’ انھوں نے تاسف سے یہ کہتے ہوئے ایک اور تاریخی حقیقت بیان کی۔

‘‘یہ غلط طور پر مشہور ہے کہ ہند میں اسلام محمد بن قاسم لے کر آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حجاج بن یوسف سے اختلاف کی بنیاد پر پانچ سو عمانی مسلمان پہلے ہی الور میں آ بسے تھے۔ اُن میں سے چند راجا داہر کے باقاعدہ مشیر مقرر ہوئے جو اُسے سفارت اور جنگ کے معاملات میں مشاورت دیتے تھے اور دربار میں اچھا خاصا رسوخ رکھتے تھے۔ حجاج بن یوسف نے ہند پر حملے کا منصوبہ خلیفہ کے سامنے منظوری کے لیے رکھتے ہوئے پیش کش کی تھی کہ سندھ پر حملے میں جتنے اخراجات ہوں گے، وہ ان سے دگنی مالیت سندھ سے لُوٹ کر لوٹائے گا۔ حجاج ایک سنگ دل آدمی تھا۔ اُس نے بیس ہزار لوگ قتل کرائے تھے اور اس سے دُگنے مرد اور عورتیں اپنی قید میں رکھے ہوئے تھے۔ اِس سنگ دلی کے باوجود وہ ایک اعلیٰ منتظم تھا جس نے کوفے کے تیز رفتار پیغام رسانوں کے ذریعے سندھ پر حملے اور جنگ کی نگرانی اور منصوبہ بندی کی تھی۔ اُس کے احکامات تھے کہ شکست خوردہ فوج کی تمام سپاہ قتل کر دی جائے، مفتوحہ مردوں اور عورتوں کو غلام بنا کر عراق روانہ کر دیا جائے، جن میں کاری گروں اور مختلف علوم کے ماہرین کو استثنا حاصل تھا۔ حجاج اور محمد بن قاسم کی دست یاب خط و کتابت میں حجاج واضح طور پر آقا اور محمد بن قاسم ماتحت نظر آتا ہے۔ محمد بن قاسم کی ہر جنگی چال درحقیقت حجاج کی چال تھی۔ وہ ایک سعادت مند اور رحم دل لڑکا تھا۔ جب راجا داہر کی شکست کے بعد اُس کی بیٹیوں کو نشے میں دھت خلیفہ کی خواب گاہ میں پیش کیا گیا تو انھوں نے خلیفہ کو بتایا کہ وہ محمد بن قاسم کے ہاتھوں پامال ہونے کے باعث اُس کے

لائق نہیں رہیں۔ چناں چہ محمد بن قاسم جو اپنے عروج پر تھا، کو کھال میں سی کر لانے کا حکم دیا گیا۔ پیغام ملتے ہی ایک بیل ذبح کر کے محمد بن قاسم کو اُس کی کھال میں سی کر بغداد روانہ کیا گیا۔ پہلا مسلمان سالار ہند رستے ہی میں تیسرے روز جاں بحق ہو گیا۔ بعد ازاں داہر کی بیٹیوں نے اعتراف کیا کہ انھوں نے انتقام میں جھوٹ گھڑا تھا۔ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُن دونوں لڑکیوں کو ہاتھیوں کی ٹانگوں سے زنجیروں کے ساتھ باندھ کر بغداد کی گلیوں میں گھسیٹا گیا لیکن اب رحم دل نوخیز محمد بن قاسم کو قبر سے دوبارہ زندہ نہ کیا جا سکتا تھا۔''

احمد بشیر صاحب نے یہ قصہ طولانی چند جملوں میں سمیٹ کر ختم کر دیا۔ ''بیش تر تاریخی روایات کا ماخذ 'چچ نامہ' ہے۔ مسلمان عورت کے اغوا اور قزاقوں کے ہاتھوں پامالی کا واقعہ صرف ایک کہانی ہے۔ انسانی ہوسِ قصہ مطمئن کرتی خود ساختہ کہانی!''

احمد بشیر ہندستان کے تہذیبی ورثے سے محبت کے حوالے سے عہد ساز شاعر میراؔجی کا ذکر کرتے تھے۔

''میں نے صحیح معنوں میں کوئی ہندستانی دیکھا تو وہ میراؔجی تھا۔ سراپا ہندستانی! میں میراؔجی کو تقسیم سے قبل کرشن چندر کے بمبئی والے گھر کوور لاج میں ملا تھا۔ کوور لاج اندھیری کے ساحل پر ناریل کے ہرے بھرے جھنڈ میں واقع تھی۔ اس کے اِرد گرد آم اور چیکو کے پیڑ، جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں اور گھنے درختوں کے بیچ کچے نم رستے تھے۔ وہاں کوئل کوکتی، توتے اور چڑیاں شور مچاتے اور طرح طرح کے پرندے بسیرا کرتے تھے۔ کوور لاج میں پورے ہندستان کے ادیب، فلمی اور سیاسی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود اس کے بڑے بڑے کمروں میں ایک ایسی خاموشی اور سکون ہوتا جیسا دور جنگلوں میں ڈاک بنگلوں یا ڈھیتی حویلیوں میں ہوتا ہے۔ پہلی منزل کا فرش لکڑی کا تھا، سو ایک ایک چاپ نچلی منزل پر سنائی دیتی۔ وہاں پہلے روز میں نے اور مفتی نے قیام کیا تو میراؔجی سے ایک سرسری ملاقات ہُوئی۔ اگلی صبح جب افق پر سفید روشنی چھا رہی تھی تو میں نے جھاڑی بالوں والے سادھو سنت نما میراؔجی کو باہر جھروکے میں طلوع ہوتے سورج کی جانب رُخ کیے، دھیان لگائے گم سم بیٹھے دیکھا۔ اس کے بعد جب میں اسے 'سلام' کرتا، وہ گویا ڈانٹ کر مجھے 'آداب' کہتا۔ عجب ملنگ آدمی تھا، سستے جاسوسی رسالے پڑھتا، ہاتھوں میں پٹیوں والی گیندیں تھامے رعب سے یوں بات کرتا گویا قطعی حکم جاری کر رہا ہو۔ بات کرتے کرتے اپنے اندر گم ہو جاتا۔ اُس نے اپنے اندر ہی لذت کوشی کا رستہ تلاش کر لیا تھا۔ خالص ہندستانی تھا چناں چہ کبھی گفت گو میں مذہبی عصبیت نہ جھلکتی۔ وہ ایسا درخت معلوم ہوتا جو ہند کی مٹی میں اُگا تھا اور اپنی فکر میں غیر محدود تھا۔''

میں نے شوق سے پوچھا۔ ''اُن کی کوئی خصوصیت؟''

''چھٹی حس بہت تیز تھی۔ بلا کا معاملہ فہم اور کم زور دل تھا۔ ایک مرتبہ میں، میراجی اور ممتاز مفتی بس میں سفر کر رہے تھے۔ ابھی سفر کا آغاز تھا کہ اُس نے یہ کہہ کر ہمیں گھسیٹ کر باہر کھینچ لیا کہ بس پر حملہ ہونے والا ہے۔ ہم بس سے اُترے تو زندگی معمول کے مطابق تھی۔ خیر ہم نے دوسری گاڑی پکڑ لی۔ اگلے روز خبر پڑھی کہ واقعی اُس بس پر گول پیٹھے میں حملہ ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بہ ظاہر ملنگ آدمی اپنی زندگی سے کتنا پیار کرتا تھا۔''

کرشن چندر ممتاز مفتی کا دوست تھا۔ احمد بشیر کی وہیں کوور لاج میں کرشن چندر سے پہلی ملاقات ہوئی۔

''بہت سادہ آدمی تھا، دیکھنے میں بالکل ادیب نہ لگتا تھا۔ چھوٹا سا قد اور اُڑتے ہوئے بال، توند نکلی ہوئی تھی اور تھوکنے کی عادت تھی۔ اُس کی بیوی ایک سادہ سی گھریلو عورت تھی جو زیادہ تر سفید کپڑے پہنتی تھی۔''

''کرشن چندر اتنی موثر، دھیمے رومان والی اور خوب صورت زبان کیسے لکھتے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ جذبے جو اُس کی تحریروں میں نظر آتے تھے، کہیں اُس کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ شاید اُن تشنہ جذبوں کی تکمیل وہ اپنی تحریروں کے ذریعے کرتا تھا۔'' احمد بشیر صاحب نے تجزیہ کیا۔

اپنے وقت کے ایک اور معروف شاعر عبدالحمید عدمؔ کے بارے میں بتانے لگے۔

‘‘میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت کرتا تھا۔ عبدالحمید عدمؔ وہاں افسر تھے۔ ایک مرتبہ تن خواہ بروقت نہ ملنے اور الاؤنس کے بل پاس نہ ہونے پر ملازمین نے ہڑتال کی ٹھان لی۔ عدمؔ بھی ہم دردوں میں شامل تھے۔ انھوں نے ہڑتالیوں کی فہرست لے لی تاکہ صحیح طرح سے ہڑتال منظم ہو سکے۔ کچھ دیر بعد سرکردہ ہڑتالی جیل میں قید تھے۔ دراصل عدم نے وہ فہرست انگریز افسر کو دے دی تھی۔’’

قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کا تذکرہ چٹخارے لے لے کر کئی مرتبہ کیا۔ حفیظ جالندھری کے ساتھ ملازمت کرتے ہوئے ہی صاحبِ طرز مزاح نگار، شاعر اور سفرنامہ نگار ابن انشا سے دوستی قلبی تعلق میں بدل گئی۔

‘‘حفیظ جالندھری کے تحت مجھے امریکی امداد کے دیہات سدھار کے ایک پروگرام میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اپنی طرز کے واحد آدمی تھے۔ مجھے پہلی ملاقات ہی میں بتا کر متاثر کر دیا کہ قائداعظم اہم سیاسی امور میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ کشمیر سے تعلق سن کر اُن کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اعتراف کیا کہ اُن کے اصرار پر پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کا منصوبہ تسلیم کیا۔ ان کا لہجہ خود پرستانہ کے بجائے عاجزانہ ہوتا تھا۔ عاجزی سے انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ پاکستان بنانا اکیلے اُن کا کام نہ تھا، اس میں قائداعظم نے بھی ان کا کافی ساتھ دیا۔ بعد میں تقسیم کے وقت جالندھر میں اپنے بے شمار عزیز و اقارب کی شہادت کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو میں نے بھی بہت مشکل سے اپنے جذبات قابو میں رکھے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تمام قصے حفیظ جالندھری کے نہ صرف اپنے تخلیق کردہ تھے بلکہ وہ اِن پر صدقِ دل سے یقین کر بیٹھے تھے۔ جالندھر میں تو تقسیم کے وقت فسادات ہوئے ہی نہ تھے۔ اُن کا مزاج پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا تھا۔ اسی لیے اُن کے ساتھی اور ماتحت بہت محتاط رہتے تھے۔ اُن کا غصہ بھی ایک منصوبہ بندی کے تحت ہوتا تھا۔ وہ اپنا ڈرائیور مہینے کی اُن آخری تاریخوں میں ناراض ہو کر فارغ کر دیتے تھے جب اُسے تن خواہ دینے کی تاریخ نزدیک آ جاتی تھی۔ ایک محتاط ڈرائیور نے مہینا بھر اچھی خاصی ڈرائیونگ کی، آخر میں کہیں گاڑی تیز رفتار ہو گئی تو حفیظ صاحب نے گاڑی رکوائی اور باہر نکل کر ایک راہ گیر سے اپنے بارے میں پوچھا۔ لوگ قومی ترانے کے خالق کو خوب جانتے تھے۔ راہ گیر نے اُنھیں بہت عزت دیتے ہوئے شعر پڑھا اور بولا۔ ‘‘واللہ، یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ حضرت آپ ابوالاثر ہیں، قومی ترانے کے خالق۔’’ اس پر حفیظ صاحب ڈرائیور کو بھول گئے اور راہ گیر پر برس پڑے ‘‘بے موقع شعر نہ پڑھیے۔’’ پھر بات کا سِرا دوبارہ پکڑ لیا اور اپنے بے شمار القابات گنواتے ہوئے لجاجت سے درخوات کی کہ وہ اُنھیں برا کہے۔ یہ سن کر وہ نستعلیق قسم کا راہ گیر، ہچکچانے لگا۔ بہت اصرار پر اُس نے اُنھیں بُرا کہہ دیا۔ اس کے بعد حفیظ جالندھری نے اُس سے درخواست کی کہ وہ اُن سے پوچھے کہ انھوں نے بُرا بھلا کہنے کی درخواست کیوں کی۔ اُس نے تذبذب میں سوال دُہرا دیا تو حفیظ صاحب نے جواب دیا۔ ‘‘میں اس لیے پاجی ہوں کہ میں نے اِس شخص کو ڈرائیور رکھا ہوا ہے۔’’ یہ کہہ کر حفیظ صاحب مڑے تو ڈرائیور وہاں سے غائب تھا۔ وہ مہینے کی آخری تاریخ تھی۔’’

حفیظ صاحب کے مزاج سے متعلق احمد بشیر نے ایک اور بات بتائی۔

‘‘وہ اپنی خیالی دنیا میں رہتے تھے۔ کبھی کبھار باہر نکلتے تو چنگھاڑتے یا آنسو بہاتے ہوئے، خاصا ڈراما کر لیتے تھے۔’’

‘‘کچھ لوگ اُن کے شاہ نامۂ اسلام کو بہت بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے’’ میں نے رائے دی تو جیسے اُنھیں کچھ یاد آ گیا۔

‘‘انھوں نے میری (احمد بشیر) کی درخواست پر ابن انشا کو ادارے میں ملازمت کے انٹرویو کے لیے بلایا۔ ابن انشا اُن دِنوں اسمبلی ٹوٹنے کے بعد وہاں مترجم کی ملازمت سے فارغ ہو کر بے روزگار تھا۔ وہ کبھی کبھار مزاحیہ کالم اور انگریزی مضامین لکھ لیتا تھا۔ خیر، جب انٹرویو ہوا تو وہ ابوالاثر کو خاصا پسند آیا۔ ایسے موقع پر ابن انشا نے ایک غیر متوقع بات کہہ دی۔’’

‘‘وہ کیا؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘اُس نے حفیظ جالندھری کو بتایا کہ اُس نے اُن پر روزنامہ ڈان میں ایک مضمون لکھا تھا۔ حفیظ جالندھری نے ٹیڑھے منہ سے پوچھا۔ ‘‘کیوں برخوردار! کیا لکھا تھا؟’’

''ابن انشا نے بتایا کہ اُس نے لکھا تھا کہ حفیظ صاحب نروس بریک ڈاؤن کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ حفیظ صاحب نے فوراً اپنی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''یہ تو ہر حساس آدمی کا مسئلہ ہے بلکہ مجھے تو شاید اس وقت بھی نروس بریک ڈاؤن ہے۔'' اس پر ابن انشا نے کہا کہ ڈاکٹر نے حفیظ صاحب کو دماغی کام کرنے سے منع کیا اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حفیظ صاحب نے یہ سن کر ٹھنڈی سانس بھری اور بولے۔ ''ہاں برخوردار! مگر فکرِ سخن، تقسیم کے فسادات میں شہید ہونے والے عزیزوں کا غم اور غمِ روزگار آرام کہاں کرنے دیتا ہے، میں دماغی کام نہ کروں تو مر جاؤں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون سا دماغی کام کر رہا ہوں تو میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں شاہ نامۂ اسلام کی چوتھی جلد مکمل کر رہا ہوں۔''

''یہ سن کر ابن انشا نے ڈرتے ڈرتے کہا ''قبل اس کے کہ آپ کو کوئی بتا دے، میں خود ہی بتا دیتا ہوں کہ میں نے یہ واقعہ من و عن لکھ دیا تھا۔ البتہ اِس میں ایک اضافہ کیا تھا۔ یہ وہ بات تھی جو عبدالمجید سالک صاحب نے مجھے بتائی تھی۔''

''وہ کیا برخوردار؟''

''میں نے لکھا کہ ڈاکٹر نے یہ سن کر کہ آپ شاہ نامہ اسلام پر کام کر رہے ہیں، آپ سے کہا اس سے آپ کی صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ میں نے تو دماغی کام سے منع کیا ہے۔''

''پھر تو حفیظ جالندھری صاحب غیظ و غضب میں خوب دھاڑے ہوں گے؟'' میں نے ہنستے ہوئے احمد بشیر صاحب سے پوچھا۔

''نہیں۔ اُن پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے ابن انشا کو کھسک جانے کا اشارہ کیا۔ میں اُسے باہر چھوڑ کر لوٹا تو حفیظ صاحب ہنوز سکتے کے عالم میں تھے۔ اُن کا چہرہ اُسی طرح پتھرایا رہا اور ہونٹ ہلے 'یہ سالک کا آدمی ہے'۔''

معاصرانہ چشمک کا یہ واقعہ سنا کر احمد بشیر صاحب کافی دیر مسکراتے رہے۔

''ابن انشا کیسے آدمی تھے؟'' مَیں نے پوچھا۔

''شان دار'' وہ بے ساختہ پنجابی میں بولے۔ ''بہت معصوم اور انتہا کا جذباتی۔ اُس پر خودکشی کے دورے پڑتے تھے۔''

میں نے انشا پر لکھے گئے ایک تھیسس میں پڑھا تھا کہ اُن کے دِل میں لاہور کے خلاف ایک جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چوں کہ انھیں لاہور میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے ان میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ میں نے احمد بشیر صاحب سے پوچھا تو انھوں نے حیرت سے بتایا کہ کبھی انشا نے ایسی کوئی بات اُن سے نہیں کی تھی۔ ابن انشا اور ناصر کاظمی مختلف حوالوں سے جن میں اے حمید مرحوم کے مضامین بھی شامل ہیں مجھے اُداس چاندنی کی ہلکی رومانوی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب کی شخصیت سے بھی اسرار وابستہ ہیں۔

''ابتداً ابن انشا کے چھوٹے بہن بھائی اور بوڑھے ماں باپ لاہور رہتے تھے۔ اُن کے اخراجات وہ خود اٹھایا کرتا تھا۔ اُس میں ایک بے ساختہ حِس مزاح تھی۔ عام طور پر مزاح لکھنے والے عام زندگی میں سنجیدہ ہوتے ہیں جب کہ وہ عام زندگی میں تحریروں سے بڑھ کر ظریف تھا۔ اُس میں جینیاتی طور پر خودکشی کا رجحان تھا۔ جب کبھی وہ ایسی کیفیت میں ہوتا میں اُسے بہلا پھُسلا کر خودکشی کے طریقوں پر منصوبے باندھتا یہاں تک کہ اُس کی یہ کیفیت ختم ہو جاتی۔''

''کبھی آپ نے انھیں حقیقت میں طویل ڈپریشن کی کیفیت میں دیکھا؟''

''ہاں۔ کراچی میں اُسے ایک شادی شدہ لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ لڑکی نے اپنے شوہر کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا۔ عشق یک طرفہ تھا۔ انشاء اُس لڑکی پر خرچہ کرتا رہتا۔ میں اُسے سمجھاتا کہ وہ لڑکی اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ وہ ایک ہی رَٹ لگائے رکھتا کہ اُسے اپنے دل پر اختیار نہیں۔ ایک مرتبہ تو اُس کی اتنی بُری حالت ہو گئی کہ وہ اُس لڑکی کے باتھ آئی لینڈ کے گھر کے باہر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو لڑکی نے اندر سے گھر بند کر لیا، بڑی مشکل سے وہ واپس ہوا۔ وہ پیدائشی طور پر رومانوی شخص تھا۔ چھوٹی عمر میں اُس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کر دی گئی

جو اُسے ناپسند تھی، عمر میں بھی اُس سے بڑی تھی۔ ان کی نبھ نہ سکی۔ اُس کے اندر محبت کی پیاس بڑھتی رہی۔ اگر کراچی والی لڑکی نہ ہوتی تو کوئی اور لڑکی بھی ہو سکتی تھی۔"

"وہ لڑکی کون تھی؟" میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گئے۔ بس اتنا اشارہ دیا۔

"حفیظ جالندھری صاحب کے عزیزوں میں سے ایک لڑکی تھی۔"

ابن انشا کے بارے میں احمد بشیر صاحب نے زیادہ بات نہیں کی، البتہ اُن کی جواں مرگی کا افسوس کرتے رہتے۔

خود احمد بشیر نے اپنی زندگی میں بالعموم اور جوانی میں بالخصوص کئی محبتیں کیں لیکن عشق صرف ایک کیا، اپنی بیوی سے عشق۔ وہ ذرا آنکھوں سے اوجھل ہوتیں تو یہ بے چین ہو جاتے۔ بیوی نے بھی اُن کا اس طرح خیال رکھا جس طرح بچوں کا رکھا جاتا ہے۔ وہ ان کی ہم نوا اور ہم روح ثابت ہوئیں۔ ان کے شوق کے کھانے کباب، مچھلی، کریلے گوشت، کھگے بہت رچاؤ سے بناتیں۔ دونوں شام کو اکٹھے پھل کھاتے۔ امرود اور آڑو زیادہ رغبت سے کھاتے۔ یہ شادی ویسے بھی اُن کی پسند کی تھی۔ اس سے پہلے ایک بیاہ ہوا تھا جو بہت مختصر مدت کے لیے چلا تھا۔

"وہ عورت مجھے ماں لگتی تھی، محبت کے بجائے عزت کرنے کو جی کرتا تھا۔" ایک قریبی عزیزہ جس سے پہلی شادی ہوئی تھی، کے بارے میں جھجکتے ہوئے ایک مرتبہ اعتراف کیا۔

دوسری بیوی سے جب بچی پیدا ہونے والی تھی تو بیوی رواج کے مطابق چالیس دن کے لیے میکے گئی۔ بچی کی پیدائش کے چودہ دن بعد وہ بیوی سے واپس چلے آنے کا تقاضا کرنے لگے۔ بیوی کے والدین اتنی جلدی اپنی بیٹی کو واپس بھیجنے کو تیار نہ تھے۔ چناں چہ ڈراما کرتے ہوئے بیوی کو پانچ ہزار کا جعلی چیک بہ طور حق مہر بھجوا دیا۔ یہ دیکھ کر بیوی کے ماں باپ بہت برہم ہوئے اور اپنی بیٹی سے کہہ دیا کہ وہ واپس اپنے شوہر کے پاس نہ جائے۔ بیٹی نے زیادہ ضد کی تو اُس کے والد نومولود بچی کے ہم راہ اُسے سسرال کے دروازے پر چھوڑ کر بغیر کسی سے ملے لوٹ گئے۔ احمد بشیر نے جب بیوی اور بچی کو باہر دیکھا تو پشیمان ہوئے اور بے اندازہ خوش بھی۔ اسی واقعے سے بھی فیصلہ کن اختیارات کا فیصلہ ہو گیا اور آیندہ احمد بشیر فیصلے کرتے رہے اور بیگم اُنھیں مانتی رہیں۔

البتہ دفتر میں ساتھ کام کرنے والی خاتون سے کراچی میں عشق آمیز دوستی کی۔ صبیحہ نام کی انتہائی پروقار اور خوب صورت دکھتی خاتون تھیں۔ پیپلز پارٹی کی شیری رحمان اُنھی کی بیٹی ہیں۔ وہ خاتون ساڑھی اور موتیوں والے بلاؤز میں اتنی پُرکشش لگتیں کہ آس پاس کے لوگوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ ان خاتون سے دوستی کو کبھی نہ چھپایا۔ پرانے زمانے تھے، بیوی بھی وسیع القلب تھی، صبیحہ کے گھر آنے جانے پر کوئی اعتراض کیا بلکہ اُلٹا اُس سے دوستی کر ڈالی۔ اب صورت کچھ یوں بنی کہ احمد بشیر کی دوست اور بیوی آپس میں بہترین سہیلیاں بن گئیں۔ جب بھی صبیحہ کا گھر آنا ہوتا تو وہ خوشی میں بیوی کو کہتے۔ "آج صبیحہ نے آنا ہے، اُس کے لیے خاص کھانا بنا لو"۔ اور بیوی بھی ہنستے ہوئے اپنی سہیلی کے لیے باورچی خانے چلی جاتی۔ یہ لوگ اکٹھے تفریح کی خاطر ساحل سمندر اور دیگر جگہوں پر چلے جاتے۔ اس دوستی میں رنگ خلوص کے سوا کوئی اور رنگ نہ تھا۔ ہاں رنگ عشق کبھی کبھی جھلک اُٹھتا۔

زمانہ اُلٹی قلا بازی لگاتا ہے۔ اُن کی زندگی میں شہاب یا وہ اُن کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔

"چند اہم اور قابل قدر ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شہاب صاحب کے عہدے سے متاثر تھے۔ اسی لیے ان کی توصیف کرتے رہتے۔" میری بات سن کر احمد بشیر صاحب غصے میں آ گئے۔

"ایسی بالکل کوئی بات نہیں۔ یہ بکواس ہے۔ شہاب صاحب کی وفات کے بعد اُن پر اعتراضات جھوٹ اور بددیانتی ہے۔ اشفاق، مفتی، بانو یا مجھے اُن کی ملازمت سے علیحدگی کے بعد ایسی باتوں سے کیا حاصل۔ وہ واقعی صوفی درویش آدمی تھے۔ آج ہر گلی کوچے میں سرکاری افسر پھرتے ہیں۔ اُس دور میں وہ بہت اونچے عہدے پر تھے۔ وہ ہماری تعریف سے بے نیاز تھے۔"

بات شہاب صاحب کی روحانی وارداتوں پر ہوئی تو احمد بشیر صاف گوئی سے بولے۔

”میں نے اُن سے وابستہ کوئی کشف یا روحانی واردات اپنی آنکھوں سے تو نہ دیکھی مگر اُن میں چند ایسے اوصاف دیکھے جو شاید اُن کی ماں جی سے انھیں وراثت میں ملے تھے۔“

ایک واقعہ ہے کہ جب شہاب صاحب وزارتِ تعلیم کے سیکریٹری اور احمد بشیر صاحب معمولی ملازم تھے تو دونوں میں ممتاز مفتی صاحب کی وجہ سے ایک تعلق پیدا ہوگیا۔ چناں چہ ایک روز صبح سویرے قدرت اللہ شہاب کا احمد بشیر کو فون آیا۔ اُن کی آواز میں لکنت اور ہیجان تھا۔ انھوں نے احمد بشیر سے کہا ”آپ فوراً میرے دفتر آجائیں۔“

احمد بشیر، شہاب صاحب کے دفتر پہنچے تو وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سیکریٹری سے کہہ دیا کہ اندر نہ تو فون ملایا جائے اور نہ ہی کسی کو آنے دیا جائے۔ اس کے بعد احمد بشیر سے بولے ”آج میں بے انتہا خوش ہوں۔ مجھے بتا دیا گیا ہے کہ مجھے کب مرنا ہے۔“

شہاب صاحب، خلاف مزاج اپنی مسرت چھپا نہیں پا رہے تھے۔

”آپ نے کب مرنا ہے؟“ احمد بشیر نے سوال کیا تو وہ بولے۔

”میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ مجھے ممتاز مفتی سے پہلے موت آئے گی۔“

یہ کہنے کے بعد شہاب صاحب بے ربط گفت گو کرنے لگے۔

بعد میں یہ پیش گوئی سو فی صد درست ثابت ہوئی۔ شہاب صاحب مفتی صاحب سے پہلے فوت ہوئے اور مفتی صاحب نے طویل عمر پائی۔

میں نے احمد بشیر صاحب سے پوچھا کہ شہاب صاحب نے یہ راز انھی سے کیوں بیان کیا جب کہ اُن کے زیادہ قریبی دوست موجود تھے تو احمد بشیر نے کہا۔ ”شہاب صاحب نے اس کی کئی وجوہ بیان کی تھیں۔ جو بات مجھے سمجھ میں آئی، یہ تھی کہ اُس روز میں ہی باآسانی میسر تھا۔ باقی دوستوں میں کوئی دور تھا تو کوئی شہر سے باہر۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے انھوں نے مجھے مناسب سمجھا۔“

بعد میں، ایک مرتبہ میں نے نیلم احمد بشیر سے شہاب صاحب کے متعلق پوچھا تو وہ بولیں۔

”شہاب صاحب سادہ سے آدمی تھے۔ معمولی سا حلیہ، سفید شلوار قمیص پہنے آتے تھے۔ یہ تو اُن کے فوت ہونے کے بعد پتا چلا کہ وہ خاصے اہم آدمی تھے۔ جب وہ آخری مرتبہ ہمارے ہاں آئے تو کافی مضطرب تھے۔ کچھ دیر ابا کے پاس بیٹھے رہے پھر چلے گئے۔ ابا نے بعد میں بتایا کہ وہ اعتراف کر کے گئے تھے کہ پاکستان کے چند مسائل کے وہ بھی بلاواسطہ ذمہ دار تھے۔ ابا نے حیرت سے یہ ضرور کہا تھا کہ نہ جانے یہ اعتراف کرنے وہ خاص اُن کے پاس کیوں آئے تھے۔“

احمد بشیر، شہاب صاحب کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے کہ اُن کے ساتھ کئی مرتبہ مسجد گئے۔ شہاب صاحب نماز پڑھتے رہتے اور یہ باہر انتظار کرتے رہتے۔ شہاب صاحب نے انھیں کبھی مجبور نہیں کیا کہ یہ اُن کے ہم راہ نماز پڑھیں۔

ایک روز ڈھلتے پگھلتے سورج کی مدھم پیلی روشنی میں، آخری دنوں میں، باتیں کرتے کرتے شہاب صاحب کے مزاج کا بتانے لگے کہ وہ کبھی بھی کھل کر اختلاف نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر اُس روز بدھ ہو اور انھیں کہا جائے کہ آج جمعرات ہے تو کہتے کہ ہاں شاید آج جمعرات ہی ہے۔ اور اگر پھر کہا جائے کہ نہیں آج بدھ ہے تو بھی کہتے کہ آپ درست کہہ رہے ہیں، آج بدھ ہی لگتا ہے۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔“

میں نے کریدا ”شہاب صاحب نے اپنی کتاب میں مختلف وظائف کا ذکر کیا ہے تو کیا مسجد میں نماز ادا کر کے وہ وظائف بھی پڑھا کرتے تھے؟“

''نہیں وہ مسجد میں فقط نماز ادا کرتے تھے، وظائف رات ہی کو ادا کرتے تھے۔''

میں نے مزید استفسار کیا کہ کیا شہاب صاحب اور مفتی صاحب ایسی ہستیوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کسی روحانی واردات سے گزرے تو اُن کا جواب مکمل نفی میں تھا۔ کہنے لگے ''میں بڑا معمولی آدمی ہوں مگر سچ یہ ہے کہ مادے کے علاوہ میرا کسی بھی شے پر زیادہ اعتبار نہیں اور نہ ہی مجھے کبھی کوئی روحانی تجربہ ہوا۔ البتہ ایک بہت بڑی ہستی اور قوت کا میں قائل ہوں۔''

''خوابوں پر بھی یقین نہیں جن میں پہلے سے اشارہ کر دیا جاتا ہے یا کوئی مرا ہوا عزیز یا بزرگ آ کر جھلک دکھا جاتا ہے؟'' میں نے پوچھا تو بولے ''نہیں۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ لوگ ایسی بہت باتیں سناتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، سچ ہو مگر میں نہیں مانتا۔ میرے بیوی بچے تو کچھ عرصے سے میری موت کے خواب بھی دیکھ رہے ہیں، موت تو لازم ہے۔'' یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اُنھیں کینسر تشخیص ہو چکا تھا۔

اُسی روز باتیں کرتے کرتے بے ترتیب سانسیں ہموار کیں، تکیے سے ٹیک لگائی اور شریر لہجے میں بولے۔

''مولویوں کو میں نے بہت مشکل میں ڈالے رکھا ہے۔ ان کے خلاف خوب لکھا اور بولا ہے۔ بھلا ملائیت نے آج تک دنیا کی تاریخ میں انسان کو کبھی کوئی فائدہ دیا؟ حضرت محمد ﷺ تو بہت نیک انسان تھے، دانش ور تھے، بہت اچھے انسان تھے مگر یہ مُلّا تو فقط باعثِ نقصان ہیں۔ ''جو ملے تھے راستے میں'' کے پہلے ایڈیشن میں تو مُلّاؤں کے خلاف کچھ نہیں تھا لیکن بعد میں میں نے خوب لکھا ہے جو کافی مشہور ہوا ہے۔''

''کبھی دھمکیاں نہیں ملیں؟''

''بہت۔ میں عدالت میں چلا گیا۔ پولیس نے کہا ہم آپ کو سپاہی دے دیتے ہیں۔ میں نے کہا سپاہی ملیں گے تو ان کے چائے پانی کا خرچہ بھی اٹھانا ہوگا سو میں نے انکار کر دیا۔''

''آپ ملائیت کے خلاف بھی لکھتے رہے اور ضیا کے خلاف بھی تو کبھی صحافت میں مشکل پیش نہیں آئی؟''

''بہت آئی۔ ڈان کے اخبار "Star" میں لکھتا تھا۔ ضیا کے خلاف بہت لکھا۔ یوسف ہارون صاحب اس کے مالک بھی تھے، بعد میں گورنر بھی ہوئے۔ ایڈیٹر مجھے بہت پسند کرتا تھا۔ سو وہ میرا نام بدل کر مضامین چھاپتا رہا۔ کبھی ایک نام سے تو کبھی دوسرے نام سے۔ بلکہ ایک لڑکی نے نجم سیٹھی کے اخبار میں اس پر ایک مضمون بھی لکھا تھا، شاید Tracking the star یا Star Track کچھ اس طرح کا نام تھا۔''

''خالد احمد کچھ نظریاتی نظر آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ بے شک بہت پڑھا لکھا اور سمجھ دار قابل آدمی ہے مگر اُس کا بھی کوئی خاص نظریہ نہیں۔''

احمد بشیر صاحب نے جوانی میں شاعری بھی کی۔ ایک نظم سناتے جس کا ایک مصرع کچھ یوں تھا۔

میں مٹی کا اِک توتا بیٹھا سوچ رہا ہوں

ہالی وُڈ میں فلم کے حوالے سے ایک برس کی ٹریننگ لی اور بڑے سہانے خواب لے کر واپس آئے۔ ممتاز مفتی کی تحریر کردہ اور ابن انشا کی شاعری پر مشتمل فلم ''نیلا پربت'' کچھ اس چاؤ سے بنائی کہ اس میں تجریدیت کے تجربے کر ڈالے اور اُسے کلاسیکی موسیقی سے سجا دیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو لوگوں کی فہم سے ماورا ہونے کی وجہ سے فلاپ ہو گئی۔ نتیجتاً ذہنی طور پر شدید دھچکے کا شکار ہوئے اور مالی طور پر کنگال ہو گئے۔ نیم بے چارگی میں پکارتے پائے گئے ''ڈاکٹر نوں بلاؤ۔''

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ بوڑھا سوشلسٹ دانش ور ایک زمانے میں ماورائی علوم، علم نجوم، برجوں، علم جفر کا نہ صرف قائل تھا بلکہ عملی طور پر دعا، وظائف اور روحانی معاملات میں شریک بھی رہا تھا۔

سیاروں کی چال کے حوالے سے اُس نے لکھا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں دو مرتبہ ساڑھ ستی آتی ہے۔ اس سے مراد انتہائی ابتلا کے ہیں جس میں ستاروں کی حرکت کا بہت اہم حصہ ہے۔ اہم ترین سیارہ زحل ہے جو تیس برس کی مدت میں دنیا کا چکر پورا کرتا ہے گویا ساٹھ برس کی عمر کے شخص کی زندگی میں دو چکر۔ اس کا ایک درجہ اڑھائی برس کا ہوتا ہے۔ خوش قسمت لوگوں کی زندگی سے یہ ایک درجے میں نکل جاتا ہے اور بد نصیب لوگوں کی زندگی میں یہ تین ڈھائے یعنی ساڑھے سات برس بعد اُن کو لاچار و خوار کر کے نکلتا ہے۔

اِن علوم کا شوق فقط ایک مشغلے کی حد تک تھا۔ ایک مرتبہ ایک گھڑ دوڑ کا نہایت محنت سے حساب لگا کر انھوں نے دوست کے حوالے کر دیا۔ ان کا حساب عین درست ثابت ہوا اور دوست ایک ہی دوڑ میں خاصی رقم کما گیا۔

اپنی بہن پروین عاطف کے شوہر بریگیڈیئر عاطف کے ہاکی سے عشق کے معترف تھے۔ اُن بریگیڈیر کے پیدائشی برج عقرب کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ ایسے لوگ مزاجاً حاکم ہوتے ہیں اور دل کا بھید چھپانا خوب جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ فیض احمد فیضؔ سے ایک شاعر (غالباً منو بھائی) نے مشورہ مانگا کہ وہ کس زبان میں شاعری کریں تو فیض صاحب نے تحت الشعور کے تخلیقی عمل پر اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے کلاسیک مشورہ دیا تھا ''جس زبان میں خواب دیکھتے ہو۔''

اسی لیے جب احمد بشیر کے فوت ہونے کے کافی عرصے بعد نیلم احمد بشیر نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اپنے والد کو خواب میں دیکھا تھا کہ وہ قبر سے باہر پھلوں کی ایک ریڑھی پر لیٹے ہیں۔ بیٹی کو دیکھ کر انگریزی میں کہتے ہیں ''I am alone and hungry'' (میں تنہا اور بھوکا ہوں) تو مجھے اس خواب میں زیادہ سچائی نظر نہ آئی کہ احمد بشیر نے انگریزی سے کبھی محبت نہ کی تھی۔ شاید نیلم نے خواب میں انھیں اپنے لاشعور کی نظروں سے دیکھا تھا۔

اس کی بہ نسبت اکمل علیمی نے انھیں خواب میں جو دیکھا، وہ زیادہ قرینِ حقیقت ہے۔ اکمل علیمی نے پینتیس برس امریکا میں قیام کیا۔ اپنے خواب میں وہ احمد بشیر کو واشنگٹن کے سمتھ سونین عجائب گھر کے باہر دیکھتے ہیں اور ان کے قریب جاتے ہیں۔ احمد بشیر اُنھیں دیکھ کر بولنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بول نہیں سکتے۔ کافی کوشش کے بعد وہ دو لفظ بولتے ہیں۔ ''ماسٹر مدن۔'' ماسٹر مدن ایک نوجوان لڑکا تھا جو لڑکپن میں فوت ہو گیا لیکن گائیکی میں لازوال نام بن کر زندہ رہ گیا۔

احمد بشیر کو گائیکی سے عشق تھا۔ یہ خواب اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس سے گمان کا پرندہ ایک ایسے گھونسلے میں بیٹھتا ہے جہاں ماسٹر مدن اور احمد بشیر اکٹھے ہوں۔ شاید یہ ترکیب درست نہیں کیوں کہ احمد بشیر گھونسلے پر یقین نہ رکھتے تھے۔ وہ ذاتی ملکیت کے شدید خلاف تھے۔ اسی لیے کوئی ملکیت نہ رکھی اور دانستہ گھر نہ بنایا۔

یہ وہی احمد بشیر ہیں جو قحطِ بنگال دیکھ کر دہاڑیں مار مار کر روئے تھے۔

''وہاں سڑکیں بھوکے ننگے لوگوں کی لاشوں اور لاغر جسموں سے اَٹی پڑی تھیں۔ ایک جانب ایک شیر خوار ماں کے سینے کو منہ لگائے دودھ کی آخری بوندیں چوستے ہوئے مر چکا تھا۔ اُس کی ماں بھی مردہ تھی۔ دوسری جانب مردہ بچے نے مردہ ماں کی انگلی مضبوطی سے تھامی ہوئی تھی۔ کیچڑ، گندگی اور کچرے کی گاڑی سڑک سے گزرتی تو لوگ اُس کے گرتے کچرے سے چاول کے دانے تلاش کرتے آپس میں لڑ پڑتے۔ کوڑے کے ڈھیروں پر انسان اور کتے خوراک کی تلاش میں جھگڑتے تھے۔ وہ قحط مصنوعی تھا۔ گودام خوراک سے بھرے ہوئے تھے لیکن بھیڑیے کی طرح خون خوار سرمایہ دار مزدور اور کسان کا خون پی رہا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے احمد بشیر کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے اور آواز کانپنے لگی تھی۔ اُنھوں نے سرمایہ دار کو گالی بھی بکی تھی۔ ایسی گالی جس میں خلوص اور ہم دردی کی مہک تھی۔ یہ وہی احمد بشیر تھے جنھوں نے پیش کشوں کے باوجود کبھی اپنے نظریات پر سمجھوتا نہیں کیا۔ کئی ملازمتیں کیں اور خود ہی چھوڑ دیں۔ مڈل کلاسیے، بلکہ غریب آدمی کی زندگی بسر کی۔

''ابا کبھی گھر خوش خوش آتے اور اُن کے ہاتھوں میں پھل یا مٹھائیاں ہوتیں تو دو ہی باتیں ہوتیں۔ نوکری ختم ہونے کی خوشی یا نوکری ملنے کی خوشی۔ ایک مرتبہ ہم خاصی مالی مشکل میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ ابا گھر واپس آئے تو انھوں نے اپنا واحد کوٹ پہنا ہوا نہیں تھا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بتایا۔ ''رستے میں ایک ضرورت مند مل گیا تھا، اُسے دے دیا۔'' یہ اُسی دَور کی بات ہے جب ہمارے لیے ایک ایک آنے کی اہمیت تھی کہ غیر متوقع طور پر گھر خالی ہاتھ لوٹے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ''تین ہزار روپے لے کر آ رہا تھا کہ ایک غریب آدمی مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی بیمار ہے۔ وہ سارے پیسے اُسے دے دیے۔'' نیلم نے اُداسی سے بتایا۔

احمد بشیر آخری مرتبہ اسپتال گئے تو اُن کے ہاتھوں میں مسولینی کی کتاب تھی۔ یہ کتاب اُس نظام کی علامت تھی جس میں ہر انسان برابر تھا۔ ایک نونہال ماں کی لوری سنتے سنتے بھوک سے نڈھال ہو کر مندتی آنکھوں سے آس پاس منڈلاتے منتظر گدھوں کی آنکھوں کی چمک کا سامنا نہ کرتا ہو۔ بدبودار سرمایہ دارانہ استعمار مزدور کے سینے پر پیر رکھ کر اُس سے خون نہ تھکواتا ہو۔ انسانی برادری ایک مالا کے موتیوں کی طرح برابر ہو اور من موہنی ہو۔

میں احمد بشیر صاحب سے آخری مرتبہ ملا تو انھوں نے مجھ سے کہا ''میں نے چند روز میں کینسر سے مرجانا ہے۔ ڈاکٹر بتا چکے ہیں۔ میرے گھر والے بھی تیار ہیں۔ میں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں ظالم سرمایہ دار اور کٹھ مُلّا کے تراشے خدا کو نہیں مانتا۔ میں ایک ایسی لازوال قوت کو تو پھر بھی مان سکتا ہوں جس کا میں نے مشاہدہ اور تجربہ تو نہیں کیا، پر جو مظلوم کے لیے شفیق اور مہربان ہو۔''

نیلم نے بتایا تھا کہ اُن کے ابا نے مرتے دم اپنی تمام اولاد کو اپنے سرہانے کھڑے دیکھ کر کہا تھا۔ ''میں نے جائداد نہیں بنائی اسی لیے تم سب یک جا ہو۔ میری کچھ ملکیت ہوتی تو تم اس کے بٹوارے کے جھگڑے میں پڑ کر یوں میرے پاس اکٹھے اور متحد نہ ہوتے۔''

''اُن کے دوست فوت ہوتے تو وہ ان کے جنازوں میں نہ جاتے اور یہ کہتے۔ 'میرا دوست تو مر گیا، اب افسوس کس سے کروں؟''

احمد بشیر اکثر مولانا روم کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بُدم، پختہ شُدم، سوختم

میرا حاصلِ عمر فقط تین لفظ
خام تھا، پختہ ہوا، تمام ہوا

اس کے علاوہ گنگنایا کرتے۔

آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا
اور بدریا چھائی ہے

احمد بشیر نامی ہم درد، غریب پرور انقلابی تو نہ رہا لیکن اُس کا خواب اس دھرتی پر زندگی بسر کرتے ہر محنت کش کا خواب ہے جسے کسی صورت پورا ہونا ہے۔ اس بدریا کو بلا تفریق برسنا ہے۔

کھلکھلاتا آدمی

عطاءالحق قاسمی

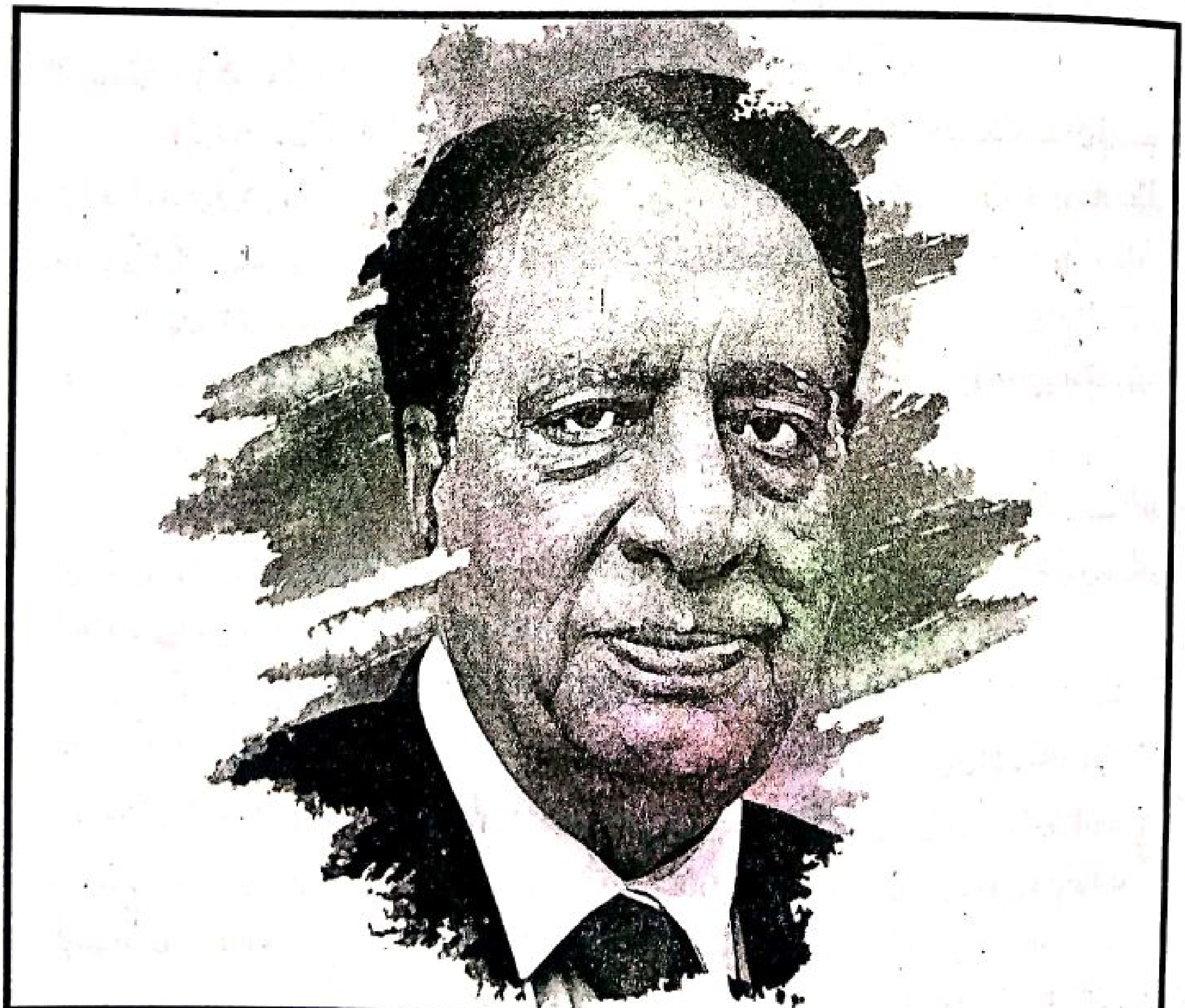

الحمرا ہال لاہور میں مجلسِ اقبال کی جانب سے تقریب کا اہتمام تھا۔ نوے کی دہائی تھی۔ غلام حیدر وائیں صاحب وزیرِ اعلیٰ پنجاب تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ چوں کہ وہ بہت بنیادی سطح سے ترقی کرتے ہوئے وزارت اعلیٰ کے عہدے پر متمکن ہوئے تھے اس لیے رسمی تعلیم کے چند ہی مراحل طے کر پائے تھے۔ ان کے وزیروں میں تو ایک وزیر ایسے بھی تھے جن کے متعلق مشہور ہے کہ ایک فائل اُن کے سامنے لائی گئی تو اُنھوں نے اپنے سیکریٹری سے پوچھا۔ ’’مجھے کیا لکھنا ہے؟‘‘ اُس نے کہا کہ بس آپ اِس پر "Seen" یعنی ’’پڑھ/دیکھ لیا‘‘ لکھ دیجیے۔ انھوں نے اس پر سنجیدگی سے خوش خط انداز میں ’’س‘‘ لکھا اور فائل لوٹا دی۔

رسمی انداز کی تقاریر جاری تھیں۔ تقریب کا ماحول بوجھل تھا اور حاضرین جماہیاں لے رہے تھے۔ اتنے میں سٹیج سیکریٹری نے اعلان کیا کہ عطاء الحق قاسمی صاحب اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ سلک کی سنہری قمیص اور کلف والی سفید شلوار میں ملبوس قاسمی صاحب اسٹیج پر آئے اور انھوں نے تقریر کا آغاز ایک واقعے سے کیا۔

ایک صاحب کا اکلوتا بیٹا قتل کے کسی جھوٹے کیس میں گرفتار ہوا اور جیل چلا گیا۔ مقدمے کی کارروائی بھی شروع ہوگئی۔ اُن صاحب نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے بیٹے کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے۔ اِس دوران مقدمے کی کارروائی نے سنجیدہ رخ اختیار کر لیا۔ اپنے بیٹے کی پھانسی کے اندیشے میں مبتلا باپ نے پینل کے ایک جج کو سفارش کروائی کہ وہ ساری زندگی کے لیے اُس کا مقروض رہے گا اگر اُس کے بیٹے کو عمر قید کی سزا دے دی جائے۔ مقدمے کا فیصلہ ہوا تو بیٹے کو عمر قید کی سزا سُنا دی گئی۔

چند روز بعد کسی تقریب میں باپ کی ملاقات جج سے ہوئی تو آنکھوں میں احسان کے آنسو بھرے وہ جج کا انتہائی شکر گزار ہوا۔ جج نے ہمدردانہ انداز میں باپ کا کندھے کو تھپتھپایا اور بولا۔ ’’وہ تو آپ کی خواہش پر میں نے ناخلف کو عمر قید کی سزا پر جیل بھیج دیا ورنہ دوسرے جج تو اسے بری کرنا چاہتے تھے۔‘‘

قاسمی صاحب نے یہ واقعہ ختم کیا تو پورا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا اور وائیں صاحب، جو گلاس منہ سے لگائے پانی پی رہے تھے، کو اچھو آ گیا اور اُن کی قمیص چھینٹوں سے بھیگ گئی۔ پس اس کے بعد قاسمی صاحب کی تقریر کے شگفتہ ذومعنی اور پُرمعنی جملوں کی پھوار برستی رہی اور وہ جانِ محفل ٹھیرے۔ تقریر ختم کر کے وہ باہر کی جانب روانہ ہوئے تو قریباً آدھا ہال خالی ہو گیا۔

یہ میرا قاسمی صاحب سے پہلا سامنا تھا۔

عطاء الحق قاسمی، صفِ اوّل کے کالم نگار، شاعر، مدیر اور سفرنامہ نگار کے قدموں کے نشان 1943 سے امرتسر، وزیرآباد، لاہور ماڈل ٹاؤن، اچھرہ سے ہوتے ہوئے نہر کنارے نئی بستیوں میں جا نکلتے ہیں۔

اُردو کے معروف ابتدائی سفرنامے ’’شوقِ آوارگی‘‘ سے اُبھرنے والے تخلیقی وفور نے کہیں نوائے وقت اور جنگ کے کالموں اور بین الاقوامی مشاعروں میں ظہور کیا تو کہیں ’’معاصر‘‘ ایسے موقر ادبی جریدے کی ادارت میں کیتھارسس پایا۔ ایم اے او کالج کی تدریس سے روزگار کا سورج طلوع ہو کر ناروے کی سفارت اور سرکاری اداروں کی سربراہی کے مناصب پر دمکا۔

گھر والوں کی پسند سے بیاہ کیا۔ شرط فقط اتنی رکھی ’’لڑکی قبول صورت، تعلیم یافتہ اور خاندانی ہو۔‘‘

ایک زمانے میں نوائے وقت لاہور کے سنجیدہ حلقوں میں مقبول ترین روزنامہ تھا۔ کالم نگاروں کی ایک کہکشاں اخبار میں جلوہ افروز ہوتی تھی۔ مجیب الرحمان شامی، نذیر ناجی اور عطاء الحق قاسمی کے علاوہ اے حمید، م ش اور دیگر نمایاں تخلیق کار۔ ایسے میں جہاں بیشتر کالموں کا رنگ سیاسی ہوتا اور یہ کالم بچوں کے غیر سیاسی ذہن کے لیے اجنبی ٹھیرتے، وہیں کبھی کبھار عطاء الحق قاسمی کا فکاہیہ کالم ظرافت و شگفتگی کا دلچسپ ورنگین امتزاج ہوتا۔

اے حمید اور عطاء الحق قاسمی کی تحریریں کو پڑھ کر امرتسر سے ہجرت کر کے آنے والے دادا جی تو اکثر فرمایا کرتے۔ ’’ایک امبرسری

ہی اتنا ذہین ہو سکتا ہے۔‘‘

یقیناً ان کالموں میں کشمیری چائے کی نمکین مہک اور باقر خوانیوں کی خستگی اور پہاڑی پھلوں کے مربّوں کی مخصوص قدرتی مٹھاس ہوتی تھی۔

بہت برسوں بعد عطاء الحق قاسمی صاحب سے ملاقات ایک دلچسپ اتفاق کا نتیجہ تھی۔

میاں نواز شریف کی حکومت گرا کر مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ جہاں ہر طرف ایک خوف کا عالم تھا، وہیں جمہوری حلقوں میں اضطراب پایا جاتا تھا۔ بہت سے کالم نگار مرغ بادنما کے مانند اپنا رخ بدل کر ابن الوقتوں کی صف میں کھڑے ہو چکے تھے۔ یہ نیا معاملہ نہ تھا بلکہ قلم کے سوداگر الفاظ کی گٹھڑی کندھوں پر ڈالے پھرتے تھے اور اِن میں اکثر حالات کے مطابق بازارِ حیات میں دکان سجا کر مطلوبہ سودا بیچنے میں مشغول ہو جاتے۔ ان پر بعد میں ایک صاحب نے ’’کالم نگاروں کی قلابازیاں‘‘ نامی کتاب بھی لکھی جس میں بارہ اکتوبر سے پہلے اور بعد کے کالم نقل کر کے ضیافتِ طبع اور عبرت کا انتظام کیا گیا۔

اِن سب ابن الوقتوں میں عطاء الحق قاسمی ایک ایسا شخص تھا جو مخالف اسباب کے باوجود اپنے نظریے اور سیاسی فکر پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی سوچ سے اختلاف تو کیا جا سکتا تھا مگر اُس کی استقامت اور باضمیری قابلِ رشک تھی۔

ایک روز میں ایک دوست کے ہم راہ چائے پر لاہور کے ایک ہوٹل میں گیا۔ وہیں قاسمی صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ قریبی میز پر کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اُن کو وہاں دیکھ کر مسرت کی ایک کیفیت نے مجھے آن لیا اور میں نے ویٹر کو بلا کر ایک پرچی تھما دی جس پر اُن کے کردار کی مضبوطی سراہی گئی تھی۔ پرچی پڑھ کے قاسمی صاحب کچھ ہی دیر میں ہماری میز پر آ گئے۔

تعارف ابتدائی مراحل میں تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرے تعلق اور خود اُن کے اپنے رسالے ’’معاصر‘‘ میں چھپنے والی میری چند تحریروں کے حوالے سے مجھے پہچان کر وہ بہت تپاک سے ملے۔ وہ کافی دیر پُر جوش گفتگو کرتے رہے اور پھر اُٹھ کر واپس اپنی میز پر چلے گئے۔ جاتے ہوئے غلطی سے میرے دوست کی گولڈ لیف کی ڈبیا ساتھ لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنی میز پر پڑی گولڈ لیف کی دو ڈبیوں کو غور سے گھور رہے ہیں۔ ہماری نظریں ملیں تو وہ مسکرائے اور دوست کی ڈبیا واپس کرنے آئے اور پنجابی میں بولے۔ ’’عرفان، میرے رسالے کے دفتر آنا۔‘‘ اور دوبارہ ایک بھرپور معانقہ کر کے لوٹ گئے۔

مشہور امریکی ادیب اور فقرہ باز مارک ٹوئن سے ایک جملہ منسوب ہے جس کا مقامی محاورے میں مفہوم کچھ یوں ہے کہ ایک متاثر کن فن پارہ پڑھ کر اُس کے ادیب سے ملاقات یوں ہی ہے جیسے مٹن کی کسی عمدہ لذیذ ڈش کو کھانے کے بعد آپ کی ملاقات بکرے سے کروا دی جائے۔

اس کے برعکس وہ اپنی تحریروں سے کہیں بڑھ کر زندہ دل، حاضر جواب اور حساس اِنسان ہیں۔

قاسمی صاحب کی ذات جس ایک محور کے گرد گھومتی ہے، وہ اُن کے مرحوم والد ہیں۔ ایک مرتبہ میں اُن کے ساتھ ’معاصر‘ کے وارث روڈ والے دفتر میں کھانے کی مصروفیت سے نمٹے تو ٹی وی چینل ’’جیو‘‘ کی ٹیم پروگرام ’’ایک دن جیو کے ساتھ‘‘ ریکارڈ کرنے آ گئی۔ قاسمی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کے ہم راہ بیٹے یاسر کے ہاں چلوں تو میں نے اسے اُن کی مصروفیت میں بے جا مداخلت گردانتے ہوئے اجازت چاہی۔ بعد میں پروگرام چلا تو دیکھا وہ اپنے والد کی قبر پر اشک بار ہو گئے۔ اس وقت اُن کی اشک باری کا درد کچھ میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ کیوں کہ بے شمار ملاقاتوں میں انھوں نے اپنے والد کا تذکرہ والہانہ انداز میں کیا تھا۔

والد اور بچپن کے تذکرے سے ایک ننھا سا، گھنگھریالے بالوں والا بچہ میرے پردۂ تصور پر اُبھر آتا ہے۔ یہ بچہ کئی بیٹیوں اور ایک بیٹے کے بعد ایک تعویز کی برکت سے پیدا ہوا تھا۔ اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ شنید ہے بعد میں جس کسی کو بھی ایک صوفی بزرگ کا

عطا کردہ وہ تعویز دیا گیا، اس کی نرینہ اولاد کی خواہش پوری ہوئی۔ سب سے چھوٹا ہونے کے ناطے وہ گھنگھریالے بالوں اور گوری چٹی رنگت والا بچہ باپ کا لاڈلا ٹھیرا۔ باپ مذہبی رجحان والا درویش صفت آدمی تھا۔ قناعت اس کی گھٹی میں اس طرح ڈال دی گئی تھی کہ بہت بعد میں تقسیم کے بعد اُسے مالِ غیر سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا تو اُس نے ٹھکرا دیا۔

اس دور کے وزیر آباد میں وقت نیم خوابیدگی کے عالم میں سستا رہا تھا۔ چھوٹا سا پُرسکون شہر چند محلوں پر مشتمل تھا اور محلے ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی حویلیوں، مکانوں، دکانوں اور تھڑوں کے بیچ سے گزرتی گلیوں اور سڑکوں کے پُر پیچ و گنجلک سلسلوں کا جال تھا۔ ان گلیوں میں طرح طرح کے رنگین کردار زندگی بسر کرتے تھے۔ چوں کہ خواہشات وضروریات کم اور ذہن رسا کی پہنچ محدود تھی چناں چہ وہ چند محلے اور گلیاں ساکنانِ شہر کی کُل کائنات تھیں۔ گرم دوپہروں میں وہ بچہ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ آتا اور کبھی نیچے کپڑا رنگتے رنگ سازوں اور مرچیں کوٹتی عورتیں تکا کرتا اور کبھی نیلے کانچ آسمان پر تیرتی سیاہ چیلوں اور اٹھکیلیاں کرتی رنگین پتنگیں معصومانہ اشتیاق سے دیکھا کرتا۔ شاموں میں لوہے کا راڈ تھامے ایک پہیے کو جسے ”ریڑھا“ کہتے تھے گلیوں میں دوڑاتا پھرتا تھا یا پٹھو گرم کھیلا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کھانے کے لیے ماں کی آواز اسے گھر کے اور بلا لیتی۔

دوپہر کو کھانے میں آٹے میں گندھے نمک والی روٹی کے ساتھ خربوزے دیے جاتے، رات کو سبزی میں مٹھی بھر گوشت ڈال کر پکا لیا جاتا۔ سردیوں میں سماوار میں اُبلتی نمکین کشمیری چائے چلتی رہتی۔

جب کبھی تفریح کا ارادہ بندھتا تو سارا خاندان چناب کا رُخ کرتا جہاں وہ اپنے باپ کی پیٹھ پر بیٹھ کر تیراکی اور غسل کا لطف لیتا۔

وزیر آباد کی سنسان گلیوں میں آج بھی اس کی آواز گونج رہی ہے۔

چناب میں آج بھی ایک تنومند باپ اپنے گھنگھریالے بالوں والے بچے کو پیٹھ پر بٹھائے تیر رہا ہے اور بچہ کھلکھلا کر اتنا ہنس رہا ہے کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

قاسمی صاحب کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے تھے۔

”ہم لوگ متوسط پاکستانی گھرانے کا نمونہ تھے لیکن ہم غریب نہیں تھے کیوں کہ ہمارے گھر میں گوشت پکتا تھا۔ میری ماں اپنے حصے کی بوٹی آنے والے کسی بھی مہمان کے لیے رکھ لیتی تھی اور خود ہنڈیا کو روٹی سے پونچھ کر کھا لیتی تھی۔ یہ میری ماں کی عظمت یا پھر ہماری محرومی کا احوال تھا۔ میری ماں چوں کہ بیمار رہتی تھی اس لیے ابا جی مجھے نہلاتے تھے اور جب تک میں آٹھویں جماعت میں چلا گیا، وہ مجھے نہلاتے رہے۔“

ایک بات میں نے قاسمی صاحب سے نہیں پوچھی کہ اُن کے ابا جی کو آخری غسل کس نے دیا تھا۔

میں قصداً اس موضوع پر اُن سے بات نہیں کرتا، مبادا وہ رنجیدہ ہو جائیں۔ جب اُن کی رگوں میں رینگتے خون میں وہ حدت باقی نہیں، جذبات کی شدت آج بھی اُن کے اندر دھمال ڈالتی ہے۔

یہ عجیب آدمی ہے، جب عشق کرتا ہے تو شدید کرتا ہے اور نفرت کرتا ہے تو بھی اُس کی سرخ تپش اس کے گالوں پر کشمیر کی لال شاموں کی طرح اُتر آتی ہے۔

آخری عمر تک ان کے والدان کے ساتھ رہے۔ کبھی ناراض ہو کر گھر سے چلے جاتے کہ بڑی بہن کے ہاں جا رہے ہیں لیکن شام تک لوٹ آتے۔

ایک مرتبہ واپس نہ لوٹے۔ سب رشتے داروں کو فون کیے۔ سب نے بتایا کہ اُن کے ہاں نہیں ہیں۔ گھبرا کر تھانے میں فون کیے، کوئی اطلاع نہ تھی۔ ہسپتالوں میں جانچ کی تو میو ہسپتال سے پتا چلا کہ اس حلیے کی ایک لاش لائی گئی ہے۔

”وہ دن میری یادداشت میں آج بھی بُری طرح دھڑکتا ہے۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا مردہ خانے میں داخل ہوا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بیت القضا میں داخل ہوا تھا۔ عجب دہشت ناک ماحول تھا۔ ایک جانب لاشیں کھڑی تو دوسری جانب لیٹی تھیں۔ مجھے مطلوبہ لاش تک لے جایا گیا۔ اُس مردہ شخص نے دھوتی پہنی تھی جب کہ ابا جی دھوتی نہیں پہنتے تھے۔ چناں چہ کچھ حوصلہ ہوا اور میں گھر لوٹ آیا۔“

ساری رات جاگتے گزری۔ صبح فجر کے وقت دستک ہوئی۔

دروازہ کھولا تو ابا جی سامنے کھڑے تھے۔ میں رو پڑا اور اُن سے لپٹ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ بارش کی وجہ سے رات کو بڑی ہمشیرہ کے ہاں رُک گئے تھے۔ پھر مجھے دِلاسا دیتے ہوئے بولے۔ ”مجھے یہ تو پتا چل گیا کہ تُم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ عطا صاحب نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ”اب بھلا محبت جانچنے کا یہ کوئی طریقہ تھا جو ابا جی نے ایجاد کیا۔“

ایک روز قاسمی صاحب سگریٹ کی راکھ، راکھ دان میں جھاڑتے ہوئے دھیمی آواز میں بولے۔

”جب ابا جی فوت ہوئے تو مجھے بہت مدت تک ان کی موت کا یقین نہ آیا۔ بہت دنوں تک میں اس واہمے کا شکار رہا کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور ابا جی وہ سامنے سے اپنی مخصوص چال چلتے ہوئے آئیں گے اور مجھ سے کہیں گے ’کیا بات ہے، بڑے دنوں سے اخبار میں تمھاری خرافات نہیں چھپیں‘ اور میں مسکرا دوں گا۔“

وہ کافی دیر خاموش رہے۔ یہاں تک کہ اُن کے دفتر کی میز پر پڑی لیمپ کی پیلی روشنی اُن کی آنکھوں میں جھلملانے لگی۔

”ابا جی اپنی وفات کے بعد دس سال تک روزانہ رات کو متواتر میرے خواب میں آتے رہے۔ دس سال تک ہر رات۔ پھر جب میں اس سانحے سے جذباتی طور پر سمجھوتا کرنے کے کچھ قابل ہوا تو اس ملاقات میں وقفے آنے لگے۔“

بولتے بولتے وہ چونک گئے۔

”عجیب بات ہے۔ بہت دن ہو گئے ابا جی سے خواب میں ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”جذباتی“ کا لفظ اُن کی شخصیت کا موزوں احاطہ کرتا ہے۔ وہ اپنے تعلقات میں بہت جذباتی ہیں۔ کسی سے اُن کی جذباتی وابستگی قائم ہو جاتی ہے تو اُس شخص کے ساتھ وہ جی جان سے ہو جاتے ہیں اور نکتہ چینیوں کے حوالے سے زود رنج ہیں۔ بعض اوقات احباب کو خاصا ناراض بھی کر دیتے ہیں۔

ادب میں احمد ندیم قاسمی سے وابستگی ہوئی تو انتہا تک گئے۔ ان کے حاسدین کے لیے دل میں کچھ ایسا بال آیا کہ آج تک دور نہیں ہوا۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں ادب کی قابلِ قدر شخصیات ہیں۔ ان میں کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پر لطیف انداز میں چوٹ کر ڈالی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں لکھا۔ ”ڈاکٹر وزیر آغا کی سب سے بڑی خدمت اُن کے وہ باغات ہیں جن کے کینو اور مالٹے بے مثال ہیں۔“ یہاں عطا صاحب کا اشارہ سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے کینو، مالٹے کے باغات کی جانب تھا۔

منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی تھیں۔ کچھ ندیم صاحب کی سرپرستانہ محبت اور کچھ افتادِ طبع کے باعث اُن کا لب ولہجہ اور رویہ بعض اوقات ندیم صاحب کے رفقاء کے ساتھ بے باک ہو جاتا تھا۔ اس رویے نے جہاں پروین شاکر جیسی نفیس خاتون کو آب دیدہ کر دیا، وہیں اختر حسین جعفری جیسے عمدہ شاعر اور مرنجاں مرنج شخص کو بھی دکھی کر دیا۔

اسی طرح منصورہ نے عطاء الحق قاسمی کو بھی اِس حد تک زچ کر دیا کہ وہ اس سے قطع کلامی پر مجبور ہو گئے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے بعد منصورہ تنہا رہ گئیں۔ وہ سب لوگ جو ندیم صاحب کی وجہ سے اُنھیں رعایت دیتے تھے، پیچھے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ گئیں۔ اسی بیماری میں اُنھوں نے اپنے اشاعتی ادارے ’اساطیر‘ کا دفتر اتفاقاً عطا صاحب کے دفتر کے

برابر میں منتقل کر دیا۔

میں جب عطاء صاحب کے ہاں جاتا تو منصورہ کی مزاج پرسی کے لیے اُن کے ہاں بھی چلا جاتا۔ چند ایک مرتبہ جب میں نے عطا صاحب سے اُن کا تذکرہ کیا تو خاموش رہے، بالآخر دکھی لہجے میں بول پڑے۔ ''میں کیا کروں مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں میرے آئیڈیل احمد ندیم قاسمی سے آخری دنوں میں رفقاء کو علیحدہ کرنے میں منصورہ نے ناقابلِ معافی کردار ادا کیا ہے۔''
منصورہ کی وفات کے بعد کہنے لگے۔ ''اگر صرف موت کی وجہ سے کسی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو پھر یزید کی بھی معافی کا جواز بنتا ہے۔''

جب یہی جذباتی وابستگی سیاست میں آئی تو درمیان کا رستہ اختیار نہ کیا بلکہ کھل کر حمایت اور مخالفت کی۔ بیشتر وقت اپوزیشن کا ساتھ دیا۔ بھٹو کی حکومت میں اس کی غلط پالیسیوں کی مخالفت کی، ضیا کے ناقدین میں شامل رہے اور جب مشرف کا طوطی بول رہا تھا تو بابگِ دہل اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ نواز شریف کا تو اُن کی جلاوطنی کے دور میں بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی وابستگی مستقل رہی اور حالات کی قیدی نہ بنی۔

ایک مرتبہ بہت دکھ میں کہنے لگے کہ پہلے وضع داری کا زمانہ تھا۔ کبھی سیاسی مخالفت کی وجہ سے ذاتی نوعیت کے رکیک حملے نہ ہوتے تھے۔ ہر ذی شعور اِنسان کے سیاسی نظریات اور وابستگیاں ہوتی ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ سیاسی رائے سے اختلاف رکھنے والے دشنام طرازی سے باز نہیں آتے۔ ایک روز ایک خاتون جو اُن کے ایک دوست کی بیگم تھیں اور ایک مخصوص سیاسی جماعت سے ہم دردی رکھتی تھیں، کہنے لگیں۔ ''قاسمی صاحب آپ کب تک اُس مخصوص سیاسی راہ نما کی چمچہ گیری کرتے رہیں گے۔''

اس پر قاسمی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ ''بھابی! ہم دونوں میں یہ قدر تو مشترک ہے۔ ہم دونوں چمچہ گیر ہیں۔ آپ ایک جماعت کی تو میں دوسری جماعت کا۔''

اس حوالے سے اُنھوں نے 1970ء کی دہائی کا ایک واقعہ سُنایا۔ ایک مرتبہ اُن کا اسکوٹر چوری ہو گیا تو انھوں نے اس کے حوالے سے چور کے نام ایک کالم لکھ ڈالا۔ اسی کالم کے تسلسل میں کئی کالم نگاروں نے کالم لکھے جن میں پیپلز پارٹی کے ترجمان ''مساوات'' کے ایک کالم نگار سہیل ظفر بھی تھے۔ چند روز بعد چور ان کا اسکوٹر واپس چھوڑ گیا جس پر انھوں نے کالم لکھا ''شکریہ چور صاحب'' اور اس میں لکھا کہ نہ معلوم کس کالم نگار کے کالم سے متاثر ہو کر چور کو رحم آیا اور اس نے چوری شدہ اسکوٹر واپس لوٹا دیا البتہ پیپلز پارٹی پر لطیف چوٹ کرتے ہوئے لکھا کہ گمانِ غالب یہی ہے کہ ''مساوات'' کے کالم کو ''پارٹی کا حکم'' سمجھتے ہوئے چور نے اسکوٹر واپس کیا ہے۔ چند روز بعد سہیل ظفر سے ملاقات ہوئی تو وہ ہنستے ہوئے ان کے گلے لگ گئے اور بولے ''شرارت تو تم پر ختم ہے لیکن بھئی تم نے جملہ بہت شان دار لکھا تھا۔''

ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ رات کو میں نے قاسمی صاحب کو فون کیا اور کسی حوالے سے کوئی بات معلوم کرنا چاہی۔ وہ غالباً کہیں مصروف تھے، بات مختصر کر کے فون بند کر دیا۔ چوں کہ معلومات بہت ضروری نہ تھیں، فقط ایک سرسری حوالے کے لیے درکار تھیں، میں انھیں نظر انداز کر کے سو گیا۔

اگلے روز چھٹی تھی سو میں آرام سے سو کر اُٹھا۔ موبائل پر دیکھا تو علی الصبح سے ان کی تین چار کالیں آ چکی تھیں۔ کچھ پریشان ہو کر میں نے فون ملایا تو انھوں نے دوسری گھنٹی ہی پر فون اُٹھا لیا۔

فون اُٹھانے کے بعد رسمی حال احوال دریافت کرنے کے بعد گزشتہ رات میری جانب سے پوچھی گئی بات کا بہت تسلی اور وضاحت سے جواب دیا۔ جب میں نے کہا کہ یہ بات اتنی اہم نہ تھی تو پنجابی میں بولے۔ ''عرفان! شام کو میں کہیں مہمانوں کے مصروف تھا، چناں چہ آپ کی بات کا تفصیلی جواب نہ دے پایا۔ رات کو بستر پر لیٹا تو خیال آیا کہ میری مصروفیت کو آپ نے بے اعتنائی پر محمول نہ کر لیا ہو۔ صبح اُٹھتے ہی

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ آپ کو فون کیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔"

ہماری ملاقاتیں بے شمار جگہوں اور مقامات پر محیط ہیں۔ اُن کا گھر، معاصر کا دفتر، لاہور اور کراچی کے ہوٹل ہوں یا میرا گھر، ہر جگہ اُن کی ذات کا نقش موجود ہے۔

ان تمام مقامات میں میری سب سے زیادہ جذباتی وابستگی "معاصر" کے دفتر سے ہے۔ یہ دفتر نہیں، ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ داخل ہوتے ہی سامنے استقبالی میز پر خاتون سیکریٹری بیٹھی ملے گی، ساتھ میں چھوٹا سا باورچی خانہ ہے۔ استقبالی کمرے کے ساتھ راہداری جیسا کمرا ہے۔ کھانے کی میز بچھی ہے۔ یہ کمرا اُن کے صدر کمرے میں کھلتا ہے۔ کمرے میں ایک جانب ٹی وی ہے اور سامنے ایک میز کے پیچھے کھلی سرخ و سپید رنگت اور مسکراتے چہرے والے قاسمی صاحب کسی کتاب پر جھکے یا فون پر قہقہہ بار گفتگو کرتے نظر آئیں گے۔ وہ ان چند رونقی لوگوں میں سے ہیں جن کے وجود سے ایک پھیکے خاموش کمرے میں زندگی کی رَو دوڑ جاتی ہے۔ کمرے کے پہلو میں ایک اور کمرا ہے جہاں قیلولے کے لیے ایک آرام دہ بستر بچھا ہے اور چند کپڑے ٹنگے ہوتے ہیں۔ اس آرام کمرے سے وابستہ ایک غسل خانہ ہے۔ ان کا دفتر گویا ایک مکمل یونٹ ہے۔

اس دفتر سے میری بے شمار یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اسی میز کے گرد کرسیوں پر میری منی بھائی سے لے کر احمد فراز تک جانے کتنے نابغۂ روزگار لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ نہ جانے کتنے اجنبی شہروں اور قصبوں کے لوگوں سے ملا ہوں جو اُن سے ملنے چلے آتے ہیں۔

میں اور قاسمی صاحب وہاں تنہا ہوتے ہیں تو یوں کہیے، تکلف کے سبھی لباس اُتار کر ایسی ایسی دیویاں ہمارے بیچ اترتی اور گدگداتی ہیں کہ قہقہوں کی رنگین پھوار سے سبھی در و دیوار دیوالی رنگ ہو جاتے ہیں۔

ابھی وہ کسی سے فون پر گفتگو کر رہے ہیں کہ مجھے دیکھ کر فون پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں۔ "ذرا انتظار کرنا پڑے گا، تبادلۂ منافقت جاری ہے۔"

ایک روز میں نے اُن سے کہا کہ پرانے وقتوں میں لوگ داناؤں اور جہاں دیدہ لوگوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے، تو کیا آپ مجھے کوئی نصیحت کریں گے۔ یہ سن کر انھوں نے آنکھیں موند لیں اور انتہائی سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا۔ "میری صرف ایک نصیحت ہے اور وہ یہ کہ کبھی کسی کو نصیحت نہ کرنا"

خوش خوراک اور کھانے کا عمدہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔ اعلیٰ ریستورانوں کے ولائتی کھانوں پر عمدہ پکے ہوئے دیسی پکوانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہماری ایک روایت چلی آ رہی ہے۔ اکثر دوپہر میں جب ہم اکٹھے ہوتے ہیں تو نیلا گنبد پر واقع غلام رسول کے مٹن چنے یا دیسی مرغ کے ساتھ تیار ہوئے مرغ چنوں کا کھانا کھاتے ہیں۔ منہ میں گھل جانے والے ذائقہ دار مٹن چنے، خستہ نمکین لذیذ نان اُن کے دفتر میں منگوا لیے جاتے ہیں اور گرما گرم، کھانے کی میز پر سجا دیے جاتے ہیں جہاں کتری گئی پیاز اور دہی کے کھٹے رائتے کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ دفتر میں کوئی مہمان موجود ہوا تو وہ بھی بھرپور رغبت سے شاملِ طعام ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بقول اُن کے بندہ 'نکونک' ہو جاتا ہے۔ کبھی کھانے کا پروگرام پہلے سے طے شدہ ہو تو وہ اپنے گھر سے کشمش، کھوئے، دیسی باداموں اور دیگر میوہ جات میں رچا ذائقہ دار زردہ لے آتے ہیں جو کھانے کے بعد گرم کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ بعد میں الائچی والی چائے کے ساتھ وہ گولڈ لیف سلگا لیتے ہیں اور میں نیم غنودگی میں اجازت چاہتا ہوں۔

اگر کبھی زبان کا ذائقہ بدلنا ہو تو چوبرجی کے ساتھ واقع خان بابا کے ہوٹل کا مخصوص عمدہ بھنا ہوا مٹن، کریلے گوشت، دیسی گھی میں بگھاری دال یا سوندھی خوشبو والا دیگی پلاؤ منگوا لیا جاتا ہے۔ اس میز پر بہت سے لوگوں کا کُفر ٹوٹا ہے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے اُن کے

مہمان ہندو ادیب کا منہ ایسے عمدہ کھانے کو دیکھ کر یوں پانی سے بھر آیا کہ اُس نے اپنے دھرم کو کچھ دیر کے لیے بالائے طاق رکھ کر کچھ ایسے چاؤ سے گوشت کھایا کہ کفر کافی دیر تک ٹوٹتا رہا۔

اس کے علاوہ اُن کے گھر میں سردیوں کی کہر آلود راتوں میں اعلیٰ درجے کے میوہ جات سے تو کئی مرتبہ لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ کھانے کے معاملے میں ان کا اصول ہے کہ بہت ہو اور عمدہ ہو۔ کھانے سے زیادہ وہ کھلانے پر یقین رکھتے ہیں۔

ایک روز میں ان کے ساتھ کراچی کے ایک ریستوران میں بیٹھا تھا کہ ایک حسین خاتون ہمارے سامنے سے گزری۔ میں نے خاتون کے حُسن کو سراہا ''ماشاء اللہ''۔ اس پر انھوں نے بے اختیار میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔ ''انشاء اللہ کہو، عرفان بھائی انشاء اللہ۔''

اسی طرح ایک مرتبہ تاسف سے سنانے لگے کہ کس طرح غلط فہمی اِنسان کو منزل کے قریب پہنچ کر بھی اس سے محروم کر دیتی ہے۔

''اوائلِ جوانی کی بات ہے۔ جہاں گردی کا خبط سوار تھا۔ سو میں پھرتا پھرا تاترکی جا نکلا۔ استنبول میں ایک ترکی لڑکی سے کچھ ایسی بات بنی کہ بات گفتگو کی حدود سے نکل کر آگے تک چلی گئی۔ سو وہ اگلے روز ہوٹل میں ملنے آئی اور اس نے وہاں ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔

رات کچھ بیت گئی تو میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ سامنے ہوٹل کا ایک نوجوان ملازم کرسی میز ڈالے بیٹھا تھا اور متوقع نظروں سے میرے کمرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اُس کم بخت کی قومی غیرت کچھ غلط وقت پر جاگ گئی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ ہم دیر تلک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

رات کا پچھلا پہر گزر گیا اور اب تک گزرا انتظار کا ہر منٹ مجھ پر بہت بھاری گزرا تھا، دبے قدموں پھر کمرے سے باہر نکلا۔ وہ ظالم نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ ٹکٹکی باندھے میرے کمرے کی جانب گھور رہا تھا۔ چناں چہ میں اُسی طرح دبے پاؤں واپس کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح ناشتے کے وقت میں کمرے سے نکلا تو باہر وہی ترکی نوجوان اور میری تازہ شناسا لڑکی ترکی زبان میں کچھ تکرار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ نوجوان میری جانب اشارہ کر کے اپنی زبان میں کچھ اونچی آواز میں بولنے لگا۔ اُس کی گفتگو سن کر لڑکی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ پیر پٹختی ہوئی میرے قریب آئی اور بولی۔ ''تمھارے اندر غیرت کی ذرہ برابر بھی رمق نہیں۔ اس بندے نے تمھارے سامنے میرے لیے نہ جانے کون کون سے مغلظات بکے ہیں مگر تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی ترک نوجوان ہوتا تو اس کے دانت توڑ ڈالتا۔ میں تم سے کسی بھی طرح کا تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔''

اس پر میں نے مسکینی سے قسم کھائی کہ مجھے تو ترکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ پھر بھی میں اس کے دانت توڑنے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن وہ لڑکی غصے میں پھنکتی مجھے اور اُس نوجوان کو بُرا بھلا کہتی وہاں سے چلی گئی اور میں بے بسی سے اُسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔''

''عورت کا حُسن حسِ لطیف کے مالک کس مرد کو متاثر نہیں کرتا۔ کچھ ہی وقفے بعد کسی نہ کسی ایسی خاتون سے سامنا ہو جاتا ہے، جس کا حُسن آج بھی مبہوت کر دیتا ہے۔ جب میں ایم اے او کالج میں پڑھاتا تھا، تو انارکلی میں ایک ایسی حسین خاتون سے سامنا ہو گیا کہ میں دنیا و مافیہا سے بے گانہ دیکھتا رہ گیا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریزی کے پروفیسر کی بیوی تھی۔ جب وہ پروفیسر ناراض ہوا کہ میں اس کی بیوی کو تاک رہا تھا، تو مجھے اپنے اس والہانہ پن پر بہت غصہ آیا اور شرمندگی بہت ہوئی۔ اسی طرح پروین شاکر کی پوری شخصیت خوب صورت تھی۔ اس کے حسن میں ملکوتی تقدس تھا۔''

ایک روز بتانے لگے۔

''میں جوانی میں اس احساسِ کم تری کا شکار تھا کہ شاید میں قبول صورت بھی نہیں۔ اسی لیے جب کوئی لڑکی میری جانب متوجہ ہوتی

تھی تو میں اسے اپنی غلط فہمی پر محمول کرتا تھا۔ ابھی چند سال پہلے مجھے میرے ایک پرانے دوست نے عہدِ گزشتہ کی ایک لڑکی کے بارے میں بتایا کہ وہ مجھے پسند کرتی تھی اور میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں اسے کسی اور نظر سے دیکھتا تھا۔ اگر کبھی مجھے اس کی جانب سے اس طرح کا اشارہ ملا بھی تو میں نے اسے اپنی ذہنی اختراع جانا اور ایک احساسِ شرمندگی کے ساتھ غلط فہمی سمجھتے ہوئے جھٹک دیا۔ چند روز پہلے کی بات ہے کہ جی سی یونی ورسٹی میں ایک پرانی کلاس فیلو سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اب تک بڑھاپے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے ملاقات کے دوران انکشاف کیا کہ اُس دور میں وہ مجھے پسند کرتی تھی۔ اُس کی بات سن کر پہلے تو میں نے اُس کے سفید ہوتے بال دیکھے، پھر اپنے اوپر نظر دوڑائی اور بولا۔ ''ایہہ دسن دا ہُن کی فیدہ (یہ بات بتانے کا اب کیا فائدہ)''

یہ کہتے ہوئے قاسمی صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

ایک واقعہ میں نے کچھ عرصے پہلے سن رکھا تھا۔ میں نے اُن سے اس کی تصدیق چاہی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہم جنس پرست شاعر افتخار نسیم (افتی نسیم) شکاگو سے تعلق رکھتا تھا۔ اُسے امریکا کے کسی مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ قاسمی صاحب سمیت پاکستان سے بھی کئی شعرا اس مشاعرے میں مدعو تھے۔

جس ہوٹل میں قیام تھا، وہاں ایک کمرے میں دو افراد کو ٹھیرانے کا انتظام تھا۔ اتفاقاً جس کمرے میں قاسمی صاحب کو ٹھیرنا تھا، اس میں ان کا رفیق افتی نسیم تھا۔ کاؤنٹر پر یہ انکشاف ہوا تو قاسمی صاحب نے کمرے میں ٹھیرنے سے معذرت کر لی۔ افتی قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے جب یہ دیکھا تو ہمدردانہ لہجے میں قاسمی صاحب کی بارعب شخصیت دیکھتے ہوئے اُن سے مخاطب ہوا۔ ''میں گے ضرور آں پر فکر نہ کرو انھا نہیں'' (میں ہم جنس پرست ضرور ہوں مگر اندھا نہیں)۔

قاسمی صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے صحتِ واقعہ کی بھرپور تردید کی اور اصل حقائق بیان کیے۔

''میں شکاگو گیا ہوا تھا، وہاں ایک جگہ افتخار نسیم سمیت چالیس پچاس کے قریب لوگ مدعو تھے۔ کسی نے بتایا کہ گزشتہ رات افتخار نسیم زنانہ لباس میں محفل میں آ گیا تھا۔ یہ سن کر میں نے محفل سے رخصت کی اجازت لی اور اپنے کمرے میں آ کر سر درد کی دوا کھا کر سو گیا۔ میں ایسے لوگوں کو ناپسند نہیں کرتا۔ غالباً یہ ذہنی کج روی اور جینیاتی ترکیب کے غلام ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمدردی کے قابل ہیں۔ میں ان کے جنسیاتی فلسفے سے کُلی اختلاف کرتا ہوں اور ان کے لیے میرے دل میں افسوس اور رحم کے سوا کچھ نہیں۔''

ناسٹیلجیا، ایامِ گزشتہ سے رومانوی وابستگی اُن کی شخصیت کا ایک بہت نمایاں پہلو ہے۔ وہ عام زندگی گزارتے ہوئے ایک دم ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں۔ بچپن اور جوانی کی اِن سرسبز پہاڑی چوٹیوں پر چھائے وقت کے روئی کے گالوں جیسے بادلوں کے اندر سے ایک بچے کے کھیلنے کی معصوم آوازیں آتی ہیں۔

امرتسر کی دھندلی گلیوں میں تانگے میں جتے گھوڑے کی ٹاپیں ہیں، وزیر آباد کی ایک مسجد سے صبحِ ازل کہ ہر صبح، صبحِ ازل کا پرتو ہے' کے وقت بلند ہوتی اذان کی میٹھی مدھر آواز ہے، ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر دوڑتے نیلے لمبریٹا اسکوٹر کی پھٹ پھٹ کا شور ہے، چوڑیوں کے چھنکنے اور مترنم نسوانی قہقہوں کی جل ترنگ سنائی دیتی ہے۔

امریکا کے ایک ہوٹل میں ہندو سکھ دوستوں کا ہلا گلا ہے، اور ایک قبرستان کی خاموشی میں صدائے اشہد اللہ ہے۔

ماضی ان کی گفتگو، کالموں اور دیگر تخلیقی کاموں میں یوں ورود کر جاتا ہے جیسے گئی چاندنی راتوں کو قراقرم کی منجمد آئینہ جھیلوں پر پریاں اُترا کرتی ہیں۔

ایک روز کہنے لگے کہ لمحۂ موجود کے گزرنے کا اس لیے بھی انتظار کرتا ہوں کہ آیندہ دن اِسے ماضی کا وقت جان کر اس کی یاد سے محظوظ ہوؤں۔

ان کا ناسٹیلجیا لوگوں کی بہ نسبت مخصوص ادوار اور جگہوں سے وابستہ ہے۔ وگرنہ ابھی تو ان کے بیشتر دوست بساطِ حیات پر اپنے قدموں کی چالیں چلتے ہیں۔

پرانے دوستوں سے ان کے وہ پہلے سے مراسم نظر نہیں آتے۔ ایک روز اس کی توجیہہ میں ایک واقعہ سنایا۔

افسانہ نگار منشا یاد ایک مرتبہ اُس دور کے مشہور تاریخی ناول نگار نسیم حجازی کے پاس گئے۔ منشا یاد کی جوانی کا زمانہ تھا، نسیم حجازی صاحب پیری کی چٹان پر بیٹھے تھے۔ منشا یاد نے اُن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ انھیں اپنے حلقۂ یاراں میں شامل ہونے کا اعزاز بخش دیں۔ اس پر حجازی صاحب کہنے لگے۔ ''برخوردار! یہ عمر نئی دوستیاں بنانے کی نہیں، بلکہ پرانی دوستیوں پر نظر ثانی کرنے کی ہوتی ہے۔''

یہ واقعہ سنا کر اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر کہنے لگے کہ بچپن کے دوستوں سے تب تک دوستی بھرپور انداز میں قائم رہتی ہے جب تک ذہنی سطح ایک رہے یا دلچسپی کا شعبہ اور سلسلۂ روزگار ایک ہو۔

اس کے بعد بتانے لگے کہ جب کبھی ان کی اپنے بچپن کے دوستوں سے ملاقات ہو تو کچھ ہی دیر بعد کرنے کو کوئی بات نہیں رہتی۔ ان سے محبت اور اپنائیت کا ایک تعلق تو قائم رہتا ہے مگر دوستی میں وہ پہلے سا دم باقی نہیں رہتا۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ انسان کسی مخصوص ذہنی سطح پر پہنچ چکا ہوتا ہے جب کہ دوست کسی دوسری سطح پر زندگی گزارتے ہیں۔ رجحانات اور خیالات کا تفاوت مسلسل رابطے میں موہوم سی رکاوٹ سے کچھ بڑھ کر ہی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک روز کہنے لگے کہ مرد اور عورت کی دوستی تادیر نہیں چلتی۔ یہ تعلق کی کسی نہج پر رومان کا رنگ اختیار کر لیتی ہے یا اس پر دوستی سے ہٹ کر دیگر عوامل اثر انداز ہو جاتے ہیں۔

ایک شام ہم دونوں کراچی میں سمندر کے اندر تک چلے جاتے ایک دل کش ریستوران میں بیٹھے تھے۔ سمندر کی لہروں پر چھوٹی کشتیوں کی روشنیوں کی جھلملاہٹ اور چاند کی روپہلی چاندنی میں نیچی پرواز کرتے سفید پرندے اسے ایک خوب صورت شام بنا رہے تھے۔ ابھی کھانے میں دیر تھی چناں چہ اِدھر اُدھر کی گپ شپ جاری تھی کہ سمندر کی جانب دیکھتے ہوئے وہ گویا ہوئے ''مجھے سمندر میں سفر یا سیر کرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ڈوب جاؤں گا۔ ایک مرتبہ میں چند دوستوں کے ساتھ ایک کشتی میں تھا کہ بیچ سمندر وہ ہچکولے کھانے لگی۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ میرا ایک دوست قہقہہ لگاتے ہوئے بولا 'مجھے تو تیرنا آتا ہے، البتہ تم سب ڈوب جاؤ گے۔' یہ سن کر میں نے اُس بدبخت کو جواب دیا۔

ڈوبو گے تو تم بھی، فرق صرف اتنا ہے کہ ہم اِدھر ہی ڈوب جائیں گے اور تم کوئی ایک کلومیٹر دور جا کر ڈوب جاؤ گے۔''

ہچکولوں پر بات چل نکلی تو ایک اور واقعہ سنانے لگے ''ایک مرتبہ میں اور گل زار وفا چودھری فوکر جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ اچانک فلائٹ ناہموار ہو گئی اور جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ یہ جھٹکے اتنے بڑھے کہ لوگوں نے باآواز بلند دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جہاز نے چند ایک غوطے لیے تو گل زار اونچی آواز میں مجھ سے مذاق کرنے لگا اور ہم دونوں قہقہے لگانے لگے۔ وہ کہنے لگا 'یار نیچے ہریالی دیکھو۔ کم از کم ہماری قبریں پُر فضا سبزہ زار میں بنیں گی۔' وہ بولتا جاتا اور ہم قہقہے لگاتے جاتے۔ اتنے میں ہم نے اِردگرد دیکھا تو لوگ ہمیں خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے اور زیرِ لب یقیناً بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ پچھلی نشستوں سے تو چند ایک مسافروں نے باقاعدہ بکواس بھی کی۔ خدا خدا کر کے جہاز بخیریت لینڈ کر گیا۔''

''ماشاءاللہ وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی نظر آ رہا ہے کہ جہاز بخیریت لینڈ کر گیا'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اصل بات تو اس کے بعد ہے۔'' قاسمی صاحب نے گویا گفتگو میں تجسس پھونک دیا۔

''وہ کیا؟''

”وہ یہ کہ اِس موضوع پر میں نے کالم لکھا اور اس میں یہ سارا واقعہ مزاحیہ انداز میں لکھ کر آخر میں لکھا کہ اُس فلائٹ کے تمام مسافروں میں در حقیقت سب سے زیادہ خوف زدہ ہم دونوں تھے۔ ہم فقط اپنے خوف کو لطیفے سنا رہے تھے۔“

اسی طرح اپنے ایک فنکشن میں جب ایک صاحب نے اُن سے پوچھا کہ انھوں نے اپنے سفر کے ”شوقِ آوارگی“ جیسا اور سفر نامہ کیوں نہیں لکھتے تو بولے ”سیاحت تو آج بھی کرتا ہوں مگر اب مجھ میں ”حیرت“ ختم ہوگئی ہے۔ یہ حیرت ہی ہے جو شوق کو ہوا اور نظر کو تازگی دیتی ہے۔“

بچے کی حیرت ہی اُس کی استاد ہوتی ہے۔ حیرت کی موت کا اس سے بہتر اور کیا تذکرہ ہوسکتا ہے۔

اپنے ایک اور دوست منی بھائی مرحوم کو بہت یاد کرتے ہیں۔

منی بھائی اور ان کی بیگم ہیوسٹن امریکا کے ایک بڑے گھر میں رہتے تھے۔ قاسمی صاحب اس گھر میں ان کے مہمان ہوئے تو منی بھائی نے ان کو اپنے گھر کا ایک کمرا دکھایا۔ کمرے میں بچوں کے کھیلنے کا سامان بہت سلیقے سے دھرا تھا اور در و دیوار کو بچوں کے مخصوص انداز سے رنگا اور سجایا گیا تھا۔ بچے قاسمی صاحب کو نظر نہ آئے تھے چناں چہ بچوں کا پوچھ بیٹھے کہ وہ کہاں ہیں۔

اِس پر منی بھائی خاموش ہوگئے۔

قاسمی صاحب نے دوبارہ پوچھا تو منی بھائی نے دھیمی آواز میں کہا کہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور اولاد کا کوئی امکان نہیں۔ پس یہ کمرا اُن کی اس حسرت کی علامت ہے کہ اگر اُن کے ہاں اولاد ہوتی تو وہ اس کمرے میں رونق لگائے رکھتی۔ اس کے بعد شعر پڑھا۔

ہر گھر میں اِک ایسا کونا ہوتا ہے
جس میں چھپ کے ہم کو رونا ہوتا ہے

قاسمی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے عام واقف کار بھی آگاہ نہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مذہب اور معاشرتی حوالے سے روشن خیالی اور کشادگی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔

ان کی اپنی ولادت تعویز کا نتیجہ تھی۔ چناں چہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ یہ ضعیف العتقادی نہیں تو اس امر کی کیا توجیح ہوسکتی ہے۔ اِس پر کہنے لگے کہ آج بھی بہت سے واقعات ماورائے عقل ہیں اور انسانی سائنسی جستجو چوں کہ ابھی مقامِ کامل تک نہیں پہنچی اس لیے ان کے اسرار جان نہیں پائی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ان کے ایک دوست نے کہا ”بسم اللہ پڑھ کر بھڑ کو پکڑ لو، وہ ڈنک نہیں مارے گی۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس ظالم نے ایسا ڈنک مارا کہ میری چیخ نکل گئی۔“

پھر ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ ہمارے ہاں روایت ہے کہ جب کسی کا دمِ آخر میں ہوتا ہے تو اس موقع پر اس کے سرہانے سورۃ یٰسین پڑھی جاتی ہے تا کہ اس کی مشکل آسان ہو، مگر وہ اسے اپنی موت کا خُفتہ اشارہ سمجھ لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دل چھوڑ بیٹھتا ہے اور انتقال فرما جاتا ہے۔ پھر ہنس کر کہنے لگے۔ ”کیسی عجیب بات ہے ہم لوگ ایک زندگی بخش آیت سے موت کا کام لیتے ہیں۔“

جب ان کے برادرِ بزرگ ضیاء الحق قاسمی صاحب کا انتقال ہوا تو یہ کراچی آئے۔ تب میں نے ان کو رنجیدگی کے اندوہ سمندر میں ایسا غوطہ زن دیکھا کہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

بعد ازاں ایک روز میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ وہ شام ایک امانت ہے۔ پس اس میں خیانت ممکن نہیں۔ البتہ اس اشارے میں غالباً کوئی مضائقہ نہیں کہ اس سانحے کے بعد سے رنجیدگی اکثر ان کو اپنے نم حلقے میں لے لیتی ہے۔ اب رنجیدہ کر دینے والی غزلیں، یہاں تک کہ فلمی گانے بھی نہیں سن سکتے۔

نابغۂ روزگار مزاحیہ اداکار چارلی چپلن کا یہ قول معروف ہوا۔ ''مجھے بارش میں چلنا اس لیے اچھا لگتا ہے کہ اس طرح میری آنکھوں سے بہتے آنسو دنیا کو نظر نہیں آتے۔'' چارلی دنیا کو ہنسا کر تھک جاتا تھا اور گھر لوٹ آتا تھا تو ساری ساری رات اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھا رہتا تھا، وہی ماں جس نے غربت اور شدید تنگی میں اپنے بیٹے کو محبت اور محنت سے پالا تھا، مگر اب جب بیٹا کامیاب اور معروف ہو گیا تو ایک دماغی عارضے کے باعث اُسے پہچان نہیں سکتی تھی۔

یہ المیہ تمام بڑے تخلیق کاروں، مزاح نگاروں کے ساتھ رہا کہ دنیا اُن کی باتوں پر تالیاں بجا کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہے، آخر میں اسٹیج کی چکاچوند میں وہی نابغہ تنہا کھڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح قاسمی صاحب کی زندگی میں چند حادثات ایسے ہیں جن کی یادیں لوٹ لوٹ آتی ہیں اور انھیں رنجور کرتی ہیں۔

قاسمی صاحب کی ادب پر گہری نظر ہے۔ ان کے والد ادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، اپنے بچوں میں بھی یہی ذوق پیدا کرنے کے لیے گھر میں رسالے، کتابیں لے آتے تھے۔ وہ کہتے تھے ''صحتِ زبان کا خیال رکھو، جو بھی زبان بولو درست بولو، وگرنہ زبان بددعا دیتی ہے۔''

ادب کچھ ایسے ان کے مزاج کا حصہ بنا کہ اکثر کہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی کسی صنف میں ارادی محنت نہیں کی بلکہ کوئی غیبی ہاتھ ہے جو ان سے یہ سب کراتا ہے۔ بلکہ یہ ایسا کام ہے جو وہ اپنی خوشی کے لیے کرتے ہیں اور اس حصولِ مسرت کا انھیں معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔

کنفیوشس نے کیا خوب کہا تھا۔ ''کوئی ایسا کام تلاش کرو جس سے تمھیں عشق ہو، تمھیں ساری زندگی کام نہیں کرنا پڑے گا۔''

ایک زمانے میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کے بارے میں یہ متنازع بات مختلف مکتبہ ہائے فکر میں وجہ بحث بنی کہ یہ ناول نہیں بلکہ تاریخ کو خوب صورت نثر میں دستاویز کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے بات ہوئی تو میں نے شکیل عادل زادہ اور دیگر چند بڑے ادیبوں کا حوالہ دیا جو اس تبصرے کو درست مانتے ہیں۔ اس پر قاسمی صاحب نے بھی اتفاق کیا اور اضافہ کیا۔ ''اردو ناول میں قرۃ العین حیدر سے بڑا کوئی نام نہیں۔ وہی یقیناً سب سے قد آور ادیبہ ہیں۔ ''آخر شب کے ہم سفر'' نے تو مجھے بے اختیار کر دیا۔ ''چاندنی بیگم'' بھی بہت بڑا ناول تھا۔ اس کا نام کچھ اور ہونا چاہیے تھا کیوں کہ قاری اِسے چاندنی بیگم کے گرد بُنا گیا ناول سمجھ کر پڑھنا شروع کرتا ہے، جب چاندنی بیگم ابتدائی صفحات میں فوت ہو جاتی ہے تو قاری اس میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی نثر نے جہاں ان کی روح کو بالیدگی عطا کی وہیں اقبال کی شاعری نے دم بخود کر دیا۔

ان دو بڑے ناموں کو دیگر سے ممتاز اور قد آور قرار دیتے ہیں۔ عظیم ادیب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہی تخلیق کار عظمت کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے جسے عوام و خواص دونوں پسند کریں۔ اس خیال کی دلیل کے طور پر وہ ٹیگور، غالب، شیکسپیئر، رومی سعدی اور میر کا حوالہ دیتے ہیں۔

''کوئی باصلاحیت تخلیق کار نظر انداز نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ایک شعر تو چھوڑو، ایک مصرع والے شاعر بھی موجود ہیں جنھیں شہرت ملی۔'' دو ٹوک انداز میں قاسمی صاحب نے ایک روز میرے ساتھ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے گویا فیصلہ سنا دیا۔ پھر ٹی ایس ایلیٹ کا قول سنایا۔ ''جب کوئی کلاسیک پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے سے پہلے اور بعد کے سو سال کھا جاتا ہے۔ یہاں اقبال سب پر بازی لے گیا۔ اُس خورشید کی آب و تاب کے سامنے سب ستارے ماند ہوئے۔ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔''

غالب بھی انھیں پسند ہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ''غالب کی واحد مشکل یہ ہے کہ اُس کے کئی اشعار کی تشریح کے لیے باقاعدہ ''کمیشن'' بٹھانا پڑتا ہے۔''

ایک روز میں نے اُنھیں اپنا ایک تجربہ سنایا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اسلام آباد کے ہوٹل میں ایک امریکی سے میری کافی اچھی گپ شپ اور دوستی ہو گئی۔ یہ بہت پہلے کا واقعہ

ہے۔

وہ امریکی کوہ نوردی کا شوق رکھتا تھا اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں کوہ پیمائی کے ارادے سے آیا تھا۔ بہ ظاہر ایک معصوم اور بے ضرر جوان تھا۔ اس کے ہاں مخصوص امریکی بے تکلفی اور مزاح بدرجۂ اتم موجود تھا۔

ہوٹل میں اُس کا قیام چندروزہ تھا۔

یہ چندروز گزرے تو روانگی کی صبح آن پہنچی۔ میں نے ناشتے کے بعد اُسے نیک خواہشات سے رخصت کیا اور اپنے معمول کے کام سے نکل پڑا۔

اگلی صبح میں ناشتے کے کمرے میں پہنچا تو اُسے وہاں پا کر حیرت کا شکار ہو گیا۔

مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ جھینپ گیا۔ میں اُس کی میز پر آن بیٹھا تو وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“

”تمھارا ذاتی معاملہ ہے، یقیناً تم نے سوچ کر فیصلہ کیا ہوگا۔“

”نہیں یار، تمھارا ملک یقیناً ایک خطرناک ملک ہے۔“

”وہ کیسے، کیا ہوا؟“

”بات یوں ہے کہ میں نے یہاں سے اپنی منزل کا قصد کیا۔ اس کے لیے جب میں بس اسٹینڈ پہنچا تو وہاں ایک بس تیار کھڑی تھی۔ میں وہاں واحد غیر ملکی تھا۔ مجھے بہت عزت دی گئی اور سب سے اگلی نشست خالی کروا کر ڈرائیور کے برابر میں بٹھا دیا گیا۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ جب میں نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھینگا تھا۔ ڈرائیور مجھے دیکھ کر مسکرایا، اور دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنا کر اُس نے بس کو ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کیا اور یوں مرکزی شاہ راہ کی راہ لی جیسے گھوڑے کو ریس کے لیے ایڑ لگاتے ہیں۔“

”واقعی؟“

”کرائسٹ کی قسم۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تمھارے ملک کی سڑکیں یک رویہ ہیں۔ چناں چہ جب ہم روانہ ہوئے تو سامنے سے ٹریفک آ رہی تھی۔ یہاں تک تو خیر تھی۔ لیکن اُس نے بس کا پریشر ہارن آن کیا، اونچے گانے لگائے اور ریس دے دی۔ کچھ دیر تو خیریت سے گزری۔ پھر اُس نے ایک گاڑی کو اس طرح سے اوورٹیک کیا کہ ہم سامنے سے آتی ہوئی بس کو گولی کی طرح چھوتے ہوئے گزر گئے۔ جب میں نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو وہ میری جانب دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ بس اس کے بعد تو حد ہو گئی۔ یک رویہ سڑک، ریس لگاتی جھومتی بس، مخالف سمت سے آتی بھاری گاڑیاں اور ان سے چھو کر بچتی ہماری بس۔ اس دوران جب بھی ہم کسی بڑے حادثے سے بچتے تو میں ڈرائیور کی جانب دیکھتا، وہ بدستور میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہا ہوتا۔ پس ایک ہی بات میرے لیے تسلی کا باعث تھی۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ چوں کہ ڈرائیور بھینگا تھا، سو میں نے سوچا کہ یہ میری غلط فہمی ہے، وہ میری جانب دیکھ رہا ہے شاید وہ سامنے ہی دیکھ رہا ہو۔ مگر اُس کا مسکرانا میری سمجھ سے باہر تھا۔“

”شاید نسوار کھا رہا ہو، اس لیے مسکراتا دکھتا ہو۔“

”بہرحال جب ہم منزل پر پہنچے تو میں سب سواریوں کے بعد آخر میں بس سے اُترا اور اس ارادے سے اُترا کہ۔“

”کہ؟“

”کہ لعنت ہے کوہ پیمائی پر، زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔“

میں نے قاضی صاحب کو [illegible]

"[illegible]

[illegible]"

یہ واقعہ سن کر قاضی صاحب ہنسے اور کہنے لگے کہ سفر سے متعلق اُن کے پاس واقعات کا ایسا ذخیرہ ہے کہ وہ [illegible] کتابوں کے لیے کافی مواد رکھتا ہے۔ پھر گویا ہوئے۔ "میرا ایک دوست تھا سید محمود علی۔ [illegible] کا شغل۔ [illegible] جب لوگ راستہ میں [illegible] جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہمارا بھی اسی طرح کا پروگرام بن گیا۔ ہم لاہور سے [illegible] کے لیے [illegible] اور روانہ ہو گئے۔ سفر کے دوران مجھ پر منکشف ہوا کہ محمود موسیقی کا رسیا تھا۔ اس نے ایک ٹیپ ریکارڈر نکالا اور اس میں کیسٹ لگا دی۔ ایسی واہیات آواز میں نے زندگی میں نہیں سنی۔ دراصل اس نے اپنے ایک دوست کی آواز ریکارڈ کی ہوئی تھی جو منہ سے طبلہ بجاتا تھا۔ چنانچہ [illegible] کا آغاز منہ سے نکالی گئی چھلکے کی آواز سے ہوا اور سارے راستے یہ منحوس آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ [illegible] محمود میری جانب داد طلب نظروں سے دیکھتا اور میں دل پر جبر کر کے مسکرا دیتا۔ بہر حال یہ سفر بہت مشکل سے کٹا۔"

قاضی صاحب نے بات جاری رکھی۔

"ہم نے وہاں پہنچتے ہی ایئر پورٹ کا رخ کیا اور فلائٹ لی۔ ایئر ہوسٹس ہر کسی سے اس کا پسندیدہ مشروب، جوس یا [illegible] پوچھتی ہوئی ہم تک پہنچی تو میں نے مالٹے کے جوس کی خواہش ظاہر کی۔ محمود میرے ہم راہ تھا اور بازو کی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب ایئر ہوسٹس نے اس کی پسند کا پوچھی تو محمود نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، توقف کیا اور بولا۔ "آپ جو محبت سے پلائیں گی، ہم پی لیں گے۔"

یہ سن کر ایئر ہوسٹس نے برا سا منہ بنایا اور وہاں سے چلی گئی اور واپس ہماری نشست پر نہ لوٹی۔ چنانچہ مجھے بھی سارے سفر میں پیاسا رہنا پڑا۔

قاضی صاحب یادوں کی زنبیل کھولتے ہیں تو اندر سے بے شمار کردار اور واقعات نکلتے آتے ہیں۔ دلچسپ و عجیب لوگوں کا تذکرہ ہوا تو اپنی زنبیل کا منہ ذرا سا کھول کر ترچھا کیا، کئی کردار لڑھکتے ہوئے باہر آ گئے۔

"ایک صاحب ہوا کرتے تھے نواب عاشق دہلوی۔ اکثر لاہور کے پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے چھت گھورتے پائے جاتے۔ شاعر تھے اور عروض کے فن میں یکتا۔ کبھی مصرع گرنے نہ دیتے، وزن کا بحر پر خیال کرتے تھے۔ اُن کا ایک شعر ہے۔

عاشق کہ تخن تیرا ہے ترباق ترپیا
زمباق ترپیا لقا زمباق ترپیا

اس غزل کے بیشتر الفاظ انھی کی ایجاد کردہ زبان میں ہیں۔

اسی طرح اُن کا شعر ہے۔

میں نہ سمجھا ہوں نہ سمجھوں گا نہ سمجھاؤ مجھے
بس خدا کے لیے آگے سے سرک جاؤ مجھے

اُن سے گزارش کی گئی کہ دوسرے مصرعے کے آخر میں لفظ ''مجھے'' کی کیا توجیہ ہے تو فرمانے لگے۔ ''مجھے'' ردیف ہے اور اس کا یہاں آنا برمحل اور لازم ہے۔''

قاسمی صاحب مسکراتے ہوئے اپنے الحمرا کے دفتر کی کھڑکی سے باہر سرسبز درخت دیکھ رہے تھے۔

اس کے علاوہ ایک اور تخلیق کار الف الحراث ملاقات رہی۔

اُن کی ہیئت کچھ ایسی تھی کہ شیو بڑھی ہوئی ہوتی اور پاجامہ پیچھے سے پھٹا ہوتا۔ زُبان دان تھے اور اس میں کئی اختراعات کے موجد۔ مثال کے طور پر یہ انھی کی دریافت تھی کہ ''بلی دودھ پیتی ہے'' کی زُبان گری ہوئی ہے۔ اس کے بجائے فرماتے ''بلی دودھ لبڑتی ہے'' زُبان کے حوالے سے درست ہے۔ بلی کے دودھ لبڑنے کے علاوہ بھی جانوروں کے مختلف افعال کی زبان کی کچھ ایسی تصحیح فرمائی کہ یہ تحقیق انھی سے شروع اور انھی پر تمام ہوئی۔''

ان کے حلقۂ احباب میں ڈاکٹر فضل الرحمان لاہوری بھی رہے جنھوں نے اپنے لیے ''مجاہدِ اُردو'' کا خطاب تجویز کر رکھا تھا۔

برسبیل تذکرہ جب قاسمی صاحب ڈاکٹر صاحب کو یاد کر رہے تھے تو مجھے وہ بات یاد آگئی کہ ایک موصوف بوجہ عجز اپنے نام کے ساتھ 'ننگِ اسلاف' لکھتے تھے۔ اُن کی پیروی میں احباب نے بھی اُن کے نام کے ساتھ ''ننگِ اسلاف'' لکھنا شروع کر دیا۔

خیر یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کی تصانیف میں نمایاں ترین ''سکھوں کے لطیفے'' تھے۔ اُن کی خواہش صدارتی انتخاب لڑنے کی تھی اور انھوں نے اپنی کابینہ بھی سوچ رکھی تھی جس میں منو بھائی کو وزارتِ اطلاعات اور عطاء صاحب کو وزارتِ تعلیم سونپنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

مونچھیں قاسمی صاحب کی کم زوری ہیں۔ ایک مرتبہ حنیف رامے مرحوم نے دل برداشتہ ہو کر پیپلز پارٹی چھوڑی تو اعلان کر دیا کہ وہ پارٹی میں کبھی واپس نہ آئیں گے اور لوٹ آئے تو اپنی مونچھیں کٹوا دیں گے۔ شومیٔ قسمت کہ انھیں کچھ ہی عرصے میں پارٹی میں لوٹ آنا پڑا۔ اس پر قاسمی صاحب نے ایک لطیف کالم لکھا۔ ''رامے صاحب مونچھوں سمیت'' اسی طرح ایک مرتبہ انھوں نے اُس وقت کے وزیر معاشیات نوید قمر صاحب جو اپنی نوابی طرز کی نوک دار مونچھوں کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے، کو مشورہ دیا۔ ''نوید قمر صاحب جتنی محنت اپنی مونچھوں پر کرتے ہیں اگر اتنی پاکستان کی معیشت پر کریں تو ہم نہ جانے کتنی ترقی کر جائیں۔''

ایک مرتبہ میں اور قاسمی صاحب کراچی کے میریٹ ہوٹل میں سردیوں کی رات میں کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہوٹل کے ریستوران کے جگمگاتے ماحول میں پسِ منظر میں گھلتی، سازِ دِل کے تاروں کو چھیڑتی موسیقی اور پرانی فلموں کے حسین گانے ایک خواب ناک اور کیف آگیں ماحول بُن رہے تھے۔ اندر کا گرم ماحول ہوٹل کے شیشوں کو دُھند آلود کر رہا تھا۔ اس دھند کے پار اوس میں نہائے سرسبز پودے روشنیوں میں جھلملا رہے تھے۔ ہم پرانی فلموں کی بات کر رہے تھے۔ پسِ منظر میں محمد رفیع اور لتا منگیشکر کا ڈوئٹ ماحول کو رنگین کر رہا تھا۔ یکدم قاسمی صاحب کی آنکھیں ایک جانب مرکوز ہو گئیں۔ اُنھوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ جب میں نے اُس جانب دیکھا تو ایک نوجوان مرد گلوکار پہلے رفیع کی آواز میں گاتا تھا اور پھر وہی گلوکار لتا کی نسوانی آواز میں کمالِ مہارت سے گاتا تھا۔ میں اس سے پہلے کئی مرتبہ وہاں کافی پی چکا تھا مگر اُس گلوکار کی اس حیران کن مہارت کا مشاہدہ نہ کر پایا تھا جسے قاسمی صاحب نے چند لمحوں میں نوٹ کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ستائش اور کچھ حیرانی سے میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ قاسمی صاحب نے پنجابی میں سرگوشی کی ''خدا کے رنگ نرالے ہیں۔''

ہم دونوں کو اپنی جانب ستائشی نظروں سے مسکراتا دیکھ کر نوجوان گلوکار کچھ بھٹک گیا اور رفیع، لتا کی جگہ اس کی آواز پکے راگ سے مماثل ہو گئی۔

میں ایک عشائیے میں مدعو تھا۔ اس کھانے میں عمائدین شہر کے علاوہ نمایاں ادیب اور دانشور بھی مدعو تھے۔ قاسمی صاحب کو بھی دعوت تھی لیکن چند دیگر مصروفیات کی بنا پر وہ نہ آپائے۔

عشائیہ جاری تھا کہ ایک خوش شکل خاتون ہماری میز پر تشریف فرما ایک نام ور ادیب کے پاس چلی آئیں اور ان کی قربت میں مچل کر محبت سے اُن کی پیشانی کو چوم لیا۔

اگلی صبح میں اور قاسمی صاحب ایک جگہ ناشتے پر مدعو تھے۔ ناشتے کے بعد واپسی کے لیے میری گاڑی میں بیٹھنے لگے تو میں نے گزشتہ رات کا ماجرا سنا ڈالا۔ قاسمی صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا تو موضوعِ گفتگو شہری سیاست اور تہذیبی ارتقا ٹھیرا۔ سفر طویل تھا چناں چہ خوب سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ابھی بات کسی سنجیدہ موڑ پر تھی کہ قاسمی صاحب خاموش ہو گئے، پھر گویا ہوئے۔ ''بوسہ پیشانی پر لیا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ توقف کے بعد گفتگو جہاں سے ٹوٹی تھی وہیں سے جڑ گئی، سفر نصف سے زیادہ طے ہو گیا تو قاسمی صاحب دوبارہ خاموش ہو گئے۔ پھر اچانک سوال کیا۔

''خاتون خوش شکل تھی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ قاسمی صاحب نے لمبی سانس بھری اور عصری ادب پر دانشورانہ تبصرہ شروع کر دیا۔ بحث نثری انحطاط سے ہوتی ہوئی عمومی معاشرتی تنزل تک آن پہنچی، یہاں تک کہ سفر اختتام پذیر ہوا۔ گاڑی سے اُتر کر میں الوداعی معانقے کے لیے اُن کی جانب بڑھا تو گلے ملتے ہوئے انھوں نے سرگوشی کی ''آج کل کی خواتین کا کوئی حال نہیں۔ انھیں مستحق اور غیر مستحق کی کوئی پہچان ہی نہیں'' اور چل دیے۔

ایک مرتبہ قاسمی صاحب ایک ادبی میلے میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے۔ ہر جانب سے دعوت نامے تھے۔ پرانے شناساؤں کا میلہ تھا اور بیچ میں ان کی باغ و بہار شخصیت۔

پرانے شناساؤں کے حوالے سے ایک قصہ ہے۔

ایک خاتون پالتو جانور خریدنے کے لیے ایک دکان پر پہنچیں۔ دکان پر ہر طرح کا جانور تھا۔ انھی میں ایک بولنے والا توتا بھی تھا۔ دکان دار نے ایک اچھے سیلز مین کی طرح توتے کی خوبیاں بیان کیں۔

''یہ توتا پُر ذہانت گفتگو میں مہارت رکھتا ہے۔ کم جگہ گھیرتا ہے۔ خوراک کا خرچہ کم ہے اور اس کی باتوں سے دِل بھی بہلا رہتا ہے۔''

''اس کی قیمت کیا ہے؟'' خاتون نے دریافت کیا۔

''فقط ایک سو روپے۔''

''وہ کیوں؟ اتنی کم کس لیے؟'' خاتون نے حیرت سے پوچھا۔

دکان دار نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ''دراصل یہ اس سے پہلے ایک قحبہ خانے میں رہا ہے اس لیے کبھی کبھار ناپسندیدہ جملے بھی بول جاتا ہے۔''

یہ سن کر خاتون نے تذبذب سے توتے کو دیکھا جو انتہائی سعادت مندی سے سر جھکائے کن انکھیوں سے خاتون کو تک رہا تھا۔

''آپ کا جی بہلا رہے گا اور اچھی تربیت سے اس کی یہ خامی بھی دور ہو جائے گی۔'' دکان دار نے خاتون کو تسلی دی۔

خاتون نے پرس سے سو روپے نکالے اور توتے کو پنجرے سمیت گھر لے آئیں۔

نئے گھر آ کر توتا کچھ دیر تو خاموش رہا لیکن خاتون کی جانب سے ناز برداری کرنے پر اِٹھلا کر بولا۔ ''واہ بھئی نیا گھر، نئے کمرے اور نئی نایکا!''

یہ سن کر خاتون چونک گئیں۔ پھر دکان دار کی اچھی تربیت والی بات کا سوچ کر خاموش ہو گئیں۔

پورا دن گزر گیا یہاں تک کہ شام کو خاتون کی دونوں بیٹیاں گھر لوٹیں تو اُن کو دیکھ کر توتا بے اختیار بول اُٹھا۔

''واہ بھئی، نیا گھر، نئے کمرے، نئی نایکا اور نئی بیسوائیں۔''

یہ سن کر خاتون اور ان کی بیٹیاں سٹ پٹا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں اور خاموش ہو گئیں۔

اتنے میں خاتون کے شوہر تھکے ہارے گھر لوٹے تو اُن کو دیکھ کر توتا چہک اُٹھا۔

''واہ بھئی نیا گھر، نئے کمرے، نئی نائکہ، نئی بیسوائیں اور آہا! وہی پرانے چہرے۔ آداب بشیر صاحب!''

تفنن برطرف، قاسمی صاحب سے میں نے اگلی دوپہر کھانے کے لیے اصرار کیا تو وہ بہت شفقت سے میری دعوت پر آمادہ ہو گئے۔

کراچی پر بے امنی کا بھوت سوار تھا۔ ابھی پچھلے روز ہی قاسمی صاحب نے اپنے کالم میں کراچی آمد سے پہلے اپنی تیاری کا تذکرہ کیا تھا جس میں نیا سستا بٹوا اور موبائل فون خریدنا بھی شامل تھا۔

میں انھیں لینے کے لیے پہنچا تو وہ ہوٹل کے پائیں باغ میں سمندر کے کنارے رنگارنگ لوگوں میں گھرے سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں نرم اپنائیت بھری محبت عود کر آئی۔

انھوں نے سگریٹ کے چند کش لیے اور جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے کرنسی نوٹ اور ضروری کاغذات علیحدہ کر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالنے لگے۔ پھر کوٹ اُتار کر اپنے ایک عزیز کے حوالے کیا کہ وہ اسے کمرے میں چھوڑ آئے۔ اس دوران مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ''باہر ہم نے لُٹ تو جانا ہے ہی، تو کیوں نہ ضروری چیزیں ہوٹل میں چھوڑ جائیں۔''

میں نے ان سے کُلّی اتفاق کرتے ہوئے بات میں استفہامیہ طور پر اضافہ کیا۔ ''آپ نے کل رات فائرنگ کی آواز سنی تھی؟''

''یہ شادی والوں کو فائرنگ نہیں کرنا چاہیے'' وہ تاسف سے بولے۔

''وہ شادی کی نہیں، دہشت گردی کی فائرنگ تھی'' میں نے وضاحت کی۔

''ہاں۔ لیکن یہاں تو ٹارگٹ کلنگ ہی ہوتی ہے نا؟''

''ضروری نہیں۔ حال ہی میں کچھ قاتل پکڑے گئے ہیں جنھوں نے اپنے اعترافی بیان میں انکشاف کیا ہے کہ انھیں کوٹہ دیا جاتا تھا، ایک مخصوص تعداد میں لوگوں کو قتل کرنا ہے تا کہ شہر میں بے چینی اور خوف پھیلے۔ پس وہ اسلحہ لے کر نکلتے اور جو راہ میں نظر آتا، اسے گولی مار دیتے۔''

قاسمی صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں اور انھوں نے تشویش سے پوچھا۔ ''واقعی؟''

''جی'' میں نے یقین دہانی کروائی۔

اتنا سن کر انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''لعنت بھیجو باہر کھانے پر، یہیں کھانا کھاتے ہیں۔ مریں گے تو اسی گولی سے جس پر ہمارا نام لکھا ہوگا۔ ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ To whom it may concern کے زمرے میں شامل کیے جائیں۔''

یادوں کی زنبیل ہے جس میں سے واقعات نِکلے چلے آتے ہیں مگر بیش تر قطعی ذاتی اور امانت۔

لاہوران کے اندر اس طرح رچا بسا ہے جس طرح صندل کے اندر مہک۔

ان سے ملاقات گویا ایامِ رفتہ کے اصل لاہور سے ملاقات ہے۔ اس میں نسبت روڈ اور اُس کا ہریسہ، بھاٹی گیٹ کی قدیم چھوٹی اینٹیں، لوہاری کے مغلیہ جھروکے، انارکلی کے رنگ ساز، قلعے کے پچھواڑے میں قیمصیں اتار کر ریوڑیاں بنانے والے، لسّی بلوتے پہلوان، دیسی گھی سے خستہ باقرخوانیاں اُتارتے نان بائی، ٹھنڈی سڑک پر دُلکی چال چلتے گھوڑے، رائل پارک کی نکڑ پر پنواڑی سے پان لگواتے ہیرو، ایبٹ اور میکلوڈ روڈ کے سینما گھروں سے نکلتے تماشائی، موتیے کے ہار بیچتے لڑکے بالے، چائے خانوں میں بحث کرتے ادیب، اندھیری منڈیروں پر سرگوشیاں کرتے محبوب، سبز چادروں میں لپٹی قبروں اور سنگِ مرمر کے مزاروں کے مجاور، اگربتیاں سُلگاتے اور گلاب کی پتیاں بکھیرتے سوگ وار اور دھمال ڈالتے حال و قال کرتے سائیں لوگ بھی شامل ہیں۔ سبھی مختلف بھی ہیں، منفرد بھی اور ایک بھی روزِ الست کو پھونکی گئی روحِ مقدس اور لباسِ خاک سبھی کو ایک کرتا ہے۔

پرانے لاہوریوں کی بے نیازی، خوش خوراکی، بذلہ سنجی، بے ریا فلک بوس قہقہے اور وفاداری کی اگر تجسیم کر دی جائے تو عطاء الحق قاسمی کہلائے۔

لوگوں کی بھیڑ میں اپنی طرز کا آخری آدمی، آخری لہوری!

قاسمی صاحب ایک بھرے پُرے گھر کے سربراہ ہیں۔ انھوں نے کبھی تخلیقی تلون کی آڑ میں اپنی اولاد کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ حقیقت آشکارا کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جس طرح وہ امریکی پُر آسایش زندگی چھوڑ کر وطن لوٹ آئے، اسی طرح انھوں نے اپنی اولاد کو یہیں پر جینے اور مرنے کا عزمِ پاک عطا کیا ہے۔

اپنے وطن کے لیے میں نے بے شمار دفعہ انھیں بے چین ہوتے دیکھا ہے۔ جو بہتر جانا، اس کا اظہار کیا ہے۔ کبھی مزاح کے لبادے میں تو کبھی بین السطور اظہارِ خیال کیا ہے۔ کبھی نہ تو دورِ جدید کی روایت کے مطابق سربازارِ برہنہ کیا ہے اور نہ ہی لفظ کا تقدس بازارِ حیات میں نیلام کیا ہے۔

بیرونی ممالک میں سفارت سے لے کر ملکی اداروں کی کام یاب سربراہی کے باوجود ان میں اتنی عاجزی ہے کہ جن سے محبت کرتے ہیں، اُن کے لیے ننگے پیر لپکتے چلے آتے ہیں اور جس سے اختلاف کرتے یا دکھی ہوتے ہیں منافقانہ ریاکاری سے کام نہیں لیتے۔

وہ ایک چھوٹا، ننھا سا بچہ جو چناب میں اپنے بابا کے کندھوں پر بیٹھا ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا تھا۔ اتنا ہنستا تھا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے، اب بڑا ہو چکا ہے۔ وہ آج بھی ہنستے ہنساتے بے حال ہو جاتا ہے، اتنا بے حال ہو جاتا ہے کہ اُس کی آنکھوں کی نمی میں چاندنی، پاک چاندنی جھلملانے لگتی ہے۔ وہی چاند جس کی وہ بچپن میں ضد کرتا تھا۔ آج بھی وہ اسی چاند کی ضد کر رہا ہے۔

میں عطاء الحق قاسمی نامی شخص کی ارضِ مقدس سے پُرخلوص وابستگی اور والہانہ محبت کی گواہی دیتا ہوں۔ میں بے نام چہرہ ہوں اور غبارِ راہ سے بڑھ کر کچھ نہیں، اپنی حقیقت سے واقف ہوں۔ واقفِ حقیقت ہوں، اسی لیے گواہی دیتا ہوں۔

بازی گر

شکیل عادل زادہ

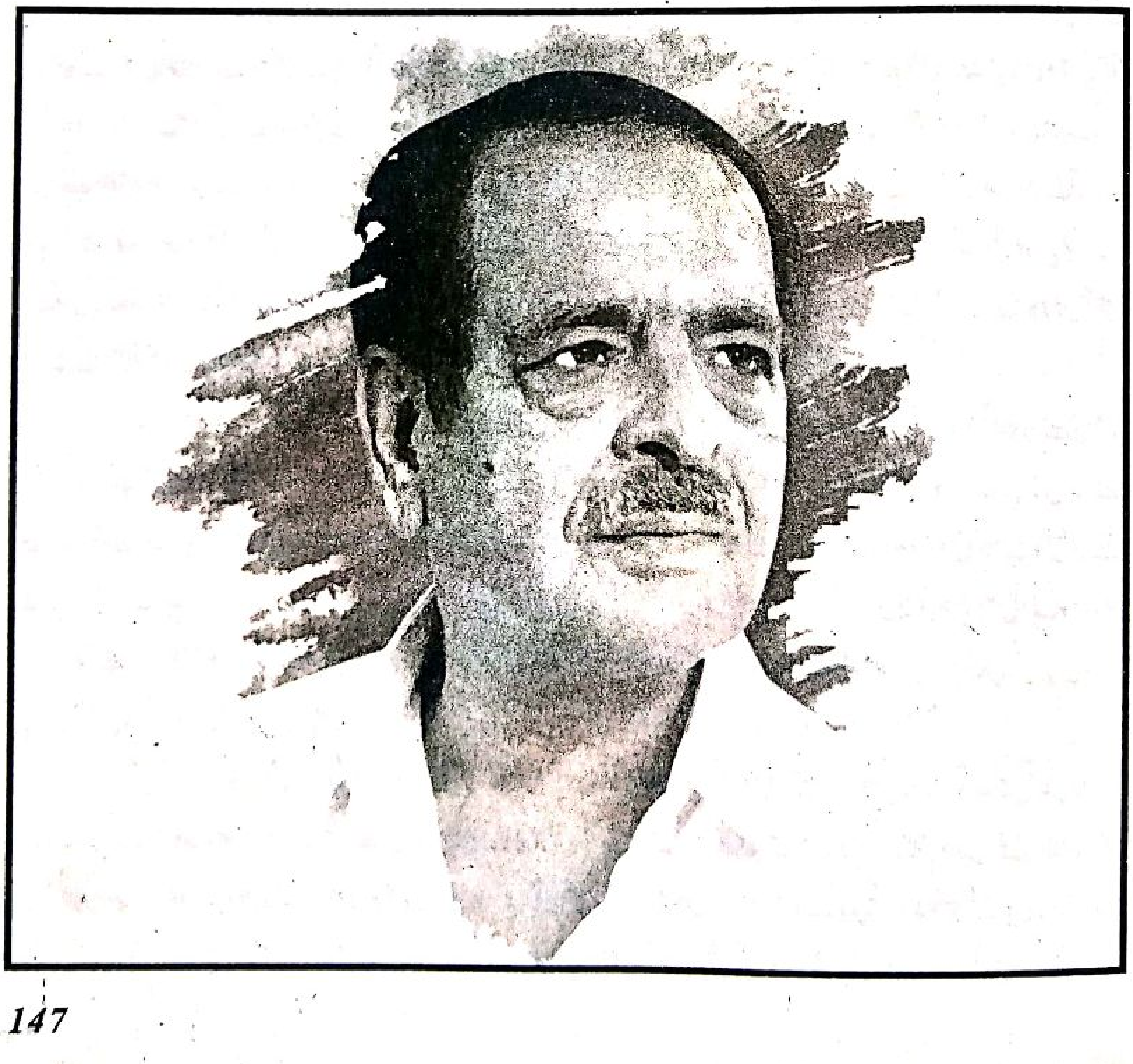

نوجوان شکیل عادل زادہ، عظیم اداکارہ مینا کماری کی زندگی میں ایک جانب سے داخل ہوتے ہیں چند دن گزرتے ہیں، کچھ مکالمات بولتے ہیں اور دوسری جانب سے نکل جاتے ہیں۔ اُس وقت شکیل عادل زادہ کون ہیں اور مینا کماری کون، ایک سننے کی کہانی ہے۔

مینا کماری ہندوستانی فلمی تاریخ کی ناقابلِ فراموش ہیروئن رہی ہے۔ بے مثال اداکارانہ جوہر کے ساتھ جذباتی اداکاری میں وہ ملکہ رکھتی تھی۔ ایک جانب وہ پردۂ سیمیں کی عظیم فن کارہ ٹھیری جو 1970 کی دہائی تک گلیمر کی چکاچوند میں دمکتی رہی، دوسری جانب اُس کی زندگی پے درپے حادثات کی وجہ سے ایک زمانے کے لیے ٹریجیڈی کی علامت بنی رہی۔ اُس کی فلم ''صاحب، بی بی اور غلام'' میں اُس کی روز وشب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ فلم بعض ناقدین ہندوستانی سینما کی عظیم ترین فلم سمجھتے ہیں۔ اس کی کہانی اور مینا کماری کی زندگی کی داستان متوازی سفر کرتی ہیں۔

ماہ جبین بانو کے نام سے جنم لینے والی بچی کی کہانی دردانگیز ہے۔ اُس کی پیدائش کے وقت اُس کے والد علی بخش کے پاس ڈاکٹر گاڈے کو دینے کے لیے معاوضہ بھی نہ تھا، وہ اُسے چند گھنٹوں کے لیے یتیم خانے چھوڑ گیا۔ جب بچی سات برس کی ہوئی تو باپ کی خواہش پر اُسے مینا کے نام سے چائلڈ ایکٹر کے طور پر ایک فلم میں کردار دیا گیا۔ بچی کی خواہش تھی کہ اُسے عام بچوں کی طرح اسکول بھیجا جائے جب کہ اُسے زبردستی فلموں میں کام کی مزدوری پر لگا دیا گیا۔ یہیں سے اس کی نفسیاتی تخریب کا آغاز ہوا۔ وہ اپنی دکھی زندگی کے باعث المیہ اداکاری میں زندگی پھونکنے پر معروف ہوئی۔ ساری زندگی وہ محبت کی متلاشی رہی۔ یہی پیاس اُسے اپنے وقت کے اہم فلم ڈائریکٹر کمال امروہوی کے نزدیک لے آئی۔ کمال امروہوی پہلے سے شادی شدہ تھے۔ مینا جو اَب تک مینا کماری کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہو چکی تھی، جلد ہی کمال امروہوی کی بیوی بن گئی۔ شادی کے بعد کمال امروہوی نے مینا کو فیصلہ سنا دیا کہ چوں کہ مینا سیّد نہیں اس لیے وہ اس سے کوئی اولاد پیدا نہیں کریں گے۔ اس اعلان نے مینا کو ایک جذباتی دھچکے سے دوچار کیا۔ یہ وہی مینا ہے جو بعد میں ''پاکیزہ'' میں اَمر ہو جاتی ہے۔ یہ وہی مینا ہے جو کمال امروہوی سے علیحدگی کے بعد کثرتِ مے نوشی سے انتالیس برس کی عمر میں جگر کے عارضے میں مرجاتی ہے۔ ابھی اُس کی موت بہت دور ہے جب چند مہمان اُس کے باندرا والے گھر میں آ کر ٹھیرتے ہیں۔ ان مہمانوں میں ایک بائیس سالہ لڑکا بھی ہے، جو بہت جلد مینا کے قریب ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اپنا مونس وغم خوار جانتی ہے اور اُس کے ساتھ رات رات بھر دل کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ لڑکا بھی جذباتی طور پر مینا کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اُس سے مینا فلمی دنیا کے مصنوعی پن اور زندگی کی بے معنویت پر باتیں کرتی ہے۔ وہ ضد کرتی ہے کہ لڑکا وہیں بمبئی ٹھیر جائے۔ لڑکا مجبور ہے۔ سو واپس چلا آتا ہے۔ زندگی کی فلم کی ریل یہاں تھمتی ہے۔

زندگی بھی عجیب معاملہ رکھتی ہے۔ اُس لڑکے سے ملاقات کے دو برس بعد مینا کماری شہرۂ آفاق ڈائریکٹر، ایکٹر گرو دت کی شاہ کار فلم ''صاحب بی بی اور غلام'' میں پرانی وضع کی ڈھیتے جاگیرداری نوابی تہذیب کی علامت ایک خاندان میں چھوٹی بہو کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ شوہر ایک عیاش شخص ہے، شراب اور طوائفوں کا رسیا۔ چھوٹی بہو ایک شریف اور خاندانی عورت ہے۔ شوہر کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے وہ شراب پینا شروع کر دیتی ہے۔ معاملہ اعتدال سے اُدھر نکل جاتا ہے۔ اسی دوران اُس عالی شان بھری پُری حویلی میں ایک نوجوان آ کر ٹھیرتا ہے۔ وہ موہنی سیندور فیکٹری میں ملازم ہے۔ جلد ہی وہ چھوٹی بہو کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے۔ چھوٹی بہو اُس سے حالِ دل بیان کرتی ہے۔ یوں اُس کی شکل میں اُسے ایک چارہ ساز میسر آ جاتا ہے۔ فلم میں اُس لڑکے کا کردار گرو دت نے خود ادا کیا۔

ٹوٹتی بکھرتی اُداس وغم زدہ مینا کماری کی حقیقی زندگی میں یہ کردار شکیل نامی ایک گم نام لڑکے نے ادا کیا۔ وہ لڑکا بعد میں شکیل عادل زادہ کے نام سے معروف ہوا۔ یہ وہی شکیل عادل زادہ ہیں جو بعد ازاں ''سب رنگ'' رسالہ نکالتے ہیں اور اسے بامِ عروج تک لے جاتے ہیں۔ ''امبر بیل''، ''اِنکا''، ''اقابلا''، ''بازی گر'' نامی سلسلے وار کہانیاں شروع کرتے ہیں اور ایک زمانے کو اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں، اُردو کے اساتذہ کے استاد ٹھیرتے ہیں اور بین الاقوامی ادب کے اعلیٰ ترین ادبی شاہ پاروں کو اُردو قارئین کی خواب گاہوں تک لے آتے ہیں۔

ایک چھت تلے اہم ترین ادیبوں اور مترجموں کو اکٹھا کر کے ''سب رنگ'' کی اشاعت 1976 میں قریباً پونے دو لاکھ تک لے جاتے ہیں جو ایک ریکارڈ تھا۔ حتمی طور پر اس کے قارئین کی تعداد سترہ لاکھ تک چلی گئی، دس افراد فی ڈائجسٹ، ملکی آبادی سات کروڑ دو لاکھ ستر ہزار (بہ حوالہ مردم شماری) شرح خواندگی 26.20% (خواندہ آبادی ایک کروڑ چوراسی لاکھ۔ اقوامِ متحدہ اعداد)۔ گویا پاکستان کی خواندہ آبادی کا ہر دسواں شخص سب رنگ پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک انقلاب تھا۔

میرے، اُن سے عقیدت اور محبت بھرے شب و روز میں اُنھوں نے بے شمار واقعات گھونٹ گھونٹ سنائے، کئی ذاتی حکایتیں بیان کیں اور اس تعلق کی ریشمی چادر میں اپنی داستانِ حیات کے کئی لعل، عقیق، زمرد، سچے موتی جڑے۔ انھی قیمتی پتھروں سے ایک مالا تیار ہوتی ہے۔ سو پہلے ان کی حیاتِ جاوداں کا رنگا رنگ ہار، بعد میں ذاتی مشاہدات و تاثرات کی سب رنگ ریشمی چادر۔

ایک مرتبہ امجد اسلام امجد صاحب نے شکیل صاحب کو ایک قہقہہ آور لطیفہ سنانا شروع کیا۔ اُس لطیفے کی ظرافت اور برجستگی کے باعث لوگ اُسے سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ جیسے جیسے لطیفہ آگے بڑھتا رہا شکیل صاحب سنجیدگی اور انہماک سے اُسے سنتے رہے۔ لطیفہ ختم ہوا تو امجد صاحب نروس ہو کر دل تھامے شکیل صاحب کو دیکھنے لگے۔ شکیل صاحب نے کچھ دیر توقف کیا، ہلکی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر اُبھر آئی اور وہ بولے ''کیا کہنے!'' اس ''کیا کہنے'' میں اُن کی شائستگی اور خود اختیاری کے ساتھ پوری شخصیت موجود ہے۔

آشفتہ سر، ہمہ صفت، فلک پیما، حسن پرست، قادر الکلام اور غیر منقسم ہندوستان کے شہر مراد آباد میں پیدا ہونے والے اُردو ادب کے قدآور اور رجحان ساز ادیب شکیل عادل زادہ کے بارے میں پانچ دل چسپ حقائق بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

شکیل عادل زادہ حافظِ قرآن ہیں، ان کا تعلق پنجابی سوداگران سے ہے، وہ اردو میں کم زور ہونے کی وجہ سے انٹر میں پہلی کوشش میں کام یاب نہ ہو پائے تھے، شکیل عادل زادہ اُن کا پیدائشی نام نہیں بل کہ معروف شاعر جون ایلیا نے تجویز کیا تھا اور وہ شکیلہ جمال کے قلمی نسوانی نام سے کئی نامور ادیبوں کو خطوط کے ذریعے رجھاتے رہے۔

ڈیفنس کراچی میں نفاست سے ترشی ہوئی باڑھ اور پھل پھول کے پودوں کے لان والے دیدہ زیب بنگلے میں رہنے والے شکیل عادل زادہ اپنے قمیص پتلون والے لباس اور انداز و برخواست کی وجہ سے مغرب پلٹ نستعلیق پروفیسر نظر آتے ہیں۔ یہ تاثر تب تک قائم رہتا ہے جب تک وہ اپنے جیب سے بیڑی نہیں نکال لیتے۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اُن کی بیڑی سُلگانے کے لیے ماچس کی تیلی جلا کر اُنھیں آگ پیش کی تو وہ اپنے ہاتھ کو پیشانی تک لے گئے اور بولے ''آداب!'' میں اُن کی وضع داری سے متاثر ہوا۔ تب وہ بیسویں صدی کے اوائل کے لکھنوی ادیب نظر آ رہے تھے۔

سو بیڑی سلگا کر انھوں نے قصہ ہائے طولانی بیان کیے، اُن کی اپنی زبان میں سخن در سخن اِک جہانِ داستاں، نگار خانہ سب رنگ، بہکتی نگاہوں کے قصے، ادھ کھلے دریچوں کے فسانے، ایک دل دار و دِل جُو کا فسانہ زندگی، برائے دل براں، بہ نامِ عاشقاں، نازنینِ ناز آفریں کے لیے شکیل عادل زادہ سربلند و دل افروز کی حکایت دل پذیر۔

شکیل صاحب نے میرے ازحد ٹالنے کے باوجود اصرار کیا کہ انھیں شکیل بھائی کہا جائے سو یہ داستاں تبھی حقیقی اور خالص ہو گی جب اس میں محترم شکیل صاحب کے پُرتکلف خطابات کے بجائے شکیل بھائی کا پیار سے چھلکتا بے تکلفانہ لفظِ تخاطب استعمال کیا جائے۔ اسے حقیقی تناظر میں دیکھنے کے لیے مختلف الفاظ تخاطب ترتیب وار استعمال کیے گئے ہیں۔ سو یہ شکیل بھائی کی کہانی ہے، پاکستان میں فٹ پاتھ پر دوسری رات گزارنے والے، بالا خانوں اور آئینہ خانوں میں زندگی کو ناچتے دیکھنے والے، رئیس امروہوی، جون ایلیا، کرشن چندر اور دوسرے ممتاز ادیبوں کے ساتھ بسر کرنے والے، ضیاء الحق سے چشم کشا ملاقات والے، اُردو میں مقبولیت کی انتہا کو چھونے والے، کئی محبتیں کرنے والے اور ایک بھی نفرت نہ کرنے والے نقاش کی کہانی۔

شکیل بھائی یکم فروری 1938 کو دلی سے نناوے میل کے فاصلے پر مراد آباد میں ادیب اور شاعر عادل ادیب کے ہاں پیدا ہوئے۔

یہ وہی سال ہے جب جارج سائمنن کی معرکہ الآرا، مہم جوئی اور اسرار پر مبنی پیش بیں عنوان کی کتاب ''ٹرینوں کی آمد ورفت دیکھتا آدمی'' شائع ہو کر مقبولِ عام ہوئی۔ جارج کیا جانتا تھا کہ کُرے کی دوسری جانب ایک ایسا بچہ جنم لے چکا تھا جس نے ٹرینوں کے سفر کرنے تھے اور ان سفروں کے حوالے سے یادگار داستانیں بُننا تھیں۔ کئی یادگار کرداروں نے ریل کاروں میں سفر کرنا تھے خواہ وہ ڈھل ہو یا بابر زمان خان۔

ان کے ابا، رئیس امروہوی اور کوکب مراد آبادی دوستوں کی ایک مثلث تھی جن کی زندگی ادب سے عبارت تھی۔

اُس دور میں مراد آباد دو لاکھ کی آبادی کا چھوٹا سا منفرد پیتل کا شہر تھا۔ ذرائع مواصلات ترقی یافتہ نہ تھے سو ہر شہر دوسرے سے منفرد تھا، ہر ایک کی شخصیت جداگانہ تھی۔ مراد آباد اپنے پیتل کے برتنوں اور اُن پر قلم کاری، جسے سیاہ قلم کی نقاشی کہا جاتا تھا، میں پورے ہندوستان میں معروف تھا۔ ننھے شکیل کی اپنے ابا کے ساتھ خوب گزرتی۔ ابا فی البدیہ شعر گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ شکیل بھائی کی اپنے ابا کے ساتھ گزرے دنوں کی یادوں میں ایک انمول یاد دل شاد سینما میں ''شاہی فقیر'' نامی فلم کا اکٹھے دیکھنا ہے۔ کیا جادوئی کردار سینما سکرین پر بھاگے پھرتے تھے اور ننھا شکیل انھیں پوری آنکھیں کھولے حیرت سے تکتا تھا، کبھی اُنگلیاں دانتوں میں داب لیتا اور کبھی مسکرا دیتا۔ مسکراتے تو ابا بھی تھے، اپنے بیٹے کو حیران و محظوظ ہوتے دیکھ کر۔

ان کے ابا نے کوکب صاحب کے ساتھ ایک رسالہ ''مسافر'' نکالا اور امروہے رئیس صاحب کو صحافت میں لے کر آئے۔ دوسری عالمی جنگ میں کاغذ کی کم یابی کے باعث رسالہ بند کرنا پڑ گیا۔ اس صدمے سے شکیل بھائی کے والد کو آنتوں کی دِق ہو گئی اور جب ننھا شکیل چھے برس کا تھا تو وہ وفات پا گئے۔ خاندان میں تو جو کہرام مچا سو مچا، ان کے عزیز دوست کوکب مراد آبادی بھی اُنھیں دفناتے وقت فلک شگاف چیخ مار کر دماغی توازن کھو بیٹھے۔ باپ کی نمازِ جنازہ پر ننھا شکیل مسجد اور ملحق مدرسے کی بالکونی میں کودتا پھاندتا پھرتا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس پر کیا سانحہ گزر چکا ہے۔

ابا کے انتقال کے بعد پہلی عید پر شکیل کو یتیمی کا احساس ہوا۔ اس کے پیچھے لوگوں کا رحم آمیز رویہ تھا۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی مختلف قابلِ رحم بچہ ہے۔ چناں چہ بچے میں ضد پیدا ہو گئی۔ ایک بار عزیز و اقارب کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں صاحبِ محفل نے شکیل کو یتیم جان کر اُس کے آگے سالن کا ڈونگا بڑھا دیا اور بولے ''بیٹا کھانا کھاؤ۔'' شکیل کو احساس ہوا کہ یہ لطف و کرم کہیں اس کے یتیم ہونے کے سبب سے تو نہیں ہے، سو ضد آڑے آ گئی۔ کہہ دیا کہ وہ کھانا کھا کے آیا ہے۔ وہاں سارا وقت بھوکا بیٹھا رہا اور کھانے کو چھوا تک نہیں۔

شکیل بھائی کو اپنے ابا سے زیادہ نانا یاد آتے ہیں، یہاں تک کہ اپنی اماں سے بھی زیادہ۔ ان کو ایک گہرا دکھ ہے، جس کا اظہار مجھ سے تنہائی میں کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ جب مالی طور پر خوش حال ہوئے اور اس قابل ہوئے کہ اپنے نانا کے لیے کچھ کر سکیں، تب نانا تنگ دستی میں وفات پا گئے۔

ابا کی وفات کے بعد نانا نے انھیں پالا۔ نانا کی خواہش انھیں حافظِ قرآن بنانے کی تھی سو جامعہ قاسمیہ، مراد آباد میں داخل کرا دیا گیا جہاں انھوں نے قرآن پاک حفظ کیا۔ جامعہ کے استاد بہت جابر تھے، جو بے وجہ طلبہ کی دھنائی کر دیا کرتے تھے۔

وہاں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے ادیب شکیل عادل زادہ کی پرداخت کی اور انھیں جہاں گردی کی لت ڈال دی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ مدرسے آنے جانے والے راستے میں محلے کی ایک دس بارہ برس کی لڑکی سے اکثر آمنا سامنا ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کم سن شکیل کو بہت من موہنی لگتی۔ دن رات شکیل کے تصورات میں موجود رہ کر کچھ ایسا اپنا اسیر کیا کہ کسی پختہ کار کی ہدایت پر عصر اور مغرب کے درمیان چالیس مرتبہ سورۂ مزمل کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ اب توقع تھی کہ وہ دل پذیر لڑکی یقیناً ملتفت ہو گی۔ وہ تو اس کی جانب ملتفت نہ ہوئی

البتہ قبلہ حافظ صاحب متوجہ ہو گئے اور سبق نہ یاد ہونے کی کچھ ایسی ظالمانہ جسمانی سزا دی کہ چوٹوں سے ہٹ کر اہانت کی وجہ سے یہ شہر چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ باندھ بیٹھا۔

اس ارادے میں ایک رکاوٹ اس کی اپنے نانا سے شدید محبت تھی۔ نانا بھی نواسے سے خالص مشفقانہ عشق کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے گھنے برگد کے درخت کی طرح تھے جس نے اپنے گہرے سائے میں سبھی اہل خانہ کو لے رکھا تھا۔ نوخیز شکیل پر نانا کا خوف کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنے فلموں کے شوق کو پورا کرنے کے لیے فلم کے ہاف ٹائم پر بقیہ ہاف فلم کا ٹکٹ بیچ آیا کرتا اور بقیہ فلم اگلے روز کسی سے ہاف ٹکٹ خرید لیا کرتا۔ یوں جلدی گھر چلے آنے پر کسی کو اس کے فلم دیکھنے پر شک نہ ہوتا۔ اپنے اخراجات کے لیے یہ والدہ، ماموں اور نانا سے جیب خرچ لیتا تھا۔ زیادہ ضرورت ہونے پر خاموشی سے نانا کی شیروانی سے پیسے اُڑا لیا کرتا۔ یوں حافظ بچہ زندگی کے تجربات پر سے گزر رہا تھا اور زندگی کی ندی میں ڈبکیاں بھی لگا رہا تھا کہ اُسے اس میں تیرنا سیکھنا تھا۔

ایک صبح جب ابھی مراد آباد کی سبزی منڈی میں بوریوں کے منہ کھل رہے تھے اور ان سے آلو پیاز نکال کر کنجڑے سامان سجا رہے تھے، منیاری کی دکانوں والے پلاسٹک کے چھوٹے سامان اور دالوں مسالوں کو ڈھیریوں میں رکھ رہے تھے، ماشکی چھوٹے سے شہر میں گملوں، کیاریوں اور سڑکوں پر پانی چھڑک رہے تھے، سورج کی حدت آمیز سنہری کرنوں میں کلیساؤں کے روشن دان اور رنگین کھڑکیاں دمک رہی تھی اور مساجد کے پیتل کے چاندی رنگے کلس سنہرے ہو رہے تھے کہ ایک بچہ تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی جانب جا رہا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ شاید وہ تنہا نہ تھا کہ اُس کے بدن پر نیل کے نشان، چھڑیوں کے زخم اور تلخ یادیں اُس کے ہم راہ تھے۔ وہ ساڑھے تین برس کی مدت میں قرآن پاک کو پہلی مرتبہ حفظ کر چکا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر وہ ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ یہ اُس کا ریل کا پہلا سفر تھا۔

وہ شام کو چار بجے مراد آباد سے دلی جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ رات دلی پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اُس کے پاس کل تین آنے ہیں۔ اُس نے پروانہ کی اور بمبئی جانے والی ٹرین میں بغیر ٹکٹ سوار ہو گیا۔ رات کو ڈبے کے ایک کونے میں سمٹے شکیل نے کسی اسٹیشن پر ایک آنے کے چنے لیے، صبح کو چائے کا ایک کپ پی لیا۔ جب ٹرین بھوپال پہنچی تو ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا۔ وہاں شکیل نے ایک کہانی گھڑی۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ شکیل نے اپنے ماموں کے ساتھ سفر کا آغاز کیا تھا، رستے میں ماموں بچھڑ گئے۔ ٹکٹ اُنھی کے پاس تھے۔ چناں چہ نہ صرف یہ کہ ٹکٹ گئے بل کہ ماموں سے بچھڑنے کی وجہ سے وہ خود بھی تنہا ہو گیا۔ کہانی اتنی تفصیل اور جزئیات اتنی حقیقی تھیں کہ نہ صرف ٹکٹ چیکر نے اُسے چھوڑ دیا بل کہ مسافروں کی ہم دردیاں بھی اُس کے ساتھ ہو گئیں۔ انھوں نے اسے جگہ دی، کھانے کو بار ہا پوچھا اور شفقت کا اظہار کیا۔ ضدی شکیل بھوک سے نڈھال تھا مگر اُس نے سبھی پر ظاہر کیا کہ اُسے بھوک نہیں۔

ٹرین سیٹی بجاتی اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ ہوئی۔ بڑودا اسٹیشن پر ریلوے پولیس نے چھاپہ مار کر بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کو حوالات میں بند کرنے کے لیے تحویل میں لے لیا۔ ٹرین کے سبھی مسافر شکیل کی حمایت میں ٹرین سے اُتر آئے۔ کیا ہندو، کیا سکھ اور کیا مسلمان؛ سبھی ریلوے پولیس سے الجھنے لگے۔ قصہ مختصر انھوں نے شکیل کو نہ صرف چھوڑ دیا بل کہ سفر جاری رکھنے کی اجازت بھی دے دی۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب ریل گاڑی کو ہندوستان میں ایک رومانوی اور دُور کے دیہات میں جادوئی سواری سمجھا جاتا تھا۔

برطانوی راج میں ایک ہندوستانی نواب کا سچا واقعہ ہے۔ نواب صاحب ریل کار کا طویل سفر کر کے ریلوے اسٹیشن اُترے۔ وہ اپنی دور افتادہ راج دھانی کا بگھی پر مزید سفر کا روح فرسا تصور کر کے ایک انگریز افسر سے بولے۔

”کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ اسٹیشن میری راج دھانی میں بنایا جاتا۔“

اُس انگریز نے مخصوص برطانوی مزاح میں جواب دیا۔

”یقیناً نواب صاحب یہ بہت اچھا ہوتا۔ لیکن ہم نے سوچا کہ ریلوے اسٹیشن آپ کی راج دھانی میں بنانے سے اُس جگہ بنانا زیادہ

بہتر ہوگا جہاں سے ریل کی پٹڑی گزرتی ہے۔''

ریل گاڑی کی ہند میں آمد سے جہاں اس سے وابستہ کئی پراسرار حکایات گردش میں رہیں، وہیں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور دیگر کئی ادیبوں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ کئی فلمیں ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روموں سے پھوٹیں ''موسم سرما کی کہانی'' کے مصنف مارک ہیلپرن نے لکھا تھا کہ ریل کے سفر کے دوران اُسے درختوں سے یہ سوچ کر ہمدردی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنی جڑوں سمیت ایک ہی جگہ پیوست ہیں اور آوارگی کے لطف سے ناآشنا!

شکیل کی ریل گاڑی بمبئی کے دادر اسٹیشن میں داخل ہوئی اور ایک طویل ہچکی لے کر وہاں کھڑی ہوئی۔ دادر ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر اور ریلوے پولیس کی یلغار دیکھ کے شکیل نے پلیٹ فارم کے اُلٹی سمت ریلوے لائن پر اترنا محفوظ جانا اور پٹریوں پٹریوں چلتا ہوا دادر کے پل پہ چڑھ گیا اور یوں دیوہیکل شہر کے شکم میں داخل ہوگیا۔

سفید کُرتا پاجامہ پہنے چلتے چلتے لڑکا ایک ایرانی ہوٹل کے سامنے بھوک اور نقاہت کے مارے چکرا کر گر گیا۔ لوگوں نے اُٹھایا، پانی پلایا اور ناشتا کرایا۔ وہیں ایک صاحب نے اسے بھنڈی بازار کا پتا سمجھایا، جہاں اس کے عزیز قیام پذیر تھے۔

ہوٹل میں اس کی دل گداز داستان سننے والوں نے آخر اُسے اس کے عزیزوں کے ہاں پہنچادیا۔ یہاں اُس نے اپنی آوارہ گردی کی ایک نئی داستان تراشی۔ ماموں سے بچھڑنے کی کہانی وہاں نہ چلتی کہ وہ رشتے داروں سے واقف تھے۔ نئی داستان اغوا کاروں کے ایک گروہ کے گرد بُنی گئی۔ عزیزوں نے شکیل کی عدم موجودی میں اس کہانی پر شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بچے جن کے باپ فوت ہوجاتے ہیں، ایسے ہی آوارہ ہوجاتے ہیں۔ اپنے استاد کی سختی سے گھبرا کر چلے آئے شکیل نے یہ گفت گو سن لی۔ اس کے دل میں گویا ایک تیزابی برچھی ترازو ہوئی اور شکیل نے بمبئی میں آباد اپنی دادی کی بہن کے ہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دادی کی بہن نے اپنے پوتے کو چوم کر گلے لگایا اور اپنے ہاں ٹھیرا کر اُس کی ناز برداری کی۔

ممبئی کا ہجوم اور شور دیکھ کے اُس کے خواب بکھرنے لگے۔ وہاں تو دنیا ہی مختلف تھی۔ ہر کسی کو بس اپنی فکر تھی۔ ہر کوئی جیسے بھاگا جارہا تھا۔ شکیل نے دادی سے مرادآباد واپس جانے کی ضد کی اور وہ دس روز بعد واپس مرادآباد لوٹ آیا۔ یوں اس کی پہلی مہم جوئی اختتام کو پہنچی۔

ابھی ایک مہم جوئی باقی تھی۔

شکیل کو لکھنے پڑھنے کا اِس حد تک شوق تھا کہ اُس نے ایک آنہ لائبریری کے سبھی ناول پڑھ ڈالے تھے۔ شہر کی لائبریریوں کو بھی کھنگال لیا تھا۔ نویں جماعت میں اس نے ناول لکھنا شروع کیا، ایک روز انگریزی کے اُستاد نے خالی پیریڈ میں اسے لکھتے دیکھا تو مسودہ پڑھا۔ پڑھ کر خوش ہوئے اور اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

اس کی خواہش تھی کہ لوگ اسے توجہ دیں۔ سو وہ اہم ادیبوں، شاعروں کو ایک لڑکی 'شکیلہ جمال' کے فرضی نام سے خط لکھتا۔ قدامت پسند ہندوستانی معاشرے میں کسی لڑکی کی جانب سے ادیب کو ملنے والا خط بہت اہمیت اختیار کر جاتا تھا۔ شکیل کو لڑکیوں والے ناز و انداز اور طریقے سے خط لکھنے میں مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ جواباً خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ بیش تر مخاطب ادیب شکیلہ جمال کے خطوط کے اسیر ہوگئے۔

نریش کمار شاد 'بیسویں صدی' رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے جوابی خطوط میں بے قراری اتنی بڑھی کہ شوق ملاقات پر منتج ہوئی۔ شکیل نے ان کو ایک باپردہ مسلمان گھرانے کی لڑکی ہونے کے ناتے ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ وہ نہ ٹلے اور شکیلہ جمال سے ملنے مرادآباد پہنچ گئے۔ یہ بہت دل چسپ واقعہ ہے۔ شاد نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو شکیل گھر پہ موجود نہ تھا۔ شاد نے شکیلہ جمال کا نام لیا تھا۔ شکیل کی والدہ کو شکیلہ جمال کے نام سے مختلف ادیبوں اور شاعروں کو لکھے جانے والے خطوط کا کچھ علم تھا۔ انھوں نے شاد کو جواب دیا کہ شکیلہ جمال تو بریلی گئی ہوئی ہیں البتہ اُن کا بیٹا شکیل شہر میں ہے۔ شاد نے شکیل سے ملنے کی خواہش کی۔ شکیل اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ واپس آیا تو سارا

ماجرہ سنا۔ بہت پریشان ہوا کہ کس طرح شاد کا سامنا کرے گا۔ شاد نے اُس کی والدہ سے کہا تھا کہ وہ مرادآباد ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں شکیل کے منتظر رہیں گے۔ شکیل نے بہر حال اسٹیشن کا رخ کیا۔ اس دوران شاد پھر شکیل کے گھر پہنچ گئے اور دو تین بار ایسا ہی ہوا۔ اِدھر شکیل اسٹیشن جاتا اُدھر شاد ان کے گھر آتے رہے۔ آخر محلے کے ایک واقف کار شخص نے کئی بار گلی میں اجنبی شاد کو دیکھ کر صاف صاف بتا دیا کہ یہاں کوئی شکیلہ جمال نہیں رہتی۔ البتہ ایک شکیل نامی نہایت شرارتی لڑکا رہتا ہے جو ہندستان کے ادیبوں اور شاعروں کو لڑکی کے نام سے خط لکھ کے لطف لیتا رہتا ہے۔ نریش کمار شاد نے کس دل سے یہ داستان سنی ہوگی اس کا اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اُن کا مایوس لوٹ جانا شکیل کے دل پر اثر کر گیا۔

شکیل کے اسکول میں ہونے والے آل انڈیا مشاعرے میں بہت سے شاعروں کے علاوہ بمبئی سے شکیل بدایوانی بھی آئے تھے۔ ساتویں جماعت کے طالب علم شکیل کی شوق خدمت سے وہ ایسے متاثر ہوئے کہ دونوں میں خط کتابت شروع ہوگئی۔ شکیل نے انھیں شکیلہ جمال کی طرف سے لکھے جانے والے ہندستان کے ادیبوں شاعروں کا تذکرہ ایک خط میں کیا تو شکیل بدایونی نے یہ خطوط دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ شکیل نے اِن خطوط کا ڈھیر بمبئی بھیج دیا۔ شکیل بدایونی بہت محظوظ ہوئے۔ انھوں نے وہ خطوط مشہور موسیقار نوشاد صاحب کو بھی دکھائے۔ وہ بھی ایک اَن دیکھی نوجوان لڑکی کے لیے ادیبوں شاعروں کے بے پناہ اضطراب اور جوشِ عشق پر بہت محظوظ ہوئے۔ البتہ انھوں نے شکیل کو یہ سلسلہ ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ شکیل نے کچھ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اور کچھ نریش کمار شاد والے واقع سے متاثر ہو کر یہ سلسلہ ترک کر دیا۔

شکیل نے پھر دل جمعی سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ جب وہ انٹر میں پہنچا تو اس کے ایک رشتے دار آصف پاکستان سے مراد آباد آئے۔ یہ 1956 کا سال ہے اور گرمیوں کا موسم۔

اِدھر شکیل کا خاندان ہندستان میں آباد ہے اور پاکستان ہجرت کا کوئی ارادہ نہیں۔ قیامِ پاکستان کو نو برس بیت چکے ہیں۔

اُدھر بین الاقوامی شطرنج کے مہرے کچھ اور چالیں چل رہے ہیں۔ مراکش فرانس سے آزادی لے چکا ہے اور مصر نے نہرِ سوئز پر تسلط حاصل کر لیا ہے۔ دنیائے ادب کی معروف ترین شادی ڈراما نگار آرتھو ملر اور دل فریب و جمال آگیں اداکارہ مارلن منرو کے درمیان انجام پاتی ہے اور البرٹ کامیو کا شاہکار، رجحان ساز ناول ''دی فال'' لے کر منظرِ عام پر آتا ہے۔ اِدھر آصف نے کراچی کی خوب صورتی اور رنگینی کا تذکرہ کچھ ایسے پر کشش انداز میں کیا کہ نوجوان شکیل کا جی کراچی کے لیے للچا گیا۔

جہاں گردی کا چسکا اور نئی دنیائیں دیکھنے کا لپکا پُر شباب شکیل کو تبھی پڑ گیا تھا جب اُس نے کاروبار کے سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ اپنے ماموں کے ہم راہ کیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ اُس کے نانا محمد شریف برتنوں کے کاروبار میں تھے۔ ان کا گھرانا روایتی ہندوستانی مسلمان گھرانا تھا۔ برتن کی صنعت سہ قسمی تھی۔ ظروف سازی، ظروف کی رسد و فراہمی اور ظروف کی ملکی غیر ملکی برآمد۔ نانا مرادآباد کے کاری گروں اور نقاشوں سے پیتل کے اعلیٰ منقش برتن بنواتے اور پورے ملک میں فراہم کرتے۔

ماموں نانا کی معاونت کرتے، پورے ملک کا دورہ کرتے، مطلوبہ فرمائش لاتے اور مال کی فراہمی کرتے۔ ایسے میں شکیل اُن کے ہم راہ قریباً سال بھر کے دورے پر نکلا۔ ماموں بھانجے نے شہر شہر قریہ قریہ پھرتے جنوبی ہندوستان کو کھنگال ڈالا۔ حیدرآباد دکن میں خاصا قیام کیا اور وہاں کی ہندو مسلم تہذیب کو قریب سے دیکھا۔

حیدرآباد دکن میں ایک پر لطف معاملہ ہوا۔ گرودت کی فلم ''پیاسا'' کا بہت چرچا تھا۔ ریلیز کے موقع پر سارا یونٹ حیدرآباد آیا ہوا تھا۔ فلم کے افتتاحی شو کے لیے ٹکٹ قبل از وقت بک چکے تھے۔ نوجوان شکیل عمدہ لباس میں اِس اعتماد سے پیلس سینما میں داخل ہوا کہ نہ تو اسے روکا اور نہ ہی ٹوکا۔ وہ سیدھا اسٹیج پر گیا اور گرودت، گیتا دت، وحیدہ رحمان، شکیلہ، جانی واکر اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ اسٹیج پر گھل مل گیا۔

سبھی نے اسے یونٹ کا فرد سمجھ کر تکریم کی۔ جانی واکر نے تو اپنی سگریٹ بھی پیش کی۔ اگلے روز کے اخبارات کی تصاویر میں شکیل سپر اسٹارز کے ساتھ کھڑا تھا۔

ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جب مہم جو پر اعتماد اور نوخیز شکیل زندگی برت رہا تھا اور زندگی اسے اپنی گود میں جھلا رہی تھی۔ ریل کے سفر، بسوں کی سواری، دکان داروں کے حربے، بازی گروں کے کمال، فقیروں کے روپ، مجذوبوں کی بے خودی، بازاروں کی ریل پیل، جھروکوں سے دید شنید، ہندو تہواروں کے رنگ، اسلامی تیوہاروں کا تقدس، مسیحی، سکھ، بدھ، پارسی زندگی کے متنوع روپ، مے خواروں کی مستیاں، جیب تراشوں کی مہارت، سرسبز کھیتوں کی تازہ مہک، صحراؤں کی ویرانی، کوہستانوں کی پرشکوہ کشش، قافلوں کی چال، اونٹوں کی گھنٹیاں، بھینسوں کی جگالی، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، سبھی کچھ دیکھا، سونگھا، چکھا، سنا، چھوا اور اپنے اندر جذب کر لیا۔

انھی اجزا سے بعد ازاں قصہ گو و داستان ساز شکیل عادل زادہ کی تشکیل ہونا تھی۔ لفظوں کی، تصورات و قصہ گوئی کی بازی گری ہونا تھی۔ ابتدائے جوانی تھی، جو انسانی چلتر اور سادگی دیکھی، جو کہہ مکرنیاں اور معصیتیں سمجھیں، ذہنِ ناپختہ پر ایسی نقش ہوئیں کہ یادداشت کا جزو بن گئیں۔

ہندوستان سے پاکستان آنے کا معاملہ بھی ایک قابلِ شنید داستان ہے۔

نانا کے گھر کے معاملات اور کچھ کر لینے کی جستجو نے جلد ہی عملی زندگی میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔ ماموں کے ساتھ دو مرتبہ پورے جنوبی ہند کی خاک تو چھان ہی لی تھی، ٹیوشنیں بھی پڑھالی تھیں، سو آصف صاحب کے پاکستان میں آگے بڑھنے کے مواقع کا رنگین نقشہ کھینچنے پر نوجوان شکیل کراچی آنے کو بے قرار ہو گیا۔ تب تک اُس نے کامرس میں ہندی میڈیم میں میٹرک کر لیا تھا اور انٹر میڈیٹ کے امتحانات میں چند ماہ تھے۔

اس نے چھپ کر لکھنؤ سے پاسپورٹ بنوایا اور اماں سے بہانہ کر کے دلی چلا آیا۔ اماں تو اپنے بچے کو دور کے شہر بھیجنے پر بھی آمادہ نہ تھیں، پاکستان تو بہت بعید از قیاس معاملہ تھا۔

پاکستان جانے اور وہاں قیام کے لیے اخراجات ایک رُکاوٹ تھی تو دوسری چھوٹی بہن اور بھائی، اماں، ماموں اور نانا سے جدائی تھی۔ اماں کی کُل کائنات تو ان کے بچے تھے۔ انھوں نے تو عین جوانی میں بیوگی کا بوجھ اُٹھائے اپنے لختِ ہائے جگر کے لیے وقت گزار دیا تھا۔

پس اپنے اہلِ خانہ کی مدد اور کچھ کر گزرنے کی خواہش نے ایک عجیب حرکت کروائی۔

اُس نے اپنی اماں کی چمپاکلی چرائی اور ایک بنیے کے پاس گروی رکھوادی۔ رسید اپنے دوست کو دی اور تاکید کی کہ پاکستان پہنچ کر جب وہ پیسے بھجوائے تو دوست رقم ادا کر کے چمپاکلی چھڑوالے۔ اماں چمپاکلی استعمال نہ کرتی تھیں سو انھیں اُس وقت اس کی گم شدگی کا پتا نہ چلا۔ اُس دور کے غریب اور بے سہارا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پاکستان گویا ایک فردوسِ پاک تھا جہاں مواقع کی بہتات اور آزادی کی جاں افزا فضا تھی۔ شکیل کے دوستوں نے مل کر اُس کی مدد کی اور اُسے مراد آباد سے امرت سر جانے والی پنجاب میل میں بٹھا دیا۔

تین واقعات ہیں جن کے تذکرے کے بنا داستان نامکمل رہے گی۔

جب شکیل ویزا لینے دِلّی پہنچا تو وہاں ایک مسلمان نجومی لڑکا اس کا دوست بن گیا جو اسے بلی ماراں کے محلے میں اپنے گھر لے گیا۔ وہاں شکیل رات بھر کے لیے ٹھیرا۔ ویزا صبح لگنا تھا۔ رات کو میزبان نے اس کا ہاتھ دیکھا اور بتایا کہ وہ گھر سے بھاگ کر پاکستان جا رہا ہے۔ عین حقیقی بات بتانے پر شکیل کا اپنے میزبان نجومی لڑکے پر اعتماد بڑھ گیا۔ اس کے بعد اُس نے جو کچھ کہا وہ ہوش رُبا تھا۔ اُس نے پیش گوئی کی کہ شکیل کو پاکستان جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، وہ انٹر نہ کر سکے گا، زندگی ناکامیوں میں گزرے گی اور تیس برس کی عمر میں انتقال ہو جائے گا۔

نوخیز شکیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے معصومیت سے پوچھا۔ ''کیا میں تیس سال کی عمر تک مر جاؤں گا؟''

وہ نجومی دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگا ”ضروری نہیں، فوت ہو جاؤ، اگر زندہ رہے تو مفلسی کی حالت میں ہاتھ پیر جواب دے جائیں گے اور تم معذور ہو جاؤ گے۔“

یہ سن کر شکیل کے تو ہوش اُڑ گئے۔

دوسرا واقعہ، بہ یک وقت چشم کشا حیرت انگیز ہے۔ ہر شہر کی طرح مراد آباد میں بھی ایک ”بازار“ تھا۔ اِسے گنج بازار کہتے تھے۔ یہاں بہت سے کوٹھے تھے جہاں رقص کے علاوہ جسم فروشی کا دھندا بھی ہوتا تھا۔ شکیل اور اس کا بڑی عمر کا صاحب حیثیت دوست عبدالقدوس سائکل پر شہر بھر میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ایک روز رات کو جب دکانیں بند ہو چکی تھیں اور شہر میں دونوں گنج بازار جا نکلے اور عبدالقدوس شکیل کا ہاتھ تھامے ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ وہاں تو عجب منظر تھا۔ ایک چوبارے پر ایک عورت پردے کی اوٹ میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ اِردگرد پردہ کھنچا ہوا تھا۔ مردوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ شوق فزوں تر تھا اور تجسس گھٹی میں، سو دونوں دوست آگے بڑھ کر دیکھنے لگے۔ قطار میں سے ایک مرد اندر پردے میں جاتا، تھوڑی دیر میں باہر آتا تو عورت بھی ساتھ میں چلی آتی۔ مرد باہر کا رخ کرتا اور عورت واش روم کا۔ کچھ دیر بعد عورت واپس آ کے دوبارہ اندر پردے میں چلی جاتی۔ ساتھ میں اگلا مرد اندر چلا جاتا۔ دو روپے کی فیس مقرر تھی۔ عبدالقدوس اور شکیل بھی قطار میں بیٹھے تھے۔ عبدالقدوس نے پہل کی۔ اُس کا نمبر آیا تو پردے کے اندر چلا گیا اور کچھ وقت گزار کے باہر نکلا تو اب شکیل منتظر تھا لیکن عبدالقدوس مضطرب و مشتاق شکیل کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہوا زینہ اترنے لگا۔

مسئلہ یہ تھا کہ شکیل کی جیب میں دھیلا نہیں تھا۔ شکیل کی باری کے دو روپے بھی عبدالقدوس کو ادا کرنے تھے۔ عبدالقدوس پیسے والے گھر کا نوجوان تھا۔ کوٹھے سے نیچے آ کے عبدالقدوس نے دس عذر تراشے کہ یار اندر بڑا گندہ ماحول تھا۔ عورت بھی بس واجبی قسم کی تھی۔ خواہ مخواہ پیسے ضائع ہوئے۔ شکر ہے کہ تم محفوظ رہے۔ شکیل کا حال بہت رنج و غم اور غصے کا تھا۔ عورت اور مرد کے تعلق جو احوال انھوں نے قصے کہانیوں میں سنا تھا، یہ اس کے مشاہدے اور تجربے کا بہترین موقع تھا۔ یقیناً اُس عمر میں عنفوانِ شباب کی بھی فراوانی تھی۔ شکیل کو بہت ہتک محسوس ہوئی۔ چوں کہ شکیل کی جیب خالی تھی وہ ضبط کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ عبدالقدوس کے پاس پیسے تھے اور وہ فیصلہ کرنے کا مختار تھا، اُس دن کے بعد شکیل کو غربت و امارت کا امتیاز شدت سے محسوس ہوا۔ بعد کو اس طرح کے کچھ اور تلخ و تند تجربوں نے اُس کے اندر ابھرنے والے جذبے کو اور مہمیز کیا۔

اس سے پہلے بھی اُس نے ایک جرأت کی تھی۔ جیب میں کچھ پیسے ہوئے تو اُس نے ایک کوٹھے پر جانے کی ٹھانی۔ گنج بازار میں صرف زنانِ بازاری کے مکانات نہیں تھے، دیگر دکانیں بھی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گنج بازار میں تاجرانہ سرگرمیاں عروج پر تھیں شکیل اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے موقع ملنے پر جھٹ ایک کوٹھے کے زینے میں داخل ہو گیا۔ اُوپر ایک چالیس پینتالیس سالہ فربہی مائل عورت نے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ شکیل نے کچھ کہے سنے بغیر جیب سے روپے نکال کے اُسے دکھائے۔ عورت اُسے لمحوں تک گھورتی رہی پھر اُس نے شکیل کو دھتکار دیا۔ ”چلو، واپس گھر جاؤ، پھر کبھی ادھر نہ آنا۔“ مایوس شکیل سے کچھ کہتے نہ بنی۔ ہیجانی عالم میں اُس نے زینے کا رخ کیا لیکن باہر نکلنے سے دُور سے اپنے ماموں کو آتا دیکھ کے اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھ گیا اور خاصے وقفے کے بعد دوبارہ نیچے اُترا۔

تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ٹرین پر پاکستان آتے ہوئے ایک نو بیاہتا نوجوان جوڑا شکیل کے ہم راہ سفر کر رہا تھا۔ وہ اجنبی اس سے جلد ہی اس درجہ گھل مل گئے گویا یہ انھی کے خاندان کا فرد ہو۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے ٹفن کیریئر سے کھانے میں شریک کیا اور اٹاری کے رستے واہگہ پہنچ کر شوہر صبح اپنی حسین و جمیل بیوی کو شکیل کے حوالے کر کے عزیزوں سے ملنے چلا گیا۔ شام کو وہ واپس لوٹا تو کراچی کا سفر شروع ہوا۔

اس سفر میں شکیل نے زندگی کا ایک اہم سبق سیکھا کہ بعض اوقات قریبی لوگ جن پر اعتبار ہوتا ہے، عین وقت پر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ البتہ غیب سے ایسے ایسے اجنبی اور نا آشنا مدد کو ہاتھ بڑھا دیتے ہیں جو قطعی غیر متوقع ہوتا ہے۔

زندگی کی کتاب کا ایک اہم سبق ابھی مرادآبادی نوجوان کو پڑھنا تھا۔

کراچی ایکسپریس رات دس بجے کراچی سٹی اسٹیشن پر رُکی تو اَن جانے اندیشوں سے شکیل کا دل دھڑک رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ اسٹیشن پر ٹمٹماتی روشنیوں میں مونگ پھلی اور چنے بھوننے والے آوازیں لگا رہے تھے۔ کراچی شہر میں پہلی رات تھی۔ اب تک پاکستان ایک دوسرا ملک تھا۔ شکیل نے سامان اٹھایا اور سائکل رکشا لے کر اپنے عزیز آصف کے گھر برنس روڈ کی جانب چل دیا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے کسی کے گھر دستک دینا نامناسب معلوم ہو رہا تھا۔ بہر حال مجبوری تھی سو دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی مرد کی بیزار آواز سنائی دی۔ شکیل نے اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرایا تو اندر سے جواب دیا گیا کہ آصف گھر پر نہیں ہے۔ شکیل پہچان گیا کہ وہ آصف ہی کی آواز تھی۔ وہ چپ چاپ وہاں سے لوٹ آیا۔ مجبوراً اُسے دوسرے دروازے کا رُخ کرنا پڑا۔ وہ رات شکیل نے آصف کے سالے جمال نامی دوست کے چھوٹے سے فلیٹ پر گزاری۔ جمال کے مختصر فلیٹ میں گنجایش مشکل تھی۔ جمال نے اپنے بڑے بھائی سے درخواست کی۔ اتفاق سے ان کی بیوی ہندستان گئی ہوئی تھیں۔ اُن کا مکان خالی تھا۔ سو جمال، شکیل کو لے کر بڑے بھائی کے مکان پہنچا۔ مکان پر تالا لگا تھا۔ جمال کے بھائی گھر پہ نہیں تھے۔ جمال زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ شکیل کو وہاں چھوڑ کے وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بھائی کے انتظار میں شکیل اپنا مختصر سامان لیے فٹ پاتھ پر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ رات گزر گئی۔ جمال کے بھائی گھر نہیں لوٹے۔ فٹ پاتھ پر سونے والے دوسرے لوگوں نے چادر بچھا دی۔ شکیل وہیں لیٹ گیا۔ فٹ پاتھیوں نے خاصی نصیحتیں کیں۔ راتوں رات پیسا کمانے کے کئی گُر بتائے اور اپنے اپنے لحاف چیتھڑے لے کر سو گئے۔

دوسرے روز شکیل اپنے قریبی رشتے داروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک رشتے دار تو اُسے دیکھتے ہی اتنے مہربان ہوئے کہ اُس کا سامان اُٹھا کے اپنے گھر لے گئے۔ وہ صاحب شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ خود بھی کہتے تھے اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اُس وقت شہر چاروں طرف اپنی حدود بڑھا رہا تھا مگر اتنی بھیڑ اور ایسی افراتفری، نفسانفسی نہیں تھی۔ شور بھی کم تھا۔ ابھی شہری مرکز سے بیس بیس میل دور تک آبادیاں نہیں بسی تھیں۔ آمد و رفت بڑی آسان تھی۔ ناظم آباد کے ابتدائی حصے میں واقع متوسط طبقے کی 'زیرِ تعمیر' ادھوری کالونی میں نغمی صاحب نے نیا نیا دو منزلہ گھر بنایا تھا۔ نغمی صاحب کے ہاں ابھی چند دن ہوئے تھے کہ شکیل کے ایک قریبی رشتے دار نے اُس پر زور دیا کہ وہ اُس کے گھر منتقل ہو جائے۔ اُسے یقین تھا کہ نغمی اپنی چھوٹی لڑکی سے شکیل کا رشتہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ جان کے شکیل کو نغمی صاحب کے گھر بھی دل چسپی بڑھ گئی اور اُس نے لڑکی کو دیکھنے کے لیے تاک جھانک شروع کر دی۔ مشکل یہ تھی کہ شکیل کو نچلی منزل میں ٹھیرایا گیا تھا اور نغمی صاحب، اپنی بیگم اور لڑکی کے ساتھ اوپری منزل پہ رہتے تھے مگر ایک دن شکیل نے لڑکی دیکھ لی۔ وہ خاصی حسین تھی اور اُس عمر میں دیوار پر کوئلے سے بنی ہوئی لڑکی کی تصویر دیکھ کر ہی خیال و خواب اُڑنے لگتے تھے۔ ایک روز نغمی صاحب نے شکیل سے اصرار کیا کہ کراچی میں روزگار کا تھوڑا بہت آسرا ہونا چاہیے۔ وہ اسے اپنے ایک شناسا، انڈین جنوئن کیمیکل کمپنی کے مالک کے پاس لے گئے اور نہایت خوشامدانہ انداز میں شکیل کی سفارش کی۔ مالک نے انٹرویو میں شکیل کو انگریزی میں خط ڈرافٹ کرنے کا حکم دیا۔ شکیل کی خاصی شکستہ انگریزی تھی۔ اُس نے دانستہ ڈرافٹ میں غلطیاں بھی کیں کہ کہیں اسے قبول نہ کر لیا جائے۔ خط دیکھ کے مالک نے سراہا اور شکیل کو توقع کے خلاف اپنے ہاں ملازمت کا عندیہ دے کر ساٹھ روپے ماہانہ تن خواہ کی پیش کش بھی کر دی۔ نغمی صاحب بہت خوش تھے لیکن شکیل تو کچھ اور خواب لے کے پاکستان آیا تھا۔

اسی دوران اس کے دیگر قریبی رشتے دار جو اُسے نغمی صاحب کے 'شکنجے' سے اُسے نکالنا چاہتے تھے، ایک ہفتے اپنے ہاں قیام کے بہانے اسے نغمی صاحب کے ہاں سے نکال لے آئے۔

شکیل کراچی آمد کے چند دن بعد اپنے والد کے دوست رئیس امروہوی سے ملاقات کے لیے برنس روڈ اور عید گاہ میدان کے سنگم پر واقع اخبار جنگ کے دفتر پہنچا۔ توقع کے مطابق رئیس امروہوی اُسے دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ کسی ہرکارے کے ہم راہ اُسے اپنے گھر بھیجا۔ کھارادر کے ایک تنگ فلیٹ میں اُن کی سکونت تھی۔ ساتھ والے فلیٹ میں ان کے چھوٹے بھائی جنگ کے مدیر اور فلسفی سیّد محمد تقی رہتے

تھے۔ دق زدہ جون ایلیا بھی شکیل کی کراچی آمد کے کوئی دس دن پہلے امروہے سے ہجرت کر کے یہاں آ کے بس گئے تھے۔ دونوں گھر بھرے پڑے تھے۔ رئیس صاحب کی بیگم اور پانچوں بیٹیوں نے والہانہ انداز میں شکیل کا استقبال کیا۔ بڑی دو بیٹیاں شکیل کے ساتھ مراد آباد میں کھیلا کرتی تھیں اب وہ بڑی ہو چکی تھیں۔ چہرے بدل گئے تھے لیکن شکیل سے وہ اپنے گھر کے کسی فرد، دوستوں اور بھائیوں کی طرح پیش آئیں۔ پھر تو اس گھر میں شکیل کا آنا جانا معمول ہو گیا۔

اُسے کراچی آئے کئی ہفتے ہو چلے تھے اور وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اس دوران اماں کے جذباتی خطوط نے شکیل کو گومگو کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دوری ویسے بھی رومان پیدا کر دیتی ہے۔ سو اُس کے دل میں اپنے شہر مراد آباد اور لوگوں کے لیے محبت عود کر آئی۔

وہ تین ماہ کراچی گزار کر وہ مراد آباد لوٹ گیا۔

مراد آباد میں ابتدائی چند روز تو سرشاری میں گزرے۔ بالآخر احساسِ زیاں فزوں تر ہوا۔ سب محنت، بغاوت اور کوشش رائگاں گئی تھی۔ تھوڑے دنوں بعد نانا نے پاس بلا کر مشورہ دیا کہ وہ اسے دکان کھول دیتے ہیں۔ ساتھ میں تسلی دی کہ ہر بڑا کاروبار شروع میں چھوٹا ہوتا ہے۔ نانا کے اِن الفاظ سے شکیل کو نوجوان نجومی کی باتیں سچی لگنے لگیں۔ اُسے لگا کہ اُس کی زندگی کس مپرسی میں گزرے گی اور ایک دن گم نامی میں غربت کی موت مر جائے گا۔

اِس دوران اُس کی زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔

ماموں کو دوبارہ کاروباری دورے پر ڈیڑھ سال کے لیے جنوبی ہند نکلنا تھا۔ انھیں ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ شکیل ان کی معاونت کے لیے ساتھ ہو لیا۔ اُس سفر نے اس میں ایک بشاشت پیدا کر دی۔ نئے نئے شہر دیکھے، حیدر آباد، بنگلور، مدارس وغیرہ۔ دیکھے، آرڈر بھی خلافِ توقع بہت ملے۔ حیدر آباد میں ابھی تک مسلمانوں کے دور کے اثرات باقی تھے، خاص قسم کی تہذیب پر اصرار تھا۔ پولیس ایکشن ہو چکا تھا لیکن نوابین کے آثار کسی قدر زندہ تھے، مخصوص عادات و اطوار، رسوم و رواج حیدر آباد کو ہندستان کے دوسرے علاقوں سے جدا کرتے تھے۔ پوری دنیا کے رواج کے برعکس وہاں باقاعدہ تین کھانے ہوتے ہیں اور ناشتے میں چاول کھائے جاتے ہیں۔ زیادہ قیام حیدر آباد دکن میں رہا۔ وہاں ایک رات مجید نامی دوست بازارِ حسن 'محبوب کی منہدی' میں لے گیا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

پھولوں کی پتیاں اور ہار، گجرے، نوٹوں کی تھدیاں، پان کی دکانیں، رات کو دن کا سماں، چہل پہل، روشنیاں اور رنگین چوبارے، تمباکو کا دھواں، نشے میں چُور اِک دوسرے پر گرتے جوان اور بوڑھے، زرق برق کپڑوں میں ملبوس اشارے کرتی لڑکیاں، مسکراتے شگفتہ زبان دلال، حسن کے بوجھ سے جھکی کمان سی کمر کو بل دیتی قیمتی دوشیزائیں، نظروں سے ملتی نظریں اور اشاروں میں کئی مراحل طے کر جاتی آنکھیں، رپٹتے قدم، لپٹتی جوانیاں، ہر قدم پر ایک مختلف دنیا سامنے تھی۔

ایک تنگ و تاریک زینے کے رستے کمرے میں جا کر دیکھا کہ محفلِ رقص برپا تھی۔ شکیل اور مجید کا خالص کاروباری انداز میں استقبال کیا گیا۔ شکیل سمٹ کر ایک کونے میں بیٹھا تو نائکہ نے طنز کیا ''فکر نہ کیجیے، آپ کو یہاں سے کوئی چرا نہ لے جائے گا۔''

مجید نے تعارف کرایا ''یہ پاکستان سے آئے ہیں۔''

اس سے محفل کا رنگ بدل گیا۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستان سے آنے والوں کو بے حد عزت سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں خوش حال تصور کیا جاتا تھا۔

سو حسین رقاصہ بولی ''زہے نصیب۔''

اُس رات شکیل کو شدت سے دوبارہ احساس ہوا کہ دنیا اُسی کی ہے جس کے پاس مال و زر ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسے پاکستان چلے

جانا چاہیے اور اپنی قسمت آزمانی چاہیے۔

بازارِ حسن کی اُس رات نے شکیل کی زندگی کا حتمی رخ متعین کر دیا۔ جنوبی ہندستان کے طویل سفر سے مراد آباد واپس آ کے وہ ایک بار پھر دلی چلا گیا اور وہاں سے ویزا لگوا کر کسی کو بتائے بغیر پاکستان چلا آیا، وہ پاکستان جو اس کا وطن ٹھہرنا تھا، جہاں اُسے عزت و رزق ملنا تھا اور اِن سب سے بڑھ کر محبت اور پہچان۔ وہ اپنے ساتھ چند خواب اور فقط چالیس روپے لایا تھا۔

اس مرتبہ اُس نے پہلے والی غلطی نہ کی اور سید ھا رئیس امروہوی صاحب کے دفتر ’’شیراز‘‘ میں جا پہنچا۔

یہاں سے اُس کی زندگی نے نیا رخ لیا اور ایک سیدھی عمودی شاہ راہ پر فراز کی جانب رواں ہو گئی۔ رئیس صاحب ایک مشہور آدمی تھے۔ ان کے دفتر میں شہر بلکہ پاکستان بھر کے ادیبوں شاعروں کا آنا جانا کثرت سے ہوتا تھا۔

ایک سہ پہر میں اور شکیل بھائی کراچی کے شیریٹن ہوٹل کی لابی میں کافی پیتے ہوئے عصر کی شفیق روشنی میں شیشے کے اُس پار پانی سے لبالب بھرے نیلے سوئمنگ پول میں نہاتے اور تیراکی کرتے انگریز سیاحوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے شفیق مربی ہونے کے علاوہ غم خوار و چارہ ساز بھی ہیں۔ سو اُس سہ پہر لابی میں کشور، لتا اور رفیع کے پرانے ہندوستانی گانے براہِ راست ایک خوش گلو فن کار سے سنتے ہوئے وہ ماضی میں کھو گئے۔

میں نے پوچھا کہ اُن کی زندگی کا پاکستان آنے کے علاوہ اہم ترین فیصلہ کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا ’’ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ۔ ملازم بھلے کتنا ہی خوش حال کیوں نہ ہو جائے، رہتا کولھو کا بیل اور دوسروں کا محتاج ہے۔ اس میں ایک حد سے بڑھنے کے مواقع نہیں ہوتے۔ اپنے کام میں خود مختاری ہوتی ہے، آدمی کسی کو جواب دہ بھی نہیں ہوتا اور ترقی کے لامحدود مواقع ہوتے ہیں۔ گویا اِنسان پیدا تو آزاد ہوتا ہے، مگر اپنے آپ کو خوشی سے ملازمت کی پابندیوں میں جکڑ دیتا ہے۔ اپنے کام میں آزادی ہوتی ہے، کھل کر سانس لیا جا سکتا ہے۔‘‘

اس کے بعد وہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے ’’میں نے زندگی میں ایک اور عملی سبق سیکھا۔ میں اُس اولاد کو نالائق اور نااہل سمجھتا ہوں جو کہتی ہے کہ اگر ہمارے والدین نے ہماری پرورش محبت اور خیال سے کی تو کون سا احسان کیا، یہ اُن کا فرض تھا۔ اسی طرح چند ناکام لوگ یہ الزام بھی دھرتے ہیں کہ اُن کے والدین اُن کی زندگی کی مناسب نقشہ نویسی نہیں کی۔ ان میں بیش تر لوگ قابلِ رحم حد تک ذہنی بیمار، ناکام اور حقیقت سے فرار اختیار کرنے والے ہوتے ہیں۔‘‘

شکیل بھائی نے ایک طویل فہرست ان لوگوں کی گنوائی جنھوں نے عملی زندگی کا آغاز یتیمی یا بے چارگی سے کیا، عروج حاصل کیا۔ بلکہ زیادہ تر عروج ایسے ہی لوگوں نے حاصل کیا۔ میں نے ان کی گفت گو کے دوران سامنے پرل کانٹینینٹل ہوٹل کی جانب اور دیگر کئی عمارات کو دیکھا اور سوچا کہ ان کے مالکان واقعی قطعی طور پر خود پرداختہ ہیں۔

داستان پھر سے زندگی کی پٹڑیوں پر دوڑنے لگتی ہے۔

نوجوان شکیل نے رئیس صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار روزنامہ ’’شیراز‘‘ کے دفتر میں قیام کر لیا۔ رئیس صاحب کے ذرائع آمدنی محدود تھے۔ ’جنگ‘ سے کچھ پیسے مل جاتے، شادی کے سہرے اور قطعۂ تاریخ وفات لکھوانے والے دس بیس روپے دے جاتے یا پھر شاعری میں اصلاح کروانے والے لوگ دو چار روپے نذر کر دیتے۔ شیراز تو مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ چناں چہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ دفتر میں چائے تک کے پیسے نہ ہوتے۔

’’شیراز‘‘ کو جو اشتہارات ملتے وہ درحقیقت رئیس صاحب کو ذاتی حیثیت میں ملتے۔ وہاں رئیس صاحب نے ’’شیراز‘‘ کے انتظامی اور ادارتی معاملات شکیل کے سپرد کر دیے۔ شکیل نے تعلیم جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اردو کالج میں شام کو کامرس کی

کلاسیں لینا شروع کر دیں۔

اخراجات پورے کرنے کے لیے بندر روڈ پر مرادآبادی برتنوں کی دکان پر روزانہ دو گھنٹے خط کتابت کی روزانہ اُجرت پہ ملازمت کرلی۔

وہاں دکان کا مالک عجیب و غریب صفات کا حامل تھا۔ دوپہر کو کھانا کھا کر جوٹھا کھانا اپنے انتہائی شریف اور وضع دار سیلز مین علیم صاحب کو دے دیا کرتا جو اسے چکھتے بھی نہ تھے۔ علیم صاحب کا دلی کے چاندنی چوک پر خاصا بڑا کاروبار تھا۔ اب ہجرت کے بعد انھیں کراچی میں نوکری کرنی پڑ رہی تھی۔ مکافاتِ زمانہ ہے کہ علیم صاحب کا بیٹا اقلیم علیم میٹرک میں پورے کراچی میں اول آیا، بعدازاں اس نے ''موت کے سوداگر،، بھی لکھی۔ جب کہ مالک کے بچے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

کراچی میں تعلیم کے دوران ہندی میڈیم سے اُردو میڈیم میں منتقل ہونے کی وجہ سے شکیل انٹر میں فیل ہو گیا۔ دکان کی ملازمت نے شکیل کے آیندہ ملازمت نہ کرنے کا ارادہ مزید پختہ کر دیا۔

ایک دن شکیل کو ایک ایسا خیال آیا جس نے ''شیراز''، رئیس امروہوی اور خود اُس کی اپنی کایا پلٹ دی۔ یہیں سے اُس کی مالی آسودگی کا سفر شروع ہوا۔

قصہ کچھ یوں ہے، شکیل نے اندازہ لگایا کہ ''شیراز'' کے خسارے میں رہنے کی وجہ اس کی روزانہ اشاعت ہے۔ چناں چہ اُس نے اُسے ڈمی پرچا بنا دیا، گویا اب وہ صرف اتوار کو باقاعدہ شائع ہوتا جب اس میں سارے اشتہارات بھی شائع کر دیے جاتے۔ یوں کاغذ، کتابت اور دیگر لوازمات کی مد میں خاصی بچت ہو جاتی۔ ''شیراز'' خسارے سے نکل کر تین سو روپے ماہانہ کے فائدے میں چلا گیا۔

شکیل نے منافع میں سے مناسب حصہ اماں کو الہٰ آباد بھیجنا شروع کر دیا۔

مگر ایک واقعے نے رئیس صاحب اور شکیل کے راستے جدا کر دیے۔

14 اگست یومِ آزادی کے لیے حبیب گروپ آف انڈسٹریز والے دو پورے صفحات کے اشتہارات اخبارات کو جاری کر رہے تھے۔ ''شیراز'' کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ یہ اشتہارات حاصل کر سکے۔ رئیس صاحب نے اپنی سی کوشش کی اور ناکام ہو گئے۔ شکیل نے انھیں ایک پیش کش کی کہ اگر وہ اشتہارات لے آئے تو اُس کا انعام کیا ہوگا۔ شکیل نے درخواست کی کہ وہ معاوضے کے نصف حصے کا مستحق ہوگا۔ رئیس صاحب نے نہ صرف فوراً ہامی بھر لی بلکہ اشتیاق کا بھی اظہار کیا۔

شکیل بھرپور ارادے سے میدان میں اُترا، کئی لوگوں کو بیچ میں ڈالا، اشتہارات والے صاحب کے دفتر کے باہر جا کر رات بھر جلے موی چراغ کی موم کی مانند جم گیا۔ نیتجتاً دونوں اشتہارات شیراز کو مل گئے۔ رئیس صاحب بے حد خوش ہوئے۔ ''بھئی کمال کر دیا۔'' وہ بولے۔

شکیل نے حسبِ وعدہ انعام طلب کیا۔

''ہائیں! کیسا انعام؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔،، رئیس امروہوی کے ٹکے سے جواب نے شکیل کی سٹی گم کر دی۔ پس تبھی اُس نے ''شیراز'' چھوڑ دیا۔

وہ روٹھا ضرور تھا، جھگڑا نہ کیا تھا۔ تعلق گھریلو نوعیت کا تھا، سو ہلکی ناراضی تک رہا۔

اب کہانی کے اندر جون اصغر داخل ہوتے ہیں، جو بعد میں جون ایلیا کے نام سے معروف ہوئے۔

محمد شکیل نامی نوجوان اب شکیل عادل زادہ کے نام سے ایک پختہ کار منجھے ہوئے ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

1957 کا سال تھا، آئی آئی چندریگر، حسین شہید سہروردی کی جگہ وزیراعظم بنے، اور چھپن روز بعد فیروز خان نون نے اُن کی جگہ لے لی تھی۔ پاکستان سیاسی ہیجان سے گزر رہا تھا۔ جون ایلیا پاکستان آ چکے تھے۔ ان کے استحکام کے لیے ''انشا'' نامی پرچہ نکالا گیا۔ رئیس

امروہوی، سید محمد تقی اور جون ایلیا تینوں بھائی اپنا علیحدہ مقام رکھتے تھے سو وہ کمشنر کراچی الطاف گوہر سے ملے اور اُسی ملاقات میں 'انشا' کا ڈیکلریشن لے کر لوٹے۔

جون ایلیا جو تب تک شکیل سے خاصے قریب ہو چکے تھے، نے انھیں شعبۂ اشتہارات سنبھالنے کی درخواست کی۔ 'انشا' میں شکیل نے ''داستاں شہرِ زرنگار کی'' کے عنوان سے کراچی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں پر لکھنا شروع کیا۔ جون صاحب اُردو، فارسی، عربی، عبرانی اور سنسکرت پر دست رس رکھتے تھے۔ گرامر اور منطق اُن کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ سو انھوں نے شکیل صاحب کی لسانی تربیت کی۔

جوانی کا زمانہ تھا، شوخیِ طبع نے آمادہ کیا کہ وہ طنز و مزاح سے آراستہ تحریریں لکھیں۔ انھوں نے یہ تحریریں بہت جلد لکھنا چھوڑ دیں۔

اس کی وجہ دو واقعات بنے۔

پہلا واقعہ کچھ یوں ہے کہ کراچی کی ادبی سرگرمیوں کو رپورٹ اور ان پر تبصرہ کرتے وہ انجمنِ ترقیِ اُردو کے مدار المہام ثانی پر ایک کٹیلا تبصرہ کر بیٹھے۔ وہ صاحب ایک مرنجاں مرنج شخص تھے۔ رنجیدہ ہو کر چپ ہو گئے اور شکیل سے باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ یہ ناراضی بہت دیر تک چلی۔ وہ صاحب معروف مزاح و تبصرہ نگار مشفق خواجہ تھے۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ شکیل کے ایک بینکار واقف کار مسلم کمرشل بینک میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ وہ صاحب ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور لکھتے بھی تھے۔ تاہم تب تک اُن کی کوئی کتاب شائع نہ ہوئی تھی۔ شکیل صاحب ہر ماہ انشا کا تازہ شمارہ لے کے اُن کے پاس جاتے تھے۔ شکیل صاحب کے پہلے بینک اکاؤنٹ پر بھی اُن صاحب نے بہ طور گواہ دست خط کیے تھے۔ اُس زمانے کی ایک صبح جب ابھی آئی آئی چندریگر روڈ پر ہنگامہ خیز ٹریفک کا اژدحام نہ ہوتا تھا، اُن بینکار نے شکیل صاحب کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ایک نصیحت کی۔

''میاں! ایک بات گرہ سے باندھ لیں تو بہتر ہوگا، دل آزاری قلم کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔''

شکیل صاحب نے وہ بات ایسی گرہ سے باندھی کہ آج بھی اُن کے پیشِ نظر ہے۔ اُن بینکار کا نام مشتاق احمد یوسفی تھا۔

''انشا' میں شکیل نے کرنل میڈاس ٹیلر کی کتاب "The confessions of a thug" کا ترجمہ ''امیر علی ٹھگ کی سرگزشت'' کے نام سے شروع کیا۔

اِدھر کراچی میں شکیل نے ترجمہ سلسلہ وار تحریر کرنا شروع کیا، اُدھر دُور پار کے ایک شہر میں ایک دل کش خاتون نے وہ ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

وہ خاتون بمبئی کی معروف اداکارہ مینا کماری تھی۔

یوں اُن جانے میں تعلق کی کڑیاں ملنے لگیں۔ قدرت کو اِن کی ملاقات منظور تھی، سو رستہ ہموار کرنا شروع کیا۔

سن 1960 تھا، دنیا بھر میں معاشرتی، ثقافتی اور ادبی تحریکیں نئے رنگ میں شروع ہو رہی تھیں۔ اس دہائی کو 'طلائی دہائی' کا نام دیا جاتا تھا، مغرب میں ہپی اور انسانی آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں، فلمی دنیا نئے زاویوں سے روشناس ہو رہی تھی اور پاکستان میں نواب محسن الملک کے نواسے، شعلہ بار، مقرر کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل حسین ناصر کو شاہی قلعے میں ایذائیں دی جا رہی تھیں۔ وہ پسے طبقات کا بے لوث رہنما بن کر اپنے نوابی چوغ کو اُتار پھینک چکا تھا۔ اُسے نومبر 1960 میں شدید تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا۔ عوامی غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اُس کی لاش کو قبر سے نکال کر کہیں اور دفنا دیا گیا تھا۔ غرضیکہ پورے کرّے پر ایک جوش و ولولے کا عالم تھا۔ ایسے میں تین افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ پاکستان سے ہندوستان کی جانب رواں دواں تھا۔ اُس قافلے میں رئیس صاحب کی بیگم، باجی امی، بیٹی خضران (بیبا) اور اُن کے نگران کی حیثیت سے شکیل تھے۔ وہ ابھی بائیس برس اور چند ماہ کے تھے۔ مراد آباد سے ہو کر امروہے اور پھر بمبئی جانا تھا۔ بمبئی میں ان سب کا قیام رئیس صاحب کے چچازاد کمال امروہوی کے ہاں تھا۔ کمال امروہوی ہندوستانی سینما کی معروف شخصیت، فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔

سکندر، پکار اور اُس وقت دھوم مچانے والی فلم ’’محل‘‘ کی کام یابی کے بعد اُن کا شمار چوٹی کی فلمی شخصیات میں ہوتا تھا۔ کمال صاحب اپنی پہلی بیوی فردوس، بچوں، رخسار، شان دار اور تاج دار سے ہٹ کر دوسری بیوی، شہرۂ آفاق اداکارہ مینا کماری کے ساتھ باندرہ میں اوسط درجے کی کوٹھی کی بالائی منزل میں رہتے تھے۔

شکیل بھائی گھونٹ گھونٹ داستان سنا رہے تھے۔ وہ بات تو مجھ سے کر رہے تھے، دیکھ کہیں اور رہے تھے۔ ان آنکھوں میں وہی چمک تھی جو بیس بائیس برس کے لڑکے کی نظروں میں ہوتی ہے۔

گھر میں مکمل خاموشی تھی، ان کی بیڑی بھی جل کر راکھ ہو چکی تھی اور کمرے میں اُن کی دھیمی آواز ہلکی گونج پیدا کر رہی تھی۔ ہم اپنی ملاقاتوں میں کمرے کی بتیاں بجھا کر صرف فلور لیمپ جلے رہنے دیتے ہیں۔ یوں ایک پرسکون اور خواب آور ماحول میں یک سوئی آ جاتی ہے۔ میں انھیں محبت سے دیکھتا ہوں اور وہ متانت سے بولتے ہیں، ماضی کی باتیں، آج کے حالات، مستقبل کے ارادے، ادب کی باتیں، ادیبوں کے قصے، زنبیلِ حیات سے واقعات اور باتیں یوں نکلتی چلی آتی ہیں جیسے جادوگر کی ٹوپی سے کبوتر، طوطے۔

’’مینا جی دل کش شکل و صورت اور نکھری سُرمہ آمیز بادامی رنگت کی خاتون تھیں۔ جب میں نے اُنھیں پہلی مرتبہ دیکھا تو اُن کے چہرے پر مقناطیسی جاذبیت تھی، ایک تابانی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ وہ جسم کے آر پار ہونے والی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اکثر اُن کی آنکھیں گہری سوچ میں نظر آتیں۔ میں کل کا لونڈا تھا اور وہ معروف ہیروئن سو ایک گلیمر بھی مجھے اُن کی شخصیت سے مسحور کرتا تھا۔‘‘

’’اُن کا گھر کیسا تھا؟‘‘ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

’’میں نے دیکھا ہے کہ بعض سادہ سے لوگ گھروں کی خوب زینت و زیبائش کرتے ہیں جب کہ خوب چمک دمک والے لوگ گھروں کو سادہ رکھتے ہیں۔ ان کے گھر جا کر مجھے حیرت ہوئی، عام سا گھر اور سادہ سا سامان۔ گھر بھی خاص وسیع نہ تھا، بس چار کمرے اور وسط میں دیوان خانہ (انگریزی میں ڈرائنگ روم، وِدڈرائنگ روم (گوشۂ خلوت) کا مخفف ہے) باورچی خانہ وغیرہ۔ ساز و سامان بھی سادہ اور عام سا تھا۔ اُس گھر میں کمال صاحب کے فلم سے وابستہ دو نوجوان رشتے دار بھی رہتے تھے۔ مینا جی نے ہم سب کا بہت محبت سے استقبال کیا۔ اُن سے ہماری زیادہ ملاقات کھانے کے دوران ہوتی یا پھر ناشتے کے بعد ہمارے ساتھ کچھ وقت گزارتیں۔ میں ایک احتیاط خاص کرتا، اُن کے ساتھ فلموں پر کم سے کم بات کرتا۔ وگرنہ میری شیفتگی اُن پر گراں گزرتی اور وہ مجھے ایک رشتے دار سے ہٹ کر فلم بین کے طور پر دیکھ کر تکلف بیچ میں لے آتیں۔ انھیں شاعری سے شغف تھا، نازؔ تخلص کرتی تھیں، سو اپنی بساط کے مطابق میں زیادہ ادب و شاعری کی باتیں کیا کرتا۔ یہ باتیں انھیں خوب دل چسپ لگتیں اور وہ ان میں کھو جاتیں۔ ایک روز وہ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ مجھے ادب کا ایسا شوق کیوں کر ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں اسے پیشے کے طور پر اختیار کر چکا ہوں تو وہ خاصی متاثر ہوئیں۔ جب میں نے انھیں امیر علی ٹھگ کی ’انشا‘ میں شائع ہونے والی آپ بیتی کا بتایا تو انھیں یقین نہ آیا۔ انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور دوبارہ پوچھا کہ کیا ایسی رواں تحریر میری ہی ترجمہ کی ہوئی ہے۔ وہ اُسے باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ میرے اثبات پر، تکلف کی معمولی سی پردہ داری بھی ہٹ گئی۔ اب وہ خوب جم کر مجھ سے گپ لگانے لگیں۔‘‘

’’آپ نے اُن سے کبھی بھی فلمی زندگی کا نہیں پوچھا؟‘‘ میں نے استفسار کیا تو بولے۔

’’میں ان کی فلمی زندگی کا ذکر قطعی طور پر نہ کرتا، تو وہ سمجھتیں کہ میں جانتے بوجھتے ایسا کر رہا ہوں۔ سو میں نے ایک بار اُن سے پوچھا کہ انھیں فلمی دنیا کیسی لگتی ہے تو انھوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ شروع میں تو اچھی لگتی تھی، بعد میں قید کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اُن سے ستائش بھرے لہجے میں کہا کہ اُن کے پاس عزت، دولت، شہرت سبھی کچھ ہے۔ یہ سن کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ گھر میں اداکاری نہیں کرتی تھیں، اُس روز انھوں نے اس میں کمالِ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر لی تھی۔‘‘

’’اُن کی زندگی کے ایسے گوشے جو کم ہی لوگوں کو معلوم ہوں، کیوں کہ آپ تو ان کے گھر دو ہفتے کے لیے مہمان تھے؟‘‘ میرے

سوال پر شکیل بھائی نے کچھ دیر سوچا اور بتانے لگے۔

''ہاں، وہ روز قرآن پاک کا ایک سپارہ ختم کرتی تھیں۔ میں نے تو نہ دیکھا، گھریلو ملازم بتاتے تھے۔ دوسرے، ایک عورت روز ان کے بدن کی مالش کرنے آتی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ نہا دھو کر کھلے بالوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آتیں تو بہت اجلی نکھری ہلکی پھلکی نظر آتی تھیں۔ دو واقعات کا تذکرہ ان کی شخصیت کو اور کھول کر بیان کر دے گا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''ایک روز ہم سب نے فلم پر جانے کا ارادہ کیا۔ کمال صاحب اور میناجی بھی ساتھ تھے۔ ہم نے دانستہ دیر سے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اندھیرے میں انھیں کوئی پہچان نہ سکے۔ احتیاطاً میناجی نے برقع بھی اوڑھ لیا۔ فلم کے وقفے میں کمال صاحب کی وجہ سے لوگوں نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ ہمارے اِرد گرد منڈلانے لگے۔ کمال صاحب نے یہ دیکھ کر فلم ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ لوگ بھی تاک میں تھے۔ بس وہ ہلڑبازی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ لوگوں نے ایسے ایسے بے ہودہ جملے کسے، گالیاں دیں اور فحش اشارے کیے کہ میرے تو کانوں کی لوویں سرخ ہوگئیں۔ ہم بھاگ کر گاڑیوں میں بیٹھے اور گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر تذلیل کے احساس سے میرا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میناجی یوں اطمینان سے بیٹھی تھیں جیسے اُنھیں اس کی عادت ہو۔''

''دوسرا واقعہ کچھ یوں ہے۔'' شکیل بھائی نے مزے لیتے ہوئے سنانا شروع کیا۔

''ہماری کبھی رات کو، کبھی تاش کی بازی لگتی۔ ایک رات دو ٹیمیں بن گئیں۔ ایک ٹیم میں کمال صاحب اور میناجی، جب کہ دوسری میں مَیں اور کمال صاحب کے بھانجے بھائی شانے تھے۔ سب کو توقع تھی کہ میرے اناڑی پن کی وجہ سے ہماری ٹیم ہار جائے گی۔

کمال صاحب نے تجویز کیا کہ ہارنے والی ٹیم جیتنے والی ٹیم کے پیر پکڑ کر ندامت کا اظہار کرے گی۔

ہم نے احتجاج کیا لیکن کمال صاحب نہ مانے۔

بازی بڑھی تو حسبِ توقع ہم ہارنے لگے۔ آہستہ آہستہ مخالف ٹیم کی کچھ تھک کر اور کچھ بوریت سے دل چسپی گھٹنے لگی۔ میرے پاس بھی چند اچھے پتے آگئے اور ہاتھ رواں ہوگیا۔ بالآخر ہم جیت گئے۔ جب ہمارے پاؤں چھونے کی باری آئی تو ہم نے انھیں معاف کر دیا۔ انھوں نے معافی کی پیش کش رد کر دی اور حکم دیا کہ ہم اپنے پیر آگے بڑھائیں۔ جب میں نے اپنے پیر آگے بڑھائے تو میناجی نے میرے پیر چھوئے اور بولیں ''ہم ہار گئے بھئی تم جیتے'' یہ کہہ کر وہ خلافِ عادت، کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ اُن کے اور کمال صاحب کے درمیان ایک رسمی اور تکلف کا تعلق تھا۔ اُس روز ان کی ہنسی میں نے پہلی مرتبہ سنی تو یوں لگا جیسے گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں اور مکان میں گھر کی فضا بن گئی ہو۔ اُن کی ہنسی میرے لیے سب سے بڑا انعام تھی۔''

''یوں آپ کے دن وہاں خوب گزرے'' میں نے وہاں کے قیام کو سمیٹتے ہوئے جملہ بولا تو شکیل بھائی چونک گئے۔

''اصل بات تو ابھی رہتی ہے۔ ایک رات کمال صاحب اور گھر کے دیگر افراد کہیں مدعو تھے۔ میناجی اور میں گھر پر تھے۔ ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا، چائے پی اور خوش گپیاں کیں اور میں باجی امی اور بیبا کے ساتھ کمرے میں آن لیٹا جو آتے ہی سو گئیں۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی سو رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اسے نیم وا کیا گیا۔ میں نے دیکھا تو میناجی تھیں۔ یک دم میں اُٹھا اور لپکا ''آیئے آیئے''۔

''سو تو نہیں گئے تھے، میں نے تمھیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' انھوں نے آہستگی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں میں تو جاگ رہا تھا اور رسالے پڑھ رہا تھا'' میں نے جواب دیا۔

''وہ بولیں کہ انھیں نیند نہیں آرہی تھی، سو باتیں کرنے کو جی چاہا۔ میں اُن کے پیچھے چلتا ہوا حسبِ معمول ڈرائنگ روم میں آگیا۔

وہ وہاں رکی نہیں اور اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئیں۔ اب تک قریباً نصف ماہ میں میں نے پورا گھر دیکھ لیا تھا۔ ان کا کمرا نہ دیکھا تھا۔ وہ کمرا گھر بھر میں سب سے مرصع تھا۔ قیمتی سامان، ریشمی پردے، ریشمی چادر، قیمتی صوفہ اور سنگھار میز کے بلب سے پھوٹتی خواب آگیں روشنی۔ میں نے اُن کی طبیعت کا پوچھا تو وہ بولیں کہ اُن کا سر بھاری ہو رہا ہے۔ میں نے پیش کش کی کہ میں سر دبا دیتا ہوں۔''

''مجھے سر دباتے ہوئے آیتیں پڑھ کر درد کاٹنا آتا ہے۔'' میں نے یقین سے کہا تو میری بے ساختگی اور معصومیت پر وہ کھلکھلا پڑیں۔

''وہ کیسے؟'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں فوراً صوفے کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اُن کی پیشانی پر انگلیاں رکھ کر انگوٹھے کن پٹی سے لاتے ہوئے اُن سے ملا دیں۔ یوں میں اُن کا سر دبانے لگا۔ اُن کے سیاہ گھنے بال کھلے تھے اور خوشبو اٹھ رہی تھی۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ اُن کی جلد خاصی چست تھی۔ میں آیتیں بھی پڑھ کر پھونکنے لگا۔ اُن پر لطف وخمار طاری ہونے لگا۔ خاصی دیر تک سر دبا کر میں ہٹا تو وہ نیم سرور میں بولیں۔

''سر سے ایک بوجھ ہٹا محسوس ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں بمبئی رک کیوں نہیں جاتا۔ میں نے مختلف بہانے کیے۔ وہ ایک نہ مانیں اور کہنے لگیں کہ تعلیم اور روزگار کے مواقع تو بمبئی میں بھی خاصے میسر ہیں۔ جب بات آگے بڑھی تو میں نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا کہ مجھے فلمی دنیا اچھی لگتی ہے۔

وہ زہر خند لہجے میں بولیں۔ ''یہ دنیا! سارا فریب ہے، دکھاوا ہے۔ یہاں کچھ نہیں رکھا۔''

جب میں نے بہانہ کیا کہ پاکستان میں میرے رہنے کا مناسب انتظام ہونے لگا ہے تو انھوں نے بات کاٹ دی۔

''یہاں بھی سارا انتظام ہو سکتا ہے۔ پھر میں بھی تو یہیں ہوں۔ اطمینان رکھو، تمھارا خیال رکھا جائے گا۔''

''آپ؟'' میں نے حیرت سے کہا تو وہ سادگی اور رازداری سے بولیں۔

''کوئی بوجھ نہ ہوگا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔''

مجھے متذبذب دیکھ کر انھوں نے اضافہ کیا۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر تم کسی قابل ہو جاؤ، جو چاہتے ہو وہ بن جاؤ۔'' اتنے میں گاڑی کے ہارن نے کمال صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو کمال صاحب نے ہم دونوں کو جاگتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

''ہم دونوں دنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔'' وہ بولیں۔

رات کو میں کم ہی سو پایا۔

صبح ناشتے کے وقت مجھے باورچی نے کہا کہ بیگم صاحبہ مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں الجھے خیالات کے ساتھ پچھلی بالکونی پر پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھیں۔ انھوں نے نیلے رنگ کا ایک لفافہ مجھے تھمایا۔

''مجھے آج جلدی جانا ہے اور رات کو واپسی میں دیر ہو سکتی ہے۔ تم یہ رکھ لو، یہ تمھارے لیے ہے۔''

جب میں نے انکار کیا تو انھوں نے زبردستی مجھے وہ لفافہ تھما دیا اور وہاں سے چلی گئیں۔

بعد میں میں نے اُس رات اور اگلی صبح وہ لفافہ انھیں لوٹانے کی خاصی کوشش کی لیکن تنہائی میسر نہ آئی۔''

''اُس لفافے میں کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک ہزار روپے کی رقم۔ سو سو روپے کے دس نوٹ۔ یہ اُس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔'' شکیل بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں اُنھیں باہر تک رخصت کرنے آیا تو ایک سوال میرے ہونٹوں پر مچل رہا تھا۔

”کیا آپ کا بعد میں مینا کماری سے رابطہ رہا؟“

”ہمیں رخصت کرتے وقت اُن کی آنکھیں نمی سے جھلملا رہی تھیں۔ کراچی آنے کے بعد ہمارا چند خطوط کی حد تک رابطہ رہا، وہ بھی ٹوٹ گیا۔“

شکیل بھائی کو رخصت کر کے میں مینا کماری کا سوچتا رہا۔ وہی مینا کماری جو کمال امروہوی سے علیحدگی کے بعد بسیار نوشی کے باعث جگر کے عارضے میں مبتلا ہو کر جوانی میں فوت ہو گئی تھیں۔ البتہ اُن کی شخصیت کا ایک معما میرے لیے ہنوز تشنہ تعبیر ہے۔ اُن کا ہمیشہ اپنے سے چھوٹی عمر کے جوان مردوں کی جانب رومانوی اور دیگر معاملات میں جھکاؤ رہا جن میں سے اداکار دھرمیندر سے اُن کا رومانوی، گل زار سے محبت بھرا تعلق منظرِ عام پر آیا۔

کمال امروہوی کی بھی اِس معاملے میں ایک کہانی، ایک نقطۂ نظر ہو گا۔

اُسے سنانے کو اُس رات کوئی موجود نہ تھا۔

کراچی واپسی پر شکیل، جون ایلیا کے ساتھ ”انشا“ پر کام میں جت گئے۔

جون صاحب اپنے مزاج کے آدمی تھے، زیادہ تر الگ تھلگ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ایک اسماعیلی تحقیقی ادارے میں جز وقتی ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ وہ لفظ کے معاملے میں بے حد محتاط اور حساس تھے۔ وہ اور شکیل صاحب ”شیراز“ کے دفتر ہی میں رہا کرتے تھے۔ شام میں وہاں خوب مجلسیں جمتیں۔ جون صاحب کے دوستوں میں محمد علی صدیقی، سحر انصاری اور دیگر دوست آتے تو رئیس صاحب کے شاگردوں کی قطار لگی ہوتی۔ جون صاحب کڑھا کرتے کہ رئیس صاحب نے شاگرد پالے ہوئے ہیں ”یہ شاگرد تخلیقی آدمی کا وقت ضائع کرتے ہیں،“ وہ اکثر کہتے۔

بہر حال انھی شاگردوں میں سے بعض نے بعد میں خاصا نام پیدا کیا اور جون صاحب کے قریبی رفقا میں شمار ہوئے۔

اگلے برس تک شکیل صاحب کا نام ”انشا“ پر مرتب کی حیثیت سے آنے لگا۔ ان کی دوستی جمیل صدیقی اور حسن ہاشمی سے ہوئی۔ اُسی دور میں جمیل صدیقی، باشرع ایسے کہ رمضان کے بعد بھی چھے روزے رکھتے اور خوش خوراک ایسے کہ نہاری، گولا کباب، شیرمال، پائے، قورمہ، شب دیگ اور تافتان کے عاشق۔

حسن ہاشمی بلا کے ذہین و نکتہ رس۔ ”بازی گر“ کی پہلی قسط بھی انھی نے لکھی تھی جسے شکیل صاحب نے دوبارہ لکھا۔

انشا کے دور میں ایک رومانوی واقعہ پیش آیا۔ شکیل بھائی آج تک اُس پر نادم ہیں۔

مرادآباد میں ان کے دور کے رشتے داروں میں ایک لڑکی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس زمانے میں شاذ و نادر ہی مسلم خواتین اعلیٰ تعلیم حاصل کر پاتی تھیں۔ شکیل صاحب نے اُسے بچپن میں دیکھا تھا اور اُس سے قربت کی خواہش لیے پاکستان آ گئے لیکن اُس کی ترقی کی خبریں انھیں لڑکی کے کراچی میں موجود رشتے داروں سے ملتی رہتی تھیں۔ تعلیم کے بعد وہ معلّمہ ہو گئی تھی اور شادی یوں نہیں ہو پائی کہ اس کے مرتبے کا لڑکا ملنا مشکل تھا۔ کچھ ثقہ قسم کے رشتے دار لڑکی کی اعلیٰ تعلیم پر معترض تھے اور یقیناً انگلیاں بھی اٹھاتے تھے۔ بہر حال شکیل صاحب جانے کیوں اُسے سر کرنا چاہتے تھے۔ آخر انھیں ایک ترکیب سوجھی ’انشا‘ عالمی ڈائجسٹ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ انھوں نے پہلے عالمی ڈائجسٹ کے چند شمارے بذریعہ ڈاک روانہ کیے۔ شکریے کا خط موصول ہونے کے بعد انھیں جیسے راستہ مل گیا۔ انھوں نے اسے خط لکھا اور عالمی ڈائجسٹ میں لکھنے کی دعوت دی۔ خاصا عرصہ گزر گیا، کوئی جواب نہ آیا۔

بالآخر ایک روز اُس کا خط آ گیا۔ اُس نے پوچھا کہ وہ کیا لکھے۔ شکیل صاحب نے اس کے جمالِ خط کو سراہا۔ نتیجتاً خط و کتابت چل نکلی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کثرت سے خطوط کا تبادلہ ہونے لگا۔

وہ لڑکی ذوق وشوق میں خوب آگے بڑھ گئی۔ بس اتنی دیر رہ گئی کہ شکیل صاحب شادی کی پیش کش کریں اور جواب لازماً مثبت ہی آئے۔ شکیل صاحب کو اُس سے جذباتی وابستگی ہو گئی تھی مگر یہ افلاطونی قسم کی کوئی بات نہ تھی۔ انھوں نے سنا تھا کہ وہ لڑکی اپنی دنیا میں مگن رہتی ہے۔ لوگوں سے کم ملتی جلتی ہے۔ ایک نخوت اس میں بے پناہ ہے۔ ایک بار انھوں نے پوری کاپی بھر کے خط لکھا۔ وہ بھی لمبے لمبے خطوط لکھنے لگی تھی۔ شکیل صاحب نے اُسے پوری طرح اسیر کر لیا تھا۔ اس سے جذباتی وابستگی ہو گئی تھی مگر افلاطونی عشق نہ تھا۔

دو تین برس یہ معاملہ چلا۔ اس دوران 1965 کی جنگ ہوئی۔ ترسیل ڈاک میں تعطل کی وجہ سے اکٹھے درجنوں خطوط ملتے۔ شکیل صاحب آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ ترکِ تعلق ہو گیا۔ شکیل بھائی اُس لڑکی کے جذبات کو اِس حد تک بڑھانے پر اب تک افسردہ ہیں۔ دس پندرہ سال بعد لڑکی کے انتقال کی خبر سے شکیل بھائی گہرے صدمے سے دوچار ہوئے۔ اس ذکر پہ کوئی خلش اُن کے چہرے اور لہجے سے صاف عیاں تھی۔

‘انشا’ کی اشاعت تمام تر توجہ کے باوجود ساڑھے بارہ سو سے بڑھ نہیں پا رہی تھی۔ ایسے میں معروف ڈائجسٹ “ریڈرز ڈائجسٹ” کے سائز کے مطابق پاکستان میں “اردو ڈائجسٹ” نکالا گیا۔ جلد ہی اُس نے شہرت پالی۔ اس کی حیران کن کامیابی دیکھ کے ‘انشا’ کو “انشا عالمی ڈائجسٹ” کے نام سے نکالا گیا۔ اِدھر یہ نکلا اُدھر لاہور سے “سیارہ ڈائجسٹ” نکلا۔ ان ڈائجسٹوں نے ایک ایسا معیار قارئین کو پیش کیا جو خاص و عام میں مقبول ہوا۔

ایسے میں دو بدل کر دینے والی باتیں درپیش ہوئیں۔

پہلی تو یہ کہ “انشا عالمی ڈائجسٹ” بننے سے اس کی اشاعت بڑھ کر چار ہزار ہو گئی مگر اس سے بڑھ نہیں پا رہی تھی۔ سبھی کوشش کر رہے تھے کہ کسی طور اس کی اشاعت بڑھے لیکن وہ ایک ہی جگہ ٹک گئی تھی۔ اردو ڈائجسٹ کی مقبولیت اور اشاعت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

دوسری یہ کہ جون صاحب مزاجاً خالص ادیب اور شاعر تھے۔ وہ سخت بددل اور بیزار ہو گئے۔ ان کی دل چسپی بھی کم ہو گئی۔ اس وقت ڈائجسٹوں کی اشاعت تو ماہ بہ ماہ بڑھ رہی تھی لیکن اُنھیں ادب کے نچلے خانے میں رکھا جاتا تھا۔ جون صاحب بھی ڈائجسٹوں کے بارے میں اس تاثر سے خود کو بری الذمہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی دل چسپی بہ تدریج کم ہوتی گئی اور شکیل صاحب ہی بیش تر ادارتی کام کرنے لگے تھے۔

اب تک شکیل صاحب عمرانیات اور سیاسیات میں ایم اے کر چکے تھے۔

ایک مرتبہ وہ کسی بات پر روٹھ کر چلے گئے، اور رئیس صاحب کے معذرت نامے کے باعث واپس آ گئے۔ آہستہ آہستہ عالمی ڈائجسٹ کی اشاعت بڑھنے لگی۔

ایک روز مشہور ناقد جون صاحب کے ہم وطن اور دوست مرحوم محمد علی صدیقی نے شکیل صاحب کو رات گئے کام میں مصروف دیکھ کر رسالے میں اپنے باقاعدہ حصے کی صلاح دی۔

شکیل اپنے آپ کو رئیس امروہوی گھرانے کا حصہ سمجھتے تھے۔ جب مشورہ دیا گیا کہ اس تصور کو کاغذی شکل بھی دے دی جائے تو گھر کے بڑوں نے ہامی بھر لی اور صدیقی صاحب کو اپنی جانب سے بات کرنے کا اختیار دے دیا۔

چند دنوں بعد صدیقی صاحب کی جانب سے مایوس کن پیغام آیا کہ عالمی ڈائجسٹ میں تو رئیس صاحب، تقی صاحب اور ان کی اولادوں کا بھی حصہ ہے۔ سو برابر کی بات ممکن نہیں۔

بس تبھی تشکیل صاحب نے اپنا رسالہ نکالنے کی ٹھان لی اور ایک نہایت مختصر خط کے ذریعے عالمی ڈائجسٹ سے علیحدگی کا پیغام دے دیا۔

شکیل صاحب کے پاس ڈیڑھ ہزار روپے کا سرمایہ، اچھی ساکھ، چند دوست اور مضبوط ارادے تھے۔ چند دوستوں کو اکٹھا کیا اور سب رنگ پر کام شروع کر دیا۔

یہ جنوری 1970 کا واقعہ ہے کہ ''سب رنگ'' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ شروع کے تین شمارے پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئے، پہلے دو شمارے ساڑھے تین ہزار فی شمارہ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ تیسرا شمارہ پورے کا پورا بک گیا۔

ان کے جانے کے بعد عالمی ڈائجسٹ میں زاہدہ حنا نے کام سنبھال لیا۔ اُن کی اور جون ایلیا کی شادی طے ہو چکی تھی۔

اِدھر 'سب رنگ' نے اپنا انداز بدلا اور بہزاد لکھنوی کی طرز پر پُراسرار کہانیوں کے سلسلے شروع کیے ''سونا گھاٹ کا پجاری''، ''انکا'' وغیرہ۔ ''عالمی ڈائجسٹ'' کے عمدہ لکھنے والوں کو دگنے معاوضے کی پیش کش کی گئی۔ کچھ نئے لکھنے والے بھی تلاش کیے گئے۔ لے آؤٹ، اسکیچز، طباعت میں نفاست پر خاص توجہ دی گئی۔ یوں پہلے برس میں اس کی اشاعت بیس ہزار کو چھو گئی جو ایک ریکارڈ تھا۔

''سب رنگ'' نے ایک خاص معیار مقرر کر دیا جس سے کم کی تحریر، بھلے اہم ادیب ہی کیوں نہ ہو، قبول نہ کی جاتی۔

ایک مرتبہ تو معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ کرشن چندر کی ایک تحریر بھی لوٹا دی گئی۔

''سب رنگ'' کے حوالے سے ایک بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ اسے گھر کے تمام افراد پڑھ سکیں۔ سنسنی خیزی، فحاشی اور جرائم سے حتی المقدور اجتناب کیا جاتا۔ فکشن میں بھی ایک خاص بین الاقوامی معیار کو مدِ نظر رکھا جاتا۔ چناں چہ اسے معیار کی علامت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس میں سلسلے وار کہانیاں بھی بے حد مقبول ہو گئیں۔ انھی دنوں حسن ہاشمی نے ''بازی گر'' کی پہلی قسط جو سولہ سترہ صفحات پر مشتمل تھی لکھی۔ شکیل صاحب نے اُسے دوبارہ تحریر کیا اور اس سلسلے کو بہت دل جمعی سے آگے بڑھاتے رہے۔ انوار صدیقی کے ساتھ نئی قسط کی مہینے کی تیرہ تاریخ کو منصوبہ بندی کی جاتی۔ ایک دفعہ تو شکیل صاحب بائیس تئیس روز تک شب و روز کام کرتے رہے، دفتر ہی میں سو جاتے، گھر تک نہ گئے۔

انھوں نے ایک نیا نسخہ آزمایا۔ کرشن چندر کے چند افسانے شائع کیے تھے، ان کا معاوضہ دبئی کے ایک دوست کی وساطت سے انھیں بھجوایا۔ وہ بہت پُرمسرت حیرت میں مبتلا ہوئے۔ یوں کرشن چندر سے ایک ذاتی تعلق کی داغ بیل ڈلی۔

بعد ازاں کرشن چندر کی بیوہ سلمٰی نے شکیل صاحب کو وہ قلم بھی تحفتاً دیا جس سے وہ اپنے فن پارے تحریر کیا کرتے تھے۔ وہ قلم شکیل صاحب کو بہت عزیز رہا۔

ہندستان کے ایک دورے میں انھوں نے عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قراۃ العین حیدر سے 'سب رنگ' میں لکھنے کی درخواست کی۔ پاکستان میں وہ شوکت صدیقی، اسد محمد خان کو تو سب رنگ کی جانب لے آئے، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد اور دوسرے نام ور لکھنے والوں کو بھی اس جانب راغب کیا۔ چناں چہ سب رنگ ایک لحاظ سے ہندوستان کا، ادب کا اعلیٰ ترین ترجمان رسالہ بن گیا۔ جنھیں 'ڈائجسٹ' کے لفظ سے کد تھی، اُن لوگوں نے اس رسالے کو تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے دیکھ کر اُنگلیاں دانتوں میں داب لیں۔

شکیل صاحب نے جاسوسی دنیا کے بے تاج بادشاہ ابن صفی اور تاریخی ناولوں کے مانے ہوئے لکھاری نسیم حجازی کو بھی اپنے لیے لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ ابنِ صفی کو وہ برصغیر کا اعلیٰ ترین جاسوسی ناول نگار سمجھتے ہیں۔ ''اُردو میں جاسوسی کہانی کا دور اُنھی سے شروع ہوا اور انھی پر ختم بھی ہو گیا۔ مجھے گولی مار چورنگی کے ساتھ دھول میں سے نظر آتی وہ دکان خوب یاد ہے جس کے سامنے چک کا پردہ گرا رہتا تھا اور اندر ابنِ صفی اپنی

دوسری بیوی کے ساتھ قیام پذیر، ناول لکھتے رہتے تھے۔‘‘

وہ ادبِ عالی کو عوام کے وسیع حلقے تک لے آئے۔ وہ ادب کے کیری پیکر بن گئے۔ وہی افسانوی آسٹریلوی میڈیا ٹائی کون کیری پیکر جس نے دنیائے کرکٹ کے اہم ترین کھلاڑیوں برطانوی ٹونی گریگ، ویسٹ انڈین کلائیو لائیڈ، آسٹریلیا کے گریگ چیپل، پاکستانی عمران خان وغیرہ کو شامل کر کے ایک ٹیم بنائی اور ’’ورلڈ سیریز کرکٹ‘‘ کی داغ بیل ڈالی، جدید ون ڈے کرکٹ کو صحیح معنوں میں مقبولِ عام کیا۔ اس میں نائٹ میچز، رنگین یونی فارم، پچ پر مائکروفون کا استعمال، مختلف زاویوں کے لیے کئی کیمروں کی تکنیک اور فلڈ لائٹوں کا استعمال قابلِ ذکر تھا۔

سب رنگ کو مقبول بنانے کے علاوہ اُس وقت تک اُردو ادب کے اہم برج لاہور کے اردو ڈائجسٹ کے علاوہ کراچی میں ڈائجسٹ کے حوالے سے ایک دوسرا اہم برج وجود میں آیا۔ گو کراچی اپنے شعرا، ناقدین اور ادیبوں کے حوالے سے اہم شہر تو تھا ہی، مگر لاہور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ادیب جو فقط شہرت اور توصیف پر سسک رہے تھے، انھیں اپنے فن پاروں کا مناسب معاوضہ بھی ملنے لگا۔ ’’جانگلوس‘‘ کا شوکت صدیقی صاحب کو ستر کی دہائی میں اڑھائی لاکھ روپیہ دیا گیا جو اپنے وقت میں ایک ریکارڈ تھا۔

’’بازی گر‘‘ ایک انتہائی دل چسپ کہانی ہے۔ یہ قارئین میں اِس درجہ مقبول ہوئی کہ اس پر فلم اور ٹی وی ڈراما بنانے کے کئی منصوبے بنائے گئے۔ اس کے وسیع لینڈ سکیپ، ثقافتی تنوع کی پچی کاری اور بے شمار رنگا رنگ کرداروں کی وجہ سے لاگت کا تخمینہ بڑھ جاتا رہا۔

یہ شہر ’’گیا‘‘ کے ایک نوجوان بابر زماں خاں کی کہانی ہے۔ اس میں دودھ میں عرقِ گلاب ملی رنگت والی لڑکی کورا ہے جو بابر کو بدھ گیا کے میلے میں نظر آئی۔ اُن میں ایک پاکیزہ محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ کورا تبت کے ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہے۔ مخالفین رستے سے ہٹانے کے لیے اُس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ٹرین میں فرار ہوتے ہیں۔ رستے میں ایک مہربان شخص مولوی محمد شفیق سفر کر رہے ہیں جو ان کے خیر خواہ بن جاتے ہیں۔ کلکتے پہنچنے کے چند ہی روز بعد چند جرائم پیشہ ان دونوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ چاقو زنی میں قتل ہو جاتا ہے جس پر بابر کو سات سال جیل ہو جاتی ہے۔ وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ وہیں ڈھل اُسے ملتا ہے۔ بارعب ڈھل کو مقامی گروہوں کا استاد مانا جاتا ہے۔ اُسے بابر کی معصومیت بھا جاتی ہے اور وہ اُس کا سرپرست بن جاتا ہے۔ سات سال جیل میں گزارنے اور ایم اے کرنے کے بعد بابر، کورا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یوں ہندوستان کے شہروں قصبات، دیہات کی معاشرت اور تہذیب چاندنی کے ورقوں کی طرح داستان کے صفحات پر دمک اُٹھتی ہے۔ کہانی روانی سے آگے بڑھتی ہے۔

اس داستان کے بابر زمان خان کی زندگی میں شکیل صاحب کی اپنی زندگی بے آواز آسمانی بجلی کی طرح لشکارا مار جاتی ہے۔ اس میں ہندوستان کے وہی شہر، وہی ریل کار، وہی ماحول نظر آتا ہے جہاں جہاں انھوں نے آوارگی کی۔ مراد آباد سے لے کر کلکتہ، ناچ گھروں میں ناچتی لڑکیاں، دیہات میں اُٹھتی دھول میں چارے اور گوبر کے ذرّات، محبت آمیز اجنبی اور دھوکا دیتے اپنے، سبھی کچھ، شکیل صاحب کی کہانی ہی تو ہے۔ البتہ اس میں ڈھل کون ہے، یہ معاملہ تشنۂ تعبیر ہے۔ کورا تو وہ لڑکی ہے، شکیل بھائی آج بھی جسے تلاش کر رہے ہیں۔ ہر مرد کے اندر ایک حسین، ذہین، مخلص اور بے لوث کورا کی خواہش اور ہر عورت محبت بھرے بابر اور فولادی ڈھل کی اجتماعی خوبیوں والے مضبوط مرد کی متلاشی ہوتی ہے۔

چند جملے کہانی میں معاشرتی فلسفے کے نگ جڑ دیتے ہیں۔

’’شراب ایک تھپکی ہے، لوری ہے، کھلونا ہے، جھنجھنا ہے، شراب ایک آغوش ہے، شراب ایک طوائف ہے، کھلی ہوئی آنکھوں کی نیند ہے‘‘

’’عورت کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے۔ مرد کی ہر بھوک پہچان لیتی ہے۔‘‘

’’حجام نے آ کے میری داڑھی مونچھیں صاف کر دیں۔ غسل کے لیے گرم پانی تیار کیا گیا اور ایک سفید کڑھا ہوا کرتا اور پاجامہ

فراہم کر دیا۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو ٹھل اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میری صورت تکتا رہ گیا۔ اس نے آوازیں دے دے کے اپنے لوگوں کو بلایا اور مستانہ انداز میں کہنے لگا ''لو دیکھو، لاڈلے کا حسن دیکھو۔ یہ ہے لاڈلا۔ دیکھا تم نے کیسا چمک کے آیا ہے۔ ابے یہ کیا گھور گھور کے دیکھتے ہو۔ نظر لگ جائے گی سالو! ہے کوئی کلکتہ شہر میں ایسا جوان؟؟ اگر کوئی ہو تو اُسے ڈھونڈ کے میرے سامنے لاؤ، میں اُسے گولی مار دوں گا۔'' (ٹھل)

''لمحوں کا یقین ایک فریب ہے اور آدمی اس فریب میں زندگی گزار دیتا ہے۔''

ایک مرتبہ بازی گر کے کرداروں کے حقیقی ہونے پر بات چل نکلی اور ڈٹھل کا ذکر آیا تو کہنے لگے ''ایسا شخص جو محلے بھر کا محافظ اور باپ کی حیثیت رکھتا تھا، ہم نے خوب دیکھا ہے۔ پہلے وقتوں میں ایسے لوگ جو عزت اور دوستی کی خاطر جان تک قربان کر دیتے تھے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔''

'بازی گر' تحریر کرنے سے قریباً ایک دہائی قبل رئیس امروہوی صاحب کو فضل احمد کریم فضلی صاحب نے اپنے ہاں اپنی دوسری فلم کی تیاری کے سلسلے میں بلایا۔ شکیل بھائی بھی رئیس صاحب کے ساتھ تھے۔ وہاں آغا حشر کی نسبت سے معروف مختار بیگم اپنی بیٹی رانی کے ساتھ موجود تھیں۔ رانی کے حسن کی تابانی قابلِ دید تھی۔ رانی نے اُس روز ٹرائل کے لیے اپنے رقص سے گویا ماحول میں جادو پھونک دیا۔

فضلی صاحب ''چراغ جلتا رہا'' نامی ہٹ فلم بنا چکے تھے۔ فضلی صاحب نے انھیں ایک پرانے پڑھے ناول کا تھیم سنایا اور اس موضوع پر فلم لکھنے کی درخواست کی۔ دونوں بنیادی خیال سن کر لوٹ آئے۔ شکیل صاحب تب تک سیکڑوں فلمیں دیکھ چکے تھے۔ سو انھوں نے قلم اٹھایا اور دن رات ایک کر کے ہفتے بھر میں کہانی لکھ ڈالی۔

رئیس صاحب کو وہ تحریر اتنی پسند آئی کہ انھوں نے اس کا بیش تر حصہ اسی طور لکھ کر فضلی صاحب کو پیش کر دیا۔ فضلی صاحب نے چند روز بعد بتایا کہ انھیں وہ تحریر اس حد تک اچھی لگی کہ انھوں نے اس میں قطع برید مناسب نہیں سمجھی۔ چوں کہ بنیادی خیال فضلی صاحب کا تھا سو ''ایسا بھی ہوتا ہے'' نامی ہٹ فلم پر رئیس صاحب کا فقط نام آیا، معاوضہ نہ ملا۔ شکیل صاحب کے لیے اپنی تحریر کی پذیرائی کی خوشی ہی کافی ٹھیری۔ بعد ازاں انھوں نے ایک اور فلم بھی لکھی جس میں 1965 کی جنگ کی وجہ سے فضلی صاحب بہت تبدیلیاں کیں اور وہ کام یاب نہ ہو سکی۔

''بازی گر'' شروع کرنے کے قریباً دہائی بھر بعد شکیل صاحب کی اُس وقت کے حکم ران جنرل ضیاء الحق سے ایک ایسی ملاقات ہوئی جس میں چھپا ایک بھید اُنھیں آج بھی متجسس رکھتا ہے۔

رُوداد کچھ یوں ہے کہ سی پی این ای کا اسلام آباد میں ایک اجلاس ہوا۔ وہاں شکیل بھائی کو بھی مدعو کیا گیا۔ کرسی صدارت پر جنرل ضیاء الحق تھے۔ ابتدا میں شرکا کا صدر سے تعارف کروایا گیا۔ جنرل صاحب سب سے مصافحہ کرتے ہوئے شکیل صاحب تک آئے، ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئے۔ بڑھ کر واپس لوٹے اور مسکرا کر دوبارہ مصافحہ کرتے ہوئے بولے ''آپ ہی سب رنگ نکالتے ہیں۔ آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔''

جنرل ضیاء کا پلٹنا اور دوبارہ ملنا ایک معما تھا۔

تقریب معمول کے مطابق اختتام پذیر ہوئی۔

اگلے روز شکیل صاحب نے سیکریٹری جنرل سی پی این ای انور خلیل صاحب سے درخواست کی کہ وہ ضیاء الحق سے اپنی طے شدہ ملاقات میں اُن کے مجوزہ خواتین کے ڈائجسٹ کے ڈیکلریشن کی بھی بات کریں۔

اُسی سہ پہر شکیل صاحب کو فون آ گیا کہ صدر صاحب ان سے ملنے کے متمنی ہیں اور شام چھے بجے ملاقات کا وقت طے کیا گیا ہے۔

شکیل صاحب یہ سوچ کر شاداں ہو گئے کہ جنرل صاحب بھی ''سب رنگ'' کے قاری نکلے۔

سو شیروانی پہن کر 'سب رنگ' کا تازہ شمارہ لے کر، صدر کی اقامت گاہ پر پہنچے۔ وہاں پرسنل سیکریٹری کے کمرے میں امور خارجہ کے دو اہم لوگ شاہ نواز اور آغا شاہی بھی موجود تھے۔

اُن کے بیچ اُردو اَدب پر بات چل نکلی۔ شاہ نواز صاحب نے اعتراف کیا کہ اُن کا اردو ادب کا مطالعہ بچپن تک محدود ہے۔ آغا شاہی اردو ادب کے معاملے میں مکمل ناواقف نکلے۔ ابھی گفت گو جاری تھی کہ صدیق سالک تشریف لائے اور شکیل صاحب کو ملاقات کے لیے بلایا۔ شکیل صاحب ایک سادہ لیکن خوش ذوقی سے آراستہ کمرے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں صدر صاحب تشریف لائے، روایتی معانقہ کر کے خوش اخلاقی سے بیٹھ کر اُن کے خواتین سے متعلق رسالے کے ڈیکلریشن کے مسائل کا پوچھا۔ اس کے بعد ''سب رنگ'' کی وسیع اشاعت پر تعریفی کلمات ادا کر کے فرمائش کی کہ وہ رسالے کے ذریعے اسلام کی بھی خدمت کریں۔ شکیل صاحب نے بتایا کہ اس میں اولیائے کرام پر سوانحی تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ ضیا صاحب نے کہا کہ اس میں تصوف سے بڑھ کر شریعت پر بھی شائع کیا جائے۔ شکیل صاحب نے اس ضمن میں پورا خیال کرنے کی بات کر کے گویا موضوع بدل دیا۔ صدر صاحب نے رسالے کی مقبولیت کی وجہ پوچھی۔ شکیل صاحب نے انفرادیت، معیار، دیانت، صحت زبان اور محنت کو اہم وجوہ کے طور پر بیان کیا۔ جب ضیا صاحب نے تازہ شمارہ دیکھا تو پوچھا۔

''کیا سرورق پر عورت کی تصویر ضروری ہے؟ پھول، قدرتی مناظر وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں؟''

شکیل صاحب نے وضاحت کی کہ اردو زبان کے کلچر کا محور نسوانی نزاکت و حسن رہا ہے۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی اسے سراہتی ہیں۔

ابھی یہ گفت گو جاری تھی کہ ضیا صاحب کی چھوٹی بیٹی زین کمرے میں آ گئی۔ یوں بات بدل گئی۔

شکیل صاحب نے درخواست کی کہ نستعلیق خط کی کتابت کے باعث اردو زبان ابھی تک طباعت کے پرانے دور میں بہ طور گھریلو دست کاری زندہ ہے۔ اگر ایران کے مانند، تمام رسائل و اخبارات پر خطِ نسخ کی پابندی عاید کر دی جائے تو اردو جدید دور کی پرنٹنگ میں شامل ہو جائے گی۔

ضیا صاحب کی ہدایت پر صدیق سالک صاحب نے یہ تجویز نوٹ کر لی۔ اب تک ضیا صاحب کی متانت اور نرمی نے شکیل صاحب کو خاصا پر اعتماد کر دیا تھا۔

یاد رہے کہ ضیا الحق پاکستان کی موجودہ تاریخ کا واحد حکم ران گزرا ہے جس کی تربیت اردو میں ہوئی تھی اور جو اردو مطبوعات و اخبارات کا باقاعدہ قاری تھا۔ گویا وہ وہی زبان پڑھتا اور سمجھتا تھا جو کروڑوں پاکستانیوں کی زبان ہے۔

شکیل صاحب دس منٹ کے لیے آئے تھے، انھیں باہر منتظر خارجہ امور کے اہم عہدے داروں کا بھی خیال تھا۔ اب تک قریباً آدھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سو انھوں نے اجازت چاہی تو ضیا صاحب نے اُنھیں روک لیا اور پوچھا۔

''بے تکلفی سے بتائیے کہ ملک کے سیاسی حالات پر عوام کی کیا رائے ہے؟''

شکیل صاحب نے نپے تلے محتاط الفاظ میں شائستگی سے گول مول بات کی۔ صدر صاحب نے پوری توجہ سے اُن کی بات سنی۔ باہر رخصت کرتے وقت وہ شکیل صاحب کو لے جانے والی گاڑی تک آئے، خود گاڑی کا دروازہ کھولا، گلے ملے، گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور انھیں یاد دلایا کہ وہ ''سب رنگ'' کے گزشتہ شمارے ضرور بھجوائیں۔

بعد ازاں انھیں وزارتِ اطلاعات سے فون آنے لگے کہ وہ ''سب رنگ'' کے پچھلے شمارے بھجوائیں۔ جب سرورق پر خواتین کی

تصاویر سے مزین پرانے شمارے بھجوائے گئے تو خواتین کے ڈائجسٹ کا ڈیکلریشن تو ایک طرف رہا ”سب رنگ“ کے اشتہارات اور کاغذ بند کر دیا گیا۔

ایک غیر مصدقہ خبر یہ بھی تھی کہ یہ سب ضیا صاحب کے حکم پر کیا گیا تھا۔

بہر حال، خاصی جدوجہد خاصے عرصے بعد کے بعد ان کی بحالی ممکن ہو سکی۔ حیران کن امر یہ ہے کہ یہ بحالی ضیا صاحب کے دور ہی میں ہو گئی۔

ستر کی دہائی کے اوائل میں حسن پرست، جوہر شناس اور متلون مزاج شکیل عادل زادہ کی ذاتی زندگی میں اہم ترین واقعہ (بہ قول اُن کے سانحہ) رُونما ہو چکا تھا۔ اُن کی شادی ہو چکی تھی۔ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ شکیل صاحب شادی کے معاملے کو تین وجوہات کی بنا پر ٹالتے آئے تھے۔

اوّل وہ سراپا ”سب رنگ“ تھے، سو خواہش تھی کہ جب تک اشاعت نصف لاکھ تک نہ ہو جائے وہ چین سے نہ بیٹھیں گے۔

دوم مالی استحکام ان کے لیے بہت اہم تھا، اس معاملے میں وہ یقین رکھتے تھے کہ جب تک انسان آسودگی سے خاندان کی کفالت نہ کر سکے تب تک شادی اپنے اور شریکِ خانہ کے ساتھ زیادتی ہے۔

سوم ان کی لڑکیوں کے حوالے سے پسند بدلتی رہتی تھی، کبھی گوری نازک تو کبھی سانولی چھبیلی اچھی لگتی۔ ایک لڑکی کے ساتھ زندگی کو محدود کر لینا جھوٹ معلوم ہوتا تھا، اپنے آپ سے اور بیوی سے جھوٹ۔ تنوع کی خواہش ختم کرنا محال تھا۔

بہر حال ان کی اماں مراد آباد سے آئی ہوئی تھیں، سب رنگ کی اشاعت پچاس ہزار کی حد عبور کر چکی تھی، مالی آسائشیں حاصل ہو چکی تھیں اور عمر پینتیس برس کے قریب ہو چلی تھی۔ سو والدہ کے اصرار پر شادی طے ہو گئی اور شادی کے کارڈ تقسیم ہو گئے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کارڈوں میں دعوت خود دُلہا کی جانب سے دی گئی تھی۔ بہر حال فروری 1972 میں شادی ہو گئی اور شکیل صاحب کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ قرار آیا یا بے قراری بڑھ گئی، ایک الگ معاملہ ہے۔

ضیا صاحب سے ملاقات کے بعد سب رنگ کی اشاعت ایک قابل ستائش ہموار سطح پر رواں رہی۔ زندگی کے معاملات طے ہوتے رہے، نشیب بھی آئے اور فراز بھی۔

ملک بھی سیاسی نشیب و فراز سے گزرتا رہا۔

دو دہائیاں گزر گئیں۔

شکیل صاحب ”سب رنگ“ کی کہانیوں کے تمہیدی نوٹ، سلسلے اور ابتدائی صفحات تحریر کرنے کے ساتھ انتظامی امور، اشتہارات، ادیبوں کے ساتھ مسلسل رابطے اور دیگر بے شمار وجوہ کی بنا پر رسالے کو باقاعدہ نہ کر پا رہے تھے۔ اکیلے آدمی تھے، وہ ذمے داری جو بیس برس کی عمر میں اٹھائی تھی ساٹھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے گراں محسوس ہونے لگی تھی۔

اب تک ”سب رنگ“ کی زبان کو سند، اس میں شائع ہونے کو قبولیتِ عام، بین الاقوامی اور اُردو کے شاہ کاروں کے انتخاب کو شہرتِ دوام حاصل ہو چکی تھی۔

شکیل صاحب کا منصوبہ ساز ذہن ایک اور تدبیر سوچ رہا تھا۔ اُن کی دو بیٹیوں میں سے ایک بیاہی جا چکی تھی، دوسری زیرِ تعلیم تھی اور بیٹا شرجیل بھی تعلیمی مراحل کی تکمیل کر رہا تھا۔

اکیسویں صدی کے اوائل کی ایک شام اعلیٰ ہوٹل میں ہونے والی ایک تقریب میں اُن کی ملاقات ایک تیس بتیس سالہ نوجوان سے ہوئی۔ وہ نوجوان اُن کا مداح نکلا۔ سو گفت گو اردو ادب پر چل نکلی۔ بات گپ شپ سے جذباتی تعلق اور دلی تعلق سے بڑھ کر غم گساری و دل جوئی

تک چلی گئی۔ وہ نوجوان اب نوجوان نہیں رہا، لیکن شکیل بھائی آج بھی نوجوان ہیں۔

ز دانش دل پیر برنا بود

(شاہ نامہ فردوسی)

شکیل بھائی کو جب میں اُس تقریب میں ملا تو وہ میری توقع سے مختلف ایک بوٹے قد، کشادہ پیشانی اور مسکراتی آنکھوں والے ہنستے کھیلتے انسان تھے جو اپنے بیٹے شرجیل (مجو) کے ہم راہ تھے۔ پردۂ اسرار بھی انسان کو تصور میں کیسی بالائے عقل شے بنا دیتا ہے۔

انسان وہی ہے جو اُس کے اسّی نوے کلو وزن کے جسم میں قریباً تین سو گرام وزنی دل اور ڈیڑھ کلو وزنی دماغ ہے۔ گویا ایک عمومی انسانی جسم میں اصل اُنسان صرف دو فی صد کی حد تک چھپا بیٹھا ہے۔ یہی دو فی صد شیکسپیئر بناتا ہے، غالبؔ کی تشکیل کرتا ہے، حافظ و رومی، اقبال و ٹیگور کی پرداخت کرتا ہے۔ یہی ایک عام گورے یہودی سے آئن سٹائن کو منفرد کرتا ہے اور سڑک چھاپ سیاہ فام سے میلکم ایکس اور باراک حسین اوباما کو!

یہی عام ادیب سے بڑے ادبا کو ممتاز کرتا ہے، ایک ناظر اور مصور میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ مے خوار و پیرِ مغاں کا فرق کرتا ہے اور عامی کو بازی گر و بازی شناس شکیل عادل زادہ سے جدا کرتا ہے۔

مجھے ایک شناسا نے سنایا تھا کہ شکیل بھائی ''سب رنگ'' کے ذاتی صفحے کو درجنوں بار لکھ کر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ جب میں نے اس بارے میں پوچھا تو بولے ''خود پھاڑ دینا بہتر ہے، بجائے اس کے کہ قاری پھاڑے۔''

میں نے سادگی سے پوچھا کہ ''بازی گر'' لکھتے ہوئے اس کے کرداروں سے جذباتی وابستگی تو ہو گئی ہوگی۔ بے اختیار بول اٹھے ''تیس برس اسے پال پوس کر جوان کیا ہے، محبت کیوں کر نہ ہوگی۔''

میری شکیل بھائی سے پچھلے بارہ برس سے ہر دوسرے تیسرے ہفتے بلاناغہ کبھی چائے، کبھی کھانے، کبھی اُن کے دفتر، کسی ریستوراں، شہر شہر، کراچی، لاہور، اسلام آباد، ملاقات ہو جاتی ہے اور فون پر تو قریباً روز ہی بات ہوتی ہے۔ یہ اُن کی محبت اور کشادہ ظرفی ہے کہ مجھ ناچیز کو درخورِ اعتنا جان رکھا ہے۔

احوالِ حیات، کچھ سنا، کچھ جمال احسانی کے ''رازدار'' سے اور زیادہ تر ملاقاتوں سے کشید کیا، بیان ہو چکا، پس اب بے ترتیب ٹکڑے ہیں جن سے دنیا کے لیے شکیل عادل زادہ، قارئین کے شکیل عادل زادہ عفی عنہ اور میرے شکیل بھائی کی شخصیت کی پچی کاری ہو سکے گی۔

میری جن غیر معمولی لوگوں سے ملاقاتیں رہیں اُن میں عموماً چند اوصاف مشترک پائے۔ غیر معمولی اور ہمہ وقت زندہ رہنے والا متحرک جذبہ، اچھی یادداشت اور نئے خیالات کی پذیرائی اور ان کو اپنانے پر آمادگی۔

شکیل بھائی داستان بننے اور ہر خاص و عام قاری کو اُس سے وابستہ رکھنے کے فن میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں، سو اُن کی اِس خوبی پر ایک رات کھانے کے دوران بات ہوئی تو بتانے لگے'' میں اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیتا ہوں، اُسے تصور کے بے کنار جہاں میں پرواز کرنے دیتا ہوں۔ سو وہ کوئی نیا خیال، نئی دنیا یا نیا کردار دریافت کر ہی لیتا ہے۔''

اُن کے ساتھ گھنٹوں ادب پر بات ہوئی ہے۔ بلا کا حافظہ ہے۔ اِدھر میں ایک ادیب کا نام لیتا ہوں اُدھر وہ اُس کی ''سب رنگ'' میں شائع شدہ تمام تحریریں تعداد، عنوانات اور جزئیات کے ساتھ دُہرانا شروع ہو جاتے ہیں۔ اُنھیں ''سب رنگ'' سے عشق ہے سو اس کی ہر سطر اُن کی یادداشت پر اِس طرح نقش ہے جس طرح محبوب کے بدن کے تمام پیچ و خم، ہر تل۔

اُن کے گھر میں اقبال مہدی، ذاکر اور دیگر مصوروں کے فن پارے خوش سلیقگی سے سجے ہوئے ہیں۔ جب کبھی کسی کا تذکرہ ہوجائے تو کئی دہائی پرانی روداد حرف بہ حرف سنا دیتے ہیں، بعض غیر معمولی تخیل کے مالک ادیبوں کی طرح ہر مرتبہ اس میں اضافہ نہیں کرتے، تاوقتیکہ وہ ایک نئی داستان بن جائے۔

ایک واقعہ ہے۔ ایک روز میں شکیل بھائی اور آصف فرخی صاحب بیٹھے گفت گو کررہے تھے۔ بات انسانی یادداشت پر چل رہی تھی اور یہ موضوع زیرِ بحث تھا کہ انسان اپنی یادداشت کو کوشش اور مختلف تیکنیک سے بہتر بنا سکتا ہے۔ ایسے میں اِس دل چسپ پہلو پر بھی بات ہوئی کہ بڑھاپے میں انسان کیسے ماضی بعید کی باتیں یاد رکھتا ہے اور ابھی کل کی بات بھول جاتا ہے۔ آصف صاحب نے اپنے بزرگ والد، دانش ور اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر اسلم فرخی کا تازہ واقعہ سنایا کہ ایک روز وہ نماز کی ادائی کے دوران چند آیات بھول گئے۔

انھوں نے بہت کوشش کی لیکن نماز یاد نہ آئی۔

اب وہ اس پریشانی میں مبتلا ہوگئے کہ کہیں وہ یادداشت نہ کھو بیٹھے ہوں چناں چہ سٹ پٹا کر انھوں نے نماز سے ہٹ کر بھی چند چیزیں یاد کرنے کی کوشش کی۔ ذہن خالی خالی محسوس ہوا۔ یک دم کہیں سے ایک خیال وارد ہوا۔ وہ غالب کے عاشقِ صادق اور حافظ ہیں، سو غالب کی ایک غزل یاد کرنے کی کوشش کی۔ غزل پہلے حرف سے آخری حرف تک مکمل طور پر حافظے میں تازہ ہوگئی۔ سو انھوں نے اطمینان کا سانس بھرا، نماز میں غزل دہرائی اور بقیہ نماز مکمل کرلی۔

شکیل بھائی عام زندگی میں قطعی طور پر کوئی فلسفہ بگھارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر کوئی اجنبی ان کے ساتھ چند گھنٹے گزار لے تو وہ ان کی خوش طبعی اور زندہ دلی کا معترف تو ہوجائے گا مگر شاید یہ نہ جان پائے کہ وہ اس اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہر طرح کے لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔

ایک روز اچھے، اوسط درجے اور کم تر معیار کے ادب پر بات ہورہی تھی۔ وہ اپنے ’’سب رنگ‘‘ کے تیسری منزل پر واقع دفتر میں بیٹھے تھے۔ ان کا دفتر آئی آئی چندری گر روڈ پر ادارہ ’’جنگ‘‘ کے ساتھ والی ایک پرانی عمارت میں موجود ہے۔ ’’سب رنگ‘‘ دفاتر ایک پوری منزل کے آدھے حصے پر واقع ہیں۔ ان کے مرکزی دفتر کی کھڑکی سے کراچی کی اہم، نئی، پرانی، بلند و پست عمارات، نیلا آسمان اور ان پر تیرتی بدلیاں نظر آتی ہیں اور نیچے شہر کے مصروف ترین معاشی مرکز کی ٹریفک رواں دواں ہوتی ہے۔ پورا منظر زندگی کی چہل پہل سے بھرپور ہوتا ہے۔

عصر کے دودھیا نارنجی شفق کو دیکھتے اپنے مخصوص پلنگ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ اسی پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگا کر امتحانی گتا گھٹنوں پر رکھے انھوں نے شاہ کار فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ آس پاس لغات، رسائل، کتب اور حوالہ جاتی مطبوعات ایک ترتیب سے پڑی تھیں۔ بغل کا کمرا تو پورا کتاب خانہ ہے، جہاں پرانے جرائد اور کتب گرد سے اَٹی پڑی ہیں۔ بتانے لگے۔

’’سب رنگ کی کہانیاں منتخب کرنے کے لیے ایک ٹیم بنائی گئی تھی۔ گنی چنی کہانیاں علیحدہ کرکے تمام ارکان کو پڑھنے کے لیے دی جاتیں جو اپنے طور پر ان کو نمبر دیتے۔ جو کہانی زیادہ نمبر لے جاتی، اشاعت کے لیے منتخب کرلی جاتی۔‘‘

’’اس ٹیم کے ممبران کون ہوتے تھے؟‘‘ میرے پوچھنے پر حیران کن بات بتائی۔

’’اس میں میرے اور میرے معاونین سے لے کر چپراسی شامل ہوتے تھے۔ حتمی انتخاب میں میرے معاون کے بھی اتنے ہی نمبر ہوتے تھے جتنے کہ چپراسی کے۔ کسی بھی رسالے کے قارئین میں دانش وروں سے لے کر عام مزدور شامل ہوتے ہیں۔ خیال رکھا جاتا تھا کہ ایسی تحریریں منتخب کی جائیں جن کی پسندیدگی کی اوسط زیادہ ہو۔

’’کبھی آپ نے ویٹو کا حق استعمال کیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بہت ہی کم۔ نہ ہونے کے برابر۔‘‘

سلسلہ وار کہانیوں کے ناقد ان کے معیار پر معترض اور اسے سنجیدہ ادب میں شامل کرنے سے گریزاں رہے ہیں۔ ایسے معترضین غالباً سلسلہ وار تحریروں کی شان دار روایات سے یا تو ناواقف ہیں یا ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

دنیائے ادب کے عمدہ ترین شاہ پاروں کا تذکرہ آئے تو چارلس ڈکنز کے ہفتہ وار چھپنے والے ناول ’’دا پک وِک پیپرز‘‘، الیگزنڈر ڈوما کا ’’تھری مسکی ٹیئرز‘‘ فلابیئر کا ’’مادام بواری‘‘ اور آرتھر کانن ڈائل کی شرلاک ہومز سیریز، تمام ہفتہ وار یا ماہ وار رسالوں میں قسط وار شائع ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ کا اہم ترین ناول لیو ٹالسٹائی کا ’’اینا کارنینا‘‘ چار برس قسط وار (1873 سے 1877) شائع ہوتا رہا، اور دستوئسکی کا عظیم ناول ’’برادرز کرامازوف‘‘ بھی۔ دستوئسکی کے اس فن پارے کے مداحوں میں آئن سٹائن، سگمنڈ فرائڈ اور کافکا شامل رہے۔ کسی نے اُسے ناول کے طور پر پڑھا تو کسی نے انسانی نفسیات کے ادبی صحیفے کے طور پر۔ جیمز جائس تو بول اٹھا ’’اس ناول نے مجھے بے حد متاثر کیا، (دستوئسکی) نے ناقابلِ فراموش مناظر تخلیق کیے، ایسی شان دار چیزیں کوئی مجنوں ہی سوچ اور لکھ سکتا ہے، اسی پاگل پن میں اُس کا جینئس تھا۔‘‘

’’برادرز کرامازوف‘‘ رشین میسنجر کے لیے 1879 سے 1880 تک سلسلہ وار لکھا جاتا رہا۔

البتہ ناقدین کا ایک اعتراض قابلِ ذکر ہے، وہ ان سلسلوں میں غیر مرئی عوامل کا تذکرہ یا پھر ناقابلِ یقین حد تک غیر حقیقی اتفاقات کا ورود ہے۔ اس بارے میں ایک مختلف نظریہ وجود رکھتا ہے اور خاصا مقبول ہے۔ امریکن دانش ور پیٹر سٹراب اپنی کتاب ’’ایڈگر ایلن پو سے لے کر موجودہ پاپولر ادب‘‘ میں لکھتا ہے ’’ہر ثقافت سے تعلق رکھنے والا انسان کہانیوں کی تلاش میں رہتا ہے، سرد ہواؤں اور جلتی لکڑی کے دھوئیں کی آمیزش سے مہکتی کہانیاں۔ یہ کہانیاں ہمارے اندر ایک مخصوص حِس کو چھیڑتی ہیں۔ تصورات، انھیں مرتکز کرنے، اُن میں مخصوص متواتر نقوش معلوم کرنے، واقعاتی تسلسل تخلیق کرنے اور خیالی خاکہ ایجاد کرنے کی حِس کو صرف فکشن کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہانیاں تخلیق کرنا انسان کی سرشت ہے اور بے مثال خوبی بھی جو صرف اِنسان کو دی گئی ہے۔‘‘

فرانز روٹن سٹائز مزید فلسفیانہ رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ’’طلسماتی ادب انسانی تاریخ کے ان ادوار میں زیادہ مقبول رہا ہے جب معاشرہ تخریب کے عمل سے گزر رہا تھا، جب پرانی اقدار منہدم کر کے نئی اقدار جگہ بنا رہی تھیں۔ ایسا ادب علامات کو اپنے اندر چھپائے ہوتا ہے۔ یہ قائم دلیل کو رَد کرتا ہے، یا تو تبدیلی لے کر آتا ہے یا اس کی خبر لاتا ہے۔‘‘

اس معاملے میں داستانِ امیر حمزہ تحقیق کی متقاضی ہے۔

ایک معاملہ جہاں شکیل بھائی کی خوش مزاجی جواب دے جاتی ہے ’’صحتِ زبان‘‘ ہے۔ اِدھر کوئی غلط لفظ بولا یا لکھا گیا، اُدھر شکیل بھائی نے بیچ چوراہے دھر لیا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ میں غسل خانے میں گنگناتے ہوئے بھی نادانستگی میں صحتِ زبان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مبادا کوئی غلط لفظ شکیل بھائی کے کان میں پڑ جائے۔

وہ بیچ جملے کے مجھے ٹوک دیتے ہیں۔ ادھر وہ کوئی شخص غلط زبان بولے گا، اُدھر شکیل بھائی استغفار اور لاحول ولاقوۃ کا ورد شروع کر دیں گے۔

میرے سیکڑوں الفاظ انھوں نے درست کیے، صحتِ زبان اور فہمِ ادب پر وہ میرے استاد ہیں۔ میرے بے شمار مسودوں کی زبان انھوں نے درست کی ہے۔ ہر لمحے اُن کا فون بجتا رہتا ہے۔ لوگ درست زبان پوچھتے رہتے ہیں۔ زبان کی ’’درستگی‘‘ کی جگہ ’’درستی‘‘ ہو، ’’مہنگا‘‘ کی جگہ منہ کے سابقے کے ساتھ ’’منہگا‘‘ ہو یا بے شمار دیگر الفاظ ہوں وہ اس معاملے میں بے حد سنجیدہ ہیں۔ سناتے ہیں۔

جون ایلیا میری زبان درست

’’میرا اُردو کی جانب رجحان رئیس امروہوی کے گھر عربی، فارسی کے عام چلن کی وجہ سے ہوا۔

کرتے رہتے تھے۔ وہ اُردو پر کامل دست رس رکھتے تھے۔ عربی، فارسی کے الفاظ کی ماہیت پر غور کریں تو بات سامنے آجاتی ہے۔ یہ زبانیں عموماً

اردو کا بیس سے تیس فی صد حصہ ہیں۔ میں ہندوستان سے آیا تو ''میعار'' کہتا تھا۔ یہاں پتا چلا یہ ''معیار'' ہے۔ زبان کے بارے میں تجسس، جیسا پہیلیوں کے بارے میں ہوتا ہے، اس کے علم میں معاون ہوتا ہے۔ جون ایلیا کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا عربی، فارسی کے عالم تھے۔ جون صاحب کے بھائی رئیس امروہوی قطعہ نگاری میں اکبر الہ آبادی سے بہتر تھے اور بھائی محمد تقی فلسفے کے آدمی تھے۔ انھوں نے کارل مارکس کی ''داس کیپٹل'' کے کچھ حصے کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان سارے شفیق بزرگوں کی صحبت اور سرپرستی میں زبان، ادب اور فلسفے کا شوق اور ذوق مہمیز ہوا۔ جب میں نے ''سب رنگ'' شروع کیا تو خوف تھا کہ یہ زبان و بیان میں ''عالمی ڈائجسٹ'' سے پیچھے نہ رہ جائے۔ جون ایلیا شعر کے آدمی تھے، میں کہانی کا طالب علم۔ چناں چہ کہانی میں محنت کی، زبان کے معاملے میں انور شعور نے بہت ساتھ دیا، ہر وقت سند کے لیے لغت ساتھ رکھتا تھا۔ یہ معمول آج بھی باقی ہے۔ چند بنیادی کلیے ہیں۔ ہندی لفظ عموماً ''ہ'' پر ختم نہیں ہوگا، ٹھیکہ، دھوکہ، دھماکہ، ہندی کے الفاظ ہیں۔ ان کی درست املا ''ٹھیکا''، ''دھوکا''، ''دھماکا'' ہے۔ البتہ گنتی کے الفاظ گیارہ، بارہ، تیرہ وغیرہ ہندی میں بھی 'ہ' پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ 'ہ' پر شبہ ہے کہ پہلے نہیں ہوتے تھے۔''

اسی طرح انھوں نے تربیت کرتے ہوئے بتایا کہ 'ہ' سے ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں ''گی'' آنا درست ہے جیسے خستہ ''خستگی''، شگفتہ ''شگفتگی'' وغیرہ۔ البتہ الفاظِ دیگر میں ''ی'' آنا چاہیے۔ حیران ''حیرانی''، رومان ''رومانی'' اور ناراض ''ناراضی'' وغیرہ۔ چند استثنیات ہیں جیسے خفا سے ''خفگی''۔ 'خفا' 'ہ' پر ختم ہوتا تھا، اسے غالبؔ نے بھی چند جگہ 'ہ' پر ختم کیا ہے، البتہ اس کا الف پر ختم ہونا رائج العام ہو چکا ہے۔

یہ بات بھی شکیل بھائی نے سمجھائی کہ 'خط و خال' مرد کے ہوتے ہیں، خط بہ معنی داڑھی، اور 'خد و خال' عورت کے بہ معنی ''رخسار اور نقوش۔'' وہ ابتدا میں ''کئی سالوں بعد'' لکھتے تھے۔ درست کروایا گیا تو ''کئی برسوں بعد'' لکھنے لگے۔

اپنی بیگم کو 'بیوہ' کہتے ہیں۔ گو اس کا صحت زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ابتداً یہ لفظ مجھے خاصا عجیب لگا۔ ایک روز وضاحت کرنے لگے ''جس خاتون کا شوہر میں ہوا، وہ بیوہ ہی ہوئی۔'' اب اس لفظ کی ایسی عادت ہوگئی ہے کہ منہ سے نکلتے نکلتے رہ جاتا ہے ''شکیل بھائی بیوہ (بھابی) خیریت سے ہیں۔ میرا اسلام کہیے گا۔''

ایک روز میں نے پوچھا کہ جون ایلیا رات کو اکثر سیاہ چشمہ کیوں لگاتے تھے تو کہنے لگے۔

''امروہہ ہمارے شہر سے اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ گویا وہاں سائکل پر جایا جا سکتا تھا۔ امروہے کے حضرات ڈراما خوب کرتے تھے۔ انھی لوگوں میں صادقین صاحب بھی شامل تھے۔ وہ کسی محفل سے اُٹھتے تو دانستہ طور پر جوتوں کے بغیر چل دیتے۔ لوگ پیچھے اُن کے جوتے اٹھائے چلے آتے کہ وہ عالمِ استغراق میں جوتے بھول آئے ہیں۔ جون صاحب بھی ایسے ڈرامے کرتے رہتے تھے۔ جب وہ کسی بھی سفر کو نکلتے تو آہ بھر کے کہتے ''ہم تو چلتے ہیں۔ نہ جانے اب ملیں نہ ملیں۔'' ایک روز میں نے تنگ آکر پوچھ لیا کہ وہ ایسے جملے کیوں بولتے ہیں تو کہنے لگے ''اس طرح کے جملے بول دینے چاہئیں۔ نامعلوم کب کوئی حادثہ ہو جائے اور ہم فوت ہو جائیں۔ بعد میں لوگ ہماری ولایت کی گواہی دیتے رہیں گے کہ ''مرحوم ولی اللہ'' تھے۔'' اسی طرح 1991 میں سوویت یونین میں کمیونزم کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب انیق احمد صاحب نے انھیں فون کیا۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے فون اٹھایا اور نیند بھرے لہجے میں ''ہیلو'' کہا تو انیق نے انھیں بتایا کہ روسی فوج لینن کا مجسمہ گھسیٹ رہی ہے۔ جون صاحب کو یقین نہ آیا۔ وہ پکے سوشلسٹ تھے۔ بالآخر جب انھیں یقین آ ہی گیا تو انھوں نے صدمے کی کیفیت میں لمبی سانس لیتے ہوئے کہا ''یہ بات تو طے ہوگئی۔ فوج کسی بھی ملک کی ہو، ہوتی پنجابی ہے۔''

میں نے شکیل بھائی کو اپنے ایک دوست کا واقعہ سنایا۔ ایبٹ آباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ جون ایلیا اُس میں مہمانِ خصوصی تھے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو میرے ایک دوست، جو جون صاحب کے شدید قسم کے عاشق تھے، ان کی قدم بوسی کے لیے اسٹیج کے پاس گئے۔ تب تک

اسٹیج خالی ہو چکا تھا۔ جون صاحب اسٹیج کی ایک جانب سے قلابازی کھاتے ہوئے لوٹنیاں لگاتے آتے اور دوسرے کنارے پر جا تھمتے۔ جب وہ قلابازیوں کا ایک چکر مکمل کر کے میرے دوست والی جانب آ کر رُکے اور کپڑے جھاڑتے کھڑے ہوئے تا کہ قلابازیوں کا اگلا چکر شروع کر سکیں تو میرے دوست نے اُن کے ہاتھ تھام لیے اور انتہائی عقیدت سے ہاتھ چومتے ہوئے بتایا کہ وہ جون صاحب کی پرستش کرتے ہیں۔ جون صاحب بنا پلک جھپکے یہ سب سنتے رہے۔ جب دوست نے بات مکمل کی تو کہنے لگے ''اگر آپ میرے اتنے ہی چاہنے والے ہیں تو آیئے میرے ساتھ قلابازیوں میں شامل ہو جایئے۔'' یہ کہہ کر جون صاحب نے اگلی قلابازی لگا دی اور میرے دوست بے بسی سے انھیں دیکھتے رہ گئے۔ جب میں نے یہ بات سنائی تو شکیل بھائی ہنسنے لگے۔ میں نے ایک سوال کیا۔

''سنا ہے کہ وہ بعض مرتبہ اُچک کر اپنے مخاطب کے کندھوں پر اپنے منحنی بدن کے ساتھ سوار ہو جاتے تھے۔''

شکیل بھائی ہنستے ہوئے کہنے لگے ''وہ اِس طرح کے خاصے ڈرامے کر لیتے تھے۔''

اُسی روز میں نے رئیس امروہوی کی وفات کے بارے میں استفسار کیا۔ رئیس صاحب کے حادثاتی طور پر فوت ہو جانے کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ملک بھر میں بھنبھنائی تھیں۔ وہ ماورائی اور روحانی معاملات پر بھی خاصی دست رس رکھتے تھے اور ان کے خاصی تعداد میں شاگرد بھی تھے۔ کچھ لوگ اس وفات میں لسانی، چند لوگ معاشی معاملات اور کئی ضعیف العقیدہ لوگ جنّات اور موکلوں کی کارستانی قرار دیتے تھے۔ شکیل بھائی نے اس ملک گیر شہرت پانے والے حادثے کی وجوہات سے پہلی مرتبہ راز کشائی کی۔

''رئیس صاحب رات گئے دیر تک فکرِ سخن کرتے رہتے تھے۔ اُن کا قیام ایک علیحدہ کمرے میں تھا جو کہ باقی گھر سے دور تھا۔ ایک رات کو دیر تک لکھتے پڑھتے رہے۔ ہوا یوں کہ انھیں ایک معاملے میں حوالے کے لیے ایک کتاب کی ضرورت پڑی۔ اُن کے کمرے میں ہر طرف الماریوں میں کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ متعلقہ کتاب ایک الماری کے اوپر پڑی تھی۔ سو رئیس صاحب کرسی کے اوپر کھڑے ہو کر کتاب نکالنے لگے تو عالمِ سُرور میں اُنھیں قریب میں چلتے پنکھے کا پتا نہ چلا۔ اُس پنکھے کا پَر ان کے سر میں کچھ یوں لگا کہ وہ چکرا کر نیچے گرے اور گرتے میں اُن کا سر کہیں زور سے ٹکرایا۔ بس یہ حادثہ اتنا جان لیوا ثابت ہوا کہ موت و حیات کی کش مکش میں رہ کر وہ راہیِ اجل ہوئے۔''

اس راز سے پردہ کشائی کرتے ہوئے شکیل بھائی کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔

رئیس امروہوی اور جون ایلیا کے ساتھ زندگی بِتا کر شکیل بھائی کی زبان ٹکسال میں ڈھل چکی تھی۔

ایک مرتبہ ساحلِ سمندر پر کلفٹن سی ویو کے ساتھ ساتھ واک کرتے ہوئے جب میں نے ایک سوال پوچھا تو مجھے توقع تھی کہ وہ رئیس یا جون صاحب کا نام لے دیں گے۔ صبح سویرے نیلے سمندر کی تیز نمکین ہوا اور لہروں کی سفید جھاگ دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا کہ انھیں قیامِ پاکستان کے بعد کون سا شاعر، شاعری کا اہم ترین ستون لگتا ہے، تو بے اختیار بول اُٹھے۔

''جوش ملیح آبادی! کیا نوابی شخصیت تھی، گورے چٹے، سرخ و سپید، کیا لحن تھا، کیا طنطنہ تھا۔ الفاظ تو گویا اُن کی زبان پر نازل ہوتے تھے اور خیال ان کے دل پر۔ میں اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنھوں نے اُن کو اس طرح اپنی ہی نظم ''یہ جوانی ہے جوانی ہائے ہائے'' پر جھوم کر اپنی کوٹھی کے لان میں رقص کرتے دیکھا ہے کہ انھوں نے صرف کُرتا پہن رکھا تھا۔''

''میں نے تو سن رکھا ہے کہ وہ خاصی مالی مشکلات کا شکار رہے'' میں نے کریدا تو بولے۔

''قطعاً نہیں۔ ان کی یہاں کراچی میں اچھی خاصی کوٹھی تھی۔''

زبان کی صحت کے حوالے سے رفیق احمد نقش کو بہت یاد کرتے ہیں جو ادھیڑ عمری میں فوت ہو گئے۔ وہ دو ڈھائی سال ''سب رنگ'' میں ان کی معاونت کرتے رہے۔

اس طرح مزدور شاعر احسان دانش کو صحتِ زبان کے حوالے سے مستند اور قابلِ تقلید سمجھتے ہیں۔

ان کی مجھ پر لاتعداد مہربانیاں اور ان گنت احسانات ہیں۔ ایک احسان کے بارِ گراں کے نیچے ڈھتا جاتا ہوں۔

ایک شام کہنے لگے کہ انھوں نے ایک تحفہ میرے لیے سنبھال رکھا ہے۔

اگلی ملاقات میں انھوں نے وہ تحفہ بہت اشتیاق سے مجھے دیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہاں موجود انگریزی ادیب ایچ ایم نقوی بھی جذباتی ہو گیا۔ وہ تحفہ کرشن چندر کے اُس قلم کا تھا جس سے اُس نے یادگار تحریریں لکھی تھیں اور شکیل بھائی کو کرشن چندر کی بیگم نے اُن کی وفات کے بعد تحفتاً پیش کیا تھا۔ کئی انٹرویوز میں شکیل بھائی بہت فخر سے اس قلم کا تذکرہ کر چکے تھے۔ انھوں نے وہ قلم مجھے دے دیا تھا۔ میرا جذباتی ہو جانا عین قدرتی تھا۔

بعد ازاں جاتے ہوئے مجھے ایک کونے میں لے گئے اور کہنے لگے۔

''عرفان بھائی یاد رکھیے آج آپ کی سال گرہ ہے۔''

میں حیران رہ گیا۔ میری سال گرہ کو ابھی کئی ماہ باقی تھے۔

''میں بیوہ سے بہانہ کر آیا ہوں کہ آج عرفان صاحب کی سال گرہ ہے اس لیے اُن کے لیے بہ طور تحفہ کرشن چندر کا قلم لے کر جا رہا ہوں۔''

ایک روز لمبی سانس بھر کر کہنے لگے۔

''وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو پیدا نہیں ہوئے۔ نہ پیدا ہوئے نہ اُن کی شادی ہوئی۔''

ایک مرتبہ فون پر گفت گو کرتے ہوئے میں نے ایک مشترکہ شناسا کا بتایا کہ اُس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ یہ سن کر فون کی دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد اُن کی حسرت بھری آواز سنائی دی ''واہ واہ کیا کہنے، ایسے اچھے نصیب ہمارے کہاں۔''

ایک روز شادی کے حوالے سے کہنے لگے ''شادیاں تو ہوتی ہی علیحدگی کے لیے ہیں۔''

ایک دنیا جانتی ہے کہ وہ انتہائی فرماں بردار، خدمت گار شوہر اور شفیق والد ہیں۔ بس ایک دکھی شوہر کا دکھاوا بنا رکھا ہے۔ ایک روز میں نے کہا۔ ''شکیل بھائی مجھے یقین ہے کہ آپ بھابی سے عشق کرتے ہیں اسی لیے فراغت ملتے ہی فوراً گھر کو جاتے ہیں۔''

انھوں نے میری بات بیچ میں کاٹ دی ''قطعی نہیں۔ خدا جانتا ہے یہ محبت نہیں، خوف ہے۔ بیوہ کا خوف۔''

ایک شام ہم خوب مرغن کھانا کھا کر واپس لوٹے۔ بھنا گوشت اور نہاری کچھ زیادہ ہی مسالے دار تھے۔ میں اُن کو گھر چھوڑ کر چلا آیا۔ اگلی صبح اُن کا فون آ گیا۔ کہنے لگے۔

''میں ساری رات جاگتا رہا۔ آدھی رات کو خاموشی سے اٹھا، دبے قدموں لان میں چلا گیا اور گھنٹا بھر چہل قدمی کرتا رہا۔ تب کہیں کھانا ہضم ہوا اور طبیعت سنبھلی۔''

جب میں نے کہا کہ بھابی کو اٹھا دیتے تو انھوں نے فون کی دوسری جانب سے لمبی آہ بھری۔

''خوف کی وجہ سے بیوہ کو نہیں اٹھایا۔''

عبداللہ حسین کا انٹرویو چھپا جس میں انھوں نے شادی کو عمر قید قرار دیا تھا۔ اُس دن سے عبداللہ حسین صاحب کی دانائی کے معتقد ہیں۔

حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کی زندگی میں جو نظم، گھر میں سلیقہ، بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور سعادت مندی اور اخراجات میں اعتدال ہے وہ ان کی بیگم صاحبہ کی وجہ سے ہے۔

ایک روز اُن کے شاگرد میر ابراہیم (میر شکیل الرحمان، جنگ، جیو والے کے برخوردار) نے اُن سے پوچھا کہ بہترین جوڑے کون

سے ہو سکتے ہیں تو بے اختیار بولے’’اگر شرع اور معاشرتی روایات اجازت دیتیں تو بہن بھائی، کیوں کہ دونوں آپس میں حقیقی محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دکھ نہیں دے سکتے۔‘‘

اِنسانی ذہن کے مشاہدے کے دوران بہت سے دل چسپ حقائق سامنے آئے۔ ایک امر ابتدا میں انھیں حیران کرتا تھا، بعد میں اُسے انسانی فطرت کرشمہ سازی کے طور پر سمجھ گئے۔

ایسے کئی واقعات ہیں جہاں نیک اور راست والدین کی اولاد حد درجہ عیاش اور بعض صورتوں میں جرائم کی دنیا کی باسی نکلی۔ اس کے برعکس ایسے قصوں کی بھی کمی نہیں جہاں اخلاقی کج روی کا شکار والدین کی اولاد ردِ عمل میں یا دیگر عوامل کی بنیاد پر فرماں بردار اور نیک نکلی۔ اسی لیے یہ کہاوت اعتبار حاصل کر جاتی ہے کہ اولاد آزمائش بھی ہے اور سہارا بھی۔ بہترین ماحول میں سے بھی خراب اولاد برآمد ہو جاتی ہے اور دیکھ بھال کر شادی کرنے سے بھی خلافِ مزاج شریکِ حیات مل جاتا ہے۔

اُن کا کہنا ہے کہ دنیا میں ہر جوڑا غلط بنا ہے۔ ایک روز میں نے محتاط الفاظ میں اختلاف کیا اور کئی ایسے لوگوں کی مثال دی، بہ شمول معروف ادیبوں کے، جو کام یاب اور خوش گوار شادی شدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ میری بات سن کر انھوں نے فوراً جواب دیا۔

’’انسانوں میں بھی گدھے ہوتے ہیں۔ جن کی آپ مثال دے رہے ہیں یہ سب گدھے ہیں۔ گدھا پن ایک مزاج اور ذہنی کیفیت کا نام ہے۔‘‘

ایک روز ہم ایک جاپانی ریستوران میں سُوشی کھانے کے ارادے سے بیٹھے تھے۔ جاپانی ریستورانوں کا کراچی میں خاصا کام یاب کاروبار ہے۔ اس میں کھانے کے لوازم بہت مختلف اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ ہمارا آرڈر آنے میں وقت تھا۔ بلندی پر واقع ریستوران کی شیشے کی دیوار گیر کھڑکی سے کراچی کا خوب صورت منظر دل موہ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اوپر سے یا دور سے مناظر کتنے خوب صورت لگتے ہیں، اصل حقیقت تو قریب جانے یا اندر اُترنے پر پتا چلتی ہے۔ اسی دوران شکیل بھائی نے کھنکھار کر مجھے سامنے کی جانب متوجہ کیا۔ سامنے ایک جاپانی جوڑا بوتل سے سرخ انگوری شراب (ریڈ وائن) کانچ کے مخصوص گلاسوں میں ڈال رہا تھا۔ میں نے اسے معمول کی بات جان کر شکیل بھائی کی جانب دیکھا تو انھوں نے حسرت سے اپنے ایک پرانے دوست کو یاد کرتے ہوئے کہا’’ کیا کیا لوگ تھے جو ہم میں سے اُٹھ گئے۔ وہ ’دوسرے لوگ‘ تھے۔ ہمارے ایک دوست ہوا کرتے تھے، بلا کے وضع دار تھے، کمال کا نستعلیق مزاج پایا تھا۔ کراچی بھی ایک دور میں کیا شان دار شہر تھا۔ کھلی شاہ راہیں اور پُرسکون ماحول، تمیز دار اور خوش ذوق لوگ اور پھلتا پھولتا کاروبار۔ کوئی کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ یوں بھی یہاں ہندو، عیسائی، پارسی اور ایرانی خاصی تعداد میں آباد تھے جو شہر کو کثیر الثقافتی رنگوں سے رنگین کر دیتے تھے۔ بات کچھ یوں ہے کہ ہمارے دوست نے ایسا فرماں بردار بیٹا پایا تھا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ ہمارے دوست کراچی کے ساحل سے ہر وقت چلنے والی نرم ہوا میں شام کو بالکونی یا ٹیرس پر بیٹھے سورج کے غروب ہونے کا نیلا نارنجی منظر دیکھتے ہوئے وائن کے گھونٹ بھرتے رہتے۔ ان کے مشروبات گھر ہی کے تہ خانے میں تیار ہوتے تھے۔ ان کا فرماں بردار بیٹا دل جمعی سے اپنے والد کے لیے شراب کشید کیا کرتا تھا۔ سو سارا انتظام گھر ہی میں تھا، باہر خوار ہونے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔‘‘

ایسے وضع دار والد اور تابع فرمان بیٹے کی مثال، میں نے پہلے نہ سنی تھی۔

ایک روز ایک صاحب ان کے دفتر میں صبح کے وقت سنانے لگے۔

’’میں کل رات گئے خمار کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا کہ پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔ میرا منہ سونگھ کر کہنے لگے کہ جرم اور گناہ دونوں کر رہے ہو۔ تمھیں حوالات میں بند نہ کر دیا جائے۔ ایسے میں میرے ذہن میں فلاں فلاں آیاتِ مبارکہ آئیں جن میں حرمتِ خمر کا تذکرہ ہے۔ میں نے اُنھیں وہ آیات سنا کر بحث میں ایسا الجھا لیا کہ وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور نکل آیا۔‘‘

یہ سن کر شکیل بھائی نے بیزاری سے کہا۔

''اُن نالائقوں کو آپ کوئی سی آیاتِ مبارکہ سنا دیتے، فرق کیا پڑتا تھا۔''

ایک مرتبہ شکیل بھائی کو پولیس نے زیبرا کراسنگ سے آگے گاڑی کھڑی کرنے پر روک لیا۔ پولیس والے نے ان کے پیشے کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ''جیو'' چینل کے لیے کام کرتا ہوں۔ پولیس والے نے درشتی سے پوچھا کہ ''سما'' چینل میں کام کیوں نہیں کرتے۔ شکیل بھائی نے پوچھا۔ ''سما میں کیوں؟'' پولیس والا یہ سن کر گہری سوچ میں پڑ گیا اور پھر بے اختیار بولا ''واقعی، کیوں؟'' اتنی دیر میں شکیل بھائی یہ کہہ کر ''جیو سے میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور احترام کا رشتہ الگ ہے'' وہاں سے اُسے سوچتا چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

ادب، عمدہ پکوان کے علاوہ انھیں کھیل سے بے حد دلچسپی ہے۔ اچھے میچ کے لیے کوئی بھی مصروفیت چھوڑ سکتے ہیں۔ کرکٹ کے علاوہ فٹ بال اور ہاکی، بھی بے حد پسند ہیں۔ ایسا بہت مرتبہ ہوا کہ میں نے فون کیا تو رسمی علیک سلیک کے بعد کہنے لگے ''ٹی وی پر میچ چل رہا ہے، آپ بھی دیکھیے۔'' میں اشارہ سمجھ جاتا ہوں۔ اچھی محفل ہو، کوئی ہوٹل ہو یا گھر انھیں میچ کی فکر رہتی ہے۔ یا تو کسی سے اسکور پوچھیں گے یا کسی ٹی وی پر چلتا میچ دیکھ کر وہیں رک جائیں گے۔

ایک عادت ان کے مزاج کا مستقل حصہ بن چکی ہے۔ وہ ہے ان کا دوپہر کھانے کے بعد کا ''قیلولہ۔'' غالباً اس کی وجہ ان کا ماضی میں رات گئے تک جاگ کر لکھنا پڑھنا اور دوپہر میں نیند پوری کرنا ہے۔ یہ عادت اس حد تک راسخ ہے کہ گرم و مرطوب علاقوں سے ہٹ کر برطانیہ ایسے ٹھنڈے ملک میں بھی وہ قیلولہ کرتے رہے ہیں۔ دوپہر سے لے کر دیر سہ پہر تک وہ فون نہیں اٹھاتے، اپنے دفتر کے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیتے ہیں اور گھنٹے دو گھنٹے میں نیند پوری کر کے تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ یہی عادت میں نے بہت سے دوسرے صحت مند طویل عمر پانے والے افراد میں دیکھی ہے۔ دوپہر کی نیند کے بعد گویا انسان ایک نئے دن کا پوری بشاشت سے آغاز کرتا ہے۔

بادلِ نخواستہ کبھی قیلولہ نہ کر پائیں تو شام بھر طبیعت مکدر اور بوجھل رہتی ہے۔ اگر احباب کا رش ہو تو بھی ایک کونے میں نیم دراز ہو جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

یہ عادت لیبیا سے لے کر اسپین تک عرب ممالک سے لے کر ہندوستان تک ایک باقاعدہ روایت رہی ہے۔ برطانوی راج میں دوپہر کے آرام کے لیے دفاتر سے ملحقہ آرام کمرے بنائے جاتے تھے۔

ان پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب دوپہر کا آرام تو ایک جانب، رات کی نیندیں اُن سے دور ہو گئی تھیں۔ ہر دم کھلکھلانے والے وضع دار ادیب خاموش سے ہو گئے تھے انھیں ''چپ'' ہو گئی تھی۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب اُن کا پال پوس کر جوان کیا ''سب رنگ'' اُن سے جدا کر دیا گیا تھا، اُن کی اولاد ''بازی گر'' کو مختلف احباب کچے انداز میں لکھنے لگے تھے۔ تب انھیں میں نے حد درجہ بے چین دیکھا۔ البتہ اُن کی زبان سے سخت کلمات تب بھی نہ سنے۔

یہ ایک دل گیر و رنجور کر دینے والی داستان ہے۔

ملک محمد اسلم، شکیل بھائی کے قریبی دوست تھے۔ اُن کی دبئی میں کتب اور اخبارات کی خاصی بڑی ایجنسی تھی۔ دونوں کا ابتدائی تعلق کاروبار کے حوالے سے تھا جو بڑھ کر گہری دوستی میں بدل گیا۔ دونوں میں جہاں گردی کا شوق مشترک تھا، سو غیر ممالک کے بہت سے سفر اکٹھے کیے۔ ملک محمد اسلم کو اپنا بھائی، دوست، محسن کہتے ہیں۔ اُن کے انتقال پر وہ بہت روئے۔ ان کے گھر میں ایک کمرا ملک صاحب کے نام سے موسوم تھا۔ ملک صاحب جب بھی کراچی آتے ہفتوں، مہینوں شکیل بھائی کے ہاں قیام کرتے۔ شکیل بھائی کہتے ہیں کہ ان جیسا فیاض، درد مند آدمی انھوں نے پہلے نہیں دیکھا۔ انھی ملک صاحب کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے محمد راشد ملک کو کراچی سے رسالے اور اخبار کی اشاعت کا شوق چرایا۔ ان دنوں سب رنگ کی عدم تواتری سے شکیل بھائی مالی طور پر شکستہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک معاہدے کے تحت سب

رنگ راشد ملک کے حوالے کر دیا۔ پکے کاغذ پر معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت ایک سال بعد سب رنگ کو باقاعدگی سے شائع کرنا تھا۔ عدم تواتر ہی میں بے شک خاصی کمی ہوئی لیکن ہزار کوششوں کے بعد شکیل بھائی ماہ بہ ماہ کرنے میں ناکام رہے۔ وجہ وہی معیار تھی۔ وقت پر نکالنے کے چکر میں سب رنگ کے معیار پر آنچ آنے کا اندیشہ تھا۔ شکیل بھائی کو نا گوارا نہیں تھا۔ معاہدے کو دوسرا سال گزر گیا۔ نئے مالک کا اصرار تھا کہ پرچا جیسا تیسا ہی ریگولر ہونا چاہیے۔

شکیل بھائی نے آزاد ماحول میں کام کیا تھا۔ یہ دباؤ ان سے برداشت نہیں ہوا۔ انھوں نے راشد ملک سے کہا کہ مالک تو اب آپ ہی ہیں۔ میں الگ ہو جاتا ہوں۔ آپ نکال لیجیے۔ معاہدے کی رُو سے شکیل بھائی کو دس لاکھ روپے ادا نہیں کیے گئے۔ حالاں کہ معاہدے میں طے ہو چکا تھا کہ دس لاکھ روپے پیشگی دیے جائیں گے۔ باقی دس لاکھ ڈیکلریشن کی تبدیلی پر۔ یہ تبدیلی دو ماہ بعد ہو گئی تھی۔ دو سال تک شکیل بھائی منتظر رہے کہ یہ رقم انھیں مل جائے۔ الگ ہو جانے کے بعد کئی بار تقاضا کیا۔ انکار کبھی نہیں کیا گیا لیکن ادائی آج تک نہ ہوئی۔ معاہدے کی قانونی دستاویز شکیل بھائی کے پاس موجود ہے۔ بہت سے احباب نے کارروائی کے لیے اُکسایا لیکن شکیل بھائی نے اپنے دوست محمد اسلم ملک کے لحاظ میں اُن کے بیٹے سے ایسی کسی تلخ قسم کی صورت حال سے اجتناب کیا اور بات آسمانوں پر چھوڑ دی۔

سب رنگ کے نئے سیٹ اَپ سے شکیل بھائی کا تعلق کوئی سوا دو سال رہا۔ اُن کے علیحدہ ہو جانے کے بعد رسالہ جاری رکھا گیا اور تسلسل قائم رکھنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن اب یہ رسالہ ایسی ریل گاڑی کی طرح تھا جو انجن کے بغیر تھا۔ بازی گر ایک مسئلہ تھی۔ جو سلسلہ 1975 سے شکیل بھائی لکھ رہے تھے اور قریباً پانچ ہزار صفحات لکھ چکے تھے۔ ظلم یہ کیا گیا کہ اُس پر کرایے کے محرروں سے طبع آزمائی کرائی گئی۔ قانونی طور پر بھی یہ ایک غلط اقدام تھا اور شکیل بھائی آسانی سے منصفوں کو اپنے قانونی حق پر قائل کر دینے میں کام یاب ہو جاتے لیکن وہ اپنے مرحوم دوست سے خاص قسم کے بلکہ دلی تعلق کی وجہ سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ بازی گر جاری رکھنے کے لیے کئی ادیب آزمائے گئے، قارئین نے واضح طور پر تبدیلی محسوس کر لی۔ ڈگر سے ہٹتا سب رنگ نکلتا رہا، سب رنگ گرتا رہا، آخر اُسے بند کر دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اپنی آنکھوں کے سامنے شکیل بھائی نے سب رنگ کا زوال دیکھا۔ ان دنوں جب میری شکیل بھائی سے ملاقات ہوتی تو میں انھیں بے طرح مضطرب پاتا۔ اُن کو کسی پہلو چین نہ آتا تھا۔ اپنی فطری برداشت اور وضع داری کی وجہ سے وہ اِس کا اظہار کم ہی کرتے البتہ ان کی ظاہری بے چینی سب کچھ عیاں کر دیتی۔

ایک شام ہم کھانے پر اکٹھے ہوئے۔ دل کے بہلانے کو بے شمار باتیں ہوئیں۔ دنیا جہاں کے قصے کہانیاں بیان ہوئے، تازہ لطائف کا تبادلہ ہوا۔ اس دوران ایک لطیفے پر ہنستے ہنستے شکیل بھائی یک دم خاموش ہو گئے۔ توقف کے بعد گلوگیر لہجے میں بولے۔

’’آہ، ہائے۔ سنا ہے ان لوگوں نے اِس مرتبہ بٹھل کو بوری میں بند کر دیا۔ بٹھل کی روح تڑپتی ہوگی۔‘‘

ایک تذکرہ مشہور و معروف مصور اقبال مہدی کا بھی۔

اقبال مہدی کے باریکی، محنت اور عرق ریزی سے بنائے گئے پورٹریٹ اور تصاویر پاکستان کے فائیو سٹار ہوٹلوں کے علاوہ مصوری کے شائق متمول لوگوں کے ہاں بھی ایک جنسِ نایاب کے طور پر سجے ہوتے ہیں۔ اقبال مہدی روشنائی اور قلم سے تفصیلی جزئیات نگاری کے ساتھ مصوری کرتے تھے کہ دوشیزہ کی پلکوں کے سائے تک اُس کے رُخساروں پر نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ مشرقی حیا سے سمٹی لڑکیوں کے پورٹریٹ بنانے کی وجہ سے مشہور ہوئے وگرنہ اس کے علاوہ بھی ان کا خاصا کام موجود ہے۔

مصوری سے دل چسپی ہونے کے باعث مجھے اقبال مہدی کا ذاتی اور ایسا ذخیرہ جو برائے فروخت نہ ہو دیکھنے کی خواہش تھی۔ شکیل بھائی مجھے اقبال مہدی کے گھر لے گئے۔ وہاں مرحوم کی بیوہ اور بیٹی اُنھیں انتہائی تپاک سے ملے۔ اُن کی نوعمر بیٹی کو تو میں نے اپنے باپ کی یاد میں بے طرح بے چین و غم گین دیکھا۔

اقبال مہدی کا احوال جاذبِ توجہ ہے۔ فطری و پیدائشی مصور اقبال مہدی رئیس امروہوی کے عزیز اور غیر معروف فن کار تھے۔ ان کی شکیل بھائی کے ساتھ دوستی تھی۔ جب ’’سب رنگ‘‘ شروع ہوا تو انھوں نے چند اسکیچ بنانے شروع کیے۔ آہستہ آہستہ کہانیوں کے علاوہ رسالے کے تمام اسکیچ وہی بنانے لگے۔ اس دوران ان کا ہاتھ بھی رواں ہوگیا اور تصاویر میں زندگی کی رو بھی دوڑنے لگی۔ وہ افسانے، تراجم، ناول پڑھتے، اُن کے کرداروں، ماحول، جزئیات کو اپنے تخلیقی جوہر کے حوالے کردیتے جو اُسے پال پوس کر پختہ شکل میں اسکیچ اور آئل پینٹنگ کی صورت میں سامنے لے آتا۔

جوں جوں ’’سب رنگ‘‘ ترقی کرتا گیا، اقبال مہدی کا شہرہ بھی ملک بھر میں پھیلنے لگا۔ اب اُن کی تصاویر کی مانگ ’’سب رنگ‘‘ سے ہٹ کر بھی ہونے لگی۔ اقبال مہدی، شکیل بھائی کے ساتھ، ان کے گھر ہی میں رہتے تھے۔ 1972 میں شکیل بھائی کی شادی ہوئی تو اقبال مہدی اپنی شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ لڑکی کی تلاش تھی اور ایک روز ایسا ہوا کہ اقبال مہدی کو ایک لڑکی پسند آگئی۔ دومنزلہ مکان کی بالائی منزل پر شکیل بھائی رہتے تھے۔ فرشی منزل پر فلمی دنیا کے مشہور ہدایت کار، ہندستان میں جاگرتی، پاکستان میں بیداری کے کام سے یادگار فلمیں بنانے والے رفیق رضوی کا قیام تھا۔ ان کی بھتیجی اپنے چچا کے ہاں چند روز کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اُس روز وہ گھر کے آنگن میں بنی ہودی یا ہودیا میں برتن دھورہی تھی کہ اقبال مہدی نے بالائی منزل سے اُسے دیکھ لیا اور ایسے فریفتہ ہوئے کہ اُسی لڑکی سے شادی کے لیے اڑ گئے۔ مشکل یہ تھی کہ رفیق رضوی کی بیگم تو شیعہ تھیں لیکن ان کے سسرال والوں کا سارا گھرانا سنّی العقیدہ تھا۔ اقبال مہدی نے پہلے تو بیگم رفیق کی منت سماجت کی۔ انھوں نے اقبال مہدی کی بے قراری دیکھ کے بات پیش قدمی تو بہر حال کی لیکن لڑکی کے گھر والے شدید قسم کے مذہبی لوگ تھے۔ بات بن نہ سکی تو اقبال مہدی نے حیرت آمیز جرأت کی۔ بذات خود لڑکی کے گھر پہنچ گئے اور یقین دلانے کا ہر جتن آزمایا کہ وہ یقیناً شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں لیکن اصل میں نہ وہ سنّی ہیں نہ شیعہ۔ وہ تو انسان دوست ہیں اور انسانیت ہی ان کا عقیدہ ہے۔

اقبال مہدی ایک غیر جانب دار نوجوان تھے، دوسرے ان کا مستقبل تاب ناک تھا۔ لڑکی والے رام ہوگئے۔ اب اقبال مہدی کو شادی کی جلدی ہوئی۔ بیس پچیس روز میں شادی کے ملبوسات تیار ہوئے۔ زیور خریدے گئے۔ ان سارے کاموں میں شکیل بھائی کی بیگم روز وشب مصروف رہیں۔

رمضان کے آخری ہفتے میں اچھی خاصی دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ اور دلہن کے لیے شکیل بھائی کے گھر کا ایک کمرا مخصوص کردیا گیا۔ دونوں جوڑوں نے ایک ساتھ ملک کے بالائی علاقوں کا سفر کیا۔

دنیا کی روایت رہی ہے کہ ساتھ رہنے کی کئی وجوہ رستے جدا کرنے کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ سوان کے رستے بھی الگ ہوگئے۔ بعد میں اقبال مہدی نے اپنی منفرد مصوری سے بہت نام پیدا کیا۔ وہ بڑے فطری قسم کے مصور تھے۔ بڑے متلون مزاج، سرکش عاقبت نااندیش۔ آخر انھیں کثرتِ بادہ نوشی لے بیٹھی۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی تصاویر کروڑوں روپوں میں فروخت ہوئیں۔ کاش وہ اپنی رخشِ عمر کو لگام دے لیتے۔

اقبال مہدی کے بارے میں ایک چونکا دینے والی حقیقت شاید اُن کے قریبی ترین رفقا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اُن کی شرماتی، لجاتی، ادائیں دکھاتی دوشیزاؤں کا بنیادی خیال وہ امریکی رسالے ’’پلے بوائے‘‘ کے وسطی خصوصی صفحات کی عریاں لڑکیوں سے لیتے تھے۔ گویا وہ ان کی ’’نیوڈز‘‘ ٹھیرتی تھیں جنھیں وہ لباس پہنا کر فن کارانہ مہارت سے حسبِ خواہش تاثرات دے دیا کرتے تھے۔ ’’پلے بوائے‘‘ ایک ایسا رسالہ تھا جو بے لباس خواتین کی تصاویر شائع کرنے کے حوالے سے رسوا و معروف ہوا۔ اُس کے پہلے ہی شمارے میں امریکی اداکارہ مارلن منرو کی تصاویر تھیں۔ یہ وہی مارلن منرو ہے جس سے بعدازاں امریکی صدر جان ایف کینیڈی کا معاشقہ بھی چلا۔ ’’پلے بوائے‘‘ کو سنجیدگی سے تب لیا جانے لگا جب اُس میں اہم ادیبوں کی تحریریں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ اُس کے لیے لکھنے والوں میں

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے ساتھ شامل ہونے
کے لیے ہم سے رابطہ کر سکتے
ہیں ہمیں امید ہے آپ کو یہ
کاوش پسند آئے گی

منیجنگ ڈائریکٹر: 03056406067

انتظامیہ

:03340120123/03168782185

03478848884:pj8o

نوبوکوف (لولیتا کے مصنف)، پی جی ووڈ ہاؤس (برطانوی مزاح نگار)، ہاروکی موراکامی (جاپانی نژاد ناول نگار) اور مارگریٹ ایٹ ووڈ (کینیڈین خاتون ادیبہ) ایسے اہم ادیب شامل تھے۔ حیران کن امر ہے کہ 1970 میں اس کا بریل ایڈیشن شائع ہونا شروع ہوا۔ گویا نابینا لوگ بھی اُنگلیوں کی پوروں کے رستے اس کے قارئین میں شامل ہو گئے۔

انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کے حوالے سے ایک مرتبہ ہمارے بیچ مختلف موضوعات پر بات چل نکلی۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ بہت سے انسان ایسے راز قبر میں لے کر جاتے ہیں جو وہ کسی سے بیان نہیں کر سکتے۔ اس پر انھوں نے گرہ لگائی ''ایسے راز جو وہ خود سے بھی بیان نہیں کر سکتے۔''

انسانی ذہن کے حوالے سے اپنے ایک دوست اور کراچی کے ایک مشہور و معروف انگریزی زبان کے صحافی کا واقعہ بیان کیا۔

وہ صحافی ان کے قریبی دوست تھے۔ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے کہ وہ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک جانب سے کسی لڑکی کی چیخ و پکار کی آواز سنائی دی۔ قدرتاً سبھی اُس جانب متوجہ ہو گئے۔ جب معاملہ کھلا تو عجب بات سامنے آئی۔ اُس لڑکی کو اُس کی ایک عزیزہ بہانے سے ہوٹل لائی تھی۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں اُس نے لڑکی کو ایک مرد سے متعارف کروا کر زبردستی کرنے کی کوشش کی تو فطرتاً شریف لڑکی نیچے لابی کی جانب بھاگی۔ یہیں وہ صحافی کھانا کھا رہے تھے۔ معاملے کی نزاکت کو کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ بیچ میں کود پڑے اور للکارا کہ کوئی اُس لڑکی کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ اُس لڑکی کے کردار کی پختگی سے وہ صحافی اتنا متاثر ہوئے کہ بعد ازاں اُس سے شادی رچالی۔۔ شادی کے بعد اُس لڑکی نے ایک مکمل وفا شعار اور گھریلو بیوی کا کردار ادا کیا۔ اِس حد تک کہ صحافی کی تحریروں کے لیے وہ مواد اکٹھا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی۔ یہ علیحدہ واقعہ ہے کہ وہی صحافی بعد ازاں راست راہ سے بھٹک کر کج رو ہو گئے۔

ایک مرتبہ میں نے شکیل بھائی کو کھانے پر مدعو کیا۔ میرے اہلِ خانہ سالانہ تعطیلات کے حوالے سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ جب میں نے شکیل بھائی کو بتایا کہ میرا گھریلو ملازم کھانا تیار کرے گا تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اُن کی بات ملازم سے کرواؤں۔ میں نے فون ملازم کو تھما دیا۔

ملازم خاصی دیر فون سن کر ''ہوں، ہاں'' کرتا رہا۔

جب میں نے فون بند ہونے کے بعد اس کی بابت پوچھا تو بولا ''صاحب کہہ رہے تھے کہ میں پیاز کتر کر رکھ دوں، لہسن کا ملیدہ تیار کر دوں، گرم مسالے الگ کر کے رکھ دوں، فلاں فلاں مسالا اگر گھر میں نہیں تو بازار سے لے آؤں، پٹھ اور دستی کا گوشت تیار کر رکھوں اور آلو خاص طریقے سے کاٹ لوں۔ چولھے پر کچھ نہ چڑھاؤں۔''

میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔

شکیل بھائی تشریف لائے تو کھانے میں کچھ بھی تیار نہ تھا۔

آتے ہی وہ باورچی خانے میں چلے گئے اور مجھے حکم صادر کر دیا کہ میں اندر نہ آؤں۔

جب وہ باہر نکلے تو آلو اور مسالا بھونے جانے کی مہک باہر تک پھیل کر بھوک بڑھا رہی تھی۔

وہ آ کر بیٹھے اور بیٹھتے ہی دوبارہ اٹھ کر باورچی خانے کی جانب یہ کہتے ہوئے چل دیے ''ہم اس نالائق پر قطعی طور پر بھروسا نہیں کر سکتے۔''

خاصی دیر بعد وہ باہر آئے تو خوشی ان کے چہرے سے مترشح تھی۔ جب کھانا لگا تو بکرے کے بھنے گوشت سے دیگی کھانے کی مہک اٹھ رہی تھی، آلو مسالے کی قاب ساتھ میں رکھی تھی اور رائتہ بھی مخصوص انداز میں تیار تھا۔

گوشت خستہ، نرم گھلتا ہوا لیکن ٹوٹا نہ ہوا، مہک آور لذیذ تھا! ایسا عمدہ ذائقہ دار سالن میں نے پہلے نہ کھایا تھا۔ ساتھ میں آلو مسالہ

اور رائتہ گویا کسی اور دنیا کے کھانے تھے، کہیں اور تیار ہوئے تھے۔

کھانے کے بعد ٹھنڈی ربڑی کھاتے ہوئے کہنے لگے" بیوہ کو پتا نہ چلے کہ میں نے آپ کے ہاں یہ کام شروع کر دیا ہے۔"

یہ عمل کئی ایک مرتبہ دہرایا گیا، شکر ہے آج بھی بھابی اس سے بے خبر ہیں۔

ایک اور ایسی ضیافت میں، جو میرے ہاں منعقد تھی لیکن گویا اُن کی جانب سے تھی کہ سبھی کچھ اُن کا تیار کردہ تھا، ایک مشترکہ دوست میرے کان میں کہنے لگے" یہ کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم دورِ حاضر کے اہم ترین مدیر و ادیب کے ہاتھ کا بنا ہوا عمدہ کھانا کھا رہے ہیں۔"

میں نے تائید کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔" یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اُن کے ہاتھ کی تحریر زیادہ باکمال ہے یا پکوان!"

ایک بار لاہور سے آتے ہوئے میں نے پوچھا کہ کچھ لیتا آؤں تو کہنے لگے۔" آپ وہاں کی نسبت روڈ کے ہریسے کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ لیتے آئیے گا۔"

اگلی ملاقات میں ہریسہ کھاتے ہوئے مایوس لہجے میں بولے۔" حیدر آباد دکن میں ہریس ہوتا تھا۔ یہ وہ تو نہیں۔"

ایک موسمِ بہار میں ہم لاہور میں اکٹھے تھے۔ انھوں نے ایک معروف جگہ کا کھانا کھانے کی فرمائش کی۔ جب میں نے جب گزارش کی کہ وہاں بیٹھنے کا اچھا انتظام نہیں تو کہنے لگے۔

" تازہ گرم کھانے کا اصل لطف چولھے سے اُترتے ہی آتا ہے۔ دوبارہ گرم کیا ہوا کھانا اپنی لذت کھو بیٹھتا ہے۔"

وہاں برلبِ سڑک کھانا کھاتے ہوئے بہت خوش ہوئے اور لذیذ کھانے کے نوالے لیتے ہوئے دل چسپی سے گاہکوں اور راہ گیروں کی حرکات و سکنات دیکھتے رہے۔

بریانی کی بہ نسبت پلاؤ پسند کرتے ہیں۔ شروع میں جب میں نے کہا، پلاؤ کراچی میں زیادہ شوق سے نہیں کھایا جاتا بلکہ پنجاب میں پسند کیا جاتا ہے تو بے ساختہ بولے۔" مراد آباد پنجاب کے ساتھ ہی تو ہے۔ میں بھی تو پنجاب ہی سے ہوں"

پھل پسند نہیں کرتے۔ شروع میں خاصی معاشی آزمائش میں وقت گزارا سو پھل ایسے منہگے شوق کی عادت ہی نہ پڑی۔ یہ عادت آج تک قائم ہے۔

ایک مرتبہ ہم معروف مصور تصدق سہیل صاحب کے ہاں گئے۔ وہ شکیل بھائی سے مل کر کھل اُٹھے۔ تصدق صاحب ستاسی برس کی عمر سے بڑھ کر ہیں۔ خوب حسن پرست اور عاشقِ زندہ دل ہیں۔ سو اپنی داستان ہائے عشق بیان کیں۔ جب وہ یہ سب سنا رہے تھے تو شکیل بھائی انھیں رشک سے دیکھ رہے تھے۔ ملاقات کے بعد مجھ سے کہنے لگے" میں نے آج تک اتنا جوان بڈھا نہیں دیکھا۔ ان سے پوچھیے گا کہ اس عمر میں بھی اتنی توانائی کہاں سے پائی؟"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ آہ بھر کر بولے۔" شادی جو نہیں کی۔ یہی ان کی زندہ دلی اور جوانی کا راز ہوگا۔"

بلاشبہ شادی کے حوالے سے مذاق کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کی عملی زندگی ان کی بیگم سے محبت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ خود جی جان سے محنت کی تاکہ بیوی بچوں کو زندگی کی ہر سہولت فراہم کر سکیں۔ بیگم تو بیگم، اپنے سسرال کی اِس حد تک عزت کرتے اور ان کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے چورانوے سال کے عمر رسیدہ سسر بیمار پڑ جائیں تو فوری ان کی تیمارداری کو چلے جاتے ہیں۔ سسرال کے دور پار کے عزیزوں کی مدارات میں اپنی پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔ اگر ان سے یہ سب بیان کیا جائے تو جھینپ جاتے ہیں اور بات کو بدلنے کے لیے عادتاً کہہ دیتے ہیں" بیوہ کا خوف ہے جو یہ سب کرواتا ہے۔"

اپنے تینوں بچوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلائی ہے۔ بیٹا برطانیہ سے تعلیم حاصل کر کے بینکاری کے شعبے میں اہم عہدے پر فائز ہے۔ بڑی بیٹی نے امتیاز سے ایم ایس کیا۔ اس کے شوہر ملکی سطح کے معیشت دان اور بینکاری میں معتبر نام رکھتے ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی

تعمیرات اور فنونِ لطیفہ میں تعلیم یافتہ ہیں۔

شکیل بھائی نے اولاد کی تعلیم و تربیت اور اُسے روزگار کے وسائل فراہم کرنے کے لیے پس انداز کی گئی آمدنی سے خریدی گئی جائداد کا بڑا حصہ فروخت کیا ہے۔

میں نے انھیں ''سب رنگ'' چھن جانے کے بعد سب سے زیادہ اداس اکلوتے بیٹے شرجیل کے بہ سلسلۂ روزگار کینیڈا چلے جانے پر پایا۔ جب اداسی حد سے گزر جاتی ہے تو اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں ''وہاں چلے جانا اُنھی کے لیے بہتر تھا۔ یہاں ترقی کے مواقع محدود ہیں۔''

اب تو یہ عالم ہے کہ بیٹے سے زیادہ پوتے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی آن کھڑا ہوا ہے کہ گھر کے معمولی پلمبر، مستری کے کاموں کے لیے، گاڑی ٹھیک کروانے کے لیے، سودا سلف لانے کے لیے خود ہی بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی مردانہ سہارا اور ساتھ میسر نہیں سو گھر کے سارے کام اپنے کندھوں پر لے رکھے ہیں۔ جب کبھی میں دل جوئی اور ہاتھ بٹانے کی کوشش کروں تو مسکرا کر کہتے ہیں ''کاموں سے دل لگا رہتا ہے۔''

بیٹے کے لیے بھی ''شجو کہتا ہے'' کی جگہ ''شجو کہتے ہیں'' استعمال کرتے ہیں۔

اُن کے ساتھ تعلقِ خاطر کے باعث اور اُن کی وضع داری اور شائستگی کی وجہ سے میرے مزاج میں ایک تبدیلی پچھلے برسوں میں غیر محسوس انداز میں دَر آئی ہے جو اس معاشرے میں ناموزوں ہے۔ اب اونچی، ناشایستہ بات یا اوچھی حرکت طبیعت پر غیر ضروری بوجھ ڈالتی ہے۔

کبھی کبھار دل گرفتہ تو ہوتے ہیں مگر جلد اپنا مزاج بحال کر کے مسکرانے لگتے ہیں۔ چند پرانی محبتیں یاد کرتے ہیں اور آیندہ کے منصوبے باندھنے لگتے ہیں۔

شکیل بھائی نے خود محبتیں کم کی ہیں، ان سے عشق زیادہ کیے گئے۔ بلکہ یہ مناسب ہوگا کہ ان کی تحریروں کے باعث بہت سی خواتین ان کی جانب مائل ہوتی رہیں۔

ایک شام ساحلِ سمندر پر اُن کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے کئی رومانوی جوڑے اپنے آپ میں مگن بیٹھے نظر آئے۔ میں نے شکیل بھائی سے پوچھا کہ اُنھیں حسن کس عمر میں زیادہ متاثر کرتا رہا ہے۔ میری بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے ''مجھ پر عمر طاری نہیں ہوئی۔ میں تو آج بھی اپنے آپ کو کل کا لونڈا سمجھتا ہوں۔ لگتا ہی نہیں، اتنے برس گزر گئے۔ مجھے تو آج بھی ہوا میں لہراتی گھنی زلفیں اور چاند چہرے اسی طرح متاثر کرتے ہیں جیسے تب کرتے تھے جب میں نے ایک لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مدرسے میں سورۃ مزمل کا وِرد کیا تھا اور اُستاد سے مار کھائی تھی۔''

شکیل بھائی کی چاہت میں جہاں کالج ہوسٹلوں کی لڑکیاں مشترک محبت نامے لکھتی تھیں، ان کی تصاویر پر لپ اسٹک کے نشان ثبت کرکے بھیج دیتی تھیں، شادی شدہ خواتین بھی مائل ہوجاتی تھیں وہیں اُن کا ''سب رنگ'' سے عشق سب پر بازی لے گیا۔

''اتنا وقت ہی نہ تھا۔ نہ ہی توجہ کہیں اور بھٹکتی تھی کہ عشق کرتا۔ میرا ابھی کچھ ادب تک محدود رہا ہے۔ ایک جنون تھا یا سودا جو سر میں سمایا تھا۔ ضد میرے مزاج کے اجزا میں اہم جز رہی ہے۔ جب کوئی ارادہ کرلوں تو اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لڑکپن میں صنف مخالف کی جسمانی کشش رومان پر ضرور غالب آجاتی رہی ہے پر عموماً میں ایک منطقی سوچ کا مالک رہا ہوں۔ فیصلے ذہن سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ وقتی جذبات میں بہا ضرور ہوں پر زیادہ دور تک نہیں گیا۔ وہ ہمارے دوست جون بھائی کیا خوب کہہ گئے ہیں۔ ہائے جون بھائی!

کیے تھے عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم "

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ شعروادب پر بات چل رہی ہے۔ ذرا خاموشی آئے تو شکیل بھائی کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے "آہ !جون بھائی۔"

کچھ عرصہ پہلے ایک روز پیٹ میں درد کی شکایت کی۔ درد بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ خون کے اور دیگر ٹیسٹ کروائے گئے۔ آخر میں روح فرسا خبر ملی کہ بڑی آنت کا کینسر ہے۔ اس کا واحد حل یہ تھا کہ بڑی آنت کا سرطان زدہ حصہ کاٹ دیا جائے۔ اعزا واقارب میں تشویش فزوں تر ہوگئی۔ بالآخر آپریشن کرکے آنت کاٹنے کا فیصلہ ہوا۔ جب میں عیادت کے لیے گیا تو بجھی ہوئی مسکراہٹ سے ملے۔

میرا دل کٹ گیا۔

لمحے دنوں میں کٹے اور دن برسوں میں۔

آخر آپریشن کا وقت آگیا۔

میں اُن کی حوصلہ افزائی اور مزاج پُرسی کے لیے اسپتال گیا۔ ان کے گرد اعزا واقارب بیٹھے ہمت بندھا رہے تھے۔ وہ بیچ میں لیٹے آپریشن کا لباس پہنے پھیکی مسکراہٹ مسکرا رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے وقتِ مقررہ کے بعد سب سے رخصت ہونے کی درخواست کی اور آپریشن کا سامان تیار کرکے اُن کو آپریشن تھیٹر لے جانے لگے۔

سبھی تیماردار جانے لگے۔ آخر میں مَیں نے اُن کے ہاتھ تھام کر سادگی میں ہم دردی سے پوچھا۔

"کسی شے کی خواہش ہو رہی ہو، کچھ چاہیے؟"

میری بات سن کر اُن کے چہرے پر مخصوص زندہ شرارتی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ آہستہ سے بولے۔

"کسی حسین خاتون کے قُرب کی خواہش ہو رہی ہے۔"

وہ حسبِ توقع اور معمول کے مطابق، آپریشن سے پہلے ہی بھرپور صحت مند رنگین زندگی کی جانب لوٹ آئے تھے۔

نانگا پربت

تصدق سہیل

چھٹی کے روز، خاموش، سنسان دوپہر کا وقت تھا، اِکّا دُکّا راہ گیر سڑکوں پر درختوں کے سایوں کی پناہ میں چلتے نظر آتے تھے۔ میں نے گھنٹی بجائی، کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی اور فلیٹ کا دروازہ نیم وا ہوا۔ اندر سے ایک بوڑھے صاحب نے باہر جھانکا، مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر تذبذب اُبھر آیا جو کسی اجنبی کو دیکھ کر آ جاتا ہے، پھر اُنھوں نے میرے ہم راہی کو دیکھا اور کِھل اُٹھے اور دروازہ پورا کھول دیا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو ایک مخصوص بساند نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے پنجروں میں مختلف قسم کے پرندے طرح طرح کا شور کر رہے تھے، پلٹ کر بوڑھے میزبان کو دیکھا تو وہ ایک تہ بند نُما کپڑے کو زیریں بدن پر لپیٹے کھڑے تھے۔ چہرے پر کِھلتی مسکراہٹ تھی جس سے اُن کا پورا سراپا روشن ہو گیا تھا۔ پیٹ سے اوپر جسم ننگا تھا، ہاتھوں پر پینٹ کے تازہ گیلے نشان تھے، گول مٹول گورے چہرے پر شریر مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہمیں اپنے اسٹوڈیو کی جانب لے چلے تو ایک بلّی کہیں سے آئی اور ان کے پیروں سے لپٹنے لگی۔ ”شرارتی! باز آ جا۔“ یہ کہہ کر اُنھوں نے بلّی کو پیار سے شُشکارا۔ اس دوران چتکبری، سُرمئی، سیاہ، خاکی اور دیگر رنگوں کی بلیاں فلیٹ میں گھومتی نظر آئیں۔ بلیاں، سبز طوطوں، سفید کبوتروں، رنگین چڑیوں اور رنگارنگ پرندوں کے ساتھ حیران کُن طور پر بقائے باہمی کے تحت ایک چھت تلے زندگی بسر کرتی نظر آ رہی تھیں۔

اندر اسٹوڈیو سورج کی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ اس کی کھڑکی باہر ایک خاک اُڑاتے خالی پلاٹ میں کُھلتی تھی۔ ساتھ میں ایک بیڈ روم تھا جس میں ٹھنڈا اندھیرا تھا۔ اسٹوڈیو میں مختلف پینٹنگز مکمل اور نامکمل حالت میں پڑی خشک ہو رہی تھیں۔ جنگل کے بھیگے مناظر، قرمزی توتے، سفید مینائیں، نیلے مور، سیاہ کوے، کاسنی چونچوں والے انگوری پرندے، عریاں جل پریاں اور داڑھیوں والے مرد گھوڑوں پر سوار سیمابی شگفتگی میں نمایاں تھے۔ چند ہیولے تھے اور کچھ جسے فن کارانہ کج شکلی میں عیاں تھے۔ سب کچھ نیم عریاں یا مکمل عریاں تھا۔ مجھے قرینِ حقیقت گمان ہوا کہ فن کار وفورِ تخلیق میں خود بھی حالتِ برہنگی میں نقاشی کرتا ہوگا۔ یہ گمان کچھ بے جا نہ تھا۔ وکٹر ہیوگو کا سا بے مثل فن کار جس نے 'لا مزریبلز' اور 'ہنچ بیک آف نوٹرڈیم' جیسے بڑے ناول تخلیق کیے جب کبھی تخلیقی قبض کا شکار ہوتا تو ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا یہاں تک کہ بے لباس ہو کر اپنے آپ کو اشیا سے آزاد کر لیتا۔ ہیمنگوے نے کئی شاہ کار عُریاں کھڑے ہو کر ٹائپ کیے۔ ڈی ایچ لارنس نے 'لیڈی چیٹر لیز لوور' ایسی رومانوی تحریر کچھ اِس طور لکھی کہ وہ لباس سے آزاد، شہتوت کے درخت پر چڑھ جاتا اور چند لمحوں بعد اُتر کر ناقابلِ فراموش ناول تحریر کرنے لگتا۔ فہرست طویل ہے، اِنسانی فطرت کی بے انت کج ادائیوں کی طرح۔

آصف فرخی جب پہلی مرتبہ مجھے لیے تصدق سہیل کے ہاں گئے تو شاید اُن کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ خاک سار اُس نقاش کے صنم خانے کا کچھ ایسا حصہ بنے گا کہ سُن سُن کر مزید تشنہ ہوگا، دیکھ دیکھ کر حیراں ہوگا۔ یہ وہی رنگ محل ہے جہاں بعد میں یہ خطاکار، شکیل عادل زادہ اور دیگر مردانِ ادب و فن کو لے گیا اور یہ وہی مے کدہ ہے جہاں بے شمار خوش جمال، خوش ادا اور خوش اندام دوشیزاؤں کو دیکھا۔

زمانہ پلٹتا ہے۔ پرندوں اور جان وروں سے محبت کرنے والے تصدق کی چوتھی یا پانچویں جماعت کا واقعہ ہے جب ننھے تصدق سہیل کو اُس کے استاد نے اقبال کا ایک شعر پڑھایا۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تصدق کو طائرِ لاہوتی کے معنی معلوم نہ تھے چناں چہ ابھی اس کا مطلب معلوم کیا ہی چاہتا تھا کہ اُستاد نے تشریح کر دی۔ ”اقبال نے پرندے کو مخاطب ہو کر کہا ہے کہ اے پرندے اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آزادی جاتی رہتی ہے۔“ چناں چہ وہ سوال تشنۂ جواب ہی رہ گیا۔ وقت گزرنے لگا۔ تصدق سہیل کے افسانے معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ تصدق کے ذہن میں کئی بار آیا کہ اس ترکیب یا پرندے کے بارے میں کسی سے پوچھ لے مگر اپنی کم علمی ظاہر ہو جانے کے خوف نے اُس کی زبان پر لگام ڈالے رکھی۔ تصدق برطانیہ چلا گیا، کئی دہائیاں گزر گئیں، مصوری میں اس نے خاصا نام کمایا۔ نصف صدی بعد وہ واپس ہوا تو لاہور میں زاہد ڈار سے پاک ٹی ہاؤس

نانگا پربت بہ معنی عریاں پہاڑ

[illegible] بہت

ہیں دوستی ہوگئی۔ چناں چہ ایک روز زاہد ڈار کو اعتماد میں لے کر اس پرندے کے بارے میں پوچھ ڈالا۔ زاہد ڈار نے بے یقینی سے تصدق کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''تمھاری عُمر کتنی ہے؟''

''ساٹھ برس سے کچھ اوپر۔'' تصدق نے جواب دیا۔

''اگر ساٹھ برس یہ جانے بغیر گزر گئے تو اب جان کر کیا کرو گے۔'' زاہد ڈار نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔

دل میں کھد بد کچھ ایسی بڑھی کہ اُسی سہ پہر اُس نے انارکلی کا رُخ کیا اور پرندوں کی ایک دُکان پر جا کھڑے ہوئے۔ دکان دار نے تذبذب میں کھڑے دیکھ کر پوچھا۔ ''باؤ جی کیہہ چاہیدا اے؟'' (باؤ جی کیا چاہیے؟)

''طائرِ لاہوتی۔'' تصدق صاحب نے بے یقینی سے کہا۔

دکان دار نے شیدے کو آواز دی۔ ''شیدے باہر آ، وکھ ایہہ باؤ جی کیہ پئے منگدے نیں؟'' (شیدے باہر آ، دیکھ یہ صاحب کیا مانگ رہے ہیں؟)

شیدا باہر آیا۔ پرندے کا نام سُن کر سر کھجایا اور پوچھا۔ ''تارا ہوتی؟''

''او تارا ہوتی دیا پترا اندروں بُلبلاں دا پنجرا چک لیا، باؤ جی آپے ای لبھ لین گے۔'' (او تارا ہوتی کے بچے اندر سے بُلبلوں کا پنجرا اُٹھا لاؤ، صاحب خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔)

''بُلبل نہیں، مجھے لاہوتی چاہیے۔'' تصدق صاحب نے تصحیح کی۔

یہ سن کر شیدا بول اُٹھا۔ ''اوہوو! ساڈے کول دو لاہوتیاں ہیگیاں سَن، او سویرے وِک گئیاں نیں۔ پرسوں ہور لاہوتیاں آ جاؤن گیاں۔'' (اہوو! ہمارے پاس دو لاہوتیاں تھیں جو آج صبح بِک گئی ہیں، پرسوں تک اور آ جائیں گی۔)

یہ سن کر تصدق صاحب خوشی سے کِھل اُٹھے اور اشتیاق سے پوچھا۔ ''یہ پرندہ دیکھنے میں کیسا ہوتا ہے؟''

شیدا بولا۔ ''توتے نالوں تھوڑا لمبا ہوندا اے جی۔'' (توتے سے ذرا لمبا ہوتا ہے)

یہ سن کر تصدق صاحب کا حوصلہ بندھا اور ایک اور پرندے بیچنے والے بزرگ کے پاس جا کر اس کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ پرندہ علامہ اقبال کے دَور میں ہوتا تھا اور اب نایاب ہے۔ اقبال اسے یورپ سے لائے تھے اور یہ فرانسیسی پرندہ ہے جسے فرانسیسی میں La Huttie کہتے ہیں۔ اس بزرگ دکان دار نے بتایا کہ اب یہ پرندہ پاک و ہند میں نہیں ملتا۔ تصدق صاحب مایوس لیکن اُس دکان دار کی علمیت سے مرعوب ہو کر خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

برسوں بعد میں نے تصدق صاحب سے اس واقعے کی تصدیق چاہی تو وہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑے اور بولے۔ ''یہاں کراچی میں میرے گھر میں کبوتر، چڑیا، توتے، مینا ہر طرح کا پرندہ ہے۔ طائرِ لاہوتی بہت ڈھونڈا مگر نہیں مِلا۔ اگر آپ کو مِلے تو میرے لیے ضرور لے آیئے گا۔ انارکلی کے ایک حکیم نے بتایا تھا کہ یہ آدمیوں کے لیے بہت مُفید ہوتا ہے گو مجھے اس مقصد کے لیے قطعی ضرورت نہیں۔''

چند روز بعد میں نے اس پرندے کے بارے میں اپنے اُستاد اور محترم دوست شکیل عادل زادہ صاحب سے پوچھا تو وہ مسکرا اُٹھے۔ انھوں نے بتایا کہ چار عالم ہیں لاہوت، جبروت، ملکوت اور نصوت۔ لاہوت انسان کا مقام تخلیق ہے اور اِنسان کو وہیں لوٹنا ہے۔ چناں چہ طائرِ لاہوتی ایک ایسی علامتی ترکیب ہے جو اقبال نے استعمال کی اور غالباً بعد کی شاعری میں دہرائی نہ گئی۔ البتہ انھوں نے بھی طائرِ لاہوتی کی تاثیر دیگر سے لاعلمی ظاہر کی اور اس موضوع پر اپنے محتاط لیکن پُرشوق تجسّس کا اظہار کیا۔

تصدق ایک اچھوتا کردار ہے۔ یہ شام سات بجے گہری نیند سو جاتا ہے جو اس عمر میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ صبح فجر سے بہت پہلے تین بجے اُٹھتا، فریج سے گوشت نکال کر اسے چھوٹے چھوٹے پارچوں میں بہت احتیاط سے کاٹتا اور ایک بڑے تھال میں ڈال کر

اپنے اِردگرد کی سڑکوں پر نکل جاتا جہاں کوے، چیلیں اور دیگر پرندے اس کے منتظر ہوتے۔ یہ بہت محبت سے انھیں گوشت کھلاتا اور اذانوں کے وقت لوٹ آتا۔ اب بھی یہی روٹین ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب یہ پرندوں کو گوشت اپنے فلیٹ کی بالکونی سے کھلاتا ہے۔ میں نے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے پر اتنا وقت صرف کرنے کی وجہ پوچھی تو شفیق مسکراہٹ سے بولے۔ ''پرندوں کے حلق چھوٹے ہوتے ہیں۔ ابتدا میں مَیں بڑے ٹکڑے ڈالتا تو دیکھتا کہ دِل اُن میں سے کچھ کے حلق میں حرارت سے پُھول کر پھنس جاتے اور دم گھٹنے سے وہ پتھر کی طرح زمین پر آ گرتے۔ معصوم پرندوں کو اس طرح مرتے دیکھ کر مجھے بے انتہا دُکھ ہوا چناں چہ اب میں گوشت کے اتنے چھوٹے ٹکڑے کرتا ہوں کہ وہ باآسانی نگل کر ہضم کر لیتے ہیں۔''

1930ء میں جالندھر میں پیدا ہونے والے تصدق سہیل نے کبھی مصور بننے کا سوچا بھی نہ تھا۔ آج بھی وہ جالندھر ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی سینماؤں سے بھری سڑک، جھنڈیوں والے پیر کی قبر، بھیرویں بازار، جرنیلی سڑک، تانگوں کے اڈّے، امام صاحب کے مزار، پکّا باغ، کمپنی باغ کو اسی طرح یاد کرتے ہیں اور وہاں کے ناک میں بولتے حکیم کنگنے، تانگے کے مخصوص گھوڑوں اور گرمیوں کی دوپہروں میں پیپل کے ٹھنڈے سایے یاد کر کے اُداس ہو جاتے ہیں جیسے اے حمید امرت سر، خوش ونت سنگھ خوشاب میں ہڈالی اور گل زار دینا کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے رہے ہیں۔ ان کی والدہ بتاتی تھیں کہ ننھا تصدق ہاتھ میں آئی کھانے کی ہر شے منڈیر پر بیٹھے کبوتروں کی جانب پھینک دیتا تھا اور دِن بھر انھیں 'آجا آجا' کہہ کر بلاتا رہتا تھا۔ یہ پکار آج بھی اُس کے اندر زندہ ہے۔ زندہ تو وہ خود بھی رہا جب تقسیم کے حوادث سے گزر کر اُس کا خاندان ہجرت کر کے لاہور آیا اور وہیں اس نے اپنا لڑکپن گزارا۔ تعلیم میں خاص دل چسپی نہ رکھنے والے تصدق کو پیسہ کمانے کا شوق چرایا تو اپنے ماموں کے ساتھ مل کر لاہور کی سردیوں میں سرکہ بنانے کا کاروبار شروع کیا۔ سستی ادنیٰ معیار کی شکر قندی اور گُڑ پانی سے بھری کڑاہی میں ڈال کر پکایا اور اس میں خوردنی تیزاب ڈال کر شراب کی خالی بوتلیں بھریں اور لندن کی ایک کمپنی کا لیبل چسپاں کر کے پورے شہر کے عمدہ ہوٹلوں کو سپلائی دے دی۔ اسی طرح ٹماٹو کیچپ کی بوتلیں اِملی کے گاڑھے پانی میں رنگ ڈال کر تیار کیں۔ ٹماٹر خاصے مہنگے تھے چناں چہ ماموں بھانجے کی زیرک کاروباری حِس کے موافق نہ ٹھہرے۔ کاروبار خوب چل نکلا۔ اعلیٰ برطانوی سرکہ اور کیچپ جب خاصی سستی قیمت پر وافر تعداد میں میسر ہوئے تو صارفین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماموں بھانجے پر پیسوں کی برسات ہو گئی۔ گرمیاں آئیں تو دھوپ ان شیلفوں میں سجی بوتلوں پر پڑی۔ اندر بلبلے بنے، گیس اُٹھی اور بوتلوں کے کارک زوردار دھماکوں سے ایسے اُڑے کہ شیشے ٹوٹ گئے اور دکان دار لندن کے سرکے میں لت پت ہو گئے۔ ماموں بھانجے کی تلاش شروع ہوئی۔ تب تک ماموں شاہدرہ کی بس پکڑ چکے تھے اور چُست بھانجا شیخوپورہ جا پہنچا تھا۔

قصّہ مختصر، زرخیز دماغ بیٹے کی کارروائیوں سے تنگ والد نے بیٹے کو لاہور سے دُور شہر کراچی میں دوسرے ماموں کے ہاں بھیج دیا۔ کراچی تصدق کو بہت پسند آیا۔ کُھلی کُھلی سڑکیں، صاف ماحول، بڑے فُٹ پاتھ جن پر شاموں کو جوڑے چہل قدمی کرتے، ہر وقت سمندر کی اور سے بہتی ہوا، کافی ہاؤس، ریستوران، بار، موسیقی کے کنسرٹ اور غزلیں بھری شامیں، مسلمان، عیسائی، پارسی، اینگلو انڈین، ہندو لوگ اور یورپین سیاح، بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے جہازوں کے بھانت بھانت کے ملاح، عملہ اور دفتروں سے لوٹتی چنچل عیسائی لڑکیاں۔ اُس کے ماموں نے طوہاً و کرہاً اسے قبول تو کر لیا لیکن ممانی نے اُس کے معمولات میں بے جا مداخلت شروع کر دی۔

یہاں تصدق سہیل افسانہ نگار نے جنم لیا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ممانی، تصدق کے نام آنے والے خطوط اور ڈاک کو اس کی غیر موجودی میں کھول کر پڑھتی رہتی۔ ایک روز تصدق کو ایک خیال سُوجھا۔ اس نے ایک افسانہ تحریر کیا، اپنا پہلا افسانہ جس کے صفحہ پانچ پر ایک دوست کے نام خط تھا اور اس میں اپنی ممانی کی بے تہذیبی اور پھوہڑ پن کا خاص تذکرہ تھا۔ تصدق نے وہ صفحہ دانستہ اپنے کمرے میں چھوڑ دیا اور گھومنے نکل گیا۔ شام کو وہ گھر لوٹا تو حسبِ توقع ماموں اور ممانی کو سیخ پا پایا۔ ماموں نے وہ صفحہ تصدق کے سامنے پٹخ دیا۔ تصدق نے افسانے کے باقی صفحات اُن کے سامنے رکھ دیے۔ ماموں

[illegible]

کا غصہ ٹھنڈا تو نہ ہوا مگر تصدق سہیل افسانہ نگار نے جنم لے لیا۔

آہستہ آہستہ تصدق کراچی کے ادبی حلقوں میں بیٹھنے لگا۔ وہ تعلیم حاصل کرتا، جز وقتی ملازمت کرتا اور شاموں میں حلقۂ اربابِ ذوق بھی جاتا۔ وہیں اس کی دوستی حمید کاشمیری سے ہوئی جس نے تصدق کی دیکھا دیکھی اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ حبیب جالب سے بھی وہیں شناسائی ہوئی۔

اُن دِنوں کراچی میں زیلن کافی ہاؤس ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کے اجتماع کا مقام ہوتا تھا۔ تصدق شام میں وہاں بیٹھتا اور دوپہر کو ناروچ یونین انشورنس کمپنی میں ٹائپنگ انچارج کی ملازمت کرتا۔ اس کے ماتحتوں میں دو لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ تصدق ان لڑکیوں کے بہت قریب ہوگیا۔ قدرتی طور پر اس کے مزاج میں وہ جھجک نہ تھی جو کسی لڑکی کے قریب آنے میں مانع ہوتی۔ شخصیت بھی خوش گوار تھی۔ چناں چہ بہت جلد کام کرتی اینگلو انڈین اور کرسچن لڑکیوں کے ساتھ بے تکلف ہوجاتا۔

اسی دوران دن کو کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں داخلے کے پس منظر میں سب سے بڑی وجہ وہاں پروفیسر محمد حسن عسکری کا لیکچر تھا۔ حسن عسکری صاحب تصدق کے بین الاقوامی ادب کے مطالعے سے بہت متاثر ہوئے اور اسے جماعت کا مانیٹر مقرر کردیا۔ تصدق جذباتی طور پر بھی ان کے بہت قریب ہوگیا اور ایک طرح کا ان کا مخبر بھی بن گیا۔ 'فلاں جگہ فلاں صاحب نے عسکری صاحب کے بارے میں کیا کہا۔' یہ سب خبریں وہ عسکری صاحب کو لاکر دیتا اور وہ مسکرا کر خاموش ہوجاتے۔ اس دوران تصدق کے افسانے اعلیٰ ادبی رسالوں میں جگہ پاکر تحسین حاصل کرنے لگے۔ اپنے فعال ادبی کردار کی وجہ سے تصدق حلقۂ اربابِ ذوق کا جوائنٹ سیکریٹری ہوگیا۔ تب ن۔ م۔ راشد اس کے صدر تھے۔

تصدق کا واسطہ طرح طرح کے لوگوں سے پڑا جن میں ایک ایسا ڈاکیا بھی تھا جو رات میں لوگوں کے خط کھول کر پڑھا کرتا تھا۔ یہ اُنھی دِنوں کا واقعہ ہے کہ تصدق کو ایک حسین شادی شدہ اینگلو انڈین عورت سے محبت ہوگئی۔ وہ بھی تصدق کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ جب ایک آدھ مرتبہ اُس کے شوہر کو اس تعلق پر شک ہوا تو اُس عورت نے بہت اعتماد سے شوہر کو جھڑک دیا کہ وہ ''ایک بچّے'' پر تو شک نہ کرے۔ یہاں سے تصدق کے عورت اور مرد کی نفسیات اور آپس کے تعلق کی بے شمار جہتوں کے مشاہدے کا آغاز ہوا۔

اُس دور میں برطانیہ جانا خاصا آسان تھا۔ تصدق کو محبت میں دل شکستگی کا سامنا تھا اور افسانوں کے نئے موضوعات کی تلاش بھی، چناں چہ وہ لندن پہنچ گیا، ٹریفالگر اسکوئر پر دانا دُنکا چُگتے کبوتروں کی طرح انوکھی کہانیاں اور چنچل و دِل کش لڑکیاں چُننے۔ مصوّری ابھی منظر میں داخل نہ ہوئی تھی۔

لندن کے ابتدائی دِن کہرے اور بارش میں لپٹے اور بھیگے ہوئے مایوس کُن تھے، دوست تھے اور نہ ہی معاشی آسودگی۔ کوئی رفیقِ حال نہ تھی۔ البتہ تصدق اپنے دوستوں کو بغل میں لڑکیاں لیے پھرتے دیکھتا۔ اُس نے پہلا سبق یہ سیکھا کہ عورت کی ہر خواہش اور ضرورت کو پورا کرنے والے مردوں سے عورتیں محبت نہیں کرتیں۔ پیسہ خرچ کرنے والوں کو لڑکیاں کھا پی کر چھوڑ جاتی تھیں البتہ جو لڑکیاں کنجوس یا کنگال لڑکوں کے پیچھے آتی تھیں، وہ حقیقی چاہت میں آتیں، پیسے کی ہوس میں نہیں آتی تھیں۔

ایک روز تصدق نے چیئرنگ کراس پر ایک گوتھک عمارت کے سامنے لڑکیوں کی ایک طویل قطار دیکھی جس میں اِکّا دُکّا لڑکے بھی کھڑے تھے۔ استفسار کیا تو پتا چلا کہ سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹ میں مصوری کی کلاسوں میں داخلہ ہو رہا ہے۔ تصدق نے نظر بھر کر گنتی کے لڑکوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ تو چند چٹکیوں کی مار ہیں اور قطار میں شامل ہوگیا۔

اگلے روز امتحانی کمرے میں ایک برہنہ ماڈل آن کر سامنے بیٹھ گئی۔ سب اُمیدوار اُس کی تصویر بنانے میں مصروف ہوگئے۔ اس سے پہلے تصدق نے شوقیہ اسکیچ وغیرہ تو بنائے تھے مگر کبھی باقاعدہ مصوری نہ کی تھی۔ امتحان میں بیٹھنے کے لیے اس نے ظاہر کیا تھا کہ اس نے مصوری سیکھ رکھی ہے۔ اب جب اُفتاد سر پر آن پڑی تو تصدق تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اُس نے کن انکھیوں سے ساتھ والے طلبہ کو

دیکھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ تصویر کشی کر رہے تھے۔ وقت ختم ہونے کا اعلان ہوا تو تصدق نے اپنی بنائی تصویر مایوسی سے دیکھی اور سامان پیک کرنے لگا۔ ممتحن باری باری سب اُمیدواروں کی تصویریں اُچٹتی نگاہ سے دیکھ کر گزرنے لگی۔ تصدق کی پینٹنگ پر وہ کچھ دیر رُکی اور آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہال میں آواز گونجی۔ ''مسٹر سہیل! یہاں رکیے گا۔'' یہ سن کر تصدق تذبذب میں پڑ گیا۔ ''آپ اصل آرٹسٹ ہیں۔ باقی سب کاپی مشینیں ہیں۔ آپ نے شاید اپنے آپ کو دریافت نہ کیا ہو لیکن میرا تجربہ آپ کے اندر چھپا فن کار دیکھ سکتا ہے۔'' زیرک اور تجربہ کار استانی کے اِن چند جملوں نے تصدق کی راہ متعین کر دی۔ اُس کے عشقوں میں ایک اور عشق کا اضافہ ہو گیا۔ جان وروں سے پدرانہ محبت، نازنینوں کی پرستش اور مصوری سے مجنونانہ لگاؤ۔

یہی عشق آنے والے دِنوں میں تصدق کا سرمایۂ حیات ٹھیرے۔

وہ چمکتی صبحوں میں ماربل آرچ کے سامنے ہائڈ پارک کے ایک کونے میں ایزل اور مصوری کا سامان لے کر بیٹھ جاتا اور کسی مناسب لڑکی کی تلاش میں رہتا۔ ایسی ٹورسٹ لڑکیاں جو لندن کی کشش میں تنہا، کم وسائل کے ساتھ چلی آتی تھیں اچھے دوست، مناسب سکونت اور ایڈونچر کی تلاش میں جلد ہی تصدق کے ساتھ گھل مِل جاتیں۔ تصدق اُن کی تصویر بنانے کی پیش کش اور خوش گوار مسکراہٹ سے اُن کی جانب بڑھتا۔ ان میں سے کئی اُس کے بڑھے ہاتھ کو تھام لیتیں۔ بھلے ان میں وائن کی شوقین جوئیل ہو جس کی جون دو گلاس ریڈ وائن کے بعد بدل جاتی یا موسمِ بہار میں جب بڑے بڑے درختوں کی سیاہی مائل بادامی شاخوں پر شگوفے پھوٹنے والے دنوں میں ملنے والی الزبتھ ایسی معصوم لڑکی ہو۔ الزبتھ نے بہت عرصے ساتھ نبھایا، متلون مزاج جارجی ہو، پہلی ہی ملاقات میں وارفتہ ہونے والی روڈا اس کے تراشے خوب صورت مجسمے ایسے جسم کی مالک شیری ہو جو اپنا نیوڈ بنوانے کے بہانے تصدق کے قریب آئی تھی، پرتگالی وائن اور گانوں کی رسیا بیلوت ہو، ناتجربہ کار، کم عمر اور کچھ حد تک بے وقوف لیون کے اسکول کی طالبہ لوسیل ہو جو اظہارِ عشق کے ابتدائی لمحات میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی، کسی بے وفا کے باعث حمل ٹھیر جانے والی اوتا ہو جسے تصدق میں حمل گرانے والا مسیحا مل گیا تھا، ناشپاتی، آلو بخارے، سیب اور چیری کے درختوں میں پھدکتی گلہریوں والے باغ کے بینچ پر ملنے والی یوگوسلاوین ملینا ہو، جو نا تجربہ کار تھی اور متلون مزاج بھی۔ وہ جب تصدق کے کمرے میں پہلی مرتبہ آئی، اُس کمرے میں جس کی بڑی کھڑکی ناشپاتیوں اور سیبوں کے درختوں سے بھرے باغ میں کھلتی تھی، اُس نے وہاں بلز بلڈ (سانڈ کا لہو) وائن پی جو اُسے اِس لیے پسند تھی کہ ایک جنگ میں دشمنوں کی فوج نے جب یوگوسلاویہ کی فوج کو یہ سرخ وائن پیتے دیکھا تھا تو وہ یہ سمجھ کر بھاگ نکلے تھے کہ فوج سانڈ کا خون پی رہی ہے۔ پھلوں کی یہ شراب پی کر اُس نے اپنے آپ کو دوشیزگی ترک کرنے پر تیار کیا تھا اور تصدق کی محبت میں گرفتار موسمِ بہار کی صاف سیاہ آسمان اور چمکتے ٹمٹماتے ستاروں والی رات کو اپنے ارمان پورے کیے تھے۔ اس کی تجربہ کار سہیلی ملینا کے اطوار ہی سب سے جداگانہ تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے تصدق کو جھرجھری آ گئی۔ وہ تو گویا مردوں سے کوئی انتقام لیتی تھی۔ اس کے سامنے مرد بے بس ہو جاتا اور ناچار خود کو اس کے رحم و کرم کے سپرد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اور وہ انگرڈ، اس کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بہت یاد آتی۔ تصدق نے ان سب کو دِل و جان سے، خلوصِ دِل سے اور عقیدت سے چاہا۔ وہ جب کسی کے ساتھ ہوتا تو تن من دھن کے ساتھ اُس کے ساتھ ہوتا۔ اُس نے عورت کو ہر اُس روپ میں دیکھا جس میں کوئی فن کار دیکھنے کی خواہش کر سکے۔

تصدق زندگی کے لیے کسی ساتھی کی تلاش میں تھے۔ بہت سے چہرے، بہت سے بدن رنگ بدل بدل کے ان کے سامنے آتے رہے یا پیش ہوتے رہے لیکن وہ ایک ہم روح انھیں کہیں نظر نہیں آئی جس کے لیے وہ بڑی طرح مضطرب تھے یا پھر یوں کہیے کہ وہ ایک ازلی بے قرار فن کار، ایک جگہ کچھ مدت قیام کے بعد کسی اور گلستاں کسی اور منظر کی جست جُو میں بھٹکنے والا جہاں گرد، وہ ایک بے پناہ منفرد، مختلف ان جانی جست جُو میں سرگرداں آوارہ نقش گر ہے۔

اپنے اسٹوڈیو میں انگوری مشروب پیتے اور پسِ منظر میں تحلیل ہوتی رومانوی موسیقی سنتے ہوئے تصدق صاحب نے مجھ سے اپنی

محبتوں کے رنگارنگ شربتی قصوں، عمومی انسانی نفسیات بالخصوص نسوانی نفسیات کے اوجھل گوشوں پر گفتگو سے لے کر جہانِ رنگ و بو کے بے شمار موضوعات پر بلا جھجک بات کی۔ وہ باتیں جو لوگ اپنے آپ سے بھی نہیں دہراتے، وہ باتیں میرے سامنے بے دھڑک کہہ دیں۔

نسوانی نفسیات کے رازداں مصور نے کیا کیا قصے بیان کیے۔ تصدق کے حلقۂ عشق میں ایسی شادی شدہ خواتین بھی آئیں جو اُس کی تصویریں دیکھنے کے بہانے اُس کے کمرے میں چلی آئیں۔ ایک باوفا نستعلیق شادی شدہ عورت سے کچھ ایسی شیفتگی کا اظہار کیا کہ وہ بانہوں میں چلی آئی اور بعدازاں ندامت کے آنسوؤں میں بار بار اُسے موردِ الزام ٹھیراتی رہی۔ جب جانے لگی اور تصدق نے دوبارہ ملاقات پر اصرار کیا تو وہ پھٹ پڑی۔ دروازہ کھول کر جاتے ہوئے تصدق نے اُس سے اگلے مقامِ ملاقات کا پوچھا تو وہ واپس مڑی اور بولی۔ ''اسی کافی ہاؤس میں'' اور روتی ہوئی چلی گئی۔

اسی طرح ایک باوقار خاتون کے ساتھ قربت کے لمحات گزار کر اگلے روز جب اخبارات کے صفحۂ اوّل پر اُس کی تصاویر دیکھیں اور انکشاف ہوا کہ وہ بین الاقوامی شہرت کی حامل ایوارڈ یافتہ ماہرِ فن ہے تو یہ ہکا بکا رہ گیا۔ اگلی ملاقات میں باادب شکوہ کیا کہ اُس نے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا تھا، وہ ہنس پڑی ''پھر ایک بے نام مصور کے ساتھ ایڈونچر کرنے کا پُرلطف تجربہ کس طرح حاصل ہوتا۔''

وقت ایک لمبا پلٹا کھاتا ہے۔

تصدق کے لڑکپن کا لاہور ہے۔ ایک دوست کے بہکاوے میں آکر وہ بازارِ حُسن چلا جاتا ہے جہاں اسے ایک خاندانی دلال ایک تنگ گلی کے پرانے بوسیدہ مکان کی لمبی سیڑھیوں کے راستے دوسری منزل تک لے جاتا ہے۔ وہاں ایک واجبی شکل وصورت کی منتظر لڑکی بیٹھی ہوتی ہے۔ تصدق کی ٹانگوں میں اَن جانے خوف کے باعث لرزش ہے۔ وہ واپس لوٹنے کا سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس کے ہاتھوں سے پیسے اُچک کر اسے کمرے میں دھکیل دیتا ہے۔ اندر لڑکی بے تال لباس کی اسیری سے خود کو آزاد کرتی ہے اور پنجابی میں چلاّتی ہے۔ ''جلدی کرو، میرے پاس تمھارے لیے تمام دن نہیں ہے۔ اللہ جانے کہاں سے جناور پکڑ لاتا ہے۔''

تصدق کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور جسم پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔

لڑکی اُسے طنزیہ نظروں سے اُسے جسم چراتے ہوئے دیکھتی ہے اور قہقہہ لگا کر طعنہ دیتی ہے۔ ''تم تو نامرد ہو۔ پیسا کیوں برباد کرتے ہو۔'' واپسی پر تصدق کو لگتا ہے جیسے سڑک پر تمام لوگ اُسے دیکھ کر طنزاً ہنس رہے ہیں۔

یہ کیفیت اُس لمحے تک محدود نہیں رہتی، کئی دہائیوں تک پھیل جاتی ہے۔ ایسا کئی مرتبہ ہوتا ہے کہ کسی حسین یورپی لڑکی کے قرب میں اُسے وہ زہریلا قہقہہ سنائی دیتا ہے، طعنہ برچھی کی طرح سینے پر ترازو ہوتا ہے اور وہ نڈھال ہو کر بے دم ہو جاتا ہے۔

''میں نوجوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ بچپن کی بے راہ روی کے اثرات تاحیات ساتھ چلتے ہیں'' ایک روز تصدق صاحب نے تاسف سے کہا۔ بات مکمل کر کے یک دم کھل کھلا اُٹھے۔ لندن کے موسم کی طرح ان کا مزاج بھی لمحہ بھر میں بدل جاتا ہے۔

''لندن میں میرا ایک انڈین دوست تھا۔ اُسے میں اپنا گُرو بھی کہتا تھا۔ نسوانی نفسیات کو اس سے بہتر جاننے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ ساٹھ، ستر کی دہائی میں یورپی لڑکیاں عموماً ہندوستانی اور پاکستانی لڑکوں کو شائستگی سے رَد کر دیا کرتی تھیں۔ چناں چہ میرے گُرو نے مجھے نصیحت کی کہ میں اپنا تعلق کبھی پاکستان سے نہ بتاؤں۔ جب میں نے اُس سے راہ نمائی مانگی کہ کس خطے سے متعلق اپنا تعارف کرواؤں تو اُس نے سُجھایا ''فجی۔'' اس کا مشورہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میں، میرا گُرو اور کوئی بھی لڑکی فجی کی ثقافت تو کجا اس کے محلِ وقوع سے بھی واقف نہ تھے۔''

تصدق صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے بات مکمل کی۔

ایک سہ پہر میں اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنی بے تکلفانہ گفتگو سے ماحول برقار رہے تھے۔ دو منزل نیچے سڑک پر

اکا دُکا گاڑیوں کے ہارن اور سائکلوں کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سامنے بجلی کے تار پر دو کوے مستیاں کر رہے تھے۔ میں نے ایک سوال کر دیا۔ سُن کر وہ چپ ہوگئے اور گہری سوچوں میں گم ہوگئے۔ چند لمحوں بعد اُنھوں نے انار رنگ شربت کا آخری گھونٹ بھرا اور کچھ بولتے ہوئے رُک گئے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، بولے۔ ''انگرڈ!''۔ میں نے اُن کی زندگی کی پکچر گیلری میں آویزاں بے شمار لڑکیوں کی پورٹریٹس میں سے کسی ایک کے بارے میں پوچھا تھا جواُن کی صحیح معنوں میں Soulmate (ہم روح) تھی۔ انھوں نے انگرڈ کا ذکر کیا اور سازِ دِل کو چھیڑ دیا۔ نغمہ طولانی ہے۔ الفاظ کو سمیٹا جائے تو بات کچھ یوں ہے۔

ایک روز تصدق صاحب لندن میں دِن کے گیارہ بجے پارک میں چبوترے پر واقع ریستوران میں کافی اور باہر شاداب گھاس کے میدان میں بکھری ہلکی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ سب لوگ بھاگ کر ریستوران کے اندر آ گئے۔ سامنے ایک نیلی آنکھوں والی گُڑیا سی لڑکی سفیدے کے درخت کے نیچے بیٹھی درخت کی تصویر بنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں بوندا باندی تھم گئی۔ یہ تجسّس کے ہاتھوں مجبور اُس لڑکی کی بنائی تصویر دیکھنے وہاں چلے گئے۔ انھوں نے طالبہ سے اُس کی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو اُس نے خوش دِلی سے قبول کر لی۔ ''تُم تو مجھ سے بہت بہتر مصور ہو۔'' تصدق صاحب نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ اب لڑکی نے متجسّس ہو کر پوچھا کہ کیا یہ بھی مصور ہیں۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے ان کی کوئی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اپنی نظر میں بہترین تصویر، ایک پہاڑی منظر کی عکاسی، اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے تصویر دیکھی اور مایوسی میں سر ہلا دیا۔ 'اور دکھاؤ۔'' انھوں نے بے دلی سے ٹیڑھے ،میڑھے بے ڈھنگے چہروں والی پینٹنگ سامنے رکھ دی۔ تصویر دیکھ کر وہ اُچھل پڑی۔ ''یہ تو بہت خوب صورت ہے۔''

''انھیں کون پسند کرے گا اور خریدے گا؟'' تصدق مایوسی سے بولے۔

''تمھیں پینٹنگ بناتے وقت خریدار کو نہیں صرف اپنے آپ کو سامنے رکھنا ہے۔'' انگرڈ کے ان جملوں نے اُن کے درمیان ایک لازوال دوستی کا آغاز کیا۔ وہ چند روز کے لیے آسٹریلیا سے آئی ہوئی تھی، رئیس باپ کی بیٹی تھی اور ہفتے کے دن اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے ہائڈ پارک جایا کرتی تھی۔ اُس روز اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی تھیں جو وہ اپنے ضرورت مند بوائے فرینڈ کو دیتی تھی۔ تصدق نے مردانہ فطرت کا نباض ہونے کے ناتے اُسے سمجھایا کہ پیار کرنے والے مرد عورت کے پیسے نہیں کھاتے۔ انگرڈ نے معصومیت سے جواب دیا کہ وہ لڑکا واقعی ضرورت مند ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ تصدق نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے ہدایت کی کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کو فون کر دے کہ اس مرتبہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر اس کے باوجود بوائے فرینڈ ملنے کے لیے خواہش کا اظہار کرے تو وہ مخلص ہے۔

تھوڑی دیر بعد انگرڈ آئی تو زار و قطار رو رہی تھی۔ بوائے فرینڈ نے اُس سے ملنے سے انکار کا کوئی بہانہ کر دیا تھا۔ تصدق سے رہا نہ گیا اور اس نے انگرڈ کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اُس کی آنکھیں چوم لیں۔

اُس رات وہ تصدق کے پاس ٹھہر گئی۔ یہ محبت اور عشق کی داستان کی ابتدا تھی۔

بعد ازاں وہ دن رات اکٹھے رہتے۔ تصدق کو شروع میں احساسِ جرم ستاتا کہ اس کے دوست کیا سوچیں گے کہ وہ اتنی چھوٹی عمر کی لڑکی کے ساتھ 'ڈیٹ' کرتا ہے۔ انگرڈ کی ذہنی پختگی اور سمجھ داری نے یہ احساس بہت جلد ختم کر دیا۔

''اُس نے مجھے صحیح معنوں میں پینٹنگ کرنا سکھایا۔ میں کئی دہائیوں تک سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹ کی شام کی کلاسوں کا باقاعدہ طالبِ علم رہا ہوں مگر انگرڈ نے جس خلوص اور دانش مندی سے مجھے آرٹ کا سلیقہ سکھایا، وہ برسوں کی نصابی تعلیم نہ سکھا سکی۔''

تصدق صاحب کی آنکھوں میں آنسو باقاعدہ جھلملا رہے تھے۔

''ایک روز میں نے اُس سے پوچھا کہ اچھی پینٹنگ اور بُری تصویر میں کس طرح تمیز کی جا سکتی ہے تو وہ بولی۔ 'بھلے خوب صورت ترین تصویر ہو لیکن وہ آپ کو ہر بار کچھ نیا سوچنے پر مجبور نہ کرے، تو وہ فقط وال پیپر کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اچھی پینٹنگ، کمال کا فن

پارہ ہر مرتبہ انسان کو پچھلی مرتبہ سے مختلف نظر آتا ہے، وہ دیکھنے والے پر بھی وہ ماورائی کیفیت طاری کر دیتا ہے جس سے فن کار اسے تخلیق کرتے وقت گزرا تھا۔ وہ صبح آرٹ کی کلاسیں پڑھتی اور رات کو میرے بازو پر سر رکھ کر ساری روداد سُنا دیتی۔ انگرڈ کی وجہ سے آج آرٹ کی دُنیا میں لوگ مجھے جانتے ہیں۔“

میں نے حیرت سے پوچھا ”وہ کیسے؟“

”میں ہر طرح کی پینٹنگ بنایا کرتا تھا، پہاڑوں، جنگلوں، جھیلوں، دیگر قدرتی مناظر، پورٹریٹ، ٹیڑھے میڑھے انسانی اور حیوانی کردار، خود تخلیق کردہ مخلوقات۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ مجھے اِن میں سے ایک طرزِ تخلیق اپنانا چاہیے جو میرا اپنا اسٹائل کہلائے۔ اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ قدرتی مناظر وغیرہ کے مجھ سے بہت بہتر آرٹسٹ بیٹھے ہیں۔ یہ بگڑے ٹیڑھے میڑھے انسانی اور دیگر اجسام کی ماورائی اور خواب آلود تصاویر ہی میری شناخت بنیں گی۔ اِن کے نیچے مجھے اپنا نام بھی نہ لکھنا پڑے گا، لوگ پینٹنگ دیکھ کر ہی پکار اُٹھیں ’یہ تصدق سہیل کے بنائی تصویر ہے‘، چناں چہ میں نے اس جانب بہت محنت کی، کئی دن گزر جاتے اور مجھے اپنا ہوش تک نہ رہتا۔“

میرا تجسس ہنوز باقی تھا۔ ”انگرڈ کے ساتھ معاملہ کیا ہوا؟“

”وہ چند ہفتے گزار کر آسٹریلیا واپس چلی گئی۔ لڑکیوں سے قربت کے فن میں طاق، مجھے فجی کا باشندہ بنانے والے ہندو استاد نے وثوق سے کہا۔ ’اسے بھول جا اَبے لونڈیا فرانس سے واپس نہیں آتی، یہ ٹھنگو، امیر باپ کی لڑکی تیرے لیے آسٹریلیا سے آنے کی نہیں۔‘ اُس کی بات سن کر میں دُکھی ہو جاتا۔ ایک روز میں ہائڈ پارک کے درمیان بنی جھیل سرپینٹائن جس کے گرد لوگ غسلِ آفتابی کرتے ہیں اور آسٹریلیا سے آئی بطخوں، ہندوستان، روس اور پاکستان سے گرمیاں گزارنے اور بچے دینے آئی مرغابیوں کو دیکھتے ہیں، کے پاس تنہا بیٹھا انگرڈ کے بارے میں سوچتا واپس اپنے کمرے میں آیا تو وہاں اُس کا خط رکھا تھا۔ میں نے مضطربانہ وہ خط لیا اور پارک جاتی بس میں بیٹھ گیا۔ خط میں اُس نے میرے لاتعداد بوسوں کا، آنکھوں کے رستے دل میں اُتر جانے کا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات کا تذکرہ کیا تھا۔ اُس نے یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ وہ لندن کے ایک کالج میں داخلہ لے کر میرے پاس آ رہی ہے۔ میں خط بار بار پڑھ رہا تھا۔ بس میں میرے ساتھ بیٹھی لڑکی کسمسائی تو مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔“

”اُس کے بعد___“ میرا استفسار بیچ سے تصدق صاحب نے اُچک لیا۔

”وہ واپس آئی۔ ہم پھر سے اس طرح اکٹھے ہو گئے جیسے بچھڑے ہی نہ تھے۔ اس طرح کئی ماہ گزر گئے۔ ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ اُس کا سنگین حادثہ ہو گیا ہے۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”محبت کا ایسا المناک انجام۔“

”نہیں۔ میں اسپتال کی جانب لپکا۔ وہ زندہ تھی اور بے ہوش تھی۔ مجھے ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ بے ہوشی میں میرا نام پکارتی رہی تھی۔“

تصدق صاحب کی آنکھوں میں دیر سے اکٹھے ہوئے آنسو قطرہ قطرہ بہہ نکلے۔ زندہ دل بوڑھے فن کار کو روتے دیکھنا کرب ناک تجربہ تھا۔ اسٹوڈیو کی خامشی آہیں بھرتی اور سسکیاں لیتی رہی۔ کچھ دیر کے لیے کھڑکی کے باہر نکھری دھوپ بھی دُھندلا کر یرقان زدہ نظر آنے لگی۔

”وہ تن درست ہو گئی۔ میں نے اُس کا بہت خیال رکھا۔ وہ بچوں کی طرح مجھ سے لاڈ کرتی اور میں اُس کے نخرے اُٹھاتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس بُری طرح روٹھ گئی کہ منانا مشکل ہو گیا۔ دراصل میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ میں اُس سے عُمر میں خاصا بڑا ہوں، وہ اپنا ہم سن لڑکا تلاش کر لے۔ یہ سن کر وہ بہت ناراض ہوئی۔“

’’پھر؟‘‘

’’پھر یہ کہ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ وہ اپنے کالج میں مصروف رہتی اور میں پینٹنگ کے علاوہ Camberland ایسے بڑے ہوٹل کے مارننگ شیف کی جز وقتی ملازمت کرتا رہا۔ محبت کا دیا سلگتا رہا۔ اس میں تیل گھٹتا رہا۔ محبت کی نشاط انگیز رات ختم ہوئی، فٹ پاتھ پر سوئے نشئی کے صبح کے متعفن دہن کی بُو کی طرح کا ناگوار دن چڑھا اور دیا بجھ گیا۔ وہ جو میں کہتا ہوں کہ محبت کی ایک عمر ہوتی ہے اور آرٹسٹ کے لیے کئی محبتیں کرنا ضروری ہوتا ہے چناں چہ انگرڈ مجھ سے کچھ اس طرح دھیرے دھیرے دُور ہوئی کہ محسوس ہی نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنے جوڑ کا ہم عمر لڑکا مل گیا۔ عمروں کا فرق پاٹا نہیں جا سکتا۔‘‘

ایک کم عمر بیوی بھی بڑی عمر کے شوہر سے کچھ عرصے ہم دردانہ محبت تو کر سکتی ہے مگر عشقِ جنوں خیز کی اُس سے توقع عبث ہے۔ وہ پختہ عمر لوگ جو کم عمر لڑکیوں سے تاحیات تازہ، پُر جوش اور مستقل محبت کی توقع رکھتے ہیں جس طرح وہ اپنے جوڑ کے لڑکوں کو چاہیں، سادہ دل اور خوش گمان ہوتے ہیں۔ اپنے جوڑ کے جوڑے ہی نظر اور دل کو بھاتے ہیں۔ ایسے بے جوڑ تعلقات میں جذبات کی عُمر کم ہوتی ہے۔ البتہ چند استثنیات موجود ہیں جیسے سجاد باقر رضوی کی اپنے سے خاصی کم عُمر طالبہ سے بلا خیز محبت اور بالآخر شادی میں جذبات کی آنچ دم آخر تک رہی اور اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی بیگم کے منہ سے اُن کا تذکرہ ہلکی آنچ پر رکھی ہنڈیا کی بھاپ کی طرح آہ کی صُورت نکلتا ہے۔

’’میں نے آج تک کوئی ایسی حسین عورت نہیں دیکھی جو اپنی تعریف سے خوش نہ ہو۔ توصیف میں پُرکاری ضروری ہے۔ عموماً خوب صورت خواتین خوش مزاج، باتونی اور رحم دل ہوتی ہیں۔ واجبی اور کم رو خواتین کو احساسِ کم تری نے کچھ ایسا کڑوا بنا دیا ہوتا ہے کہ اُن کی تعریف گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے۔‘‘

اسی طرح لندن کا ایک واقعہ سُنایا۔

’’وہاں میں ایک گھر میں پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔ مالک مکان میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میاں ایک نک سک انگریز اور بیوی کھلکھلاتی گوری تھی۔ ایک روز وہ کسی میوزیم میں گئے۔ واپسی پر اُنھوں نے باہر نکلتے وقت ایک آرٹ گیلری کی جانب تیر کا نشان بنا دیکھا جس کے اوپر میرا نام لکھا تھا۔ اس معروف آرٹ گیلری میں میری تصویروں کی نمایش جاری تھی۔ میاں بیوی وہاں میری تصاویر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اُنھیں میرے آرٹسٹ ہونے کا اندازہ تو تھا مگر یہ علم نہ تھا کہ میرا وہاں کے مصوری کے حلقوں میں خاصا نام بن چکا ہے۔ چناں چہ وہ خاصے متاثر ہوئے اور واپس آ کر شکوہ کیا کہ میں نے کبھی اس بات کا اُن سے تذکرہ کیوں نہ کیا۔ چند روز گزرے تو بیوی نے شوہر سے فرمایش کی کہ وہ میری تازہ پینٹنگ چند روز کے لیے سجاوٹ کی خاطر لے لے۔ شوہر نے جھجکتے ہوئے مجھ سے نستعلیق انداز میں درخواست کی تو میں نے فوری ایک پینٹنگ اُس کے حوالے کر دی۔ اگلے روز اُس کی غیر موجودی میں اُس کی بیوی نے میرے فن کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میری تصاویر دیکھ کر اُسے ان کے گہرائی اور دائمی تاثر کا پہلے سے کچھ اندازہ تھا۔ میں نے عاریتاً دی گئی پینٹنگ اُسے تحفتاً بلا قیمت دے دی۔ یہ دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوئی کہ مسرت میں مجھ سے لپٹ گئی۔‘‘

’’لپٹنا تو وہاں عام سی بات ہے۔‘‘ میں نے تبصرہ کیا۔

’’یہ ’عام‘ بات بعد میں ’خاص‘ بھی ہوئی۔‘‘ انھوں نے بات جاری رکھی۔ ’’شادی شدہ عورت کو کوئی بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ میرے شادی شدہ خواتین کے ساتھ بیش تر تجربات میں آمادگی اور پیش قدمی اُنھی کی جانب سے ہوئی۔ میں نے عورت کو کبھی بُری نگاہ سے نہیں دیکھا، میں نے اُسے مرد سے بہتر انسان پایا ہے۔ یقیناً زیادہ ہم درد، قابلِ اعتماد و محبت ہوتی ہے۔ عورت سے محبت، میں عبادت سمجھ کر کرتا ہوں، میں اس کی پرستش کرتا ہوں۔ یہ ہے ہی قابلِ پرستش۔ محبت اور جنس اِنسانی خمیر میں گندھے ہوئے ہیں۔ یہ مرد اور عورت کی بنیادی ضرورت ہیں۔ چناں چہ انھیں مفروضی معاشرتی اخلاقیات کے تناظر میں جانچنا فطرت کے آفاقی اصولوں کے خلاف ہے۔‘‘

ایک روز خلافِ معمول خاصے غصے میں تھے، کہنے لگے۔ ''عورت خدا کا شاہ کار ہے۔ اس سے خوب صورت اور قابلِ ستائش کوئی شے نہیں۔ وہ تنگ نظر اور متعصب مرد جو اسے سات پردوں اور گھر کی دیواروں میں چھپانا چاہتے ہیں اس سے حسد کرتے ہیں۔ وہ اپنی صدیوں پرانی بالادستی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔''

اِس کے بعد کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''یہ لوگ امریکا کے خلاف نعرہ لگاتے ہیں ''گو امریکا گو'' اور ساتھ ہی اپنی اولاد کو کہتے ہیں ''گو امریکا گو'' اور انھیں وہاں گرین کارڈ کے لیے بھیج کر مسکینوں کے بچوں کو قتال میں جھونک دیتے ہیں۔ اِن میں سے کتنے اپنے بچوں کو اس تنور میں جھونکتے ہیں؟''

میں نے اُس روز اُن کی ناراضی کی وجہ پوچھی تو بولے۔ ''ایک جگہ کہا گیا ہے کہ میں جنس زدہ ہوں۔ ہاں میں جنس سے محبت کرتا ہوں۔ یہ تو بہت اطمینان بخش، قدرتی اور خوب صورت عمل ہے۔ دُنیا کی سب سے بڑی سچائی اور تخلیق کا اہم ترین سرچشمہ ہے۔''

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نفسیاتی ماہرین کہتے ہیں کہ جنس کا غیر ضروری تذکرہ جنسی طور پہ کم زور انسان کی علامت ہے۔ جیسا کہ شنید ہے کہ ایک معروف افسانہ نگار کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے عارضۂ جگر کے باعث غالباً جنسی طور پر فعال نہیں رہا تھا، اُس کے ہاں جنس کا تذکرہ بہت ہے۔''

''واقعی وہ بکواس کرتے ہیں۔ میں ستاسی برس کی عمر میں خود کفیل ہوں۔ ہاں حُبِّ نشاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اپنے اطمینان سے زیادہ اپنی دوست لڑکیوں کے اطمینان سے خوشی محسوس ہوتی ہو۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ اُن کے سازِ بدن کی کون سی تار سے مسرت آگیں موسیقی جنم لے گی۔ پاکستانی مرد تو اِس معاملے میں بالکل ہی ہیٹے ہیں۔ جو لڑکیاں اور عورتیں مجھ سے محبت کے ایسے سبق لینے آچکی ہیں، میں اُن کے نام مرتے دم تک نہ لُوں گا وگرنہ قیامت آجائے'' انھوں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

ایسے بے شمار مواقع ہیں۔ ہم بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں، گھنٹی بجتی ہے، وہ حیرت سے کھڑکی سے باہر چھب دِکھلاتی زُلفِ بنگال کی سی شام کو دیکھتے ہیں، اور خود کلامی کرتے ہیں۔ ''یہ وقت تو نہیں تھا، یہ کیسے آگئی۔'' دروازہ کھولتے ہیں تو بھرپور بدن کی فیشن ایبل بائیس چوبیس سالہ حسینہ دھوپ کا چشمہ لگائے اندر داخل ہوتی ہے، ان سے گلے ملتی ہے اور یہ اُسے فرج میں سے ایک ٹھنڈا جھاگ اُڑاتے مشروب کا ٹن دے کر ملحقہ پُراسرار اندھیرے کمرے میں بٹھا کر آجاتے ہیں اور میرے سامنے بے چینی سے پہلو بدلنے لگتے ہیں۔

ایسا اتنی مرتبہ ہوا کہ اُدھر گھنٹی بجتی ہے اور اِدھر میں اجازت طلب کرتا ہوں۔ اُن کے گھر کو مجھ سمیت کم ہی مردوں کے قدموں نے چھوا۔ ایک روز میں نے اُن سے فرمائش کی کہ میں ایک معروف انگریزی رسالے کے لیے ان کا خاکہ لکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے آمادگی ظاہر کی۔ عجب منظر تھا جب ہمارے بے تکلفانہ تعلق کے ریشمی قالین میں رسمی سوال جواب کے پٹ سَن کا پیوند سیا جانے لگا۔ ابھی گفتگو بیچ میں تھی کہ گھنٹی بجی، ایک لمبی چھلکتی مچلتی بھرپور پنجابی لڑکی اِٹھلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہی پرانی روایت دہرائی گئی۔ وہ کمرے میں بے چینی سے واپس ہوئے تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ اُن کی ذات کے حوالے سے گفتگو یک رُخی رہی ہے، کیا ہے اچھا ہو اگر اِس میں اُن کی 'ماڈل' کے خیالات بھی شامل کر لیے جائیں تاکہ یہ زیادہ rich (متنوع) ہو جائے۔ یہ سن کر انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا، بُرا سا منہ بنایا اور بولے۔ ''پورا انٹرویو ہی بعد میں کریں گے'' اور باہر کی جانب میرے آگے آگے چل دیے۔

شریف خاندانی خواتین کے سامنے وہ انتہائی شرمیلے اور شریف انسان ہیں، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ خواہ وہ آرٹسٹ ہوں، گھریلو خواتین یا عام آرٹ کی شائق عورتیں، ان سے بات کرتے وقت ان کی زبان میں لکنت آجاتی ہے۔

ایک سہ پہر میں بلا اطلاع ملنے گیا تو انھوں نے گنگناتے ہوئے دروازہ کھولا اور مجھے سامنے پا کر مروتا اندر بلا لیا۔ مزے میں تھے۔ اُن کی ایک ماڈل ملاقات کے لیے آرہی تھی۔ اُس روز حُبِّ نشاط، حُبِّ بحالی، محب مہیزی (طبی نام ویاگرا) کے استعمال پر پُرمغز گفتگو

کرتے رہے کہ اسے استعمال کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے اور یہ کس خوراک کے ساتھ سب سے زیادہ فعال ہوتی ہے۔

اگلی صبح اُن کا فون آ گیا۔ بتانے لگے کہ وہ شب اُن کی کرب انگیز رات تھی۔ وہ شام بھر دو انگل کر بیٹھے، انتظار کرتے رہے اور اُن کی 'ماڈل' نے دغا کی۔ نہ صرف ملاقات کے لیے نہ آئی بلکہ موبائل بھی بند کر دیا۔ اِس کے بعد بتایا کہ اگر توانائی کی بحالی کی اس کرشماتی دوا کا مذکورہ استعمال نہ ہو پائے تو بعد کا وقت مایوسی اور ڈپریشن میں گزرتا ہے۔

وہ بہت سی ایسی خواتین کا سہارا بنے ہیں جن سے ان کے قطعی افلاطونی تعلقات تھے، ایسے ان چھوئے تعلق میں انھوں نے خواتین کے گھریلو اخراجات کا ذمہ اُٹھایا۔ ایک ایسی ہی شایستہ پڑھی لکھی بیوہ سے اُن کا رابطہ ہوا تو اس کے گھریلو اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کیے۔ جب بھی اُس خاتون سے ملاقات ہوئی، نظریں جھکا کر ادب سے بات کی۔ آج اُس عورت کے بیٹے باعزت ملازمتیں کر رہے ہیں۔ تصدق اور اس خاتون کے معاشی تعلق کی کبھی کسی کو بھنک تک نہ پڑی۔

ایک بینک جس کے اکاؤنٹ میں یہ پیسے جمع کراتے تھے، کی خوش اخلاق اسسٹنٹ منیجر انھیں نام ور آرٹسٹ ہونے کے ناتے بہت عزت دیتی تھی۔ یہ بھی اندھا اعتماد کرتے ہوئے اُسے پیسے تھما کر رسید لے آتے تھے۔ کبھی پیسے کا جوڑ توڑ کرنا آیا نہیں چناں چہ بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ خاتون بینکاران کی رقم میں وسیع خورد برُد کا باعث بنی۔ ان کی جمع پونجی کی ایک کثیر رقم وہ عورت لے اُڑی۔ ان کو اس بات کا عرصے تک رنج رہا۔

خواتین سے ایسے ناخوش گوار واقعات کے باوجود میں نے اُنھیں عورتوں کے خلاف کبھی کڑوا ہوتے نہیں دیکھا۔

اس مصور کی زندگی میں عورت سے بڑھ کر ایک اور عشق ہے، مصوری۔ لیکن اس سے پہلے کچھ تذکرہ ادب اور ادیبوں کا۔

تصدق صاحب 1955ء سے فروری 1961ء تک کراچی میں رہے۔ اس دوران کی ادبی سرگرمیوں میں خاصے فعال رہے۔ انھی دنوں انھوں نے افسانہ ''بالشتیا'' لکھا جو بعد کو احمد ندیم قاسمی صاحب کے مستند ادبی رسالے ''فنون'' میں چھپا۔ دیوندر ستیارتھی کی زود نویسی کے حوالے سے سناتے ہیں کہ اُس کی عادت تھی، دوستوں کے حلقے میں گپ شپ چل رہی ہوتی اور ایک کان اِدھر لگائے اُس کا قلم کاغذ پر دوڑ رہا ہوتا۔ احباب بے جواز مباحث میں اُلجھ جاتے تو وہ اُٹھ کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور یک سوئی سے لکھنے لگتا۔ سب خیال کرتے کہ بک بک لکھ رہا ہے۔ مگر جب اُٹھتا تو مناسب معیار کے دس بارہ صفحات لکھ چکا ہوتا۔ وہ ایک رات میں بیٹھ کر طویل افسانہ مکمل کر لیتا۔

اپنی ادبی تربیت کا تمام تر سہرا اپنے استاد حسن عسکری صاحب کے سر باندھتے ہیں اور اُن کی بلا کی یادداشت اور ذہانت سے آج بھی متاثر و مرعوب ہیں۔

''وہ صفحات کے صفحات کمپیوٹر کی طرح سکین کر جاتے تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ بعد میں ایسا قد آور آدمی نہ دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے اُن کے سامنے ڈراما کیا۔ میں چند روز سے بال زاک کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اُس روز کلاس سے نکلتے ہوئے میں نے قصداً وہ صفحات اُن کے سامنے گرا دیے۔ انھوں نے دل چسپی سے پوچھا کہ ان صفحات میں کیا ہے۔ میں نے سادگی سے کہہ دیا 'بس کچھ فضول سی باتیں ہیں'۔ انھوں نے صفحات دیکھنے کی فرمایش کی۔ میں نے صفحات اُن کے سامنے رکھ دیے۔ وہ میرے رواں ترجمے سے خاصے متاثر نظر آنے لگے۔ میں نے سوچا کہ خوب ستایش ہو گی۔ میری ترجمہ شدہ تحریر پڑھ کر انھوں نے میری جانب غور سے دیکھا اور بولے 'خوب ترجمہ کیا ہے'۔ یہ سُن کر میں خوش ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد بولے 'کبھی ترجمے میں مت پڑو۔ اتنی محنت اپنی تحریر پر کرو۔ جو لکھو، اور جتل لکھو، وہ کم بولتے تھے۔ جو بھی بولتے اُس میں دانش ہوتی اور وزن ہوتا تھا۔ چناں چہ اُس روز کے بعد میں نے کبھی ترجمہ نہیں کیا۔

برطانیہ میں ان کے دو قریب ترین دوست شاعر ساقی فاروقی اور نابغۂ روزگار ناول نگار عبداللہ حسین تھے۔ ساقی فاروقی جلد ہی ایک برطانوی خاتون سے شادی کر کے گھر بسا بیٹھے اور بہ قول تصدق صاحب کے ''اپنے ٹیلنٹ کا بیڑا غرق کر لیا۔'' البتہ عبداللہ حسین سے ان کی

بہت بھی۔ اُن کی علمیت، شخصی وقار، مطالعے، قدرتِ تحریر اور نظر کی گہرائی کے بہت معترف نظر آئے۔ ''عبداللہ حسین اپنی متاثر کن شخصیت اور خوب صورت گفتگو کے باعث خواتین میں خاصا مقبول اور کام یاب تھا۔ ساقی فاروقی مبالغہ زیادہ کرتا ہے۔''

اپنے ایک دوست کا دل چسپ اور سبق آموز قصہ سنانے لگے۔ اُس دوست کی خواہش ایک عظیم ناول لکھنے کی تھی۔ ایسے بڑے کام کے لیے وہ ساری جوانی معاشی آسودگی اور مناسب وقت کی تگ و دو میں لگا رہا۔ خوش حال ہوگیا اور اُس نے اپنا ناول لکھنے کے لیے خاصا وقت پس انداز کرلیا تو ایک فلیٹ کرائے پر لیا، اس میں کئی ماہ کی خوراک ذخیرہ کی اور ناول لکھنے بیٹھ گیا۔ چند روز بعد اس بدبودار فلیٹ کا دروازہ توڑا گیا تو اندر سے اس کی کئی روز پرانی لاش ملی۔ اس کی موت برین ہیمرج سے ہوئی تھی۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ برسوں سے اکٹھا ہوتا ذہنی دباؤ برداشت نہ کرپایا اور مشقِ سخن نہ ہونے کے باعث تسلی بخش تخلیقی کام اس انداز سے نہ کرپایا جس کا اُس نے خواب دیکھا تھا چناں چہ صدمے سے اُس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ ''وہ وقتاً فوقتاً اپنے ناول کے حصے زبانی مجھے سنایا کرتا تھا۔ اُس کے خیالات واقعی متاثر کن تھے۔ آج اُس کا عظیم ناول اُس کی لاش کے ساتھ کسی گم نام قبر میں دفن ہے۔'' کچھ توقف کیا اور بات جاری کی۔ ''کسی بھی کام کو شروع کرنے کا بہترین دن 'آج' کا دن اور بہترین وقت 'ابھی' ہوتا ہے۔ کسی مناسب وقت اور موقع کی کوشش اور انتظار صلاحیتوں کو زنگ کی طرح کھا جاتا ہے۔ اس لیے بھلے چھوٹے اور تھوڑے کام سے شروع کرو مگر آج اور ابھی کرو۔ اس سے مشق بھی ہوتی ہے اور تخلیق میں نکھار بھی آجاتا ہے۔''

ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''تنہائی کا سفر'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آچکا ہے جس کا انتساب ''اُن تمام حسین عورتوں کے نام ہے جنھوں نے زندگی کے دُشوار سفر کو طے کرنے میں اُن کا ساتھ دیا۔ ان کی یادیں میری تصویروں کے شوخ اور دل کش رنگوں میں ہمیشہ جگ مگاتی رہیں گی۔'' اس کتاب میں انھوں نے لکھا کہ تمام کہانیاں لندن کے حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ فقط دو میں ترمیم کی گئی ہے۔ جب میں نے اس بات کی حقیقت پوچھی تو اس بیان کی پُرزور تائید کی اور بتایا کہ اِس کے علاوہ اور بھی واقعات ہیں جو فکشن سے زیادہ دِل چسپ اور حیران کُن ہیں۔ ان افسانوں کی خوبی ان کا فنی کمال نہیں بلکہ حقیقی اچھوتے اور دل چسپ واقعات کا سادہ اسلوب میں بیان ہے۔ ان کے ایک افسانے کا انگریزی ترجمہ جید اور ثقہ مترجم محمد عمر میمن نے بھی کیا جو بعدازاں پاکستانی افسانوں کے ایک انتخاب میں شائع ہوا۔ 'تنہائی کا سفر' کی ترکیب شاید اتنی قرینِ حقیقت نہیں کیوں کہ بے شمار رفیق ہائے زندگی اس طولانی سفر میں شریکِ سفر رہے۔

تصدق صاحب کی حیران کن نثری تخلیق اُن کی خودنوشت سوانح ہے جس کا عنوان غالبؔ کے مصرع ''دیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری'' سے ''مہ رخوں کے لیے'' لیا گیا ہے۔ یہ سوانح عمری ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے محبت، مذہب، ثقافت، نفسیات، معاشرت، اعتراضات، معاصرین اور مصوری کے حوالے سے انوکھے، غیر روایتی لیکن انتہائی دل چسپ واقعات اور بے لاگ تبصرے اسے ایک روایت پرست اور بے لچک معاشرے میں شائع ہونے سے روکتے ہیں۔ تصدق سہیل ایک بے ضرر آدمی ہے۔ اپنی حقیقت اور خیالات معصومانہ سچائی سے اس ریاکارانہ معاشرے میں بیان کرنا چاہتا ہے۔

شگفتہ گفتگو اور بعض اوقات ہلکی پھلکی گپ شپ کرنے والا مصور بے وجہ معروف و کام یاب فن کار نہیں۔ اس کا فلسفے، تھیالوجی، ادب، مصوری اور فنونِ لطیفہ پر نہ صرف گہرا مطالعہ ہے بلکہ ہر موضوع پر اپنی مخصوص خالص رائے بھی ہے۔ چوں کہ اس کے دن کا بیش تر حصہ مصوری اور غور و فکر میں گزرتا ہے چناں چہ اپنی روزمرہ کی سنجیدگی کے بھاری لحاف سے چہرہ نکال کر تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے چٹکلوں اور خوش گوار گفتگو سے مخاطبین کو کم اور اپنے آپ کو شاید زیادہ بہلاتا ہے۔ چند لمحے اپنے خول سے باہر گزار کر واپس سمٹ جاتا ہے۔

''مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ میری تمام تصاویر میں کوئی کہانی ہوتی ہے جو مختلف زاویوں سے دیکھیں تو رنگ بدلتی ہے۔'' انھوں نے مجھے سمجھایا۔

تصدق کینوس کو کئی خانوں میں تقسیم کرکے چھوٹے چھوٹے بلاکوں میں مختلف تصویریں پینٹ کرتے ہیں۔ بہ ظاہر ان کا آپس میں

کوئی ربط نہیں ہوتا۔ یہ تصاویر سب سے زیادہ اہم مانی جاتی ہیں اور مہنگی فروخت ہوتی ہیں۔

ابتدا میں مالی تنگ دستی میں وقت گزارنے والے تصدق کی پینٹنگز بعدازاں لندن کے معروف ''بونمز'' اور دبئی کے ''منعم'' نامی بین الاقوامی آکشن ہاؤسز میں لاکھوں روپے میں فروخت ہوئیں۔ کراچی میں ان کی تمام تصویریں ایک نمائش شروع ہونے سے پہلے ہی فروخت ہوگئیں۔ ان کی قیمت چند لاکھ سے شروع ہوکر دسیوں لاکھ تک چلی جاتی ہے۔

''ان تصاویر کو غور سے دیکھنا پڑتا ہے۔ ان کو دیکھنے کے لیے خاص نظر چاہیے۔ بظاہر ان میں شعوری سطح پر ربط نہیں لیکن شعور کی زیریں سطح پر یہ باہم منسلک ہیں۔ کہانیوں کی یہ پچی کاری داستان کو مکمل کرتی ہے۔ گویا دیکھنے والا ایک طویل حکایت، ضخیم ناول یا متنوع کرداروں اور رنگوں کی داستان دیکھ رہا ہے۔ اِن میں کرداروں کے ظاہر سے زیادہ ان کا باطن نظر آتا ہے۔'' جس نظر کا تذکرہ تصدق صاحب نے کیا، اُس کا مائکل اینجلو نے صدیوں پہلے کیا تھا جب وہ وفورِ جذبات میں بول اُٹھا تھا۔ ''میں نے سنگِ مرمر میں فرشتے کو دیکھا سو اس پتھر کو تراشا اور فرشتے کو آزاد کردیا۔'' پکاسو بھی کیا فطرت کا عجب شناور تھا جو پکار اُٹھا تھا۔ ''ہر بچہ فن کار ہوتا ہے۔ مسئلہ اصل بچپن کے بعد اُس فن کار کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔'' اُس نے پہلا لفظ 'ماں' نہیں بلکہ ہسپانوی ''پز'' بولا تھا جس کے معنی ''قلم'' کے ہیں۔ قلندرانہ فن کاروں کی اُس لڑی کا سرخیل وان گوف تھا جس نے عالمِ بے خودی میں اپنا کان کاٹ ڈالا تھا اور دس برسوں میں اُس کی بنائی نو سو پینٹنگوں اور گیارہ سو اسکیچوں میں سے صرف ایک ''سرخ باغیچہ'' فروخت ہوئی۔ یہ وہی مردِ دروں بیں تھا جسے جب ذہنی شفاخانے سے آزاد کیا گیا اور اُس دور کے عمدہ ماہرِ نفسیات ڈاکٹر گیچٹ کے پاس بغرض علاج بھیجا گیا تو اُس نے اپنے بھائی تھیو کو لکھا۔ ''یہ ڈاکٹر تو دماغی طور پر مجھ سے بھی زیادہ بیمار ہے'' لیکن پھر چند روز بعد بہن کو لکھا ''ڈاکٹر گیچٹ میں مجھے بھائیوں سے بڑھ کر دوست مل گیا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔'' یہاں سے ڈاکٹر اور مریض کی لازوال دوستی کا آغاز ہوا۔ جب شہرت نے دیوانے وان گوف کی کٹیا کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ قبر میں اُتر چکا تھا۔ وہ تو مر گیا مگر دنیائے فن کو لازوال فن پارے دے گیا۔

''میں اپنے تخیل کو آزاد اور بے لگام چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ اس کائنات اور ماورا میں سفر کرتا ہے۔ وہ ان روایات اور زماں و مکاں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ میں نومولود کی طرح دنیا کو دیکھتا ہوں جیسے یہ تازہ تخلیق ہوئی ہو۔ اس میں حیرت کا سامان ہوتا ہے۔ میں اُس کیفیت میں چلا جاتا ہوں جہاں میں اپنے شعور سے آزاد ہو جاتا ہوں۔ یہ تصویریں اسی تازہ نظری نے میرے تحت الشعور سے تخلیق کروائی ہیں۔ میں اِنسان، جان وروں اور پرندوں کے اجسام کے اندر دیکھتا ہوں۔ میں بالباس شخص کو بے لباس تصور کرتا ہوں اور اُس کے چہرے کے اندر اُتر جاتا ہوں۔ میں خواب کم دیکھتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں تو اُن میں میرے اِردگرد پرندے اور جان ور ہوتے ہیں، پریاں ہوتی ہیں، جل پریاں، یک قرن اور دیگر ماورائی مخلوقات ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ میرے اندر سے نکل کر میرے کینوس پر بکھر جاتے ہیں۔ زیادہ تر ابھی میرے اندر قید ہیں۔ میں اِنھیں آزاد کرنا چاہتا ہوں۔''

ارسطو نے ایسے فنافی الفن فن کاروں کے بارے میں کہا تھا۔ ''فن کار کا مطمحِ نظر ظاہر کو بیان کرنا نہیں بلکہ باطن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے''

ایک روز بہت خوش تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو پینٹنگ بنانا چھوڑ کر سامنے اسٹول پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ سائنس دانوں نے ایک مصنوعی سیارچہ خلا میں بھیجا تھا۔ وہ تیس سال کا سفر طے کر کے بھٹک کر ایک کہکشاں میں پہنچ گیا ہے اور وہاں کی سیارے پر اُتر گیا ہے۔ میں اس خبر کے بارے میں سوچتا رہا۔ رات خواب میں، مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ میں اُس مصنوعی سیارچے پر سوار ہوں اور ایک سیارے پر اُتر گیا ہوں۔ وہاں زندگی موجود تھی اور عجیب و غریب مخلوقات بسیرا کرتی تھیں، حیران کُن ماحول تھا اور وہ کچھ تھا جو بیان نہیں کیا جاسکتا، فقط پینٹ کیا جاسکتا ہے۔''

''آپ کے ذہن کی اُڑان اب سیاروں تک پہنچنے لگی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کہنے لگے۔ ‘‘میں تو ذہنی طور پر اُس خوب صورت دور میں رہتا ہوں جب اِنسان نے اس شان دار زمین کو پامال نہ کیا تھا۔ یہاں گھنے جنگل، کنوارے چشمے، معدوم ہو چکے پھل پھول اور مخلوقات اور تازگی تھی۔’’

تصدق صاحب کا اشارہ اُس دور کی جانب تھا جب سب چرند پرند آزاد تھے، اِنسان بھی آزاد تھے۔ ابھی موافق استدلال، روایت اور اشیا کا آہنی خول سر پر چڑھایا نہ تھا۔ دوسروں کی خواہشات کا قیدی نہ تھا۔ آزاد تھا اسی لیے زندہ تھا۔ ابھی انسان کی موت واقع نہ ہوئی تھی۔

ان کی پینٹنگز میں قرمزی مچھلیاں، نیلی دُموں والے سبز توتے، سفید ہنہناتے گھوڑے، طلائی مور، روپہلی دمکتے ماورائی پرندے، بڑی چھاتیوں اور بھرے کولھوں والی برہنہ عورتیں اور داڑھیوں والے مرد ہیں۔

‘‘یہ داڑھی والے مرد کیوں ہیں؟’’ ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔ یہ سن کر گہری سوچ میں گم ہو گئے اور آنکھیں نیم موند لیں۔ سادگی سے بڑبڑائے ‘‘یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔’’

‘‘کہیں معاشرے میں مذہبی انتہاپسندی کی علامت تو نہیں؟’’ میں نے ایک اشارہ دیا۔

‘‘نہیں نہیں۔ یہ تو میں لندن میں بھی بناتا تھا۔’’ انھوں نے صاف گوئی سے وضاحت کی۔

‘‘آپ بھی سوچیے، بھلا میں داڑھیوں والے مرد میں کیوں بناتا ہوں؟’’ انھوں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

تھوڑی دیر میں ایک خیال میرے ذہن میں کوندا اور میں چٹکی بجا کر بولا۔ ‘‘آپ یقیناً داڑھیوں والے مرد اس لیے بناتے ہیں کہ ہر شے کو اس کی اصل حالت میں پینٹ کرتے ہیں۔ مرد شروع سے داڑھی میں ہے۔ شیو تو سکندرِ اعظم کی ایجاد ہے۔ اصل مرد تو داڑھی والا مرد ہے۔’’

یہ سن کر تصدق صاحب نے آنکھیں کھولیں اور مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر بولے۔ ‘‘واہ وا، آپ میرا ذہن کتنا سمجھتے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ آیندہ کسی کو اِس کا یہی مطلب بتایئے گا۔ میں بھی یہی بتاؤں گا۔’’

یقیناً سادہ دِل مصور کے تحت الشعور میں یہی خیال کارفرما تھا جس کی وہ تفہیم نہ کر پایا تھا۔

بین الاقوامی مصوروں میں انھیں پکاسو نے بہت متاثر کیا جسے ‘‘غیر معمولی جینیس’’ سمجھتے ہیں۔ ‘‘وہ ایک لائن کو سیر پر لے جاتا تھا۔ اتنا اسٹیمنا ناقابلِ یقین ہے۔’’ اسی طرح وان گوف کو استادوں کا استاد تصور کرتے ہیں۔ میری ذاتی رائے میں اُن کے فن پر شیگال کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ شیگال تھا جو جدید مصوری کا سرخیل ٹھیرا اور اس کے بارے میں پکاسو بول اُٹھا ‘‘میٹیسی کی موت کے بعد شیگال واحد مصور رہ جائے گا جو رنگوں کی زبان سمجھتا ہے۔’’ شیگال رنگوں سے شاعری کرتا تھا اور رنگ اُس سے محبت۔

پاکستانی مصوروں میں انھیں استاد اللہ بخش بہت پسند ہے۔ اسے کلاسیکل انداز کا ایسا مصور سمجھتے ہیں جسے اپنے فن پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ اینا مولکا کے فن پاروں کے بارے میں اُن کا خیال ہے۔ ‘‘ایسے متحیر کر دینے والے نیوڈز گویا ابھی جاگ اُٹھیں، آپ کا جی اُنھیں گھنٹوں دیکھ کر بھی نہ بھرے، صرف اینا مولکا ہی بنا سکتی تھی۔’’ کولن ڈیوڈ سے بھی خاصے متاثر ہیں۔ امرتا شیرگل کو پیدائشی مصورہ مانتے ہیں۔ صادقین کو ایک شان دار مصور سمجھتے ہیں۔ ‘‘کام کی کثرت اور سیاہ رنگ کے غیر ضروری استعمال نے اس کا معیار گہنا دیا۔ مجھے اس کی نظم غالباً ’درستایشِ موئے زیرِ ناف‘ خاصی مختلف لگی۔’’

میں نے ایک معاصر معروف مصور کا نام لیا۔ نام سن کر اُن کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک آگئی مگر ناکام اداکاری کرتے ہوئے منہ بنایا۔

‘‘یہ کون ہے؟ میں نہیں جانتا۔ پہلی مرتبہ نام سنا ہے۔’’

معاصرین کے تذکرے پر سادگی سے سرہلا دیا۔ ’’ان کے مقام کا فیصلہ ان کی موت کرے گی۔‘‘

معاصر فن کار اور ناقدان کے فن کے معترف ہیں۔ قدوس مرزا نے ان کے ہاں جادو، اساطیر اور تاریخ کے سنگم کو سراہا تو مہر افروز کا بیان ہے ’’ان کے ہاں ایک مکمل دنیا آباد ہے۔ وہ ایسی روانی سے پینٹنگ تخلیق کرتے ہیں جو کوئی اُستاد ہی کر سکتا ہے۔ ان کا جمالیاتی تخیل آزاد، اسٹروکس پُراعتماد اور انداز جداگانہ ہے۔ ان کے ہاں ہر رنگ موجود بھی ہے اور اپنی علیحدہ شناخت بھی کرواتا ہے۔ چوں کہ وہ معاشرتی روایات کے اسیر نہیں چناں چہ ان کے فن میں آزادی کے خوش نُما رنگ ہیں۔‘‘ آر ایم نعیم کہتے ہیں ’’بے ساختگی، ہماری معاشرتی شگفتگی اور مخصوص انوکھا پن کینوس سے اُبل پڑتا ہے۔ ان کی تصویر دیکھنا، ایک خوب صورت کتاب پڑھنا ہے۔‘‘

ان کے ناقدین ان کی تصویروں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ دماغ کو نہیں بلکہ صرف دل اور نظر کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ اِن کی باقاعدہ نصابی ڈگری نہ ہونے پر بھی معترض ہوتے ہیں۔

’’سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹ میں مَیں نے دہائیاں شام کی کلاسوں میں گزاریں۔ وہ شام کے طلبہ کو ڈگری نہیں دیتے لیکن ان کی موجودی کا رِکارڈ رکھتے ہیں جو میرا ابھی موجود ہے۔ ویسے اُستاد اللہ بخش، صادقین اور دیگر بڑے مصوروں کے پاس کون سی ڈگریاں تھیں۔ جہاں تک دماغ کو متاثر نہ کرنے کی بات ہے اور دِل و نظر پر اثر کرنے کا تعلق ہے تو اِس سے عمدہ فن پارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔‘‘ انھوں نے اطمینان سے مسکرا کر اعتراض ہی میں جواب تلاش کر لیا۔

تصدق صاحب کی تصویریں لاکھوں روپوں میں بِکتی ہیں۔ قلندرانہ مزاج ہے، چناں چہ کئی دنوں کی محنت سے تیار کی گئی تصاویر دوستوں کو تحفتاً بھی دے دیتے ہیں۔ مجھے اپنی چند ایک تصاویر وقتاً فوقتاً تحفتاً تھما دیں، کہنے لگے۔ ’’میں آپ کے پاس اپنی پینٹنگز کا مکمل سیٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘ ایسا سخی مزاج، دوست نواز شخص ایک نایاب اور بیش بہا معدوم ہوتی بامروّت نسل کا نمائندہ ہے۔ ایک تجربے سے تو میں بارہا گزرا ہوں۔ ان کے اسٹوڈیو میں کوئی بہت متاثر کُن تصویر دھری ہے۔ میں تعریف کرتا ہوں تو کہتے ہیں۔ ’’ابھی اِس پر کام ہونا باقی ہے۔‘‘ جب میں کچھ عرصے بعد دوبارہ جاتا ہوں تو تصویر ویسی ہی رکھی ہے، غور سے دیکھنے پر کسی جانب ایک معمولی اسٹروک کا اضافہ نظر آتا ہے۔ جب میں اس کے بارے میں پوچھتا ہوں تو غیر مطمئن انداز میں سر ہلا دیتے ہیں۔ ’’ہاں تصویر کچھ متوازن تو ہو گئی ہے مگر اب بھی اِس پر کام ہونا باقی ہے۔‘‘ وہ اپنی کسی تصویر سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ایسے ہی نقاشوں کے بارے میں پال ویلری نے کہا تھا۔ ’’ایک سچا فن کار کبھی اپنا کام مکمل نہیں کرتا، فقط اُسے بیچ میں چھوڑ دیتا ہے۔‘‘

ایک مرتبہ میں اُن کو ملنے گیا تو ایک بڑی پینٹنگ اختتامی مراحل میں تھی۔ اس میں دیگر مناظر کے علاوہ وسط میں ایک لڑکی کی پشت بنی تھی جس پر ایک سبز طوطا بیٹھا تھا۔ مجھے بتانے لگے کہ ایک بڑا صنعت کار اُن کو ایک موٹی رقم پیشگی دے گیا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ یہ اُس کے لاؤنج کے لیے تصویر بنائیں۔

’’مجھے ایک تیر سے دو نشانے لگانے کا خیال آیا۔ ایک تو اچھا معاوضہ مل گیا اور دوسرے اس لڑکی کی پشت پر سبز طوطا بٹھا کر میں نے نقش فریادی* کو پیغام دیا ہے کہ کبوتر کے علاوہ کوئی اور پرندہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور اسے کندھے کے علاوہ جسم کے دیگر حصوں پر بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔‘‘ جب وہ قہقہہ لگا کر مجھے اپنی واردات سنا رہے تھے تو میں چشمِ تصور میں پینٹنگ وصول کرتے وقت اُس صنعت کار کا تصویر دیکھ کر دھچکے سے غم گین ہوتا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔

جب پہلی مرتبہ مجھے تحفتاً ایک تصویر دینے کی نوید سنائی تو اشتیاق مجھ پر حاوی ہو گیا۔ آخر ملاقات کا وقت ہوا، انھوں نے آہستہ آہستہ کینوس پلٹا تو سامنے ایک حسینہ کی پُرکار پشت تمام جزئیات کے ساتھ موجود تھی۔ جب میرے اُترتے چہرے کو دیکھا تو فخر سے بولے۔ ’’یہ

---

* نقش فریادی۔ فرضی نام

پشت کئی سالوں سے میرے خیالوں میں آ رہی تھی۔ میں اب بنانے میں کام یاب ہوا ہوں۔ آپ کے ڈرائنگ روم میں خوب سجے گی۔"

ایک مرتبہ ایک شاعر نے انھیں اپنے شعری مجموعے مہرِ دونیم (دوٹکڑوں میں بٹا سورج) کا سرورق بنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے شرارتاً ہامی بھرلی۔ جب اُن شاعر کو تصویر پیش کی تو اُس نے اشتیاق سے اسے دیکھا، سامنے دونیم کے درختوں کے بیچ سورج بنا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ باقاعدہ ناراض ہوگیا۔ یہ واقعہ تصدق صاحب مجھے کئی مرتبہ ہنستے ہوئے سنا چکے ہیں۔

ایک روز اعتراف کے موڈ میں تھے تو بتانے لگے کہ انھیں زندگی میں دو چیزوں نے بہت پریشان کیا۔ ایک تو لاہور کی اُس بازاری عورت کے ساتھ تلخ تجربے نے انھیں مدتوں غیر فعال رکھا۔

دوسرے یہ نوجوانی میں گنجے ہوگئے تھے۔ اِس گنجے پن نے انھیں احساسِ کم تری میں مبتلا کردیا۔ چناں چہ ان کی نوجوانی کا خاصا عرصہ یہ احساس کھا گیا۔

"میں نے زندگی کی ابتدا میں چند فیصلے کرلیے تھے جن پر آج بھی قائم ہوں۔ ایک تو یہ فیصلہ کہ کبھی باقاعدہ فُل ٹائم نوکری نہیں کرنی بھلے اِس کے لیے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑیں۔ اس خود عہدی کو پورا کرنے کے لیے سیلزمین سے لے کر شیف تک رہا مگر اپنی زندگی کو زیادہ وقت دیا، دوسروں کی زندگی کو نہیں۔ دوسرے کسی کام کو حقیر نہیں جانا چناں چہ ہر پیشے کی دِل سے عزت کرتا ہوں۔"

ایک سہ پہر خوش مزاجی سے گفتگو کر رہے تھے تو میں نے پوچھ ہی ڈالا کہ لاہور میں ابتدائی زندگی گزارنے کے باوجود انھوں نے کراچی میں مستقل سکونت کیوں اختیار کی۔

یہ سوال سن کر دکھی لہجے میں بولے۔ "آج کا لاہور وہ شہر نہیں جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میرا پہلے والا شہر لاہور کشادہ نظر اور تخلیقی طور پر بڑے بلکہ عظیم لوگوں کا شہر تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ شہر پھیلاؤ میں تو بڑھ گیا ہے مگر سوچ میں سمٹ گیا ہے۔ دیہی، قصباتی تنگ نظری جب سے ہجرت کرکے اس میں آباد ہوئی ہے، وہ ایک عام شہر ہوگیا ہے۔ وہیں شاکر علی کے میوزیم کو جلا دیا گیا، کولن ڈیوڈ کے گھر پر حملہ کیا گیا، نیر علی دادا کے آرٹ ہاؤس میں توڑ پھوڑ کی گئی اور صادقین کی اُنگلیاں توڑ ڈالی گئیں جس کے بعد اُس نے 'نیوڈز' (برہنہ جسم) بنانا چھوڑ دیے۔ اِس دور میں جب وہاں انارکلی میں گیلس پہن کر نکلتا ہوں تو لوگ مذاق اُڑاتے ہیں 'یہ بابا لندن میں چار دن گزار آیا ہے تو کاٹھا انگریز بننے کی کوشش کر رہا ہے' جب کہ یہاں کراچی میں سو خطرات سہی، میں اپنی مرضی کی زندگی تو گزار سکتا ہوں۔ میں نے تو اپنی زیادہ زندگی لندن جیسے شہر میں گزاری ہے جہاں اگر آکسفورڈ اسٹریٹ پر بے لباس لڑکی بھاگتی چلی جا رہی ہو تو کوئی اُسے گھورنا تو کجا، مڑ کر دیکھتا بھی نہیں۔ ہر کسی کو اپنی زندگی سے غرض ہے، دوسروں کی ذاتی زندگی میں دل چسپی نہیں۔"

ایک ملاقات میں شکیل عادل زادہ صاحب کو دیکھ کر کِھل اُٹھے اور خوب دِل کھول کر باتیں کیں۔ شکیل صاحب نے ان کی اس طویل عُمر میں تازگی برقرار رہنے کے حوالے سے پوچھا تو بتایا۔

"میں جوان لوگوں میں رہتا ہوں اِس لیے جوان ہوں۔ اِنسان کی طبعی عمر سو برس ہے۔ اگر کوئی اس سے پہلے طبعی موت مرجائے تو میں اسے 'بے وقوف' سمجھتا ہوں۔ ہاں حادثات اور بیماریاں اِنسان کے اختیار میں نہیں۔ میرا ایک عزیز اسپتال میں داخل ہوا۔ ڈاکٹروں نے اس کا آپریشن کیا اور اس کے چلنے پھرنے پر سختی سے پابندی لگا دی۔ وہ ظالم تازہ ٹانکوں کے ساتھ آنکھ بچا کر رکشے میں بیٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ رستے میں سڑک ٹوٹی پھوٹی اور زیرِ تعمیر تھی چناں چہ جھٹکے لگنے سے اس کے زخم کھل گئے اور وہ باہر گر گیا۔ وہیں اس کی موت واقع ہوگئی۔ میں اُس کے جنازے میں شریک نہ ہوا۔ جب شکوہ کیا گیا تو میں نے صاف کہہ دیا 'میں کسی بے وقوف کے جنازے میں شریک نہیں ہوا کرتا۔ میں ۸۷ برس کا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ میں جلد مرجاؤں گا اسی لیے دھڑا دھڑ میری تصویریں خریدتے ہیں تاکہ بعد میں انھیں مہنگے داموں فروخت کردیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

جب ہماری آدھ گھنٹے کی طے شدہ نشست تین گھنٹے میں تشنہ چھوڑ کر میں اور شکیل صاحب باہر سڑک پر نکلے تو وہ بولے۔ ''میں نے اتنا جوان بڑھا آج تک نہیں دیکھا۔ اِن کی تو ہر بات ریکارڈ کر کے محفوظ کرنے والی ہے۔ یہ تو کھرے آدمی ہیں، سچے ہیں۔ یہ سچ کہہ رہے تھے، ابھی واقعی اِن کا مرنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا۔''

ایک ملاقات میں ان تبدیلیوں کا تذکرہ ہوا جو اُن کے بعد پاکستان میں وقوع پذیر ہوئیں تو مثبت رُخ کا حوالہ دے کر کہنے لگے کہ اب عورتیں زیادہ آزاد اور معاشی طور پر خود کفیل ہیں۔ پہلے صرف کرسچن اور اینگلو انڈین لڑکیاں ملازمتیں کرتی تھیں جب کہ اب عام گھروں کی لڑکیاں بھی معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑی ہیں اور پہلے کی نسبت ذہنی طور پر بھی خاصی ترقی کر گئی ہیں۔

منفی حوالے سے بتانے لگے کہ پہلے کراچی ایک صاف ستھرا شہر تھا۔ یہاں ہر قومیت اور مذہب کا شخص اطمینان سے زندگی بسر کرتا تھا۔ آج کے کراچی میں عمارتیں بے ڈھنگی اور جمالیاتی حسن سے محروم، سڑکیں گندگی اور کچرے سے لب ریز، زندگی قطعی غیر محفوظ، ٹرانسپورٹ ٹوٹی پھوٹی اور بے قاعدہ، لوگ غیر مہذب ہو چکے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس تمام تنزل کے باوجود وہ واپس پاکستان کیوں لوٹے تو خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد گلوگیر لہجے میں بولے۔ ''پرندے پورا دن سیر کر کے شام کو اپنے گھونسلوں ہی کو لوٹتے ہیں۔ میرے پاس آخر میں سوائے گھر واپس آنے کے کوئی اور رستہ نہ تھا اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔ پورا دن آوارہ گردی کر کے آخر میں تو اِنسان کو گھر ہی واپس آنا ہوتا ہے۔''

اُن کے گھر واپسی کے بعد کے حالات کچھ آسان نہیں رہے۔

ان کے ساتھ کچھ ایسے حادثات بیت چکے ہیں جنھوں نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چوں کہ تنہا رہتے ہیں، کھانے کے لیے ہوٹلوں کو فون پر آرڈر کر دیتے ہیں، چند مرتبہ سفاک مجرموں نے فن کار کے ساتھ ظلم کی انتہا کر دی۔ سادہ منش مصور ابتدا میں اپنی رقم بستر کے نیچے اور الماریوں میں رکھتا تھا۔ کسی واقفِ حال نے مجرموں کو ان کے ہاں بھیجا، جنھوں نے خریداروں کے روپ میں گھنٹی بجائی اور اندر آن کر سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ان کی تصویروں کا سودا کرانے والے ایک ایجنٹ، نے ان کی غیر موجودگی میں گھر خالی کر دیا۔ ایک روز گھنٹی بجی محتاط مصور نے دروازہ نیم وا کیا تو ایک شخص پستول دِکھا کر اندر داخل ہوا، ان کو پرے دھکیلا، یہ دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے اور وہ ڈراتا دھمکاتا پیسے لوٹ کر چلتا بنا۔ تنگ آ کر بینک میں رقم جمع کروانا شروع کی تو خاتون بینکار فراڈ کر گئی۔ ایسے حادثات نے ذہنی طور پر انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ ''اس ملک میں آدمی کا تنہا رہنا بہت مشکل کام ہے۔'' مجھ سے زخمی لہجے میں حالِ دِل بیان کیا۔

ابھی یہ سانحات اُن پر گزر رہے ہی تھے کہ ایک ایسی اُفتاد سر پر آن پڑی جس نے اُنھیں نا قابلِ تلافی جذباتی صدمے سے دوچار کیا۔

سناتے ہیں کہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک آرٹ ایجنٹ نے ان سے رابطہ کر کے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ سدا کے فن کار ٹھیرے، سو جہاں دیدہ رابطہ کار کی ضرورت رہی جو آرٹ کے شائقین اور ان کے درمیان پُل بن سکے۔ اسے اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ وہ شخص وقت گزرنے کے ساتھ حاکمانہ طبیعت کا شخص ثابت ہوا جس نے اِنھیں گویا اپنے چنگل میں پھنسا لیا اور تین برس تک اِن سے دِن رات ''مزدوری'' کرواتا رہا۔ جب ان کو رقم کی ضرورت ہوتی چند ہزار دے دیتا اور کہہ دیتا کہ بقیہ وہ جمع کر رہا ہے۔

ایک روز یہ اُس کے ساتھ بینک گئے اور اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا آئے۔ ایک دو روز بعد چیک بک آئی تو وہ ان کے پاس بیٹھا تھا۔ اِن کی طبیعت ناساز تھی۔ نمایندے نے چیک بک وصول کی اور کسی بہانے تصدق صاحب سے رسید پر دست خط لے لیے۔ انھوں نے بھی سادہ لوحی سے دست خط کر دیے۔

چند ماہ بعد ان کو رقم کی ضرورت پڑی تو یہ بغیر چیک بک سادگی سے بینک چلے گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ ان کا اکاؤنٹ خالی ہے۔

وہ شخص ان کے دست خط کر کے رقم لے جا چکا تھا۔

اُسی شام اتفاقاً میں نے فون کیا تو انھوں نے یہ بپتا سنائی۔ میں فوراً ان کے ہاں پہنچا تو فلیٹ میں تصدق صاحب چند دیگر آرٹسٹوں کے بیچ غم کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ میں نے دِل جوئی کی اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ میری گفتگو ختم ہوئی تو معصومیت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”میری رقم مل جائے گی؟“

”یقیناً“ میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

وہیں بیٹھے ایک اور آرٹسٹ نے انکشاف کیا کہ اُس ایجنٹ کے قبضے میں اِن کی ڈیڑھ دو سو تصاویر ہیں جن کی مالیت کروڑوں روپے بنتی ہے۔ ان تصاویر میں ان کے کئی سال کی محنت شامل ہے۔

یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔

”اب جب کوئی ثالث یا حکومتی کارندہ آپ کے پاس آئے تو بھرپور اور پُرزور انداز میں اصرار کیجیے گا کہ آپ کو رقم فوری چاہیے۔ ایسے معاملات طول پکڑ جائیں تو برسوں تک چلے جاتے ہیں۔“ میں نے عاجزانہ تاکید کی۔

”چلو، پیسے بے شک رکھ لے، بس میری جان چھوڑ دے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ اُس نے مجھے یرغمال بنایا ہوا تھا۔“ تصدق صاحب نے سہمے لہجے میں کہا۔

میں نے اپنا سر تھام لیا۔

بالآخر ہم سب کی بارہا تسلی کے بعد انھوں نے حوصلہ پکڑا۔ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ”تصدق صاحب آپ بھی بغیر کسی جانچ پڑتال کے لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں۔“

تصدق صاحب نے عادتاً سر ہلا دیا۔

یک دم مجھے ایک خیال سوجھا۔ ”میں پچھلے دس برس سے آپ کے ہاں نہ صرف آ رہا ہوں بلکہ دیگر جگہوں پر بھی ہماری ملاقات رہی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں میں کون ہوں، کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر مخصوص انداز میں سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ”واقعی! آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟“ سب ہنس پڑے۔

سب کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنس پڑے اور روایتی خوش مزاجی سے بولے۔ ”میرا ایک بہت پرانا دوست تھا۔ انگلینڈ سے کبھی کبھار اِدھر آتا تو اُس سے ملاقات ہو جاتی۔ اب جو میں مستقل طور پر اِدھر آ گیا تو ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ ایک شام میں نے ڈرائیور منگوایا اور اُس کے بنگلے پر حسبِ معمول ملاقات کے لیے چلا گیا۔ وہاں میرے ڈرائیور اور اُس کے چوکی دار کی اچھی گپ شپ ہو گئی۔ میرے ڈرائیور نے کہیں چوکی دار کو کہہ دیا۔ ’میرا صاحب بہت امیر ہے۔ ڈیفنس میں اس کا فلیٹ ہے۔‘ اس پر چوکی دار بولا۔ ’تمھارا صاحب ٹھینگا امیر ہے۔ جہاں اُس کا فلیٹ ہے وہاں کے نہ صرف قریباً تمام فلیٹوں بلکہ دس بارہ دکانوں کی ملکیت بھی میرے صاجب کے پاس ہے۔‘ واپسی پر ڈرائیور نے ساری رُوداد مجھے سنا ڈالی۔ چناں چہ اگلی ملاقات پر میں نے دوست سے کہا۔ ’میں نے تو تم سے اتنے برسوں میں کبھی پوچھا ہی نہ تھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ تم اتنے امیر آدمی ہو۔‘ میری بات سن کر دوست پریشان ہو گیا اور پوچھا کہ مجھے یہ ساری بات کس بدبخت نے بتائی تو میں نے اپنے ڈرائیور اور اُس کے چوکی دار کا مکالمہ اُسے سنا دیا۔ یہ سن کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب میں دوبارہ ملا تو دوست نے بتایا کہ اُس نے اگلے روز ہی چوکی دار کو نوکری سے یہ کہتے ہوئے فارغ کر دیا۔ ’ظالم تو نہ صرف اپنی بے وقوفی سے ہمارے گھر ڈاکا ڈلوائے گا، بلکہ ہم دونوں میاں بیوی کو قتل بھی کروائے گا۔‘“

تصدق صاحب نے چہکتے ہوئے یہ واقعہ سنایا تو سبھی ہنس پڑے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ اپنی ترنگ اور جون میں واپس آ گئے اور بولے۔ ’’میرا ایک ہٹا کٹا جوان واقف کار صحافی اور ناقد مجھے جب بھی ملنے آتا تو کہتا ’’کیہ حال اے بزرگو؟‘‘ (کیا حال ہے بزرگوار؟) اس کا لفظ ’’بزرگو‘‘ مجھے بچھو کی طرح ڈنک مارتا اور میں سوچتا کہ کیا میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ان ملاقاتوں کا نفسیاتی طور پر مجھے بہت نقصان پہنچا اور میں ہر ملاقات کے بعد اپنے آپ کو کئی برس مزید بوڑھا محسوس کرنے لگتا۔

’’آج کل وہ کہاں ہوتا ہے اور کیا اب بھی آتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

اُن کو گویا کچھ یاد آ گیا۔

’’ہاں یہی بات تو میں نے بتانی تھی۔ وہ بے وقوف جوانی ہی میں فوت ہو گیا اور میں ’’بزرگو‘‘ ابھی تک زندہ ہوں۔‘‘

آخر ہم نے اجازت چاہی۔ سب چلے گئے تو ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد اُنھوں نے لمبی سانس بھری اور نیم مردہ انداز میں مسکرا دیئے۔ میں یہ سوچتا ہوا نکلا کہ یہ رات اس مصور پر بہت بھاری گزرے گی جس کی جمع پونجی آج کے دِن نقدی اور قیمتی تصویروں کی شکل میں لُٹ گئی۔

اُن کے فلیٹ سے اُتر کر میں سامنے ایک سٹور پر ٹھنڈی بوتل پینے رُک گیا۔ دکان میں دکان دار کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ میں نے اُس سے سرسری انداز میں پوچھا۔

’’سامنے فلیٹ والے صاحب کو آپ جانتے ہیں؟‘‘

وہ بولا ’’یہ کئی سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ سنا ہے، بہت بڑے مصور ہیں۔ بہت سادہ آدمی ہیں، کوئی درویش یا فقیر۔ آدھی رات کو اُٹھ کر گوشت اُبال کر اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے کرتے ہیں اور پرندوں، جان وروں کو کھلاتے ہیں۔‘‘

’’سنا تو میں نے بھی ہے‘‘ میں نے تائید کی۔

’’آپ نے تو سنا ہے۔ میں یہیں قریب رہتا ہوں۔ روزانہ منہ اندھیرے، سویرا ہونے سے پہلے، ایک وقت پر باقاعدگی سے اس سڑک پر سب پرندے اور جان ور یہاں آتے ہیں۔‘‘

’’سارا دِن یہ بالکونی میں باجرا اور دانے ڈالتے رہتے ہیں اور مٹی کے پیالوں میں پانی بھرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ دن بھر کبوتروں، چڑیوں اور دوسرے چھوٹے پرندوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔‘‘

میں نے دکان دار کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے خلوص اور سچائی نظر آئی۔ ’’فقیر آدمی ہیں فقیر‘‘ اُس نے دہرایا۔

رات گہری ہو رہی تھی اور ہوا میں اُداسی گھل مل رہی تھی۔ دکان دار نے بات ختم کی اور میں باہر نکلا تو میری نظر تصدق صاحب کے فلیٹ پر جا پڑی۔

اندر روشنیاں گُل ہو رہی تھیں۔ مجھے اُن کا جملہ یاد آ گیا۔

’’بالآخر انسان کو گھر واپس آنا ہی ہوتا ہے۔‘‘

بوڑھا فن کار ایک اعصاب شکن دِن کے بعد یقیناً سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرے نئے دن تمام تر تازگی اور شادابی سے طلوع ہونے اور نت نئے خیال و خواب نقش کرنے کے لیے۔

ٹِلّا جوگیاں کا مصلّی

نصیر کوی

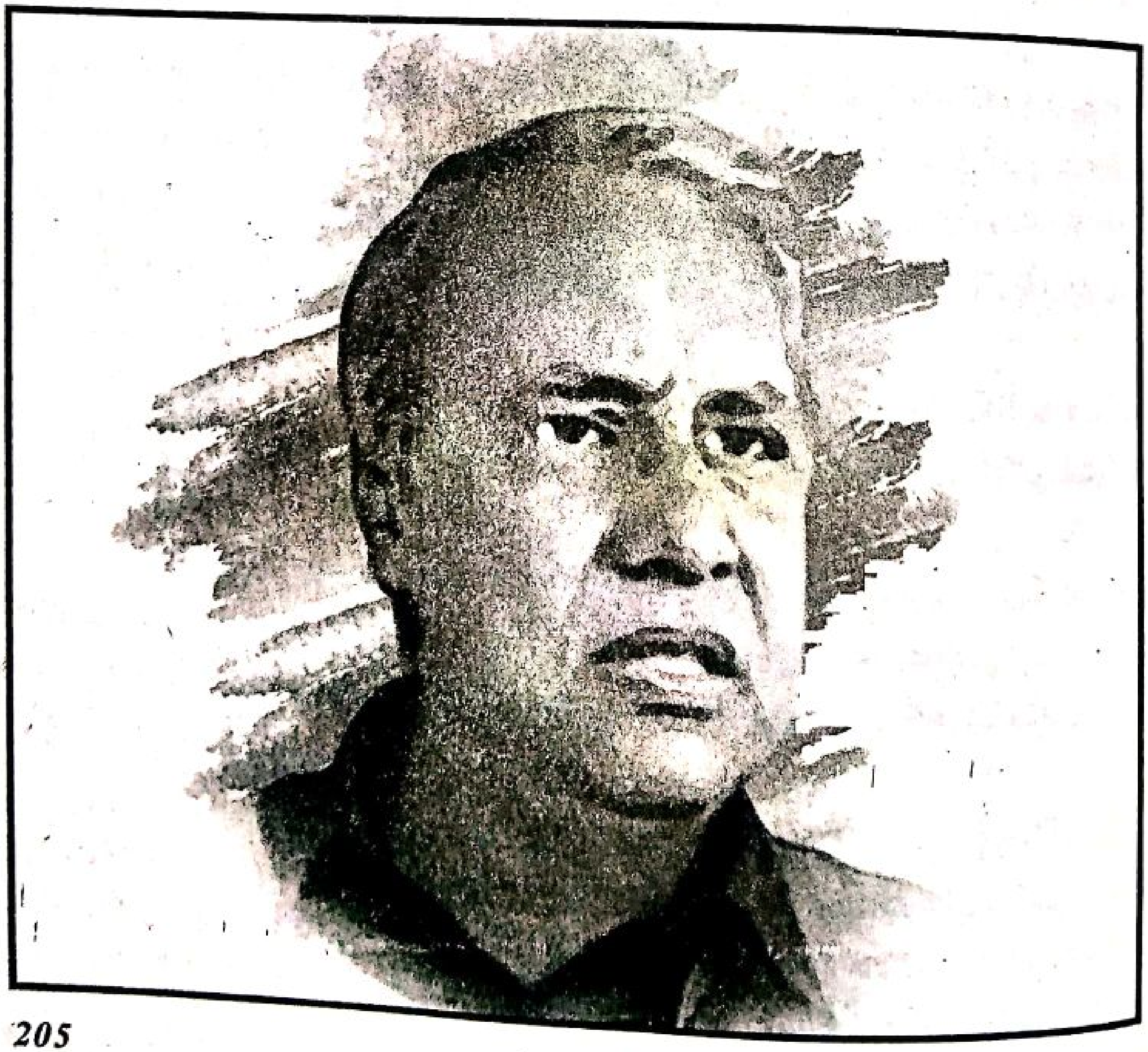

شاعر کے انکشاف نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔

کروڑوں لوگ کئی برسوں سے گُمان کے جس بُلبلے میں قید تھے، اس اعتراف نے سوئی کی نوک کی طرح اُسے پھوڑ ڈالا۔

شیر شاہ سُوری کی تعمیر کردہ گرینڈ ٹرنک روڈ (جی ٹی روڈ یا شاہ راہِ عظیم یا جرنیلی سڑک) پوٹھوہار کی بکھر بکھری اور پتھریلی سرخ پہاڑیوں کے بیچ سے سانپ کی طرح بَل کھاتی، ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہوں کے مرکز ٹلا جوگیاں کے برابر سے گزرتی، سندھ ساگر دوآبہ کے سرسبز قطعات کو چھوکر برصغیر کے سب سے وسیع اور زرخیز میدانی علاقے پنجاب میں اُتر جاتی ہے۔ یہ علاقۂ اتصال زیادہ تر بنجر اور بے آباد ویرانی ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ کہیں کہیں پانی کے چھوٹے تالاب اور برساتی ندی نالے اپنے اندر نمک اور سرخ مٹی کو ملاتے گدلے پانیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

جہلم شہر سے کچھ پہلے سڑک کے دونوں اطراف میں سبز، نیلی اور پیلی ٹمٹماتی اُداس ٹیوب لائٹوں اور چمک دار ٹائلوں سے مزّین بے ڈھنگے شادی گھر ناگ پھنی کے پودوں کی طرح بے ترتیبی سے اُگ آئے ہیں۔ علاقے کے جغرافیائی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث یہ عمارتیں تعمیراتی حُسنِ لطیف سے محروم اور نظروں پر گراں گزرتی ہیں۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر میں نے اپنی گاڑی سڑک سے اُتار کر ایک شادی گھر کے سامنے پارکنگ میں جا کھڑی کی۔ چند ملازم چھڑکاؤ کر کے اینٹوں سے بنے داخلی رستے کی حدت گھٹا رہے تھے۔

سڑک اور داخلی رستے کے سنگم پر ٹین سے بنا ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا کھوکھا برائے نام اشیائے خورد و نوش سجائے اپنے عارضی وجود کا احساس دِلا رہا تھا۔ اُس کھوکھے میں چند چپس، بسکٹ اور نمکو کے پیکٹ شیشے کے چھوٹے سے شیلف کے پیچھے دھرے تھے اور ایک کونے میں ٹھنڈی بوتلیں فریج میں سجی تھیں۔ کھوکھے کی پیشانی پر ''اللہ رزق دیتا ہے۔'' لکھا تھا۔ اندر ایک لڑکا بیزاری سے بیٹھا زناٹے سے گزرتی ٹریفک دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے مخاطب کیا اور شاعر کا پوچھا۔ شاعر سے میری ملاقات ٹیلی فون پر طے ہو چکی تھی۔ لڑکے نے بتایا کہ شاعر اُس کا والد ہے اور تھوڑی ہی دیر پہلے اُٹھ کر شہر کی جانب گیا ہے۔ اُسے ہماری طے شدہ ملاقات کا معلوم تھا۔ چناں چہ اُس نے میری راہ نمائی کرتے ہوئے بتایا کہ میں شہر کے داخلی رستے کے قریب پہنچ کر اُس کے والد کو موبائل پر فون کر لوں۔ وہ خود ہی کسی متعین مُقام پر پہنچ جائے گا۔

جب میں شہر کے داخلی رستے پر پہنچا تو غلاظت سے بھری ایک نالی کے پار بھنبھناتی مکھیوں سے ڈھکی مٹھائی کی چھوٹی سی دُکان کے سامنے میلے نیلے رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس ایک ادھیڑ شخص تجسس بھری نظروں سے سڑک کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میری چھٹی حِس نے بتایا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی تلاش میں مَیں اسلام آباد سے آیا تھا۔

وہاں گاڑی روک کر میں نے اُس شخص سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ کِھل اُٹھا اور آگے بڑھ کر بھرپور معانقہ کیا۔ اُس کے انداز سے مترشح تھا کہ یہ بات اُس کے لیے بہت اہم تھی کہ کوئی اُس سے ملنے دُور سے آیا تھا۔ اُس شاعر کے کھوکھے کے سامنے سڑک پار ایک ریستوران میں سُوپ پیتے ہوئے اُس سرفروش نے اپنی حکایتِ جنوں سُنانی شروع کی۔ یہ حکایتِ دیوانگی اُس ریستوران کے نیم تاریک خنک کمرے سے شروع ہو کر کئی ملاقاتوں پر محیط ہوئی۔

اُس سادہ شخص کے حلیے اور کھوکھے کو دیکھ کر گُمان بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ اس جسم کے اندر قوی جذبے دہکتے اور آنکھوں کے پیچھے رومانی خواب مچلتے ہیں۔ اُس کے منہ سے نکلنے والے اشعار مجمع میں آگ لگا دیتے ہیں اور اُسے تنویمی کیفیت میں لے آتے ہیں۔ وہ ایک شعر پڑھتا ہے اور ہزاروں کا مجمع دوسرا شعر یک زبان پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اُسی پہلی ملاقات کی بات ہے کہ میں نے فرمائش کی کہ وہ اپنی مشہور نظم سُنائے۔ میری درخواست سُن کر شاعر کی آنکھوں میں چمک سی جھلملا گئی، یہ دل گرفتگی کا اظہار تھا یا جذبے کی حدت،

یہ وہی شاعر جانتا تھا یا پھر اُس لمحے میں ایک اور شخص جانتا تھا۔ غریب شاعر نے اپنی آنکھیں مُوند لیں، گویا ایک مجمع کو اپنے سامنے [illegible]
تصور کرلیا اور نظم پڑھنی شروع کی۔

تم ڈاکو چور لٹیرے بھی نگرانی کرنے آئے ہو
تم بھوکے ننگوں کے خوں کی ارزانی کرنے آئے ہو
تم آمر کے پروردہ ہو جمہور کے معنی کیا جانو؟
تم فتویٰ گر ہو شاہوں کے، منصور کے معنی کیا جانو؟
ہم بھٹو کے دیوانے ہیں یہ جان امانت بھٹو کی
ہم آن پہ مرنے والے ہیں یہ آن امانت بھٹو کی
کیوں اتنا بوجھ اُٹھاتے ہو؟ کل کیسے قرض اُتارو گے
یہ بازی جان کی بازی ہے اور تم یہ بازی ہارو گے

تم خلقِ خدا کے ٹھکرائے سلطانی کرنے آئے ہو
تم ٹینکوں، توپوں کے بل پر من مانی کرنے آئے ہو
تم قاتل ہو دستوروں کے دستور کے معنی کیا جانو؟
تم تاریکی کے پالے ہو تم نور کے معنی کیا جانو؟
بی بی پہ کرنے آئے ہیں قربان امانت بھٹو کی
جس شان سے مقتل میں آئے وہ شان امانت بھٹو کی
تم اپنی جاں بخشی کے لیے پھر ہم سے عرض گزارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا تم کتنے بھٹو مارو گے

جب نصیر کوی نے اپنی یہ نظم ختم کی اور آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا تو میں اب تک اس نظم کے پیچھے کارفرما جذبے کے سحر میں گرفتار تھا۔ سحر ٹوٹا، اِردگرد نظر دوڑائی، خالی ریستوران کے بیرے ہماری میز کے گرد خاموشی سے کھڑے، یہ نظم سننے کے بعد بکھر رہے تھے۔

نصیر کوی نے 'ہوکا' (لمبی سانس) بھرا اور بولا 'خواب دیکھنا تو ہر غریب کا حق ہے۔'

اُس پہلی ملاقات کے بعد اگلی ملاقات نصیر کوی کے گھر پر ہوئی۔ جہلم کے اندر نیم شہری نیم قصباتی خاموشی اور سکون میں سستاتی ایک تنگ گلی میں پھول کی بیلوں سے ڈھکا چھوٹا سا مکان اہلِ خانہ کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ جالی دار دروازے کے اندر سادہ بیٹھک نفاست اور قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ صاف ستھرے صوفوں پر بیٹھ کر نصیر کوی نے گھنٹوں مجھ سے اپنی اور اپنے خوابوں کی باتیں کیں۔ وہ شخص جس کی شاعری جلسوں میں پڑھ کر سیاسی راہ نما اقتدار کی غلام گردشوں سے گزر کر مسند تک پہنچتے تھے، مجھے بہت تنہا محسوس ہوا۔ ایک بے دوالا چارگی تھی، حسرت تھی یا ناامیدی جو اُس شاعر کے اندر سرایت کرگئی تھی۔ میں کئی مرتبہ سوچتا کہ کیا کھوکھے پہ ٹھنڈی بوتلیں بیچنے والے شخص کی سیاسی اور سماجی فراست اہم دانش وروں سے بڑھ کر ہوسکتی ہے۔ میرا فہم مجھے سمجھاتا کہ فراست کسی کی وراثت نہیں اور معاشیات کی غلام نہیں۔ جہاں مجھے اُس شاعر سے ہم دردانہ اُنسیت ہوگئی تھی، وہیں ہم دونوں میں ایک جذبہ مشترک تھا جو ہمیں ایک اَن دیکھی وابستگی میں باندھتا تھا اور وہ تھا، اضطراب۔ دھیمی گفتگو کے دوران پہلو بدلنا، خاموش ہوجانا، موضوع سے ہٹ کر کوئی اور بات شروع کردینا، جذباتی ہوجانا اور متلون مزاجی شاعر کی شخصیت کے لازمی اجزا تھے۔

اکتوبر 1947ء کو جہلم کے ایک سفید پوش گھرانے میں جنم لینے والا نصیر صرف دسویں جماعت تک نصابی تعلیم حاصل کرپایا۔ گھر کے دگرگوں ہوتے معاشی حالات نے اُسے تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنے پر مجبور کردیا۔ تربیلا کے مقام پر دنیا کا سب سے بڑا ڈیم تعمیر ہورہا تھا۔ اُس کے لیے بڑی تعداد میں افرادی قوت کی ضرورت تھی چناں چہ نصیر کوی نے وہاں بہ طور ترکھان ملازمت اختیار کرلی۔ وسیع پیمانے پر آبادی کا انخلا ہورہا تھا۔ ایک بڑے قطعۂ زمیں کو زیرِ آب آجانا تھا۔ دن رات کام جاری تھا۔ اُنھی مزدوروں اور ترکھانوں میں نصیر نامی ایک لڑکا بھی کام میں جتا ہوا تھا۔ اُس کی آمدنی سے گھر کے اخراجات چلتے۔ شاموں میں نصیر باقی کاری گروں سے علیحدہ بیٹھ کر شاعری پڑھا کرتا اور تاریخی کتابیں چاٹتا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ساتھ کام کرتے محنت کشوں کے دُکھوں اور بے چارگی پر کُڑھا کرتا۔

''ایک مزدور اور خچر کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں جاں توڑ محنت کرتے اور دونوں بے زبان تھے'' ایک سہ پہر نصیر کوی نے بندۂ مزدور کے اوقاتِ تلخ پر بات کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں مجھ سے کہا۔

’’میں نے تبھی سوچا تھا کہ اپنے بچوں کو مکمل تعلیم دوں گا اور عزت دار انسان بناؤں گا۔ الحمدللہ! میری بیٹیاں پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں البتہ اکلوتے بیٹے کے حوالے سے خاصی پریشانی رہتی ہے۔‘‘ جب نصیر کوی نے یہ بات کہی تو گھریلو خوش ذوقی میں نسوانی نزاکت کا رنگ اُبھر کے سامنے آ گیا۔ جب تربیلا ڈیم پر کام مکمل ہوا تو نصیر کوی کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اور وہ چار برس کے لیے وہاں چلا گیا۔ وہاں پر کام کرتے محنت کشوں کے حوالے سے مقامی لوگوں کے رویے کے حوالے سے اُس کی یادیں زیادہ خوش گوار نہ تھیں۔

’’میری عادت رہی ہے کہ جو بھی کام کیا ہے، پوری نیک نیتی اور خلوص سے کیا ہے۔ ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہر مزدور، ترکھان اور روغن گر میں ایک فن کار چھپا ہوتا ہے۔ شاعر اپنے فن کا اظہار شعر میں کرتا ہے تو ترکھان لکڑی کے ایک ٹکڑے میں۔‘‘

سعودی عرب میں جاں گسل محنت کے چار برس گزار کر نصیر کی جہلم واپسی ہوئی۔ نصیر کے ساتھ بے شمار لمحات بتا کر اُس کی شخصیت کے جو پہلو زیادہ نمایاں ہوئے اُن میں اپنی مٹی سے پیار، تاریخ کا شعور، ماں بولی سے عشق، محنت کش کے لیے درد بلکہ تڑپ اور بے ساختہ اُبلتی ہوئی شاعری تھی۔ نصیر کوی کی پہچان اُردو شاعری بنی جب کہ اُس سودائی کو اصل مان اپنی پنجابی شاعری پر تھا۔

گنج شکر نے لوکاں دے نال جیہڑی بولی بولی　　نانک ہوراں اُشلوکاں وچ اوہدی شکر گھولی
بھر بھر پیو پیالے ایہدے ایہہ امرت نہ ڈولھو　　ماں بولی وِچ لکھو پڑھو تے ماں بولی وِچ بولو
بُلھے شاہ نے ایہدے وِچ ای دَسی الف سچائی　　وارث شاہ نے ایہدے راہیں عین دی شکل وکھائی
ایس کتاب دے اِک اِک کر کے سارے ورقے پھولو　　ماں بولی وِچ لکھو پڑھو تے ماں بولی وِچ بولو
(گنج شکر نے لوگوں سے جو بولی بھی بولی　　نانک نے اشلوکوں میں اُسی کی شکر گھولی
بھر بھر پیو پیالے اِس کے، یہ امرت نہ بہاؤ　　ماں بولی میں لکھو پڑھو، ماں بولی میں بولو
بُلھے شاہ نے اِس میں ہی سمجھائی سب سچائی　　وارث شاہ نے اِس رستے ہی عین کی شکل دکھائی
اسی کتاب کے ایک ایک کر کے سارے ورق کھنگالو　　ماں بولی میں لکھو پڑھو، ماں بولی میں بولو)

کبھی میں شاعر سے درخواست کرتا اور کبھی وہ از خود اپنے اشعار ترنگ میں پڑھنے لگتا۔ پنجابی اشعار لوک روایت کے شیرے میں رچے بسے اور دھیمی درد میں سُلگتے ہوتے۔ جہلم کے گرد و نواح میں بکھرا افلاس اُس محنت کش کوی کو بے چین رکھتا۔ وہ شعر پڑھتا اور میں اُنھیں لکھتے لکھتے ان کے جذبہ و آہنگ کے زیرِ اثر قلم روک کر سانسیں تھامے اُنھیں سننے لگتا۔ وہ اس قبیل اور نسل کے آخری لوگوں میں سے تھا جو اپنے دین سے عشق کرتے اور دوسروں کے مذاہب اور ان کے اوتاروں کی بھی عزت کرتے تھے۔ وہ ہندومت، بدھ مذہب، سکھ گرنتھ صاحب، مسیحی پاپائیت کا دِل سے احترام کرتا اور اپنے اشعار میں ان کے نقوش اور ہستیوں کے تذکرے اِس طرح جڑ دیتا جیسے کوئی فن کار جوہری زمرد، ہیرے، موتی، نیلم اور دیگر بیش بہا قیمتی دمکتے جواہرات سونے کے جڑاؤ ہار میں جڑ دے۔

’’ہم محنت کش چھوٹے لوگ نہیں۔ ہم خدا کے مقرب اور پیغمبرؐ کے وارث ہیں۔‘‘ ایک روز یہ کہہ کر اپنے اشعار سنانے شروع کر دیے۔

اسیں ڈِنگے وانگ کمان دے　　(ہم خم دار کماں کی صورت
اسیں سدھے وانگر تیر　　ہم سیدھے، جیسے تیر
اِک ہتھ وِچ رمبا داتری　　ایک ہاتھ میں کھرپا درانتی

اِک ہتھ وِچ ہے شمشیر
سانوں خواج خضر دا تھاپڑا
ساڈی کنڈ تے پنجے پیر
اِک وار دے نال سوار نوں
سنے گھوڑے دیساں چیر
اسیں لوہا موم بناوندے
ساڈے ہتھ اگنی داتاء
پانی نوں سنگل ماریئے
ساڈے قابو وچ ہوا
لہراں نال لڑنا جاندے
اسیں ہاں دریائی لوک
اِس وار زمانہ ویکھسی
اِس ہڑھ تے لاساں روک
ساڈے سر تے ٹلا جوگیاں
پیراں وِچ ویہت وگے
مُکھ چمکے دیپک سوریہ
مَن چندر جوت جگے

ایک ہاتھ شمشیر
ہمیں خواجہ خضر کی تھپکی
اور پشت پہ پانچوں پیر
ہم ایسا وار کریں دشمن پر
دیں سنگ گھوڑے چیر
ہم لوہا موم بنائیں
ہم ہاتھ میں رکھیں آگ
ہم قابو کریں ہوائیں
پانی کی پکڑیں باگ
لہروں سے لڑنا جانیں
ہم دریائی لوک
اس بار زمانہ دیکھے گا
سیلاب کو لیں گے روک
مالک سر پہ ٹلا جوگیاں
پیروں میں وہیت بہے
چہرہ ہے سورج دیوتا
اور من میں چاند جگے)

جب میں نے پوچھا کہ معاش کے گھوڑے کی سموں تلے بڑے بڑے باغی کُچلے گئے اور اُن کا جوش رزق حالات ہوا تو اُس کے اندر مزاحمت کا شعلہ کیسے بھڑکتا رہا۔ یہ سُن کر شاعر مسکرایا اور بولا:

”میری مٹی، جہلم کی زمین، ہمیشہ سے جنگ جوؤں کو جنم دیتی رہی ہے، راجا پورس سے لے کر آج تک ہم لوگوں نے ایک ہاتھ میں بیلچہ اور دوسرے میں تلوار اُٹھا کے رکھی ہے۔ بے شک ہم عسکری لوگ ہیں۔ لیکن مت بھولیے ہم کن پھٹے جوگی بھی ہیں۔“

اِس گفتگو میں نصیر کوی کا تاریخی شعور اور علاقائی فہم یوں اُبھر آیا تھا جیسے کبھی ٹلا جوگیاں کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایستادہ عبادت کدوں پر ایک کھڑا ویں پہنا رانجھا ہیر ہیر کرتا جلوہ گر ہوا تھا۔ شاید اُس فقیر نے ہیر میں خدا کو دیکھا تھا کہ خدا تو اپنی جھلک چاہے کسی بھی شاہ پارے میں دکھلا دے۔

راجا پورس، ٹلا جوگیاں، خانقاہیں۔ محقق البیرونی، جنونی رانجھا، آزادی کا جری سکھ بھائی متی داس اور بے چارہ کوی ـــــ نصیر کوی آج بھی وہاں کے نقشِ لازوال ہیں۔ اس زمیں سے کیا پرندے اُڑے اور دُور ڈالیوں پر جا بیٹھے، دینے کا گل زار، چھوٹا لے کا سنیل دت، جہلم کا اندر کمار گجرال اور من موہن سنگھ چہکتے ہوں یا ضمیر جعفری زیرِ زمیں کھلکھلاتا ہو:

مندر، گرجے، مسجد دے پیراں نوں دھو کے لنگھدا ائیں
ہُن مونہہ پھیر کے سُتا رہنا ایں تیریاں راہواں مَلّاں کتھے
تک تیرے گجرال اَجے تک ہور کسے وَل تکیا ای نہیں

گرو دوارے متھا ٹیکن لئی کھلو کے لنگھدا ائیں
جہلم تیرے پانیاں اندر پہلے جیہیاں گلاں کتھے
سُن تیرا گل زار دی تیریاں گلاں کر کر تھکیا ای نہیں

دِل دِل درد خزینے تیرے ماریاں جا جائلاں کتھے   جہلم تیرے پانیاں اندر پہلے جیہیاں گلاں کتھے
(تم مندر، گرجے اور مسجد کے پاؤں دھو کر بہتے تھے   ماتھا ٹیکنے گردوارے کی سمت سے ہو کر بہتے تھے
اب مُنہ پھیر کے سوئے ہو، اب تم سے ملاقات کہاں   جہلم تیرے پانیوں میں ، اب پہلی سی بات کہاں
دیکھ ترے گجرال نے تیرے بعد کسی کو تکا نہیں   سُن تیرا گلزار ابھی تیری باتیں کر کر تھکا نہیں
ہر دل میں تیرا درد بھرا ،اب تم سے ملاقات کہاں   جہلم تیرے پانیوں میں ، اب پہلی سی بات کہاں)

نصیر کوی کا اپنی دھرتی سے ایسا جذباتی رومان تھا جس میں تاریخی شعور کے پکوان پر مبالغے کا تڑکا شروشرواتا۔ اُس کی نظر میں اُس کے لوگوں جیسے لوگ دنیا میں نایاب تھے۔ گویا اُس کا وطن محورِ کرۂ ارض کا۔ کچھ عجیب نہیں کہ البیرونی نے اسی ٹلے کو نقطۂ حوالہ بنا کر دنیا کا قطر دریافت کیا تھا۔ نصیر کا مرکزِ ثقل بھی پوٹھوہار، جہلم اور اس کے پانی تھے۔

ہماری گفت گو میں کبھی کبھار راجا پورس کا حوالہ آتا تو کبھی رانجھا بھی آجاتا۔ رانجھے کا ذکر ہو اور ٹلا جوگیاں نہ آئے، یہ کیسے ممکن ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ مہابھارت کا ذکر ہو اور پانڈوؤں کا تذکرہ نہ ہو۔ اِن میں سے بہت سے تذکرے تو کوی کی شاعری میں بھی اُبھر آئے، ٹلا جوگیاں اور چند ایک اُس سے ہٹ کے، جیسے دراوڑ۔

ذکر جہلم کا ہو، بات ہو دینے کی   چاند پکھراج کا، رات پشمینے کی   (گل زار)

مہابھارت کی رزمیہ داستان میں پانچ پانڈو بھائی اسی علاقے میں دیس تیاگی ہوئے تھے۔

یہ وہی مٹی ہے جہاں جہلم اور چناب کے بیچ کے علاقے شاہ کوٹ کے مہاراجا پورس کو سکندر یونانی نے اپنی اطاعت قبول کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔ پورس نے جنگ جویانہ للکار سے جواب دیا تھا۔ ''میری تلوار اور میرا سینہ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔'' سکندر نے دیوتاؤں کے حضور بھینٹ چڑھا کر یونانی سُورماؤں کو بیل گاڑیوں پر کشتیاں لاد کر پورس کی راج دھانی کی جانب یلغار کا حکم دیا تھا۔ دریائے جہلم کے پانی طغیانی پر تھے، چناں چہ سکندر نے بپھرے پانیوں کو دیکھ کر اعلان کیا کہ دریا برسات کے بعد پار کیا جائے گا۔ شاطر جنگ جو، فاتح عالم سکندرِ اعظم کی یہ چال موثر ثابت ہوئی۔ یونانی سُورماؤں کے دستے دریا کے ساتھ حرکت میں رہے۔ کبھی وہ کشتیوں میں دریا بھی پار کر جاتے۔ اُن پر نظر رکھے پورس کے فوجی دستے بھی حرکت میں آجاتے۔ یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ مہاراجا پورس کھوہار کے مقام پر فوج کی کمان سنبھالے چوکس شیر کی طرح ہوشیار بیٹھا تھا۔ اِدھر کئی روز کی یونانی چھاپا مار کارروائیوں سے پورس نے تصور کر لیا کہ سکندر کی فوج دریا عبور نہ کر پائے گی۔ اُدھر سکندر اپنی فوج کو پڑاؤ سے کئی کوس نیچے ایسے مقام پر لے گیا جہاں گھنے جنگلات تھے اور دریا خم کھا کر بہنے کی وجہ سے تنگ ہو گیا تھا۔

اسی خم میں ایک جزیرہ بن گیا تھا۔ سکندر نے اپنی فوج کے منتخب دستے رازداری سے اس جگہ پہنچا دیے۔ گرجتے برستے بادلوں اور طوفانی ہواؤں میں سکندر اپنے نائبین کے ساتھ رات کے اندھیرے میں دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ پورس کے بیٹے راج کمار نے اُسے دیکھ لیا اور اپنے دو ہزار جاں نثاروں اور ساٹھ رتھوں کے ساتھ اُس کی جانب جھپٹا۔ قلیل تعداد میں ہونے کی وجہ سے یہ ہراوّل دستہ کام آیا اور راج کمار پیوندِ خاک ہوا۔ اس کے بعد گھمسان کا رن پڑا۔ پورس کی طاقت اُس کے گراں ڈیل ہاتھی تھے۔

سکندر نے اپنی فوج کو ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹنے کا حکم دیا۔ یونانی فوجیوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹنی شروع کیں تو زخمی ہاتھی پیچھے کی جانب بھاگے اور اپنی ہی فوج کی صفیں کچلنا اور اُلٹنا شروع کر دیں۔ بارش کی وجہ سے کیچڑ اور پھسلن بڑھ چکی تھی چناں چہ پورس کی فوج پس پائی اختیار کرنے لگی۔ اُس کی فوج کے پچیس ہزار جنگ جو ہلاک ہو گئے لیکن پورس ڈٹا رہا اور اپنے دستوں کو آگے بڑھاتا رہا۔ اس دوران وہ خود بھی بُری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ زیادہ لہو بہہ جانے کی وجہ سے اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی تو فیل

بان نے ہاتھی کا رُخ میدان سے باہر موڑ دیا۔ یہ دیکھتے ہوئے سکندر نے راجا امبھی چند کے بھائی کو اُس کے پاس ہتھیار ڈالنے کا پیغام دے کر بھیجا۔ پیغام سن کر پورس نے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھولیں اور مردانگی سے خنجر پوری قوت سے اُس کی جانب اُچھال دیا۔ یہ دیکھ کر یونانی فوج نے آخری ہلا بولا اور شدید زخمی پورس کو گرفتار کر کے سکندر کے سامنے پیش کیا۔ سکندر نے پورس کی بہادری سے متاثر ہو کر پوچھا۔ ''تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

پورس نے وہ جواب دیا جو تاریخ میں امر ہو چکا۔ نہ سکندر رہا نہ پورس لیکن اُس کے چند الفاظ تاریخ کے سینے پر کندہ ہیں ''جیسا سلوک ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔''

سکندرِ اعظم نے یہ الفاظ سن کر کمالِ سخاوت سے پورس کی راج دھانی اُسے لوٹا دی۔ جاتے ہوئے اُس نے یہاں اپنے گھوڑے کے نام پر ایک شہر آباد کیا جسے آج ''پھالیا'' کہتے ہیں۔

نصیر کوتی کی گفت گو میں جہاں پورس کی دلیری کا ذکر آتا، وہیں اُسی سانس میں رانجھا بھی میٹھے رومانوی سُروں میں کُوکتا۔

جا ٹِلے کن پڑواندے رہے
رنگ پور وِچ اُلکھ جگاندے رہے
اسیں ہیراں دل چوں کڈھیاں نہیں
اسیں منگاں کدے وی چھڈیاں نہیں
اسیں شاہ حُسین تے بکھے ہاں
اسیں ساندل بار دے دُتے ہاں
(جا جا ٹیلے گن چھدوائے
رنگ پور میں اُلکھ جگائے
ناں ہیر سے ناتا توڑ سکے
ہم اپنی مانگ نہ چھوڑ سکے
ہم شاہ حسین اور بکھے ہیں
ہم ساندل بار کے دُتے ہیں)

وہ شخص ایک لمحے میں ماضی بعید اور حاضر میں سانس لیتا تھا۔ حال کو سانسوں کے رستے کھینچتا اور ماضی دُھونکتا۔

دل چسپ امر یہ ہے کہ ہماری گفت گو میں ذاتی زندگی کے حوالے کم ہی آتے۔ جب میں نصیر کوتی کے چھوٹے سے صاف ستھرے مکان کے مہمان خانے میں بیٹھتا تو پردوں کے پیچھے سے اہلِ خانہ کی سرسراہٹ اور چائے کے انتظامات کی سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ میرے ذہن میں اُس کی معاشی تنگ دستی کا بوجھ ہوتا چناں چہ میں بے حد اصرار کرتا کہ وہ چائے کا تکلف نہ کرے لیکن چائے کے ساتھ خستہ نمکین سموسے پکوڑے آ ہی جاتے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ اپنے کھوکھے پر مجھے مل لے لیکن وہ سرِ راہ ملاقات کو آدابِ شائستگی کے منافی سمجھتا۔

وہ ابتدا سے کھوکھے کا مالک نہ تھا بلکہ مناسب حد تک خوش حال تھا۔ یہ کھوکھے تک کا ڈھلانی سفر کیسے ہوا، دل چسپ اور عبرت انگیز کتھا ہے۔ اِس کتھا سے پہلے اُس کی عمومی گفتگو کے موضوعات ـــــ ذاتی زندگی کے حوالے سے وہ ہمیشہ اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کے لیے پدرانہ تشویش کا شکار رہتا۔ علاوہ ازیں شاید وہ خشک ہوتے دریائے جہلم، ماں بولی پنجابی کی زبوں حالی، صدیوں سے دِلوں میں زندہ صوفی شعرا کی آہستہ آہستہ عوامی حافظے سے معدومی پر جذباتی حد تک غم گین تھا۔

ٹِلا جوگیاں قدیم ہند کا خانقاہی مرکز تھا جہاں زائرین، درویش، سادھو اور طلبہ دور افتادہ علاقوں، تبت، نیپال، سیلون، برما، وسطی جنوبی شمالی ہند، ہمالہ و قراقرم اور افغانستان سے چلے آتے۔ یہ خانقاہوں کا وہ وسیع اور زندہ دھڑکتا مقناطیسی قطعۂ مرتفع تھا جو تیاگیوں کا آتش کدہ تھا، جدھر وہ خواہشات کو نذرِ آتش کرتے اور جوگ سنبھالتے۔ گرو گورکھ ناتھ کن پھٹے (چھدے کان) جوگی سلسلے کے بانی اور اِدھر کے پہلے معروف پروہت تھے۔ یہ وہی گرو گورکھ ناتھ تھے جن کے پاس اجین کے مہاراجا وکرم دتیہ کے بڑے بھائی پورن بھگت، تخت و حکومت چھوٹے بھائی کے حوالے کر کے پدھارے اور ان کے مرید ہوئے۔ اس مقام کی شہرت ایسی عالم گیر تھی کہ اکبر بادشاہ بہ نفسِ نفیس خود دو مرتبہ یہاں آیا اور

مرعوب ہوا۔

رانجھا بھی سیال (جھنگ) سے اِدھر آیا اور زعفرانی لبادہ اوڑھے، پیروں میں لکڑی کی کھڑاویں پہنے، کان چھدوائے ٹِلّے سے عشق کا منتر جاپتا اُترا اور تاریخ کے اوراق پر نقش ہو گیا۔ کون نقش ہوتا ہے اور کون نہیں، یہ بھی نصیب کی باتیں ہیں، آنے والی نسلوں کے نصیب کی۔ وگرنہ شاہ فیصل کے نام پر فیصل آباد ہے، اُس کی بلا سے، لایل پور نام کا اعزاز سر جیمز لایل کے لیے بعد از موت بے معنیٰ!

نصیر کوی کی طولانی حیات کا قصۂ مختصر کچھ یوں ہے۔ فکرِ روزگار میں غلطاں نصیر پاکستان کے سیاسی وسماجی مدوجزر سے لاتعلق سر جھکائے کولھو کے بیل کی طرح گول دائرے میں گھوم رہا تھا۔ کچھ کتھارسس تھا تو شاعری میں۔

سعودی عرب سے واپسی پر پس انداز کردہ سرمائے سے نصیر نے جہلم میں ایک مناسب ہوٹل کھول لیا۔ اب جیسا کہ طورِ معاشرت ہے، وطن عزیز کے اُن ہوٹلوں میں جہاں ’’سیاست اور مذہب پر گفتگو منع‘‘ ہوتی ہے صرف اِنھی دو موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ چناں چہ یہ روایت نصیر کے ہوٹل میں بھی دہرائی جانے لگی۔ گاہکوں، مہمانوں، علاقائی دانش وروں اور اخبارات کے مقامی نمایندوں کے سیاسی مباحث نے نصیر کے خوابیدہ سیاسی شعور کو کچھ ایسا جھنجھوڑا کہ وہ نہ صرف بیدار ہوا بلکہ آمادۂ پیکار بھی ہوا۔

’’یہ ایم آر ڈی تحریک کے دِنوں کی بات ہے کہ میں سیاسی طور پر متحرک ہوا۔ اِس سے پہلے بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ کچھ غلط ہوا ہے مگر جھنجھوڑے جانے کی کیفیت نہ ہوئی تھی۔ اس تحریک کے آغاز تک میری زندگی کا سب سے الم ناک واقعہ سانحۂ مشرقی پاکستان تھا۔ میں اس سانحے کے بعد کئی راتیں اُٹھ اُٹھ کر روتا رہا تھا۔‘‘

یہ حقیقت تو نصیر نے پہلی ملاقات میں سُوپ پیتے ہوئے ہی مجھ پر آشکار کر دی تھی۔

البتہ سیاست میں متحرک کردار ادا کرنے کے حوالے سے بتایا کہ اُس کی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ ہوٹل میں دن بھر گاہکوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا۔ سیاسی اور ادبی گفت گو کرنے والے زیادہ تر لوگ چائے کی ایک پیالی پر پورا دن گزار دیتے۔ دل چسپ امر تو یہ تھا کہ وہ پیالی چائے کی بھی زیادہ تر اُدھار ہوتی۔ اسی دوران ایم آر ڈی کی تحریک شروع ہو گئی۔ بائیں بازو کے نظریاتی کارکنوں اور پیپلز پارٹی کے جیالوں نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ گو تب سندھ میں وہ تحریک زیادہ موثر تھی، البتہ پنجاب میں بھی اس میں جان پڑنے لگی۔

’’اس دوران ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ بے زبان خچر جسے محنت کش کہا جاتا ہے، اُسے ملکی تاریخ میں کسی نے زبان دی تھی اور خواب دیکھنے کا حق دار بنایا تھا، وہ بھٹو تھا۔ تب تک میری بھٹو سے جذباتی وابستگی اس لیے بھی نہ تھی کہ اس کے آخری برسوں میں مَیں بیرونِ ملک تھا۔ چناں چہ اب مجھے احساس ہوا کہ اُس شخص کا اِس طرح ستم شعاروں کے ہاتھوں قتل ایک بھیانک واقعہ تھا۔‘‘

تحریک زور پکڑ رہی تھی اور ساتھ میں نصیر کا جذبۂ حریت ہوا پکڑ رہا تھا۔ چناں چہ نصیر نے اپنا ہوٹل ان سیاسی جاں بازوں کی نذر کر دیا۔ وہاں خفیہ اجلاس اور منصوبہ بندی ہونے لگی۔ نصیر کو اُمید بندھی کہ غریب دہقان اور مزدور حالات کے بہاؤ پر اُبھر کے اوپر آئے گا۔ چناں چہ اس کے لیے یہ تحریک آزادیٔ محنت کش کا استعارہ بن گئی اور بھٹو اس جذبے کا چہرہ۔

نصیر کے ہوٹل پر چھاپے پڑنے لگے۔ لُکن میٹی شروع ہوئی، آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا جانے لگا۔ محافظوں میں سے چند ایک ہم درد قبل از کارروائی اطلاع دے دیتے چناں چہ حریت پسند بر وقت فرار ہو جاتے۔ بالآخر ہوٹل سیل کر دیا گیا اور نصیر زیرِ زمین چلا گیا۔

چند ہفتوں مہینوں میں تحریک دم توڑنے لگی۔ محافظوں کی سختی نرم پڑنے لگی۔ نصیر کی آمدنی کے سوتے خشک ہو چکے تھے اور پس انداز کی گئی رقم ماہ و سالِ عمر کے مانند خرچ ہوتے ہوتے ہلالِ عید ہوئی۔ بیش تر حصہ خرچ ہو چکا تھا اور قلیل رقم رہ گئی تھی۔ کاروبار کو نئے سرے سے

چلانے کے لیے سرمایہ چاہیے تھا۔ ہوٹل کا کام ازسرِ نو شروع کرنے کی کوشش میں وہ رقم بھی خرچ ہوئی۔ جب مٹھی کھلی تو ہتھیلی میں سوراخ تھا۔ پس بات یہاں آن کر ٹھیری کہ نصیر کوی مقروض اور چھوٹے موٹے کام کرنے پر مجبور ہوا۔

‘‘لوگ پارٹی رکنیت تب حاصل کرتے ہیں جب وہ پارٹی عروج کی جانب گام زن ہوتی ہے۔ میں نے پیپلز پارٹی کی رکنیت تب حاصل کی جب قد آور لوگ اسے چھوڑ رہے تھے۔ لوگ ڈوبتی کشتی سے چھلانگیں لگاتے ہیں اور میں تب اس میں سوار ہوا۔’’

‘‘کیوں؟’’ میں نے استفسار کیا۔

‘‘میرے اندر سے آواز اُٹھی کہ یہی درست وقت ہے جب پورے قد کے ساتھ کھڑے ہو کر راست گوؤں میں شمار ہوا جائے۔ میرا ضمیر گوارا نہ کرتا تھا کہ جو وقت آواز بلند کرنے کا ہے تب دونوں ہاتھ بلند کر کے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا جائے۔’’

‘‘آپ کے پیشِ نظر کیا تھا؟’’

‘‘مجھے اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔’’

‘‘پھر؟’’

‘‘پھر اندھیرا چھٹا، روشنی چھائی اور ہم اقتدار میں آ گئے۔’’

میں نے مسکرا کر ہم دردی سے نصیر کو دیکھا، اُس کا قلیل سامانِ حیات دیکھا، اُس کے لڑکے کو دکان پر ٹھنڈی بوتلیں بیچتے چشمِ تصور سے دیکھا اور ہمت کر کے سوال کیا۔

‘‘مجھے تو آپ اقتدار میں نظر نہیں آتے؟’’

یہ سوال نصیر کو سن کر گیا۔ بلا تکان بولنے والا شاعر خاموش ہو گیا۔ اُس سے کوئی بات نہ بن پائی تو سادگی سے بولا ‘‘ہمارے ابتدائی دن انتہائی خوشی کے تھے۔ ایک جنون تھا جو سب پر طاری تھا۔ سبھی گویا ایک حالتِ جشن میں تھے۔ ہماری بی بی اقتدار میں آ گئی تھی۔ وہ ہم سے اور ہم اُس سے وابستہ تھے۔ ہمارے درمیان ایک جذباتی تعلق تھا۔’’

‘‘بی بی نے آپ کے لیے کیا کیا؟’’ میں نے سادگی سے پوچھا۔

شاعر کی آواز لڑکھڑائی گویا وہ کوئی جواب تراش رہا ہو۔ ‘‘وہ بہت اچھی لیڈر تھی۔ بس اُسے اچھے اور مخلص ساتھی نہ ملے۔’’ شاعر کی آواز میں افسوس تھا۔

‘‘لیڈر کی سب سے بنیادی خوبی تو اپنی ٹیم کا انتخاب ہوتا ہے۔’’ میں نے بات بڑھائی۔

‘‘اب ایسی بات بھی نہیں، ہماری لیڈر کو کام نہیں کرنے دیا گیا۔’’ نصیر نے وضاحت کی۔

‘‘بی بی نے اپنی پارٹی کے لیے کیا کیا، غریبوں کے لیے کیا منصوبے بنائے جو پروان نہ چڑھ سکے؟’’ میں نے ہم دردانہ استفسار کیا۔

نصیر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

‘‘بی بی نے ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ کھانے پر بلایا تھا۔ وہاں ہم ساتھیوں نے بی بی کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھایا تھا’’ نصیر نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا۔

میں نے سامنے دیکھا۔ نصیر کی پلیٹ خالی تھی۔

یہ وہی ملاقات تھی جس میں نصیر کوی نے وہ انکشاف کیا جس نے مجھے چونکا دیا اور ایک معروف لیکن غلط العام تصور باطل کیا۔

نصیر نے بتایا کہ اُس کی وہ نظم جس کا شعر ؎

یہ بازی جان کی بازی ہے اور تم یہ بازی ہارو گے   ہر گھر سے بھٹو نکلے گا تم کتنے بھٹو مارو گے

پیپلز پارٹی کے ہر جلسے کا منترا اور جلوس کا سلوگن بن چکا تھا، بھٹو کی پھانسی کے بعد کسی وقت میں نہ لکھی گئی تھی بلکہ اس سانحے کے بارہ پندرہ برس بعد لکھی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی رات میں معرضِ وجود میں آئی تھی جب نصیر کو بھٹو کی یاد نے بہت ستایا تھا اور اُسے اپنے لیڈر کی کمی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہ نظم بی بی کے دوسرے دورِ حکومت کے بعد لکھی گئی تھی اور اس کے ورود کا بھٹو کی پھانسی کے لمحۂ سنگین سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا۔

اِس مکالمے کے بعد بھی ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ شاطر سیاست دان نہ تھا، دور اندیش سیاسی کارکن بھی نہ تھا، فقط خواب دیکھنے والا ایسا معصوم، جذباتی اور درویش شاعر تھا جو اُمید اور نا اُمیدی کے بیچ جھولا جھولتا رہتا تھا۔ میں نے اُس کے منہ سے کبھی اپنی پارٹی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ اپنے نظریے سے اس طرح چمٹا ہوا تھا جیسے اگلے وقتوں میں گوفصیل سے چپک کر دیوار پھلانگنے والوں کے لیے دوسری جانب کودنے میں معاون ثابت ہوتی تھی۔

البتہ اُس کی شاعری میں اُمید کے ساتھ دُکھ کی آمیزش بڑھنے لگی تھی۔ وہ جو جذبے سے اشعار گاتا تھا اب گویا خود کلامی میں اپنی شاعری میں سے افسردہ کر دینے والے اشعار بڑبڑاتا تھا۔

بھکھ وِچ پردہ داری کاہدی   چادر چاردیواری کاہدی
میرے گھر دیاں کندھاں وی نہیں   بوہا کاہدا باری کاہدی
(بھوک میں پردہ داری کیسی؟   چادر چاردیواری کیسی؟
میرے گھر دیوار نہیں ہے   دَر کیسا اور باری کیسی؟)
جیہڑے لکھ کروڑ دے ربّا   میری رَت نچوڑدے ربّا
مینوں ساری دنیا چھڈ گئی   دُکھ نہیں مینوں چھوڑدے ربّا
بندیاں اگے جھکنا پیندا   نہ توں اپنی تھوہڑ دے ربّا
(جو ہیں لاکھ کروڑ کے ربّا!   میرا لہو نچوڑتے ربّا!
دنیا ساری چھوڑ گئی ہے   دکھ نہ مجھے چھوڑتے ربّا!
مخلوق جھکے مخلوق کے آگے   نہ اتنی تُو تھوڑ دے ربّا!)
کیہ دساں میں یارو اپنے اُجڑے گھر دا حال   میرے ویہڑے آوندے رہندے روز ای نویں بھچال
(کیا بتلاؤں یارو، اپنے اُجڑے گھر کا حال   میرے گھر میں آتے ہیں روز نئے بھونچال)

آخری ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات میں نصیر کوی نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا۔ میں نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے۔ اِس پر وہ خوددار شخص آنکھیں چرانے لگا۔ پھر ہکلاتے ہوئے بتایا کہ اس لفافے میں اس کے بیٹے کے کاغذات ہیں۔ ''بیچارہ دُکان دھندا کرتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اسے کہیں نوکری مل جائے۔ بھلے چھوٹی نوکری ہو، کم از کم تن خواہ تو ملے گی اور ایک تحفظ کا احساس رہے گا۔''

میں نے اپنے سامنے ایک بوڑھے شخص کو پایا۔ ''میری زندگی کا کیا پتا۔ اِس کا کچھ بن جائے تو مجھے سکون آجائے گا۔''

سڑدی جائے گلدی جائے   موم حیاتی بلدی جائے
جثہ بڈ رلاؤ را کردی   ساہ دی آری چلدی جائے

(جلتی جائے، گلتی جائے
موم حیاتی جلتی جائے
جسم کو ریزہ ریزہ کرتی
سانس کی آری چلتی جائے)

میرے سامنے وہ بہ ظاہر صحت مند مگر اندر سے نحیف شخص کھڑا تھا جس نے خواب میں روشنی دیکھی تھی، نیند میں خوشبو نے اُسے مہکایا تھا اور اُمید کے کومل ہاتھوں نے سہلایا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس نے کبھی للکارا تھا۔

دراز قد پہ یہی لازم ہے اپنے قد میں رہے
ستم شعار سے کہہ دو کہ اپنی حد میں رہے

شاید اُس کی آنکھ کھل چکی تھی جو ہماری آخری ملاقاتوں میں تواتر سے پڑھتا تھا۔

میں ویلے دے بھٹے اُتے
وقت کے بھٹے پر
کھنگر بنیا
میں کھنگر بنا
میں ہر اوکڑ جھلی
اور سختی جھیلی

میرے پیؤ دانیاں دراوڑ
میرا باپ دراوڑ
میرا ناں مُصلی
میرا نام مُصلی!

میں نے وہ کاغذات کا لفافہ تھاما اور اسلام آباد میں ایک بارسوخ سیاسی شخص کے حوالے کیا جس سے ہوتا ہوا وہ پارٹی کی اعلیٰ کمان تک پہنچ گیا۔ بی بی ایک الم ناک حادثے کا شکار ہو چکی تھی لیکن اُس کی پارٹی اقتدار میں تھی۔ چناں چہ میں مطمئن ہو گیا۔

چند مہینوں بعد مجھے اسلام آباد چھوڑ کر کراچی جا بسنا پڑا۔ بیچ میں ایک آدھ مرتبہ مختصر بات ہوئی۔ اُس کا بیٹا تب تک بے روزگار تھا اور اُس کی ملازمت کا معاملہ کھٹائی میں نظر آتا تھا۔ اس کی ذاتی خواہش ہنوز تشنۂ تکمیل تھی۔ بڑے شہر کی مصروفیات نے میرے شب و روز نگل لیے۔ مہینے گزر گئے۔ میرا رابطہ شاعر سے مکمل کٹ چکا تھا۔ سوچتا تھا کہ اسلام آباد جانا ہوا تو جہلم جا کے مل لوں گا۔

طویل وقفے کے بعد اسلام آباد جانا ہوا۔ میں حسبِ معمول نئی کتب کی تلاش میں جناح سُپر میں واقع کتابوں کے شوروم سعید بُک بینک کی بالائی منزل میں کتابیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر شاعری کی ایک کتاب پر پڑی۔ ''ساڈے ہتھ اگنی داتا'' شاعر کا نام نصیر کوی تھا۔ مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ہماری آخری ملاقات تک نصیر کا شعری سرمایہ کتابی صورت میں نہ آیا تھا۔ میں نے اشتیاق سے کتاب اُٹھائی تو اندر سے ایک کارڈ گر پڑا۔ اس پر لکھا تھا۔

''ایک اہم گزارش۔

آپ جانتے ہیں کہ صاحبِ کتاب جناب نصیر کوی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہیں اور شوکت خانم ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ ان کے علاج پر بے تحاشا اخراجات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کی پہلی کتاب کا ان کے دست خطوں سے جاری شدہ یہ ''خصوصی ایڈیشن'' تمام احباب اور مداحین نصیر کوی اصل قیمت کے بجائے ایک ہزار روپے میں خریدیں گے۔ تا کہ حاصل شدہ رقم ہمارے محبوب شاعر کے علاج معالجے پر خرچ کی جا سکے۔

تمام احباب سے اس مہم میں نصیر کوی کی صحت یابی کی دُعا کے ساتھ شمولیت کی دردمندانہ درخواست ہے۔

من جانب
احبابِ کوی''

میرے لیے ایک اندوہ ناک خبر تھی۔ میں نے بے چین ہو کر نصیر کوی کا نمبر ملایا تو وہ بند ملا۔ چناں چہ ایک مشترکہ شناسا سے رابطہ

کیا۔ وہ تفصیل بتانے لگا۔ چند جملے سن کر میرا دماغ ماؤف ہوگیا اور میں نے فون بند کر دیا۔ میری چشمِ تصور میں ایک ہنستا مسکراتا جذباتی شاعر آنکھیں مونڈے مخصوص لے میں اپنے اشعار پڑھ رہا تھا اور کیف وجذب میں جھوم رہا تھا۔

حقیقت کچھ اور تھی

نصیر کوٹی ہسپتال کے ایک کمرے میں گم نامی، غربت اور بے چارگی کی موت مر چکا تھا اور اُس کا تیشہ اُسی کے سینے میں گڑ چکا تھا۔ اناللہِ واِنا الیہِ راجعون۔

دوسرا آدمی

جاوید چودھری

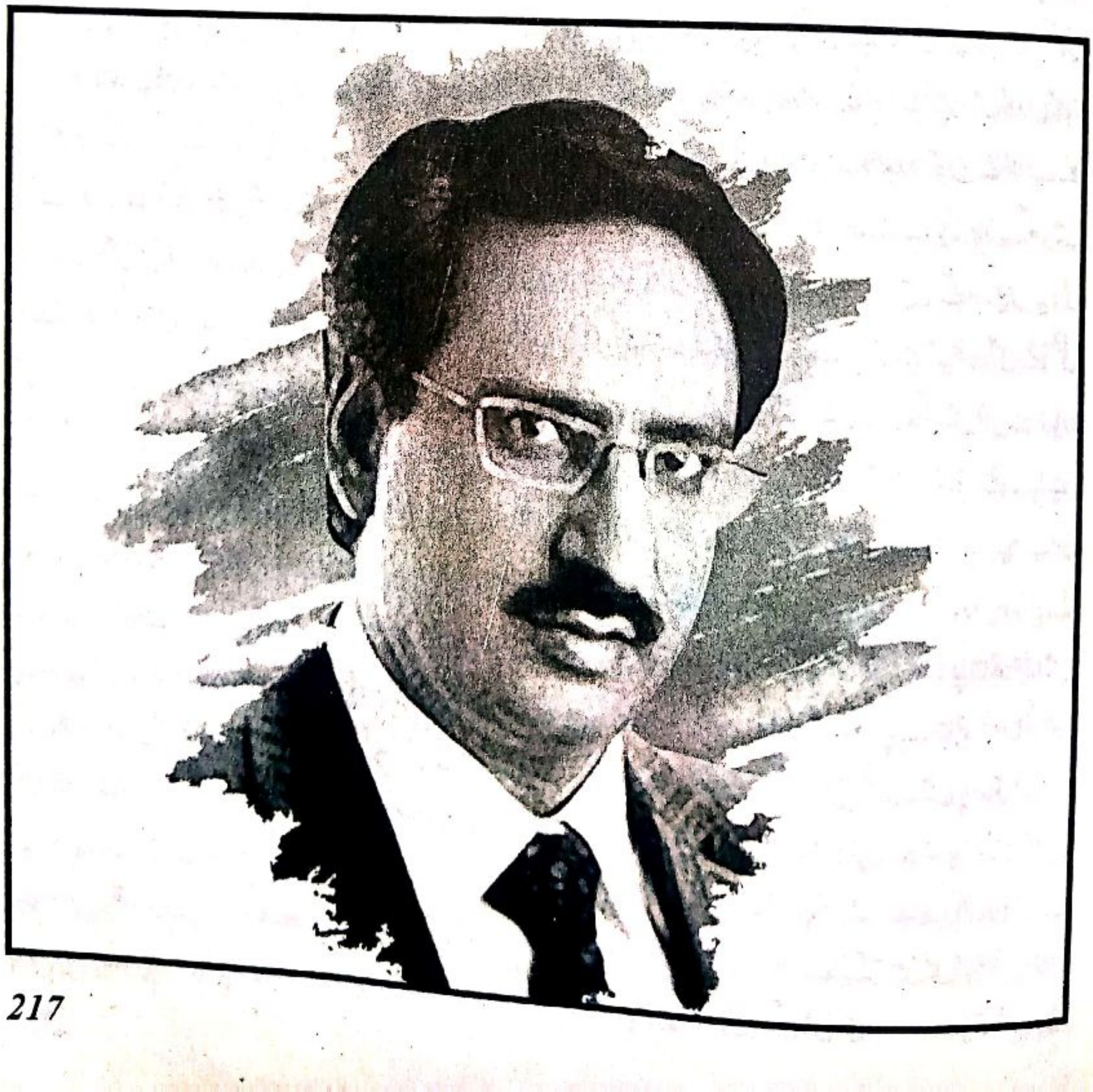

جاوید چودھری نے کہا ”میں بے بس، نالائق اور لاچار تھا۔ میرے پاس صرف دو ہتھیار تھے۔ اللہ کا کرم اور ان تھک محنت۔“

پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی، اسلام آباد بھیگنے لگا، مارگلہ روڈ کے درختوں، بیلوں، پودوں اور گھاس کا رنگ مزید سبز ہو گیا، مارگلہ کی پہاڑیاں ہمارے سروں پر جھکی تھیں، تاحد نظر دھند تھی، بارش تھی اور شام تھی، میں مارگلہ کی پہاڑیوں، مارگلہ روڈ کے فٹ پاتھوں اور ایف سیون اور ایف ایٹ کے بوڑھے درختوں اور ایف سکس کے سبزہ زاروں اور ان سبزہ زاروں کی گیلی سبز گھاس کا عاشق ہوں، یہ چاروں مل جائیں تو یہ مجھے دور لے جاتی ہیں۔ دور اس جگہ جہاں سے جنت کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہ دن بھی میری زندگی کا نایاب دن تھا۔ اسلام آباد تھا، بارش تھی، شام تھی، مارگلہ کی پہاڑیاں تھیں۔ دھند میں لپٹی ہوئی سڑک تھی اور ہم دونوں تھے۔ ہم آہستہ آہستہ ایف سکس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ”میرے پاس صرف دو ہتھیار تھے، اللہ کا کرم اور ان تھک محنت کا جذبہ، میرے پاس آج بھی محنت اور اللہ کے کرم کے سوا کچھ نہیں۔“ جاوید کی آواز میں معمول سے زیادہ اداسی تھی، مجھے اس کی اداسی نے جکڑ لیا، میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا، بارش صرف باہر نہیں تھی، بارش اس کے اندر بھی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں کے کونوں سے نکل کر بارش کے قطروں سے مل رہے تھے، یہ دونوں ملتے تھے، اس کی ٹھوڑی تک پہنچتے تھے اور پھر اس کے سینے، اس کی گیلی قمیص پر گر جاتے تھے، میں نے اسے زندگی میں دوسری بار روتے دیکھا، پہلی بار اس کی آواز میں چیخ تھی جب کہ دوسری بار وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا، پگھلتی ہوئی موم بتی کی طرح نرم اور مسلسل۔ وہ پہلی بار کب رویا، یہ بعد کی بات ہے۔ ”میری زندگی کے دو دور ہیں، پہلا دور 1990ء تک تھا اور دوسرا 1990ء سے اب تک۔“ وہ گویا ہوا ”میں 1990ء تک عام لوگوں سے بہت پیچھے تھا، مجھ میں زبان سیکھنے کی اہلیت نہیں تھی۔ میں ایک وقت میں صرف ایک زبان لکھ اور بول سکتا ہوں۔ تم نے محسوس کیا ہو گا میں جب بھی اردو بولتے ہوئے انگریزی کا لفظ بولتا ہوں تو اس کی آواز غلط ہوتی ہے۔ میں پھر رُکتا ہوں، وہ لفظ درست کرتا ہوں اور پھر بولتا ہوں۔ یہ فطری نقص ہے، گاؤں میں پیدا ہوا، سکول جانے والا خاندان کا پہلا بچہ تھا، خاندان سکول اور تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، ہم لوگ کلچرلی اجڈ تھے، میرے والد نے میرے بچپن میں گاؤں چھوڑ دیا۔ ہم شہر آ گئے، والد نے کاروبار کیا اور بے تحاشا پیسہ کمایا لیکن ہمارا رہن سہن، طرز گفتگو اور کلچر دیہاتی رہا۔ میرے والد دوستوں کے خلاف تھے، وہ سمجھتے تھے دوست انسان کو برباد کر دیتے ہیں چناں چہ والد کا کوئی دوست تھا اور نہ ہی انھوں نے ہمیں کوئی دوست بنانے دیا۔ ہمارے گھر میں ڈرائنگ روم بھی نہیں تھا، والد نے بنایا ہی نہیں تھا، وہ سمجھتے تھے گھر میں بیٹھنے کی جگہ ہو گی تو ان کے بیٹے دوستوں کو گھر بلائیں گے اور یوں یہ بری صحبت کا شکار ہو جائیں گے۔ میرے والد دنیا کے ہر شخص کے خلاف تھے، یہ آج بھی اپنی ذات کے علاوہ سب کے خلاف ہیں، یہ سخت بھی تھے، شکی بھی تھے اور منفی بھی تھے لیکن اس کے باوجود یہ میرے آئیڈیل تھے، کیوں تھے؟ اس کی وجہ ان کی خوبیاں تھیں۔ میں نے زندگی میں ان سے زیادہ رسک لینے والا شخص نہیں دیکھا۔ یہ آگے بڑھتے تھے اور بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ یہ اپنے محدود دائرے میں اچھے خاصے انقلابی تھے۔ یہ ایسے نہ ہوتے تو شاید ہم لوگ کبھی گاؤں سے باہر نہ آتے، اگر ہم آ جاتے تو شاید ہم لالہ موسیٰ سے نہ نکل پاتے۔ ہم اسلام آباد تک نہ پہنچتے، یہ سب ان کی مہربانی اور آگے بڑھنے کی لگن تھی جس کے باعث ہمارا خاندان لالہ موسیٰ کے چھوٹے سے گاؤں شاہ سرمست سے اسلام آباد آیا اور ہم نے خوش حالی اور اطمینان کے ذائقے چکھے“۔ بارش تیز ہونے لگی، سردی میں بھی اضافہ ہو گیا لیکن میں جاوید کے تسلسل کو نہیں توڑنا چاہتا تھا لہٰذا میں چپ چاپ اس کے قدم سے قدم ملاتا رہا، وہ گویا ہوا ”میرا پورا بچپن احساس کمتری، حساسیت اور محرومی میں گزرا۔ میں چپ رہتا تھا، جسمانی طور پر کمزور تھا لہٰذا بزدل بھی تھا۔ بولتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی تھی اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے وقت ٹانگیں کانپتی تھیں۔ میں پڑھائی میں بھی کمزور تھا، بیک بینچر تھا، استادوں سے روز مار کھاتا تھا، استادوں کی مار نے میرا رہا سہا اعتماد بھی توڑ دیا، میں احساس کمتری سے شدید احساس کمتری میں چلا گیا۔ میں آج بھی جب کسی ٹیچر کو دیکھتا ہوں یا کوئی صاحب استاد کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتے ہیں تو خوف سے میری گردن، میرے سینے اور میری بغلوں میں پسینہ آ جاتا ہے۔ میں اکثر لوگوں کے انٹرویو دیکھتا یا پڑھتا ہوں اور جب وہ بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں میں آج جس مقام پر ہوں یہ میرے اساتذہ کی محنت اور شفقت کا نتیجہ ہے، تو مجھے ان پر بہت رشک آتا ہے کیوں کہ میری زندگی میں کوئی ایسا استاد نہیں تھا جس نے

مجھ پر شفقت کی ہو' جس نے مجھے محبت دی ہو یا جس نے مجھ پر محنت کی ہو۔ میرے اساتذہ میرے پورے بچپن میں میری خودداری' میرے اعتماد اور میرے ٹیلنٹ کو ڈنڈے' ٹھڈے اور تھپڑ مارتے رہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا' سکول کے زمانے میں کسی دن میرے بستے سے اخبار کا کوئی صفحہ' کہانیوں کی کوئی کتاب اور کوئی ناول نہ نکلا ہو اور اس کتاب کے ''جرم'' میں مجھے پوری کلاس کے سامنے مرغا نہ بننا پڑا ہو اور ماسٹر جی نے میرے چوتڑوں پر ڈنڈے اور چھتر نہ مارے ہوں۔ میرے استادوں کا خیال تھا کورس کے علاوہ تمام کتابیں فحش اور غیر اخلاقی ہوتی ہیں۔ میں کتاب بینی کی لت کا شکار تھا چناں چہ میں استادوں کی نفرت کا ہدف تھا میرے زیادہ تر استاد روزانہ ہماری دکان کے سامنے سے گزرتے تھے' یہ حقہ پینے کیلئے وہاں رکتے بھی تھے' حقہ نوشی کے دوران میرے استادوں کا واحد مشغلہ مجھے نالائق اور بد اخلاق ثابت کرنا ہوتا تھا۔ استاد چلے جاتے تھے تو مجھے دوبارہ مار پڑتی تھی' اساتذہ نے میرے والد اور چچاؤں کو اچھی اور بری کتابوں کی نشانیاں بھی بتا دی تھیں۔ استادوں نے بتایا بڑے سائز کی کتابیں اچھی ہوتی ہیں اور چھوٹے سائز کی کتابیں فحش۔ والد نے میرے چچا کو فحش کتابوں کے خلاف جہاد کی ذمہ داری سونپ دی۔ میرے چچا روزانہ میرے بستے کی تلاشی لیتے' چھوٹے سائز کی ساری کتابیں نکالتے' اور انہیں آگ لگا دیتے۔ میں چیختا چلاتا رہتا لیکن میری کوئی نہیں سنتا تھا' مطالعہ میری عادت بن چکا تھا۔ میں اس کے بغیر ادھورا تھا چناں چہ میں نے بہت جلد اس مسئلے کا حل نکال لیا' میں ناول کو گھر میں چھپا دیتا تھا۔ رات کے وقت جب سب سو جاتے تھے تو میں رضائی کے اندر ٹارچ جلاتا تھا اور رضائی کو شامیانے کی طرح تان کر ناول پڑھتا تھا' یہ آئیڈیا کام یاب ہو گیا مگر میری آنکھیں خراب ہو گئیں۔ مجھے بلیک بورڈ پر لکھا ہوا نظر نہیں آتا تھا' میں نے والد سے بات کی لیکن میرے والد یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ کسی بچے کی آنکھیں بھی خراب ہو سکتی ہیں چناں چہ مجھے جھڑک دیا گیا۔ میں پورا سال دنیا کو دھندلی آنکھوں سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ میں نے پیسہ جمع کیا' بس پر بیٹھ کر پہلی بار گجرات گیا اور آنکھیں ٹیسٹ کرائیں' میری نظر منفی دو درجے خراب تھی۔ میں نے عینک خریدی اور واپس آ گیا۔ میں اب جوں ہی گھر سے نکلتا تھا میں عینک پہن لیتا تھا اور گھر کے قریب پہنچ کر اپنی عینک چھپا لیتا تھا۔ میرے چچا نے ایک دن یہ عینک بھی پکڑ لی' میں چیختا رہا لیکن میرے سامنے میری عینک توڑ دی گئی۔ مجھے دوسری عینک کیلئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے' یہ کہانی بھی آج تک میرے سینے پر لکھی ہے''۔

اس نے لمبی سانس لی۔ عینک اتاری اور گیلی قمیص کے گیلے کف سے گیلی آنکھیں صاف کرنے لگا' میں نے پوچھا ''کیا کوئی استاد یاد آتا ہے'' اس نے ہاں میں سر ہلایا اور بولا '' ہاں دو استاد۔ ایک ماسٹر سعید تھے اور دوسرے چودھری فضل حسین۔ ماسٹر سعید نے ساتویں جماعت میں مجھے بتایا تھا' تمہارے اندر لکھنے کی قدرتی صلاحیت ہے۔ میں اس ایک فقرے پر ان کا آج تک ممنون ہوں۔ چودھری فضل حسین گجرات میں ہمارے کالج کے پرنسپل تھے' اللہ تعالیٰ نے انہیں حیران کن حس مزاح دی تھی۔ میں ان کا مداح تھا' میری ان سے ملاقاتیں کالم نگار بننے کے بعد شروع ہوئیں۔ وہ کمال انسان تھے میں آج تک ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ بولا '' میں نے دنیا کی ہر چیز پنجابی میں پڑھی' اردو ہو' انگریزی ہو' الجبرا ہو' کیمسٹری ہو یا پھر فارسی ہو میرے استادوں نے مجھے دنیا کا ہر علم پنجابی میں پڑھایا' میں آج بھی پنجابی میں سوچتا ہوں میں سارا دن پنجابی بولتا ہوں' میرا لہجہ خالص پنجابی ہے۔ میں آج تک کوشش کے باوجود لٹکانے کو آویزاں نہیں کہہ سکا' میں برا طالب علم بھی تھا۔ میں نے ایم اے تک کوئی پوزیشن نہیں لی' ایف ایس سی میں فیل ہو گیا' پرائیویٹ ایف اے کیا' بی اے کے لیے ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لے لیا' وہاں بھی نہ چل سکا۔ پرائیویٹ بی اے کیا' لاء کالج پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر قانون کی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکا۔ اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور میں ماس کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں بھی نالائق اور اینٹی سوشل تھا۔ میں حساسیت کا مریض بھی تھا۔ مجھے اس دوران شوگر کا مرض بھی لاحق ہو گیا مگر مجھے کیونکہ شوگر کے بارے میں علم نہیں تھا۔ چناں چہ میں اس کے جسمانی اور نفسیاتی اثرات سے بھی آگاہ نہیں تھا۔ میں شوگر کی وجہ سے زود رنج' حساس اور چڑچڑا ہو چکا تھا لیکن میں اس کی وجہ سے ناواقف تھا۔ میں یونی ورسٹی میں ''بغلول'' مشہور ہو گیا۔ لوگ مجھے دیکھ کر سیٹیاں بجاتے تھے' یونی ورسٹی میں میرے دو مشغلے تھے۔ لائبریری سے کتابیں لینا

اور کمرے میں لیٹ کر پڑھتے رہنا، میں لوگوں کے مذاق کی وجہ سے کلاس میں بھی نہیں جاتا تھا۔ میں اکثر اوقات پورے شہر کا پیدل چکر لگا لیتا تھا۔ یہ سلسلہ 1990ء تک جاری رہا۔ میرا اس دوران ایک بزرگ خاتون استاد کے ساتھ جعلی سکینڈل بھی بن گیا، یہ سکینڈل، بیس سال طویل نفرت کا بوجھ اور نہ ختم ہونے والی اذیت یہ تمام چیزیں مجھے وہاں لے گئیں جہاں انسان سنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ میں روزانہ خود کو ہلاک کرنے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن بزدلی آڑے آ جاتی۔ میں نے ایک دن کوشش بھی کی۔ میں نیند کی گولیاں کھا گیا۔ میرے روم میٹ مجھے ہسپتال لے گئے، میرا معدہ صاف ہوا، میں نے آنکھ کھولی تو وہاں سے میری زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا“ وہ خاموش ہو گیا، مارگلہ روڈ تھی، شام تھی، ہلکی ہلکی بارش تھی اور جاوید تھا۔ ایک دوسرا جاوید چودھری جس سے دنیا واقف نہیں تھی۔ میں حیرت سے اس دوسرے جاوید چودھری کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا ”میں نے اس دن پرانے جاوید چودھری کو قتل کیا اور بہاولپور میں دفن کر دیا۔ میں اٹھا، بہاولپور سے لاہور آیا، پنجاب یونیورسٹی کے ایک دوست سے اس کا کمرا لیا، جرنلزم ڈیپارٹمنٹ گیا، صحافت کی کتابیں نکلوائیں اور نوٹس بنانا شروع کر دیئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں ایک استاد ہوتے تھے شفیق جالندھری۔ میں ایک دن 25 صفحے لکھ کر ان کے پاس چلا گیا، میں نے انہیں وہ 25 صفحے دکھائے اور ان سے پوچھا ”اگر آپ کے پاس یہ سوال چیکنگ کیلئے آئے تو آپ کتنے نمبر دیں گے“۔ شفیق جالندھری نے کاغذ دیکھے اور بولے میں ”20 میں سے 19 نمبر دوں گا لیکن کوئی شخص آدھ گھنٹے میں 25 صفحے لکھ نہیں سکتا“۔ یہ ایک فقرہ میری نئی زندگی کی بنیاد بن گیا۔ میرے ہاتھ نسخہ آ گیا، میں سمجھ گیا میں اگر 30 منٹ میں 25 صفحے لکھنا سیکھ لوں تو میں 20 میں سے 19 نمبر لے سکتا ہوں۔ میں نے اس کے بعد اپنے تمام مضامین کے نوٹس بنائے، نوٹس کو رٹا لگایا اور پھر تیزی سے لکھنے کی پریکٹس شروع کر دی۔ میں چوبیس گھنٹے میں سے 18 گھنٹے پریکٹس کرتا تھا، رٹا لگاتا تھا اور لکھتا تھا یہاں تک کہ میں 30 منٹ میں 35 صفحے لکھنے لگا۔ امتحان کا وقت آیا تو میں واپس بہاولپور آ گیا۔ میں نے پیپرز دیئے اور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ یہ حیران کن واقعہ تھا۔ کلاس کے نالائق ترین طالب علم نے پہلی پوزیشن حاصل کر لی، کوئی یقین کرنے کیلئے تیار نہیں تھا لیکن میں نے زندگی کا نسخہ کیمیا جان لیا تھا، میں نے معلوم کر لیا تھا، آپ اگر روزانہ 18 سے 20 گھنٹے کام کریں اور آپ کے کام میں تسلسل ہو تو آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کامیابی، دو لفظوں کا مجموعہ ہے کام اور یابی۔ آپ اگر یاب ہونا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو کام کرنا پڑے گا، میں نے اگلے سال بھی ”کام کیا اور اس سال بھی ”یاب“ ہو گیا، میں نے دوسرے سال بھی پہلی پوزیشن حاصل کر لی، یہ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔ میں نے اس کے بعد اللہ کے شکر اور محنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اُس کے بعد کا قصہ انگریزی محاورے کے مطابق تاریخ ہے۔

وہ ایک خود پرداختہ فن کار ہے۔ کام یاب لوگوں کو قدرت چند صلاحیتیں دیگر لوگوں سے بڑھ کر عطا کرتی ہے۔ اُس کی یادداشت بے پناہ اور بروقت ہے اور لوگوں کی پہچان بہت اچھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم کسی ایسے شخص سے ملے جو مسئلے میں گرفتار تھا۔ اُس کی روداد اُس کی بے گناہی کی دلالت کرتی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد جاوید نے محتاط انداز میں اُس کی بے گناہی، دوغلے پن یا ملوث ہونے کے بارے میں اپنی مدلل رائے دی۔ بعدازاں وہ رائے، اُس کہانی اور کردار کے انداز و اطوار کے برعکس، دُرست ثابت ہوئی۔ واقعات کی عمومی پیش بینی بھی اُسے قدرت کا تحفہ ہے۔ یادداشت تو اُس کی حیران کن حد تک غیر معمولی ہے۔

تعلیمی طور پر یک دم کام یابی حاصل کر لینے کا معاملہ اور بعدازاں محنت کو وطیرہ بنا لینے کی روایت انوکھی نہیں۔ عام زندگی میں ایسے طالب علم بھی نظر آتے ہیں جو آٹھویں نویں درجے یا پھر کالج میں تعلیمی طور پر یک دم کایا کلپ کے باعث کام یابی کو ایک جست میں حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ مکمل طور پر بدل جاتے ہیں۔ محنتی، ذہین اور کام یاب طالب علم ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک جھٹکا یا کام یابی کا ایک معمولی انجکشن اُن کا اعتماد بحال کر کے اُنھیں ذہنی طور پر پُر اعتماد اور توانا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ابتدائی طور پر کام یاب طالب علم ستائش اور غیر معمولی اعتماد کے بوجھ تلے دب کر بعد کے ادوار میں ناکام ہو کر ایسا اعتماد کھوتے ہیں کہ پھر اُٹھ نہیں پاتے۔

اولین معاملے میں اعتماد بحال ہونے کے علاوہ کام یاب ہونے کی بے پناہ تڑپ اور ضد بھی اہم ہوتے ہیں۔ نہ بجھنے والی پیاس اور مسلسل کوشش۔ اس کے علاوہ ہمارے طویل تعلق میں مَیں نے جاوید کو حد درجہ حساس، صاف گو اور منکسر المزاج انسان پایا ہے۔ اُسے میں نے حقیقی طور پر لوگوں کی پریشانیوں پر دُکھی ہوتے دیکھا ہے اور ملکی حالات پر رنجیدہ۔ وہ ترقی یافتہ ممالک سے واپسی پر پورے خلوص سے وہاں کی خوبیوں کو یہاں پر عملی شکل میں دیکھنے کی تڑپ رکھتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ماں کا دل رکھتا ہے اور بھائیوں کے لیے باپ کا۔ اپنی بیوی کا ہم درد اور بے لوث ساتھی ہے۔ البتہ کسی کی زیادتی ایک حد تک برداشت کرتا ہے، اگر حد سے بڑھ جائے تو ناراضی صورت میں اظہار کر کے دل صاف کر لیتا ہے۔ یہ اسی زرخیز نرم دل کی خوبی ہے کہ اُس میں خیال کے بیج خوب صورت کونپلوں کی شکل میں سر نکالتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور دل پذیر مدلل الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ہمارے طویل تعلق میں مَیں نے جاوید کو حد درجہ حساس، صاف گو اور منکسر المزاج انسان پایا ہے۔ اُسے میں نے حقیقی طور پر لوگوں کی پریشانیوں پر دُکھی ہوتے دیکھا ہے اور ملکی حالات پر رنجیدہ۔ وہ ترقی یافتہ ممالک سے واپسی پر پورے خلوص سے وہاں کی خوبیوں کو یہاں پر عملی شکل میں دیکھنے کی تڑپ رکھتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ماں کا دل رکھتا ہے اور بھائیوں کے لیے باپ کا۔ اپنی بیوی کا ہم درد اور بے لوث ساتھی ہے۔ البتہ کسی کی زیادتی ایک حد تک برداشت کرتا ہے، اگر حد سے بڑھ جائے تو ناراضی صورت میں اظہار کر کے دل صاف کر لیتا ہے۔ یہ اسی زرخیز نرم دل کی خوبی ہے کہ اُس میں خیال کے بیج خوب صورت کونپلوں کی شکل میں سر نکالتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور دل پذیر مدلل الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

جاوید چودھری کی تین تخلیقی اور پیشہ ورانہ جہتیں ہیں۔ پہلا وہ جو صرف کالم لکھتا تھا، قاری کے اور مصنف کے درمیان پردۂ اسرار کی وجہ سے خاص احترام کا حامل تھا۔ دوسرا وہ جو ٹیلی وژن پر آیا۔ اسرار کی دھند چھٹنے کی وجہ سے گو اُس کی پہنچ پہلے سے بڑھی فاصلہ گھٹا سو تنقید اور نکتہ چینی کا ریچھ لمبی نیند سے بیدار ہوا۔ تیسرا درجہ سوشل میڈیا کا روپ ہے۔ اس میں کالم نگار آئیڈیلسٹ جاوید چودھری 'کل تک' کے قصہ گو نقاد و اینکر جاوید چودھری کی جگہ دور اندیش کاروباری صحافی کا ظہور ہوتا ہے جس کی نظر میں ایسے سیکڑوں معروف صحافی اور دانش ور ہیں جو کسمپرسی میں فوت ہوئے اور غربت کی اجتماعی قبر میں دفن ہیں۔

اُس کی شخصیت کا ایک رخ اور ہے جسے اُس کے قریبی ترین چند دوست جانتے ہیں یا اہل خانہ۔ یہی اصل جاوید چودھری ہے۔ جاوید فطرتاً الگ تھلگ آدمی ہے۔ صحافت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اُسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے وگرنہ سماجی سطح پر اُس کے زیادہ دوست نہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ احباب کے گھروں پر آنا جانا نہ ہونے کے برابر ہے۔

اُس کا اصل روپ وہ ہے جس میں وہ تب آتا ہے جب وہ کالم لکھتا ہے، سوچتا ہے یا قریبی احباب کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا وہ رابرٹ لوئی اسٹیونس کے معروف کردار ڈاکٹر جیکال کی طرح ذاتی زندگی میں مختلف انسان ہوتا ہے اور لوگوں سے ملتے ہوئے کچھوے کی طرح اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ لوگ اس خول ہی کو جاوید چودھری سمجھ لیتے ہیں۔

جب اُس نے ماسٹرز میں گولڈ میڈل لیا تو کلاس فیلوز اور اساتذہ کو اس کے گولڈ میڈل لینے پر یقین نہ تھا۔ اس نے کالم نگاری شروع کی تو بہت سے احباب کا خیال تھا یہ کالم جاوید چودھری جیسا پینڈو نہیں لکھ سکتا۔ یہ وہ عام لوگ تھے جو جاوید سے ملتے تھے اور اسے ہی جاوید چودھری سمجھ بیٹھتے تھے۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ جب جاوید قلم اُٹھاتا ہے اور اپنے اندر اُتر جاتا ہے تو یہ کوئی اور آدمی ہوتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی!

وہ کئی برسوں سے پاکستان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار ہے' فیس بک پر اُس کے قارئین کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ وہ پاکستان کا سب سے بڑا نیوز پورٹل بھی چلا رہا ہے' اس کی ویب سائیٹ javedch.com کے روزانہ وزیٹرز 25 لاکھ ہیں' اُس کی کتاب ''زیرو پوائنٹ'' کا پہلا حصہ تین سو ایڈیشن سے زیادہ شائع ہو چکا ہے' یہ ایک ریکارڈ ہے۔ ''زیرو پوائنٹ'' کے بقیہ حصے بھی فروخت

میں ملکی سطح پر پہلے نمبر پر موجود ہیں، اُس کا پروگرام ‘‘کل تک’’ اپنے ٹائم سلاٹ کے تمام پروگراموں میں پہلے تین نمبروں پر چلا آ رہا ہے۔ گویا وہ پرنٹ میڈیا میں پہلے نمبر پر، کتابوں کی اشاعت میں بیسٹ سیلر، سوشل میڈیا پر تمام جنوبی ایشیا کے صحافیوں میں پہلے نمبر پر، الیکٹرانک میڈیا میں اینکرز میں مقبول ترین لوگوں کی صف اول میں کھڑا ہے۔ گویا ابلاغ کے سبھی ذرائع میں غیر معمولی کام یابی حاصل کر رکھی ہے۔ قصباتی تہذیب کا ایسا شخص جس کے خاندان میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا، جو آج بھی پنجابی لب و لہجے میں شین قاف کی غلطیاں کر جاتا ہے اور انگریزی بولتے اٹک اٹک جاتا ہے، اس میں ایسی کیا بات ہے جس نے اُسے کروڑوں لوگوں میں مقبول کر رکھا ہے۔ اُس نے ایک گاؤں سے نکل کر قلم کے زور پر، اُردو زبان میں ایسی کام یابی حاصل کی ہے جو ہر عام پاکستانی لڑکے کے لیے اُمید کی عملی شکل ہے۔ میں کہ شناور ہوں حدیثِ دل بیان کرتا ہوں، کچھ اپنی کہتا ہوں، کچھ اُس کی سناتا ہوں، دنیا کے لیے جاوید چودھری اور میرے لیے جاوید۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ سرسبز و گل و گلزار اسلام آباد میں بہار کی چمکیلی نیم سرد صبح تھی۔ میں اور جاوید مارگلہ روڈ سے پیر سوہاوہ کے لیے پیدل مارگلہ پہاڑ کی پتھریلی، خشک جھاڑیوں والی پرمشقت چڑھائی چڑھ کر ہانپ گئے تھے۔ نصف رستے میں سانس لینے کے لیے ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے سبزے کے غلاف میں لپٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا، جنگلی پھولوں پر بھونرے تھے یا سکون بخش خاموشی میں ہوا سرسراتی تھی۔ جب ہمارے پسینے سے تر بدنوں پر تازہ ہَوا اپنی نرم انگلیاں پھیرنے لگی تو ہلکی ٹھنڈک کا ویسا ہی احساس ہوا جیسا نیم سرد ہوا میں پسینہ خشک ہونے پر ہوتا ہے۔ جاوید خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا اور میں سبزے کی کچی مہک کو مشامِ جاں میں اُتارنے لگا۔

مارچ کی اس دمکتی صبح پہاڑیوں کے سائے میں سبزے کے غلاف پر بیٹھ کر میں نے اُس سے پوچھا تھا ‘نیم خواندہ دیہی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود تمہارے اندر ایک توازن، سوچ میں جدت اور زندگی کے معاملات میں ایسی شائستگی جو برسوں کی تربیت سے آتی ہے’ کیوں کر موجود ہے؟ وہ مسکرایا اور مجھے دیکھ کر کہا ‘‘یہ اللہ کا کرم ہے۔’’ یہ اُس کا تکیہ کلام بھی ہے اور یقین بھی۔ سو میں نے مزید ٹٹولا تو اُس نے قصوں کی پٹاری کا منہ کھولتے ہوئے کہا ‘‘میں نے پہلے دن سے یقین کر لیا تھا‘ مجھے کچھ نہیں آتا اور میں نے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ سو جب مجھے کسی کی کوئی چیز اچھی لگتی ہے تو میں اُسے اپنانے کی کوشش کرتا ہوں، کوئی نئی بات پڑھنے دیکھنے کو ملتی ہے تو اُسے سمجھنے کی کوشش دل و جان سے کرتا ہوں۔ جہاں تک مزاج میں سادگی کا تعلق ہے تو یہ مجھے میری دادی سے وارثت میں ملی ہے۔’’

‘‘دادی؟!’’ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا تو اُس نے مجھے اپنے بچپن کی بہت سی باتیں سنائیں۔ میں کچھ پہلے جانتا تھا، کچھ اُس صبح معلوم ہوئیں۔ مارچ کی وہ صبح جب سفید کپاس کے پھولوں کے ایسے بادل مارگلہ کی پہاڑیوں پر اپنا سایہ ڈالتے نیلے بے اتھاہ آسمان پر تیرتے پھسلتے چلے جا رہے تھے، اس وقت دو بندے دھبوں کی مانند سبزے میں معدوم ہو رہے تھے۔

اُس صبح جاوید نے میرے سامنے چند لوگوں کا بہت پیار سے تذکرہ کیا۔ وہ جنھوں نے اُسے تب عزت اور توجہ بخشی جب وہ ایک گم نام صحافی تھا، اُن میں سرِ فہرست الطاف گوہر ہیں۔

‘‘الطاف گوہر کی شخصیت میں ایک سکون اور گھر کے ماحول میں ٹھیراؤ تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک پڑھے لکھے دانش ور تھے۔ اُن کی لائبریری میں عمدہ کتابیں اُن کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتی تھیں۔ جب میں نیا نیا صحافت میں آیا تو مجھے نہ لباس پہننے کا صحیح ڈھنگ تھا اور نہ ہی طبقۂ اشرافیہ میں نشست و برخواست کا سلیقہ۔ الطاف گوہر ایوب خان کے دور کے طاقت ور ترین بیوروکریٹ رہے تھے۔ بڑے آدمی کا اہم جوہر اس کی عاجزی اور سادگی ہوتی ہے۔ چناں چہ الطاف صاحب مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے۔ یوں نستعلیق انداز میں مدلّل گفت گو کرتے کہ باتیں سیدھی دل میں اُتر جاتیں۔ وہ پرانے خاندانی لوگوں کے انداز میں زندگی گزارتے۔ اپنی بیگم کے ساتھ صبح ناشتا کرتے اور میاں بیوی آپس میں باتیں کرتے ہنسوں کا جوڑا دِکھتے۔ میں اُن کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا، اُن سے سیکھنا چاہتا تھا سو میں نے اُن کو پیش کش کر دی کہ میں اُن کی زیرِ تالیف کتاب کے ریکارڈ کی تلاش اور اسے تحریر کرنے میں اُن کی معاونت کروں گا۔ چناں چہ مجھے ان کے ساتھ

وقت گزارنے کا خاصا موقع مل گیا۔ ان کے متعلقہ حوالہ جاتی ریکارڈ پر مجھے اس حد تک عبور ہو گیا کہ کئی مواقع پر جب وہ بھول جاتے تو میں اُن کو لقمہ دے کر یاد دِلا دیتا۔ یوں میرے دل پر اُن کی متانت اور شائستگی کا دائمی نقش موجود ہے۔ اسی طرح ابتدائی دور میں جاوید اقبال (کارٹونسٹ) نے بھی بہت محبت اور عزت دی۔ جب انسان کسی مقام پر پہنچ جائے تو بیش تر لوگ لحاظ کرتے اور عزت دیتے ہیں۔ انسان کا اصل ظرف تبھی سامنے آتا ہے جب وہ کسی عام بندے کو عزت دے۔'' جاوید نے سوچتے ہوئے کہا۔

ممتاز مفتی ایک منفرد آدمی تھے۔ وہ اتنی توجہ اور شفقت سے پیش آتے کہ جاوید کو اپنے اہم ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ ان دنوں وہ اپنی آخری کتاب ''تلاش'' پر کام کر رہے تھے۔ سو انھوں نے جاوید کے ذمہ کام تفویض کیا کہ یہ ان کے لیے متعلقہ مواد تلاش کر کے لائے۔ اس نے دل و جان سے اُن کی معاونت کی۔

یہ بہار کی وہی صبح تھی جب جاوید نے چند ایسے دوستوں کا نام لیا جو اُس کے اوائلِ صحافت میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں، کام یابیوں اور توانائیوں کے ہم راہ اُس کے ساتھ ناروا سلوک رکھے تھے۔ کوئی اُس کے لباس کا مذاق اڑاتا تھا' کوئی انداز و اطوار کا۔ بعضے تو ایسے بھی تھے جو احباب کے ساتھ مل کر اُس پر جگت بازی کرتے اور خوب محظوظ ہوتے۔ یہ بے چارگی میں چپ چاپ سہتا رہتا۔

ابھی اس کے عملی زندگی میں ابتدائی دن تھے، عمر چوبیس پچیس برس کی تھی جب اُسے طویل انٹرویو لینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اُسے ایم اے کے دوران محنت کی عادت پڑ چکی تھی۔ اُس نے ایک ریٹائرڈ پولیس افسر جو کالم نگار بھی تھے سے انٹرویو کی درخواست کی۔ وہ صاحب آمادہ ہو گئے اور انھوں نے روزانہ صبح سویرے کا وقت طے کر دیا۔ اب جاوید فجر سے پہلے صبح صادق کے وقت اپنے گھر راول ٹاؤن سے پیدل چلتا ہوا اسلام آباد پہنچتا۔ اُس دور میں وہاں سے کوئی ویگن اتنی صبح نہیں چلتی تھی سو وہ کئی میل پیدل چل کے آب پارہ اور وہاں سے ویگن پر اُن صاحب کے ہاں پہنچتا۔ سردیوں کے دِن تھے۔ دھند آلودہ ٹھٹھرتے ماحول میں سر پر ٹوپی پہنے، گردن پر مفلر اور جسم پر جیکٹ ڈالے جب وہ اُن صاحب کے ہاں پہنچتا تو وہ اپنے لیے گرما گرم چائے منگوا لیتے اور اسے لکھوانا شروع کر دیتے۔ اگر دل میں ہم دردی آ جاتی تو اسے بھی چائے پوچھ لیتے۔ جاوید، جلدی میں کئی مرتبہ ناشتے کے بغیر خالی پیٹ آ جاتا۔ ایک مرتبہ یہ میٹھا بن اپنے ساتھ لے گیا۔ جب چائے آئی تو یہ اس کے ساتھ بن کھانے لگا۔ اُن صاحب نے اچھا خاصا بُرا منایا۔ اُن کے مزاج میں درشتی اور تلون کا یہ عالم تھا کہ اگر جاوید دس بارہ منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو وہ ملنے سے انکار کر دیتے اور یہ گیٹ سے ٹوٹے قدموں واپس لوٹ جاتا۔ کئی دنوں کی تپسیا کے بعد اس صاحب نے انٹرویو جاری رکھنے سے معذرت کر لی۔ یوں ساری محنت اکارت گئی۔

ہماری پہلی ملاقات ایک نجومی کی وساطت سے ہوئی تھی۔ لاہور کے نجومی کا بھی دل چسپ واقعہ ہے۔ مطیع الرحمان ایک انوکھا نجومی تھا۔ وہ ہر وقت چونکا دینے والی باتوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اپنا اچھا خاصا جما جمایا روزگار کا سلسلہ چھوڑ کر نجوم کا کاروبار سجا بیٹھا تھا۔ اُس نے لاہور چھاؤنی میں ریلوے اسٹیشن کی بغل میں اپنی چھوٹی سی نجوم گاہ قائم کر رکھی تھی۔ ایک روز ایک لڑکا اُس کے پاس آیا۔ مطیع ابھی فارغ تھا چناں چہ نجوم کے معاملات کے دوران دیگر موضوعات پر بھی بات چل نکلی۔ باتوں باتوں میں لڑکے نے ایک ایسے موضوع پر بات چھیڑ دی جس نے مطیع کو چونکا دیا۔ وہ موضوع آواگون، جنموں کے سلسلہ کا تھا۔ لڑکا اس معاملے میں خاصی دل چسپی رکھتا تھا اور اُس نے آواگون پر خاصا پڑھ رکھا تھا۔ لڑکے نے حساب لگاتے مطیع الرحمان سے جھجکتے ہوئے متذبذب لہجے میں پوچھا ''میرا کون سا جنم ہے؟'' مطیع الرحمان نے کن انکھیوں سے باہر کی جانب دیکھا اور لڑکے کے کان میں سرگوشی کی۔ ''چھٹا! براہ مہربانی اس بات کا باہر تذکرہ نہ کیجیے گا ورنہ لوگ میرے دفتر کو آگ لگا دیں گے۔'' لڑکے نے معصومانہ حیرت سے پوچھا ''اِدھر سے کوئی پچاس کلومیٹر پر امرت سر واقع ہے جہاں لوگ جنموں پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا سرحدیں حقائق بھی بدل دیتی ہیں؟ اُدھر ہمارے ہم سائے چین میں لوگ زندگی بعد از موت پر یقین نہیں رکھتے، وہ ہمیں اتنا ہی سادہ دل سمجھتے ہیں جتنا ہم مشرقی سرحد کے پار والوں کو۔ یہ تو سمجھ اور تلاش کے معاملے ہیں۔'' مطیع الرحمان نے توجہ سے بات سن کر اُسے ایسے چند ذاتی

واقعات سنائے جن میں لوگ آواگون کے بارے میں دریافت اور انکشاف کرتے اُس تک آپہنچے اور باہر نکل کر خوف اور بے یقینی کی وجہ سے خاموش رہے۔ اس کے بعد دونوں میں ایک دوستانہ تعلق قائم ہوجاتا ہے جس میں کئی نشستیں ہوتی ہیں۔ ان نشستوں میں ایسے تجربات بھی زیرِ بحث آتے ہیں جن سے بہت لوگ عام زندگی میں گزرتے ہیں۔ انھی میں Dejavu (التباس) کا تجربہ ہے جس میں ایک فرد کسی وقت، تجربے یا مقام سے گزرتے وقت سمجھتا ہے کہ وہ واقعہ اس کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے یا اُس مقام پر وہ پہلے بھی آچکا ہے۔ یہ اپنائیت یادہرایا غیر مشتبہ ہوتا ہے۔

آواگون پر یقین رکھنے والوں میں مسیحی، یہودی، اور دیگر مذاہب کے عالم گیر شہرت کے حامل دانش ور شامل رہے ہیں جن میں بنجمن فرینکلن، مارک ٹوئن، لیو ٹالسٹائی، نپولین بوناپارٹ، نطشے، گوئٹے، سقراط، کارل یونگ، والٹئر، شوپنہار اور گوگین جیسے شان دار فن کار، فلسفی اور لیڈر شامل تھے۔

بعد ازاں مطیع الرحمان دست شناسی کے حوالے سے ایک کتاب تحریر کرتا ہے جس میں آخری باب میں اپنی زندگی کے دل چسپ ہاتھوں اور لوگوں کا ذکر کہانیوں کی صورت میں کرتا ہے۔ انھی میں فسانہ طرازی اور مبالغے کے ساتھ وہ اُس لڑکے کی کہانی بھی شامل کر دیتا ہے جو آواگون کے بارے میں متجسس ہوتا ہے اور اس واہمے کا شکار رہا ہوتا ہے کہ وہ موجودہ زندگی سے پہلے ایک بھرپور زندگی گزار چکا ہے۔ وہ کتاب اسلام آباد کا ایک نوجوان صحافی پڑھتا ہے۔ وہ صحافی مطیع الرحمان کا واقف ہے، سو کتاب پڑھ کر لاہور کے لڑکے کے بارے میں پوچھتا ہے۔ وہ لڑکا میں تھا اور اسلام آباد کا نوجوان صحافی جاوید چودھری۔

جاوید کی وجہ سے میرے کئی صوفی منش روحانی شخصیات سے روابط قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سرفراز شاہ صاحب سرِ فہرست ہیں۔ ایک روز میں شاہ صاحب کی لاہور چھاؤنی سے پیوستہ برج کالونی کے قریب کی رہائش گاہ پر بیٹھا تھا۔ وہاں جاوید کا ذکر چل نکلا تو مجھ سے کہنے لگے۔

”ایک روز مجھے جاوید چودھری کا فون آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ ہم نے وقت طے کر کے ملاقات رکھ لی۔ ملاقات میں خوب گپ شپ ہوئی۔ گفت گو کے دوران جاوید چودھری نے مجھے ایک لڑکے کا قصہ سنایا۔ وہ لڑکا پندرہ برس پہلے مجھ سے ملا تھا۔ تب وہ زندگی میں تگ ودو کر رہا تھا۔ میں نے نہ صرف اُسے ایک مشورہ دیا بلکہ اسے ایک تاب ناک مستقبل کی یقین دہانی بھی کرائی۔ میری خوش کلامی اور حوصلہ افزائی سے وہ بے یقینی کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ اُس نے میرے مشورے پر سوچا اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”وہ لڑکا کون تھا اور آپ نے اسے کیا مشورہ دیا تھا؟“ میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

”وہ لڑکا ابھی صحافت کی عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے مشورہ دیا تھا ’آپ رپورٹنگ اور ایڈیٹنگ کے بجائے کالم نگاری کا شعبہ اختیار کریں۔ مجھے واضح طور پر اُس کی کام یابی نظر آ رہی تھی۔“ شاہ صاحب نے وضاحت کی اور بات جاری رکھی۔

”وہ لڑکا جاوید چودھری خود تھا۔ سچ تو یہ ہے میں اُس لڑکے کو بھول چکا تھا۔ اُس دور میں جب وہ بے یقینی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا، کم ہی لوگوں نے اُس کی اس طرح حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ میری جانب سے اُس پر اعتماد کرنے اور پیش بینی کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔“

سرفراز شاہ صاحب نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا ”چودھری ایک بہت اچھا کالم نگار اور صحافی تو ہے ہی مگر مجھے وہ ایک اور وجہ سے پسند ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہر وقت مسکراتا، مذاق کرتا، شگفتہ موڈ میں رہتا ہے۔ لوگ میرے پاس دکھ درد لے کر آتے ہیں اور رنجیدہ رہتے ہیں۔ چودھری کی زندگی میں بھی بہت مسائل ہوں گے مگر وہ اپنے دکھ، اپنی پریشانی کا کبھی اظہار نہیں کرتا، خوش رہتا ہے اور خوش رکھتا ہے اور مجھے اُس کا

یہ ہنسا کھیلنا اور ماحول کو خوش گوار بنا دینا پسند ہے۔"

جاوید نے پروفیسر رفیق احمد اختر کی دی ہوئی تسبیح کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ میں نے اُسے شروع سے یہ تسبیح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ہر وقت زیرِ لب یہ تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے، گاڑی چلاتے ہوئے، سفر کے دوران وہ یہ تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔

اُس نے مجھے بتایا کہ تسبیح سے اُس کا اضطراب قابو میں رہتا ہے، ایک سکون اور ٹھہراؤ قائم رہتا ہے اور ذکر کی برکت کے باعث اس کی مشکلات کے حل نکل آتے ہیں۔

پروفیسر صاحب سے میری اپنی ملاقات نوے کی دہائی میں ان کے گوجر خان کے گھر میں ہوا کرتی تھی، وہ اس وقت بھی خواص میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر ابھی عوامی سطح پر اتنے معروف نہ تھے۔ میں پہلی مرتبہ ایک پریشانی میں اُن کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر میری پریشانی کی جڑ کو اپنی انگلیوں کی چٹکی میں یوں پکڑ لیا تھا کہ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ یقیناً اس میں ولایت اور روحانی کشف کا واضح عمل نظر آتا تھا۔

ایک مرتبہ میں جاوید کو کراچی کی معروف روحانی شخصیت اور آصف علی زرداری کے مقرب صوفی جمیل صاحب کے شان دار بنگلے پر لے گیا۔ وہاں کا ماجرا بھی عجیب ہے۔ مجھ سا ہمہ وقت تشکیک کا شکار روسیاہ بھی چونک اٹھا تھا۔

صوفی صاحب سے جاوید نے اپنی ذاتی زندگی کا ایک مسئلہ بیان کیا۔ صوفی صاحب نے کچھ دیر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا اور دعا کی۔ پھر کہنے لگے آپ پر بندش ہے جو اللہ تعالیٰ کے کرم سے دور ہو جائے گی۔ اس کے بعد جاوید کی قمیص کی آستین تھامی اور اُسے جھٹک دیا۔ اس میں سے آلائشیں، سیپیاں اور ایک زنگ آلود آہنی تالہ باہر جھولی میں آن گرے۔

صوفی صاحب اِس سے پہلے بھی ایک مرتبہ میرے سامنے ایک دوست پر نحوست کا سایہ یوں ختم کر چکے تھے کہ اُسے قمیص اتار کر سامنے دیوار میں گڑے کیل پر ٹانگنے کا کہا تھا اور بنیان اور شلوار میں ملبوس دوست کے لیے دم درود کیا تھا۔ اس کے بعد اُسے اپنی دور لٹکی قمیص کو دیوار سے اتار کر جھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اُس نے یہ عمل کیا تو قمیص کی آستین اور دامن سے مختلف ہیئت اور جسامت کے کیل، کانٹے، مردہ مچھلیاں وغیرہ جھڑی تھیں۔

صوفی صاحب کے ہاں بارہا ایسے معاملات دیکھے جا چکے ہیں۔ یہ شعبدہ بازی ہے، نظر کا فریب یا ولائت۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میں صوفی صاحب سے متاثر ہوں لیکن جاوید نے مثبت ردِعمل کا اظہار نہیں کیا، وہ انہیں نارمل لے رہا تھا۔

ایک شام ہم کراچی میں ایک شان دار بنگلے میں مقیم رئیس بزرگ کے ہاں بھی گئے تھے جن کا گھر ساٹھ کی دہائی کا ایک شان دار اور ایسا وسیع بنگلہ تھا جو اُس دور کی فلموں میں بھی نظر نہ آتا تھا۔ بڑے لان میں چھوٹی سی ندی پر بنی پلوں کی راہ گزر، ڈرائنگ روم کے ایک جانب شیشے کی دیوار کے پیچھے ایسا ساٹھ کی دہائی سے بنا ہوا باغ جو مصنوعی درجۂ حرارت اور بارش وحدت میں قائم تھا۔ گھر کے اندر وسیع زینے اور لاتعداد کھڑکیاں۔ کمرا در کمرا۔ وہ صاحب ایوب دور میں پاکستان کے رئیس ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اب سب کاروبار چھوڑ کر گوشہ نشینی میں عبادت و ریاضت اور مجاہدے کے سلسلے پر قائم ہو چکے تھے۔ انھوں نے بھی متاثر کن روحانی فیض کا دروازہ وا کر کے اس گورکھ دھندے کا نظارہ کروایا تھا۔

ایک رات جاوید مجھے کراچی میں گلشنِ اقبال میں ایک ولی اللہ حکیم اختر صاحب کے آستانے پر لے گیا۔ وہ برگزیدہ ہستی نیم بے ہوشی کے عالم میں صاحبِ فراش تھے۔ آس پاس ایک ایسا ہجوم عاشقاں تھا جو اِن کی خدمت پر کمربستہ تھا۔ ان کے چاہنے والوں میں شمالی امریکا اور برطانیہ سمیت دنیا کے کونوں سے خاصے پڑھے لکھے ڈاکٹر اور اسکالر اُن کے دیدار، عیادت اور خدمت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بیماری کے باوجود دُور سے اُن کے پُرنور چہرے پر سکون اور ٹھہراؤ نظر آتا تھا۔ دانائے راز کہتے ہیں کہ اللہ کے مقرب کو اپنی تشہیر کی نہ تو ذاتی وجوہ کی بنیاد پر

خواہش ہوتی ہے اور نہ ہی ضرورت۔ البتہ اجتماعی مفاد کے لیے سامنے آنا ایک ناگزیر ضرورت بن سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اُن کی محفل اور قربت میں سکون محسوس ہوتا ہے۔ مزاج میں ٹھیراؤ اور دل کو قرار سا آ جاتا ہے۔

ایک روز لانگ ڈرائیو کے دوران میری اور جاوید کی ماورائی معاملات پر بات ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کے تجربات کے حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ سنایا۔

بی بی سی کی ایک ٹیم پاکستان میں درگاہوں، ولیوں، پیروں، جوگیوں اور روحانی شخصیات پر ڈاکومینٹری بنا رہی تھی۔ جاوید کا دفتر اور ادارہ ان لوگوں کی معاونت کر رہا تھا۔ وہ لوگ پاکستان کے طول و عرض پر چپہ چپہ پھر کر عکاسی اور فلم بندی کرنے کے علاوہ لوگوں کے انٹرویو کر رہے تھے۔

اسی دوران انھیں خبر ہوئی کہ جنوبی پنجاب میں ایک صاحب روحانی کرامات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ جب پوری ٹیم بہاول نگر کے قریب ایک نیم قصباتی علاقے میں جا کر اُن صاحب سے ملی تو اس کے اراکین حیران رہ گئے۔ وہ سادہ سے آدمی تھے جو صاف تہبند اور قمیص میں ملبوس تھے اور اوسط درجے کے دیہی پیشوں سے منسلک دھوبی، موچی یا حجام لگتے تھے۔ چوں کہ یہ لوگ تعارف کے ساتھ گئے تھے اِس لیے اُن صاحب نے ٹیم کو خندہ پیشانی سے بٹھایا، چائے پوچھی اور سادہ لہجے میں عمومی نوعیت کی گفت گو شروع کر دی۔ جب بات اُن کی روحانی رسائی تک پہنچی تو انھوں نے مسکرا کر خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر توقف کے بعد ان صاحب نے سب لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی زندگی سے متعلق ۵ سوال لکھ کر پرچیوں کو فرش پر اُلٹا رکھ دیں۔ سب نے اپنے خاندان، ازدواجی زندگی اور دیگر ایسے معاملات جن کی صرف انھی کو خبر تھی کاغذ کی پرچیوں پر لکھ کر اُنھیں الٹا رکھ دیا۔ اس کے بعد اُن صاحب نے ہولے ہولے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سب کو اپنی اپنی پرچی اُٹھانے کا کہا۔ جب سب نے اپنی پرچیاں اُٹھائیں تو اُن کے لکھے سوالات مثلاً بچوں کی تعداد وغیرہ کے نیچے شکستہ لکھائی میں درست جواب لکھے تھے۔ سبھی ششدر رہ گئے۔

اِن معاملات کے حوالے سے مَیں ہنوز تذبذب اور حیرت کا شکار ہوں۔ کراچی میں ایک ٹیرو کارڈ (Tarrot Card) والے صاحب ہیں۔

وہ صاحب خوب پڑھے لکھے ہیں اور دنیا کی سیاحت کر رکھی ہے۔ ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ قابلِ رشک ہے اور حلیہ بھی مغربی ہے۔ میں اُن کی تعریف سن کر ملنے گیا تو پہلی ملاقات میں حساب لگا کر بولے۔ ’’آپ کا تیس روز میں ایک معقول رقم کا انعامی بانڈ نکل آئے گا۔‘‘

میں نے زندگی مین پہلی مرتبہ دو بانڈ خریدے تھے۔ البتہ ایسے کئی قیافہ شناسوں کے بارے میں ناگفتنی سن رکھی تھی سواے بھی ایک توتے کی فال نکالنے والے صاحب سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے پوچھا ’’اور اگر انعام نہ نکلا تو؟‘‘

’’تو میں اسی شہر میں رہتا ہوں، آپ مجھے جواب دہ کر سکتے ہیں۔‘‘ انھوں نے یہ بات اِس یقین سے کہی کہ میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ خلافِ توقع میرا زندگی میں پہلا بانڈ اُن تیس دنوں میں نکل آیا۔ میں نے اپنی حیرت جاوید سے بیان کی تو اس نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ ’’وہ صاحب پہلی ملاقات میں سو فی صد درست پیش گوئی کرتے ہیں۔ البتہ بعد کی نشستیں حسبِ توقع نہیں ہوتیں۔ ان میں خاصے جھول ہوتے ہیں۔‘‘

بعدازاں بہت سے لوگ ملے جو اِن صاحب سے متعلقہ ایسے ہی تجربے سے گزر چکے تھے لیکن میں حیران ہوں جاوید نے اس شخص کے بارے میں ایسا درست انکشاف کیسے کیا جبکہ یہ اس سے ملا بھی نہیں تھا۔

میرا منطقی ذہن ان تجربات سے حیران تو ہوتا ہے پر تا حال اِن میں روحانیت کے عنصر کا اس لیے قائل نہیں ہوتا کہ سویڈن، جرمنی

اور دیگر بہت سے مغربی ممالک میں غیر مذہبی خواتین و حضرات پوری آب و تاب سے ماورائی معاملات پر دسترس رکھتے ہیں۔ جاوید دوست نہیں بناتا لیکن جس کا دوست ہوتا ہے پھر اس کا دوست ہوتا ہے۔

جاوید کے ایک دوست یورپ میں کاروبار کرتے ہیں۔ اُن کے فرانس میں ریستوران ہیں اور مواصلاتی ذرائع میں سرمایہ کاری ہے۔ وہاں کے ٹیکس قوانین سے عدم واقفیت کی وجہ سے باقاعدہ ریکارڈ نہ رکھنے کی پاداش میں ایک مرتبہ دھر لیے گئے اور انھیں جیل جانا پڑ گیا۔ اچھے خاصے خوش حال اور سلجھے ہوئے آدمی کا یوں پابندِ سلاسل ہو جانا ایک کڑی آزمائش تھی۔ جب جاوید کو خبر ملی تو وہ بے چین ہو گیا۔ دوست کی بھرپور معاونت کی، پہلی فرصت میں بیرونِ ملک اُس قید خانے جا کر دوست سے بھی ملا اور باقاعدگی سے اس کی مدد بھی کرتا رہا۔ یہ پرانی بات نہیں پس دو چار برس ادھر کا قصہ ہے۔

بعد ازاں جب وہ دوست رہا ہو کر آیا تو جاوید نے اُس کی معاونت کے لیے اپنا کمرشل پلاٹ بیچ دیا تاکہ حسبِ ضرورت رقم حاصل ہو سکے اور اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اپنے بچپن کے کئی دوستوں کو پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے وہ بے چین رہا ہے تاوقتیکہ ان کے مسائل کا عملی حل ہو گیا۔ میں نہ صرف اس کا شاہد ہوں بلکہ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ میں نے اسے پریشانی میں فون کیا تو وہ میری دل جوئی کے لیے بہ طورِ خاص اگلی فلائٹ سے اسلام آباد سے کراچی یا لاہور چلا آیا اور کسی قسم کا احسان نہ جتایا۔

وہ دِلی اور جذباتی طور پر کھلا ڈُلا خالص پنجابی آدمی ہے۔ دوستوں کا دوست اور کسی سے ناراض ہو جائے تو اظہار کر دیتا ہے۔ اس کھلے ڈُلے ہمہ تن ”میڈ اِن پاکستان“ اور ”میڈ فار پاکستان“ صاحب ادراک دانش ور اور معاملہ فہم، زیرک، خبر گر، خبر گو اور باخبر قلم کار کی زندگی ایک ذائقہ دار رنگین ناول اور تہ در تہ فلم کا سامان رکھتی ہے۔ اُس نے اپنی زندگی کی کہانی چھوٹی چھوٹی منی ایچر ٹکڑیوں میں مجھے سنائی۔ کبھی کافی پیتے ہوئے، کبھی طویل سیر کرتے ہوئے، کبھی کھانے پر، کبھی اپنی اسٹڈی میں، کبھی میری قیام گاہ پر، کبھی فون پر تو کبھی رُو بہ رُو، سو اس کی کہانی کے رنگ کو بہ کو پھیلے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے سوچا کہ اگر کام یاب تخلیقی لوگوں سے اُن کی زندگی، بچپن کی پہلی یاد کا پوچھا جائے اور اسے کتابی شکل دے جائے تو ایک دِل چسپ اور حوالہ جاتی کام ہو جائے گا۔ بچپن کے ابتدائی نقش انسانی فطرت اور رجحان کے عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ تحت الشعور کی بنیاد بنتے ہیں۔

اسلام آباد کی کوہسار مارکیٹ میں واقع کیفے کی بالائی منزل کے دیوار گیر شیشے سے سردیوں کی دوپہر کی گھنے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی دھوپ کو دیکھتے جاوید نے مجھے اپنی زندگی کی کہانی کی کئی بکھری ٹکڑیاں سنائیں۔ اُس کی زندگی کی سب سے پہلی یاد اُس وقت کی ہے جب وہ سات آٹھ ماہ کا تھا ”مجھے والد نے اُٹھایا ہوا ہے، والدہ نے بڑے سے کڑاہے میں پانی اور سوڈا ڈال کر اُسے آگ پر گرم ہونے رکھا ہوا ہے، کڑاہے میں کھیس ڈالا ہوا ہے۔ ہم گاؤں کے ڈیرے پر ہیں۔ والد صاحب نے تہبند باندھا ہوا ہے اور جسم کا بالائی حصہ ننگا ہے۔“

پس یہ حصہ فلیش بیک کی جھلک میں اُسے یاد ہے، اس کے بعد نو دس مہینے کی عمر کی ایک یاد ہے۔ ”پانی کا کنواں ہے، رہٹ میں ٹھرکی لگی ہوئی ہے، اس کی جانب ایک کتے کا بچہ جا رہا ہے، والدہ شور مچا دیتی ہیں تاکہ کنویں کے گرد گھومتے بیلوں کو روک دیا جائے اور مجھے بچا لیا جائے۔ میں تب رینگتا تھا۔“

اپنے والد کے گھرانے کی تفصیلات سناتے ہوئے جاوید نے بتایا کہ اُس کے دادا شاہ محمد عرف شاہو، ساڑھے چھے فٹ کے گرانڈیل مرد تھے جن سے لالہ موسیٰ کے بازو میں واقع شاہ سرمست گاؤں کے باسی مرعوب رہتے تھے۔ اُس دور میں شہ زوری عزت کی علامت تھی۔ ان کے سے دبنگ آدمی نے اپنا ڈیرہ خوب آباد کر رکھا تھا۔

اُن کے پانچ بچے تھے، جاوید کے والد درمیان میں تھے۔ دادا کی وفات کے بعد خاندان پر زوال آ گیا۔ اُن کے جاں نشینوں میں

کوئی بھی ان کی جگہ نہ سنبھال پایا۔ تب کھاریاں چھاؤنی بن رہی تھی، جاوید کے والد نے اُسے کوئلہ سپلائی کر کے اپنے پیر مضبوط کیے۔ تبھی انھوں نے لالہ موسیٰ میں آڑھت کے کام کو جمانا شروع کیا۔ والد صاحب بہن بھائیوں میں خاصے پڑھے لکھے شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے دو جماعتیں پڑھ رکھی تھیں۔ دیگر چچا بہ مشکل سو تک گنتی جانتے تھے۔

خاندان میں تعلیم کو وقت کا ضیاع سمجھا جاتا تھا جس کا واہی بیجی (کھیتی باڑی) میں کوئی کردار نہ تھا۔

والد صاحب ترقی پسند ذہن رکھتے تھے سو کاروبار میں آ گئے۔ انھوں نے بھائیوں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی مگر یہ معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بالآخر باقی بھائی شہر سے واپس گاؤں لوٹ آئے۔ لوگ دیہات سے شہر کا رخ کرتے ہیں۔

”وہاں اُلٹی گنگا بہہ رہی تھی۔“ جاوید نے گرم کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے سنایا۔ وہ بے توجہی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بارش تھوڑی دیر کے لیے تھمی تھی مگر ہوا میں نمی موجود تھی۔ میرے والد کو بھی اس لیے اسکول سے اُٹھا لیا گیا تھا کہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے۔“

جاوید کے گاؤں میں لڑائی، مار کٹائی کو شیوۂ مردانگی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے والد خالص دیہی ماحول میں پلے تھے جہاں اُن کی ماں (جاوید کی دادی) سرگی ویلے (صبح سویرے) سب سے پہلے اُٹھ کر کچے اُپلوں اور بکھری خشک ٹہنیوں کو آگ دِکھا کر پھونکیں مار کر چولھا جلاتیں اور دیسی مکھن میں پراٹھے اور ساتھ میں لسی کا ناشتا تیار کرنا شروع کرتیں تو اُن کے بھی بچے فرداً فرداً اُٹھ کر آنکھیں ملتے چولھے کے گرد بیٹھنا شروع کر دیتے۔ بعد ازاں سبھی زندگی کی مصروفیات میں گم ہو جاتے جن میں گائے بھینسوں کے دودھ دوہنے سے لے کر لکن میٹی کھیلنے جیسے کام ہوتے تھے۔ جاوید کے والد کا بچپن مولیاں شلجم توڑ کر کھاتے گزرا تھا۔ وہ کھیتوں کو سانجھی ملکیت سمجھتے ہوئے ان میں سے من پسند سبزیاں اور پھل کھا لینا معمول کی بات سمجھتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ بہت سے کھیتوں کے مالک اُن کے نظریات سے متفق نہ تھے سو وہ جب بھی اُنھیں اپنے ہاں سے گاجریں توڑتے دیکھتے تو دبے پاؤں والد کی جانب بڑھتے۔ والد کی کاروباری حس کی طرح چھٹی حس بھی خاصی تیز رہی ہے، چناں چہ وہ بقائے باہمی کے اصولوں کے عین مطابق گاجر مولیاں ہاتھوں میں تھامے بروقت تیزی سے وہاں سے یوں رخصت ہوتے کہ مالکان اُن کی دھول کو دیکھتے رہ جاتے۔

رات کو سبزی ترکاری کے ساتھ روٹیوں کا کھانا ہوتا تھا۔ اُس دور میں ابھی قدرتی کھاد استعمال ہوتی تھی چناں چہ سبزیاں طاقت ور، بھرپور اور خوش ذائقہ ہوتی تھیں۔ طاقت کے لیے دودھ میں کچے انڈے ڈال کر بھی لیے جاتے تھے۔ بعض صورتوں میں انڈہ توڑ کر موقع پر پی لیا جاتا۔

دیہی پیشے بھی چند ایک ہی تھے۔ عمومی طور پر کم تر ذات کے غریب لوگ ان سے وابستہ ہوتے تھے۔ ان پیشوں میں نائی، موچی، جولاہا، چوہڑا، لوہار، ترکھان، مولوی اور رنگ ساز بھی شامل ہوتے تھے۔

البتہ مولوی خاصا باعزت پیشہ تھا جو اہلِ دیہہ کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا، جنازے پڑھاتا، نکاح پڑھاتا اور قرآن پاک کا ختم کرواتا۔ اُسے گاؤں کے لوگ چندہ کر کے کھانے پینے کو مناسب انتظام کر دیتے۔ رہائش کے لیے مسجد کے ساتھ حجرہ ہوتا۔

ایک مرتبہ میں نے افسانہ نگار منشا یاد سے پوچھا تھا کہ ازمنۂ رفتہ کی سادہ زندگی کی کون سی بات اُنھیں بہت پسند تھی تو انھوں نے کئی چیزوں کے علاوہ کہا تھا ”اُس زمانے میں لوگ بور نہیں ہوتے تھے۔ نہ تو ہمارے ہاں یہ لفظ ایجاد ہوا تھا اور نہ ہی لوگوں کو اس کا مفہوم معلوم تھا۔ چناں چہ لوگوں کے بور ہونے کا تصور ہی نہیں تھا۔“

جب میں نے جاوید سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ بولا ”ہمارے گاؤں میں ہر مصیبت کو من جانب اللہ سمجھا جاتا تھا اور اسے زندگی کا ”صدقہ“ سمجھ کر قبول کیا جاتا تھا۔ زراعت، کھیتی باڑی، آب پاشی کے لیے بیلوں کی جوڑی استعمال میں آتی تھی، گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی

وجہ سے لوگ سرِ شام سو جاتے، اکثر لوگ دھوتی میں ملبوس ہوتے، نئی جوتیاں پیروں کے بجائے بغل میں ہوتیں تاکہ اُن پر مٹی نہ لگ جائے، بیماریوں کا علاج مولوی صاحب کے دم درود پر منحصر ہوتا، شہر میں اسپتال جانے والے کی واپسی کی توقع نہ ہوتی اور پورا گاؤں مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں میں واقعی ''قناعت'' تھی۔ یہ کوئی ماضی کی رومانوی تخیلاتی بات نہیں۔ لوگ صابر بھی تھے اور شاکر بھی۔ اب وہاں اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے پر لوگوں کے ہونٹوں پر ناشکری بھی ہے۔ اب میرا گاؤں ایک غریب گاؤں ہے۔ لوگوں کے دل غریب ہو چکے ہیں۔''

جب گاؤں کے دیگر لڑکے بالے کاموں کے لیے بڑوں کے ساتھ نکل جاتے تو وہ پیچھے گھر کی خواتین کے ساتھ اکیلا رہ جاتا۔ گاؤں میں خواتین ہوتیں، ڈھور ڈنگر ہوتے یا پھر آوارہ پھرتے کُتے۔ شام تک یہی کیفیت رہتی، تاوقتیکہ مرد اور لڑکے بالے زمینوں اور کاموں سے واپس آجاتے۔ جاوید اپنی والدہ، چاچیوں، تائیوں، ممانیوں، پھوپھیوں کا پلو پکڑے چلتا ہوا اتنا بڑا ہو گیا کہ اسکول جا سکے۔ البتہ اِس دوران گاؤں کی گلیوں میں اُترنے والا سفید سناٹا اُس کے اندر حلول کر گیا۔ اس تنہائی کی وجہ سے وہ آج بھی تنہائی میں زیادہ آسودگی محسوس کرتا ہے۔

جاوید کو اسکول داخل کروا دیا گیا۔ دیہی معاشرت کو سمجھنے والے خوب جانتے ہیں کہ وہاں چودھری ایک باعزت سابق ولاحقہ ہے۔ یہ جس کے نام کے ساتھ ہو وہ عامیوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ ایک روز مستنصر حسین تارڑ صاحب مجھ سے کہنے لگے ''آج کل انگریزی میں فکشن لکھنے والے ہماری علاقائی ثقافت سے اتنے ناواقف ہیں کہ ایک مصنف نے اپنی کہانی میں مرکزی کردار مصلی کے نام کے ساتھ 'چودھری کا سابقہ لگایا ہوا تھا۔''

بہرحال اسکول میں جاوید کو چودھریوں کا بیٹا ہونے کی وجہ سے دیگر طلبا پر ایک برتری حاصل تھی۔ اسکول ایک برگد کے نیچے ہونے والی تدریس تھی۔ اُس دور کے بیش تر اسکول اور مدرسے کے طالب علم تعلیم کے بوجھ کی بہ نسبت ماسٹر کی مار کے ڈر سے بھاگ جاتے تھے۔ وہ ترکھان، راج مزدور، موچی بن جانا گوارہ کر لیتے تھے مگر ''پڑھا لکھا'' نہیں۔

ایک وقت ایسا آیا کہ جاوید کے اسکول میں وہ، اُس کا اُستاد، اُستاد کی چھڑی اور برگد کا درخت ہی رہ گئے۔

جاوید اسکول کھوتی پر بیٹھ کر جاتا تھا۔ کھوتی کو اُن کا ملازم نورا مصلی ''اسٹارٹ'' کرتا تھا اور اس کا کان پکڑ کے چلاتا ہوا اسکول لے جاتا تھا۔ جاوید، نالیوں پر سے ٹاپتی، کیچڑ سے بچتی لہراتی کھوتی پر بیٹھا اسکول پہنچ جاتا تھا۔ گاؤں میں جاوید کے دادا کے گاؤں میں ''ڈیرے'' کی ایک روایت تھی۔ جو اُس کے سامنے سے گزرتا اُسے بہ وجہ احترام سواری سے اُتر کر پیدل گزرنا پڑتا۔ چناں چہ وہاں کے راہ گیر سائکلوں، کھوتیوں، خچروں سے اُتر کر ڈیرے کے سامنے سے گزرتے۔ ورنہ اُنھیں موقعہ ہی پر کان پکڑوا دیے جاتے۔

''ہمارے خاندان میں مذہب کو عورتوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ مذہب کو فقط دم درود کے لیے محدود کر دیا گیا تھا۔'' ہمارے پورے خاندان میں صرف تین خواتین نے ناظرہ قرآن مجید پڑھا تھا' مرد اس نعمت سے محروم تھے' جاوید نے کافی کے جھاگ کو پھونک مارتے ہوئے کہا۔

جاوید کے والد کاروباری ذہن رکھتے تھے سو اُن کے بھائی اُنھیں آڑھتی کہتے تھے۔ آڑھتی خاصے خوش حال لوگ ہوتے تھے جو زمیں داروں سے اناج خرید کر آگے بیچ دیتے تھے۔ البتہ ایسے لوگ صلح جُو ہونے کی وجہ سے کم تر اور بزدل سمجھے جاتے تھے۔

والد صاحب روز روز کے طعنوں سے تنگ آ کر اور کاروباری سمجھ بوجھ کو استعمال کرنے کے لیے قریبی شہر لالہ موسیٰ آ گئے۔

گاؤں میں تو چودھریوں کا بچہ ہونے کی وجہ سے جاوید کا لحاظ کیا جاتا تھا مگر یہاں اُس کی جسمانی کم زوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر کے اسکول کے شرارتی اور خرانٹ لڑکے اُسے خوب پیٹتے۔ وہ بُری طرح روتا اور ضِد کرتا کہ اسے اسکول نہیں جانا۔ اُسے والدہ سمجھا کر پیار سے ترلے مِنّت کر کے اسکول بھیج دیتیں۔

جاوید نے کتابوں سے اپنی محبت کی کہانی سنائی۔

”اسی دوران میرے ہاتھ میں الٰہ دین کا چراغ لگ گیا“ جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ہجے کر کے لفظ جوڑ کر جملہ پڑھ لیتا تھا، تیسری جماعت میں کہانیوں کی ایک کتاب میرے ہاتھ لگ گئی۔ وہ کتاب میرے لیے الٰہ دین کا چراغ تھی۔ میرے ہم جماعت تب تک پڑھ نہ سکتے تھے سو انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اُنھیں کہانی سناؤں۔ میں نے کہانی سنائی تو پہلی مرتبہ وہ مجھ سے مرعوب ہوئے۔ میرے ہم جماعتوں کو روز ایک نئی کہانی چاہیے تھی۔ اب میرے لیے روز کہانی کی ایک نئی کتاب خریدنا مسئلہ بن گیا۔ کبھی ماں جی تو کبھی ابا سے پیسے مانگتا، کبھی گھر کے ٹین ڈبے بیچتا تو کبھی کچھ۔ یوں میں روز ایک چھوٹی سی کتاب خرید لیتا۔ ایک روز میں کتاب گھر بھول آیا۔ لڑکے میری چھینٹی لگانے کی تیاری کرنے لگے۔ اُن کی مار سے بچنے کے لیے میں نے پچھلی کہانیوں کے کرداروں کو ملا کر ایک نئی کہانی اپنے دماغ میں تخلیق کی اور اُنھیں سنا دی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے انھیں روزانہ ایک نئی کہانی بُن کر سنانی شروع کر دی۔ اب میرے بستے میں درسی کتابوں کے ساتھ کہانیوں کی کتابیں ہوتیں۔“

اُس کی تاریخِ پیدائش کا معاملہ بھی دل چسپ ہے۔ جب اُس کے اسکول کے پرائمری کے داخلے جانے تھے تو اُس کی جماعت کے استاد نے ہر بچے کی عمر کے حساب کرنے کے تردّد سے بچنے کے لیے کلاس کے تمام بچوں کی تاریخِ پیدائش یکم جنوری 1968 لکھ دی۔ چناں چہ اُس کے تمام ہم جماعتوں کی تاریخِ پیدائش یکم جنوری 1968 ہے۔ یہی تاریخِ پیدائش آج تک اُس کے کالر میں لگی ہوئی ہے۔

جاوید کی تنہائی نے اُسے تین دوست دیے۔ پہلا مشاہدہ، دوسرا مطالعہ اور تیسری یادداشت۔ وہ ہر بات کو یوں پڑھتا اور دیکھتا جیسے پہلی مرتبہ پڑھ اور دیکھ رہا ہو، چناں چہ یادداشت تیز کرنے کی مشق اتنی بڑھ گئی کہ غیر معمولی حافظہ اُس کے دماغ کا لازمی جزو بن گیا۔

بابائے جدید نفسیات کارل یونگ نے کہا تھا ”تمھاری نظر تبھی صاف دیکھ سکتی ہے جب تم اپنے اندر دل میں جھانکو۔ جو باہر دیکھتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں جو اندر دیکھتے ہیں جاگتے ہیں۔“ جاوید نے کافی کا مگ ختم کیا۔ شفاف شیشے کی دیوار گیر کھڑکی سے باہر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ بوندوں کی دیواریں گھنے درختوں، فٹ پاتھ اور سڑک پر آ کر ٹوٹ رہی تھیں۔

اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”میرے والد کو اخبار کا بہت شوق تھا۔ میں انھیں خبریں سناتا تھا۔ وہ حقہ گڑگڑاتے مزے سے خبریں سنتے رہتے تھے۔ ان کے پاس حقہ پینے کے شوقین لوگوں کی آمد جاری رہتی جو تمباکو بھرا چلم گڑگڑاتے خبریں سنتے اُن پر تبصرے کرتے رہتے۔ یوں میری اخبار کے مطالعے اور اسے سنانے کی خوب مشق ہوتی رہی۔“

ایک مرتبہ میں اسلام آباد میں منشا یاد کی رہائش گاہ پر گیا تو باتوں باتوں میں جاوید کا ذکر آ گیا۔ منشا صاحب کہنے لگے ”جاوید چودھری ہمارے قبیلے کے آدمی ہے، فکشن نگار، افسانہ نگار ہے۔“

جب میں نے یہ بات جاوید کو بتائی تو کہنے لگا ”بہت سے لوگوں نے مجھے افسانہ نویسی کا مشورہ دیا ہے۔ میں نے دو وجوہات کی بنا پر اب تک اس سے اجتناب کیا ہوا ہے۔ ایک تو میں نے افسانہ نویسوں کو فاقے کرتے دیکھا ہے۔ دوسرے جب میں طالبِ علم تھا تو میرے مطالعے اور مزاج کو دیکھتے ہوئے ساتھی طالب علم طنزاً مجھے ”شاعر ٹائپ“، ”ڈاکٹر صاحب“ اور ”بغلول“ کہتے تھے۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مطالعہ کرنے یا شاعری اور افسانہ نگاری کرنے والے لوگ مذاق کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم بنیادی سطح پر علم دشمن لوگ ہیں، ہم علم کے شوقین لوگوں کا اُن کے سامنے اور پیٹھ پیچھے مذاق اڑاتے ہیں۔ یوں ہم اپنے احساسِ کم تری اور نالائقی پر پردہ ڈالتے ہیں۔“

اس میں جستجو اور نامعلوم کی حقیقت جاننے کی بے پناہ خواہش ہے جو اس کی تحریروں میں بھی موضوعاتی تنوع لے کر آتی ہے۔ میرے ساتھ دوستی کے تعلق کے دوران جب بھی کسی ایسی معلومات کا تذکرہ ہوا جس سے وہ ناواقف تھا تو اُس نے نہ صرف اپنی لاعلمی کا

اعتراف کیا بلکہ اُس موضوع کے بارے میں اشتیاق کا اظہار بھی کیا۔ ہمارے عمومی معاشرتی رویے میں کسی نئی بات کے بارے میں تشکیک، اپنی معلومات اور رائے کو حتمی سمجھنے پر اصرار اور اُس کے حوالے سے لاعلمی یا کم علمی کو باعثِ خفت سمجھنے کا رجحان عام ہے جبکہ اس کے برعکس اعلیٰ علمی و تہذیبی معاشرت میں اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ عاجزی اور یہ اعتراف ''میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، یہ حتمی نہیں'' عام چلن ہے۔

زبان کے حوالے سے بھی وہ شکیل عادل زادہ اور دوسرے ادیبوں سے رجوع کرتا رہتا ہے۔

زبان کے حوالے سے یہاں دو واقعات کا تذکرہ برمحل ہے۔ ایک مرتبہ میں ایک محفل میں بیٹھا تھا، وہاں ایک اردو دان اور ایک انگریزی دان دوست تشریف فرما تھے۔ اردو دان کہنے لگے ''ہمارے لوگ بھی کتنی غلط اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ درست ترکیب ''عاقبت نااندیش'' ہے جب کہ لکھتے ہیں ''ناعاقبت اندیش''۔'' اس پر انگریزی دان بھنا اٹھے اور بولے ''ناعاقبت اندیش'' ہی درست ہے۔ اپنی رائے پر وہ اس ضد سے جمے رہے کہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ وہاں سے اٹھ گئے۔

ایسے میں اگر وہ لغت سے رجوع کر لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ درست اصطلاح عاقبت نااندیش ہی ہے۔ شکیل صاحب تو دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں اور کسی کو آزمائش میں ڈالنے کی بجائے سادگی سے دونوں اصطلاحیں سامنے رکھ دیتے ہیں اور صلاح لیتے ہیں کہ کیا درست ہے۔ یوں مخاطب کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی اور اکثر و بیشتر وہ خود لغت سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ شکیل صاحب کے ایک شاگرد نے ''جنگ'' اخبار راولپنڈی کے ایک صاحب کو فون کر کے مودبانہ گزارش کی کہ ''بدامنی'' غلط العام اصطلاح ہے۔ یعنی بر امن کوئی ترکیب نہیں۔ پر امن ہونا چاہیے یا پھر بے امن۔ اس پر وہ صاحب جھلا اُٹھے اور کہنے لگے ''آپ کی بات دبستانِ دہلی یا دبستانِ لکھنؤ میں تو درست ہوگی، دبستانِ راولپنڈی میں بدامنی ہی درست ہے۔'' لیکن جاوید اس معاملے میں لچک دار ہے، آپ اس کی کسی غلطی کی نشان دہی کریں، یہ نہ صرف آپ سے معذرت کرے گا بلکہ شکریہ بھی ادا کرے گا۔

ابھی میرا اور جاوید کا تعلق ابتدائی مراحل میں تھا۔ ایک روز رات کے کھانے پر ہم بلیو ایریا کے ایک معروف ریستوران میں گئے۔ جاوید کالم نگار تو تھا مگر معروف عوامی چہرہ نہیں۔ سو ہم بغیر کسی مداخلت کے شاہراہ کے رخ پر واقع کھڑکی کے ساتھ والی میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر کر کے ہم گپ شپ کرنے لگے۔ اتنے میں اُس نے اپنی جیب سے ایک موٹا سا پین نکالا اُس کی ٹوپی کھولی تو اندر سے ایک سرنج برآمد ہوئی۔ میں ابھی اُسے حیرت اور تشویش سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے وہ سرنج اپنی قمیص اونچی کر کے پیٹ میں پیوست کر دی۔ میرے لیے یہ منظر پریشان کن تھا۔ اُس نے میری پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔

''اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیں۔ مجھے شوگر ہے اور ہر کھانے سے پہلے انسولین کا انجکشن لگانا پڑتا ہے۔''

بعدازاں کھانا کھاتے ہوئے اُس نے بتایا کہ وہ بچپن سے کم زور تھا۔ اُس کا جسم منحنی اور لاغر تھا اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ایک مرتبہ اُس نے سنا کہ ایک حکیم کے پاس ایسے نسخے ہیں جن کے کھانے سے کم زور سے کم زور لڑکے بھی اچھے خاصے کسرتی جسم کے مالک بن جاتے ہیں۔ چناں چہ وہ حکیم کے پاس گیا۔ اُس نے اسے چند خوراکیں دے دیں۔ وہ خوراکیں کھانے کے بعد اس کے جسم میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہو گئیں۔ اُس کا جسم بھر گیا، چھاتی خوب توانا ہو گئی اور جسم میں گویاں مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ وہ بے اندازہ خوش ہو گیا۔ چند روز بعد اُس کا جسم ڈھلکنے لگا۔ تھکاوٹ کا احساس رہنے لگا۔ جب اُس نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے پریشان کن انکشاف کیا۔ جاوید کو عین نوجوانی میں بلڈ شوگر ہو چکی تھی۔ حکیم کے نسخوں میں steroids تھے جنھوں نے جسمانی تخریب کا آغاز کر دیا تھا۔ اُس کے بعد سے انسولین کا انجکشن اس کی زندگی کا مسلسل حصہ بن گیا۔

ہمارے تعلق میں ایسا کئی مرتبہ ہوا ہے کہ بروقت کھانا نہ ملنے پر اُس پر نقاہت طاری ہونے لگتی ہے اور وہ بے دم ہو جاتا ہے۔ اُسے مخصوص وقفے کے بعد مناسب خوراک کی ضرورت رہتی ہے۔

عمومی طور پر خطرناک حد تک بڑھی شوگر کے مریضوں کے مزاج میں مدوجزر عام بات ہے۔ وہ پچھلے بیس برس سے شوگر کے مرض کو اپنے خون میں لیے پھر رہا ہے۔ اس کے باوجود عمومی طور پر خوش گوار موڈ میں کھلکھلاتا رہتا ہے۔ وہ شوگر کا بھی ایک آئیڈیل مریض ہے، ایک ایسا مریض جس نے شوگر کو کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔

بعدازاں میں اور جاوید بے شمار مرتبہ کھانے کو ریستورانوں میں گئے ہیں۔ وہ کھانے کا زیادہ شوقین نہیں۔ جب کہ میرا ان دوستوں میں اُٹھنا بیٹھنا رہا ہے جو عمدہ پکوانوں کے اہم مقامات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بھلے وہ لاہور میں نسبت روڈ کا ہریسہ، نیلا گنبد کے چنے، چوبرُجی پر خان بابا کا ختہ، دیسی گھی میں بھنا گوشت، ماڈل ٹاؤن میں بھیے کے کباب، بزنس روڈ کراچی کی نہاری، دل بہار ہوٹل ہاتھی دروازہ راول پنڈی کی شب دیگ اور دیگر کشمیری کھانا، حیدرآباد میں مچھلی کا حلوہ، ڈیرہ اسماعیل خان میں ''صحبت'' کا پکوان، گوجرانوالہ میں جی ٹی روڈ کے مٹن بوٹی کباب، سیال کوٹ میں امام صاحب کے نزدیک دیسی مکھن میں توے پر بنی چانپیں، ٹھٹھہ کا ''یخنی گوشت''، کوئٹہ کا دم پخت اور بے شمار لذیذ پکوان۔ ایک روز کھانا کھاتے ہوئے اُس نے خود ہی اعتراف کیا۔

''ابا جی تازہ خوراک کے حق میں اور فریج کے خلاف تھے۔ وہ بڑی مقدار میں خوراک لے آتے تھے۔ اب گھر میں اُسے محفوظ کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ اس لیے ہمیں وہ ساری خوراک ایک دن میں ختم کرنا ہوتی تھی۔ جب مقدار میں خوراک گھر آتی تو اسے دیکھتے ہی ہمارے رنگ اڑ جاتے۔ اگر کھانا مرضی سے کھایا جائے تو لذیذ لگتا ہے، زبردستی کا عمدہ کھانا بھی عذاب ہوتا ہے۔ اسی لیے میں کھانا ضرورت کے تحت کھاتا ہوں۔ مجھے بھوک کم ہی لگتی ہے۔''

جاوید نے توقف کیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''ابا جی ہماری بہتری کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ لالہ موسیٰ میں کم گھروں میں ٹی وی موجود تھا۔ ہمارا گھرانا بھی ان خوش نصیب گھروں میں شامل تھا جہاں ٹی وی تھا۔ گھر میں ٹیلی فون بھی تھا۔ اُس کا نمبر 18 تھا۔ ابا جی نے گھر میں لوہے کے چھ گلاس رکھے ہوئے تھے۔ کانچ کے گلاس تو تھے نہیں جو ٹوٹتے اور نئے گلاس آتے۔ سو ہم وہی چھ گلاس استعمال کرتے رہے۔ ہماری صحت کے لیے ہمیں ٹھنڈے پانی سے نہلایا جاتا، ہرڑیں کھلائی جاتیں، مالش کروائی جاتی، سارا لڑکپن آملے کا سالن کھاتے گزر گیا۔ دودھ میں دیسی گھی ڈال کر پلایا جاتا جو جیسے جیسے ہم اوپر سے پیتے جاتے نیچے سے نکلتا جاتا۔ تازہ خالص مکھن رُوکھا کھلا دیا جاتا۔ بیماری میں حکیم سے رجوع کیا جاتا۔''

''کس طرح کی بیماری عام تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جسمانی کم زوری تو تھی ہی، ایک مرتبہ کالی کھانسی ہوگئی۔ والد صاحب حکیم کے پاس لے گئے۔ اُس نے گدھی کا دودھ پلایا۔ اس کا ذائقہ اب بھی منہ میں موجود ہے۔'' جاوید نے بُرا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اُس دور کا کوئی اور واقعہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ایک واقعہ ہے۔ اس سے پہلے اپنی دادی کا ذکر۔ میری دادی دیگر خاندان سے مختلف تھیں۔ وہ نیک، خوب صورت، حلیم الطبع، دریا دل اور مخلص بزرگ تھیں۔ ہر وقت نماز تسبیح میں مشغول رہتیں۔ اُن کی کبھی تہجد قضا نہ ہوئی تھی۔ آخر میں بینائی چلی گئی۔ تسبیح اتنی پڑھتی تھیں کہ نظر چلی جانے کے بعد جہاں سے اُسے چھوڑا ہوتا، عین اُسی دانے سے شروع کرتی تھیں۔ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتی تھیں۔ میں بھی ان کی دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔ وہ مجھے ہاتھ اٹھا کر دل سے دعائیں دیتی تھیں۔ عبادت کے دوران بھی میں اُن کی دعاؤں کا مرکز رہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اُنھی کی دعائیں ہیں جو آج بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور مجھے نامساعد حالات سے نکال کر کامیابی پر گام زن کر دیتی ہیں۔ جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے تو میں نے اِس کا ذکر کالموں میں بھی کیا ہے۔''

جاوید نے دل چسپی سے واقعہ سنانا شروع کیا۔

''شہر میں ہمارے گھر کے سامنے سڑک پر ایک بابا جی بیٹھتے تھے۔ وہ فقیر تھے، جذب کے عالم میں رہتے تھے۔ میری والدہ انھیں کھانا بھیج دیا کرتی تھیں۔ یوں ہمارے گھرانے کا اُن سے ایک تعلق قائم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ گھٹائیں خوب اُمنڈ کر آئیں اور چھاجوں مینہ برسا۔ جب بارش کچھ تھمی، درختوں کے پتوں، مکانوں کے پرنالوں سے پانی دھاروں اور قطروں کی صورت بہہ اور ٹپک رہا تھا کہ میں گلی میں نکلا۔ اُس روز نہ جانے اُن فقیر کے جی میں کیا سمائی کہ انھوں نے مجھے پاس بٹھا لیا اور سامنے ایک دائرہ کھینچا۔ دائرے میں ہماری سڑک نظر آنے لگی۔ سڑک کا ماضی زندہ ہو گیا۔ وہ دور سامنے آ گیا جب ابھی بیل گاڑیاں چلتی تھیں اور کنویں سے پانی کے نکالنے کے لیے جانور استعمال ہوتے تھے۔ میں ابھی عالمِ حیرت میں تھا کہ انھوں نے ایک اور دائرہ کھینچا۔ اس دائرے میں مستقبل نظر آنے لگا۔ ابھی میں مستقبل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انھوں نے اپنے انگوٹھے سے میری گردن کی ایک رگ یوں دبائی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ اُس روز اُن فقیر کے اِس طرح میری گردن دبانے سے یوں لگا جیسے میری روح کی ایک کھڑکی کھل گئی ہو۔''

جاوید نے کھوئے لہجے میں کہا۔

''اُس دن کے بعد وہ فقیر بزرگ وہاں نظر نہیں آئے۔ نہ جانے کہاں چلے گئے۔''

''کہیں انھوں نے سب تخیلاتی نہ دکھایا ہو؟'' میرے لہجے میں تذبذب تھا۔

''نہیں۔ اُس دائرے میں جو نظر آیا وہ واقعی حقیقی تھا۔ میرا آج بھی اس پر پورا یقین ہے۔''

جاوید کا دفتر مارگلہ پہاڑی سلسلے کے قدموں میں سرسبز قطعے پر مارگلہ روڈ اور جناح سپر سے آنے والی شاہراہ کے سنگم پر واقع ہے۔ وہاں کیا کیا رنگین کرداروں اور حیران کن واقعات سے شناسائی ہوئی ہے۔

ایک روز میں اُسے ملنے پہنچا تو وہاں ایک سمٹی سمٹائی خوب صورت لڑکی سامنے بیٹھی تھی۔ جاوید سراپا ہمدردی بنا ہوا تھا۔ اُس نے لڑکی کو تسلی بخش الفاظ کہے، لڑکی نے مسکرا کر مجھے سلام کیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

بعد میں جاوید نے مجھے اُس لڑکی کی چونکا دینے والی حیران کن اور عبرت انگیز بپتا سُنائی۔

وہ پنڈی کے ایک انتہائی متمول اور جانے پہچانے گھرانے کی لڑکی تھی۔ گھر والے پڑھے لکھے اور روشن خیال تھے۔ لڑکی کا باپ کاروباری دنیا میں جانا پہچانا نام تھا۔ وہ اُس کی اکلوتی بیٹی تھی اور ایک بہترین کالج میں انگریزی ادب کی طالبہ تھی۔ باپ کو شراب کی لت تھی۔ بات اگر یہاں تک رہتی تو بھی قابلِ برداشت تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ باپ شراب پی کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا تھا اور اسے اپنے پرائے کی تمیز ختم ہو جاتی تھی۔ ایک رات وہ نشے میں دُھت گھر آیا تو اپنی خواب گاہ کے بجائے بیٹی کے کمرے کا رُخ کر لیا۔ وہاں شرفِ انسانیت کو پیروں میں رگیدا گیا۔ بیٹی باپ کی حرکت سے شدید خوف زدہ ہو گئی۔ چند روز گزرے تو باپ نے وہی مکروہ حرکت پھر دہرائی۔ لڑکی پہلے جذباتی سانحے کے پلید اثرات میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی کہ اس عمل دُہرائے جانے پر نفسیاتی طور پر تباہ ہو گئی۔ اب تک ماں اس وحشیانہ فعل سے ناواقف تھی۔ جب اُسے اِس کا عِلم ہوا تو وہ قریباً ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ گھر پر ہر سُو نحوست کے سائے گہرے ہو گئے۔ اِس دوران کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے باپ عارضۂ جگر میں مبتلا ہو کر آناً فاناً جہنم رسید ہو گیا۔

''بہت دُکھی داستان تھی'' میں نے گہرے دکھ سے کہا تو جاوید بولا۔

''ایک معاملہ اِس کے بعد آتا ہے۔ لڑکی نفسیاتی معالج سے علاج کرواتی رہی ہے۔ اب اُس کی شادی طے ہو گئی ہے۔ لڑکا خاصا معقول اور خاندانی ہے۔ لیکن لڑکی کے دماغ پر کچھ ایسا اثر ہو گیا ہے کہ وہ کسی مرد کے قریب آنے پر خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اب وہ معالج اس پہلو کا بھی علاج کر رہا ہے تاکہ بچی معمول کی زندگی گزار سکے۔''

''اِنسانی زندگی کے بعد کیا بھیانک روپ ہیں۔'' میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ دفتر میں سوگوار خاموشی دھواں دھواں دم گھونٹنے لگی۔

’’جب مجھے پہلی مرتبہ اِس واقعے کا پتا چلا تو میں پوری رات سو نہیں سکا تھا۔‘‘

جاوید کی آواز گہرے دکھ میں بھیگی ہوئی تھی۔

ایسا کئی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی ایسے واقعے پر جس کا اُس کی ذات سے براہِ راست تعلق نہ بھی ہو۔ وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے اور دن کو بے چین رہتا ہے۔ اِن میں ملکی سطح کی خبریں بھی آ جاتی ہیں بھلے وہ لاہور میں ایک درندہ صفت آدمی کا چھوٹے بچوں کو تیزاب کے ڈرموں میں گھول دینا ہو یا ایک بیوی کا اسلام آباد میں اپنے شوہر اور بچوں کو ناشتے کی میز پر قتل کر دینا ہو، وہ دنوں اُداس رہتا ہے۔

ایک شام میں اُس سے فون پر بات کر رہا تھا کہ اُس کے فون میں یک دم ایک دھماکے کی ہول ناک آواز سنائی دی۔ وہ سپر مارکیٹ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ سڑک پار اطالوی ریسٹورانٹ میں بم دھماکا ہو گیا تھا۔ وہ فون ہاتھ میں تھامے مقامِ حادثہ کی جانب لپکا۔ میں نے اُسے جان کے خطرے سے ہوشیار کرتے ہوئے دُور رہنے کی درخواست کی تو وہ بولا۔ ’’میری وہاں ضرورت ہوگی‘‘ اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ بعد میں وہ لاشوں اور زخمیوں کو دیکھ کر کئی دنوں شدید ڈپریشن میں رہا۔

’’میں شوگر کا مریض ہوں، حساس ہوں اور میں نے زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے اس لیے کوئی بھی سانحہ مجھ پر زیادہ اثر کرتا ہے۔‘‘ بعد میں اُس نے بتایا۔

بتایا تو اُس نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں اور بھی بہت کچھ تھا۔

اسلام آباد میں سینچورس ٹاور کے افتتاح کے کچھ دن بعد ایک روز ہم سرِ شام اُس کے دفتر سے پیدل ہی اُس کی جانب روانہ ہو گئے۔ گرین بیلٹس میں پگڈنڈیوں پر چلتے، سڑکیں عبور کرتے اور فٹ پاتھوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے اُس نے اپنے کالج کے زمانے کی باتیں، قصے، کہانیاں سنائے۔

بزرگوں نے جاوید کو زمیں دار کالج گجرات میں داخل کروا دیا۔ لالہ موسیٰ کے طالب علم روزانہ صبح گجرات جاتے اور شام کو واپسی ہو جاتی۔ جاوید نے سفر سے بچنے کے لیے ہاسٹل میں رہنا شروع کر دیا۔ والد کی محبت یہاں بھی جاوید کے ہم راہ رہی۔ وہ روزانہ جاوید کو لالہ موسیٰ سے خالص تازہ دودھ بھجواتے۔ دودھ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا جاوید تک پہنچتا تو ختم ہو چکا ہوتا، اُسے لڑکے بالے طالبِ علم پی جاتے۔ اِس دودھ کے حوالے سے اُس کا نام ’’جاوید دودھی‘‘ (جاوید گوالا) پڑ گیا۔ اُس پر بچپن کے دور کا ردِعمل ہوا اور اُس نے لفنگے تیز طرار دوستوں میں رہنا شروع کر دیا۔ وہیں اُس نے پہلا ٹیپ ریکارڈر خریدا، چھروں والی بندوق خریدی اور خوب سیر سپاٹا کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً ایف ایس سی کے امتحانات میں فیل ہو گیا۔

امتحانی نتیجہ ملتے ہی جاوید ڈر کر لاہور بھاگ گیا۔ وہاں اس نے نہر کے پاس اسکاچ کارنر میں دکانوں کی بالائی منزل پر کمرا لے کر چارپائی اور گدا ڈالا اور وہیں رہ پڑا۔ دریں اثنا ’’پاکستان ہومیو پیتھک میڈیکل کالج‘‘ گڑھی شاہو میں داخلہ لے لیا اور ایف اے بھی کرنے لگا۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ جاوید نے ہومیو پیتھی کا کورس بھی کام یابی سے کر لیا اور ایف اے بھی۔

ایف اے کرنے کے بعد وہ ایف سی کالج میں داخل ہو گیا۔

’’میں کالج کا واحد طالبِ علم تھا جس نے سر پر تیل لگایا ہوتا، شلوار قمیص پہنی ہوتی اور کندھے پر بستہ ڈالا ہوتا۔ میرے دیسی حلیے کو دیکھ کر لڑکے خاصا مذاق کرتے۔ بی۔ اے میں مَیں نے اُردو کا مضمون رکھ لیا۔ اردو کے استاد شمیم صاحب تھے۔ میں اُن کا واحد طالب علم تھا۔ میرے ہونے سے اُن پر ایک بوجھ رہتا اور وہ مجھے سمجھاتے رہتے کہ میں نے اردو میں داخلہ لے کر درست فیصلہ نہیں کیا۔ چناں چہ میں نے کالج میں درخواست داخل کی اور صحافت میں چلا گیا۔ جب شمیم صاحب کو یہ خبر ملی تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ بے اختیار مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگے ’’تم بہت ترقی کرو گے۔‘‘ وہاں واصف ناگی میرے استاد تھے۔ چوں کہ میرا کوئی دوست نہ تھا اِس لیے واصف صاحب سے میرا اچھا تعلق بن گیا۔

یہ مضبوط تعلق آج بھی قائم ہے۔

جاوید کی انگریزی شروع سے کم زور رہی ہے۔

‘‘مجھے آج تک انگریزی کا کوئی مناسب استاد نہیں ملا۔ بی۔ اے میں انگریزی رکھنی لازمی تھی، میں نے پہلے پرچے میں رٹا لگا کر 70 فی صد نمبر حاصل کر لیے اور دوسرا پرچہ چوں کہ انگریزی سمجھ بوجھ کا تھا سو اس میں صفر آیا۔ کُل دو سو میں سے ستر نمبر لے کر میں پاس ہو گیا۔ بی۔ اے میں مجموعی طور پر میری فرسٹ ڈویژن آ گئی۔ ایم اے میں میرا انگریزی میں فیل ہونا یقینی تھا۔ حادثاتی طور پر اس کے پرچے گم ہو گئے سو اس مضمون میں مجموعی فی صد کے تناسب سے نمبر دیے گئے اور میں نہ صرف پاس ہو گیا بلکہ مجھے گولڈ میڈل بھی مل گیا۔’’

جاوید کے جنون اور سیکھنے کے حوالے سے دو دِل چسپ حقائق ہیں۔

ایک مرتبہ جاوید کو لیکچر دینے کے لیے ایک ایسی یونی ورسٹی جانا پڑا جہاں طبقۂ اشرافیہ کے بچے زیرِ تعلیم تھے اور اسلام آباد کے ماحول کے زیرِ اثر انگریزی میں بات چیت کرتے تھے۔

آڈیٹوریم میں جاوید کے لیکچر کا آغاز ہوا تو اس نے اردو میں بات کرنا شروع کی۔ یہ روایت کے خلاف معاملہ تھا، چناں چہ چند گوشوں سے احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں جو تھوڑی ہی دیر میں دب گئیں۔ جیسے جیسے جاوید کی بات بڑھتی گئی ویسے ویسے طالب علموں کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جب اس کا لیکچر ختم ہوا تو سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجا کر اسے داد دی۔

‘‘سب سے اہم ہوتا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کس طرح کہہ رہے ہیں، باقی تمام باتیں بعد میں آتی ہیں۔’’ وہ اس خیال کا اظہار کرتا ہے۔

ہمارے معاشرے کا بھی عجب مضحکہ خیز المیہ ہے کہ سبھی اردو بولنے اور سمجھنے والے آپس میں کانفرنسوں میں انگریزی میں گفت گو کرتے ہیں۔ گویا اجتماعی احساسِ کم تری کا اس بری طرح شکار ہیں کہ اعتماد سے آپس میں نظریں بھی نہیں ملا پاتے۔

ایک راز جاوید کے بہت قریبی لوگ جانتے ہیں۔ اُس نے جس طرح اپنے آپ کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کیا ہے اسی طرح انگریزی سیکھنے کیلئے اُس نے چندسال پہلے انگریزی کی ایک ٹیوشن پڑھنی شروع کر دی۔ لگاتار مصروفیت کے بعد رات ساڑھے گیارہ بجے کا وقت بچتا تھا سو وہ رات گئے ٹیوشن پڑھنے جاتا رہا ہے۔

یہ اُس کے ابتدائی زمانے کی باتیں ہیں کہ بحریہ ٹاؤن کے ملک ریاض جو اُس وقت عام سے پراپرٹی ڈیلر تھے اُس کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔

اِس سے پہلے، زمانی ترتیب سے واقعات!

جاوید کو ایک دوست نے بتایا کہ صحافت میں آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ریلوے اور پی آئی اے میں ٹرینوں اور جہازوں کی ٹکٹوں کے زخوں میں رعایت مل جاتی ہے۔ اس نے ایم اے صحافت کے لیے بہاول پور میں اسلامیہ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

دہاں اُس کی زندگی کا ایک ایسا وقت شروع ہوا گویا ایک بچے کو ہوش آیا ہو اور اُس نے آنکھیں کھول کر دنیا کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ یہاں وہ ایک شرارتی طالب علم کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ایک دنیا اُس کے سامنے بچھی ہوئی ہے اور جسم میں طاقت اور زندگی ہے۔ پارہ صفتی، تخلیقی اُپج اور محنت کا مادہ تو اُس میں موجود تھا ہی۔ اس میں جب شرارت کا آمیزہ شامل ہوا تو شترِ بے مہار نے کبھی چڑیا گھر کا رخ کیا تو کبھی سینما کا۔

بہاول پور ابھی نوابی دور کی پرال کے قریب بیٹھا نیم غنودگی میں جگالی کر رہا ہے۔ ٹھیرے وقت میں سائکل رکشوں کی جل ترنگ گھنٹیاں یوں خوش آہنگی سے بج اٹھتی ہیں جیسے کائی جمے پرانے مقدس تالاب کے قرب میں ایستادہ مندر میں گھنٹیاں۔ شہر میں اب تک نوابی دور

کی مغلیں بو باس باقی ہے، انگریزی راج کی عمارتوں کے ساتھ پرشکوہ نور محل، دربار محل، گل زار محل، نشاط محل اور راج بھون صادق گڑھ محل کندھے سے کندھا ملائے تمکنت سے کھڑے ہیں۔

ایک سہ پہر وہاں چڑیا گھر میں ایک دل چسپ واقعہ ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی آتی ہے۔ وہ مختلف جان وروں کے پنجروں تک جاتی ہے اور ایک نوجوان کو دیکھ کر جان ور، بن مانس، شیر، ریچھ وغیرہ اپنے اپنے پنجروں میں ڈبک کر پچھلے پنجوں پر پیٹھ پیچھے کیے جا بیٹھتے ہیں۔ ٹولی ان جان وروں کی حرکات کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ یہ جہاں جہاں جاتے ہیں، وہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ بالآخر ٹولی کا متعلقہ نوجوان شرط جیت جاتا ہے کہ اُس کا خوف جان وروں کو چوکنا کر دیتا ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اُس "دورے" سے چند روز پہلے شرط بدنے والا نوجوان ایک سرنج میں سپرٹ لیے چڑیا گھر آیا تھا۔ اُس نے کچھار کے پاس ٹہلتے وحشی شیروں، ریچھوں اور دوسرے جان وروں کی پیٹھ کے زیریں حصے پر دُم کے نیچے، نشانہ لے کر سرنج سے سپرٹ کی دھار اپنے ہدف تک کام یابی سے پہنچائی۔ پیٹھ پر ٹھنڈی سپرٹ نے جان وروں کو بوکھلا دیا۔ نوجوان نے یہ عمل چند روز دہرایا تو جان ور خطرے کو بھانپتے ہوئے اپنی اپنی پیٹھ کو دیوار کے ساتھ جوڑ کر بچاؤ کرنے لگے۔ سپرٹ کی ٹھنڈک تیز لیکن عارضی ہوتی جو تھوڑی ہی دیر میں اُڑ جاتی۔ یہ نوجوان جہاں جہاں سے گزرتا وہاں جان وروں میں سراسیمگی پھیلتی جاتی۔ اُس نوجوان کو دیکھ کر جان ور ہڑبڑا کر اپنی اپنی پیٹھ چھپاتے دیواروں سے جڑ کر بیٹھ جاتے۔ بعدازاں اُس نوجوان نے اس مشق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تجربہ انسانوں پر بھی آزمایا، گو یہ بہت بعد کی بات ہے۔ وہ نوجوان جاوید چودھری تھا۔

اور یہ تبھی کی بات ہے کہ جاوید اپنے دوستوں کے ساتھ سینما میں فلم دیکھنے جاتا اور کوئی گانا پسند آنے پر شرارتی طالب علموں کی ٹولی اسے دوبارہ چلانے کا مطالبہ کر کے خوب ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ طوعاً و کرہاً انتظامیہ کو وہ گانا دوبارہ، سہ بارہ، چوبارہ چلانا پڑتا۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب سینماؤں میں شرارتیں ہوتی تھیں، بم دھماکے نہیں۔

بہر طور، جاوید اِن غیر نصابی مصروفیات کے باعث تعلیم کی جانب زیادہ توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ یونی ورسٹی میں تعلیمی لحاظ سے نچلے درجے میں شمار کیا جانے لگا۔

نوجوان جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا اثر تھا یا اساتذہ کی "گھر کیوں" کا نتیجہ کہ فائنل امتحانات سے تین ماہ قبل خاصا سنجیدہ ہو گیا۔ یہ تیاری کی چھٹی کے دوران لاہور آیا تو اس کی ملاقات شفیق جالندھری صاحب سے ہو گئی۔ شفیق جالندھری صاحب حقیقی معنوں میں اس کے پہلے راہ نما اور محسن ثابت ہوئے۔ انھوں نے اسے کورس کی تیاری کا طریقہ بتایا اور یہ تیاری میں جُت گیا۔

اب یہ عالم تھا کہ جاوید دنوں تک پنجاب یونی ورسٹی کی ہاسٹل کے اُس کمرے جہاں یہ عارضی قیام کر رہا تھا سے باہر نہ آتا۔

گھوٹا (رٹہ) لگانا اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ یہ لائبریری سے کتابیں لیتا اور ان کے پیراگراف، صفحات کے صفحات یاد کر لیتا۔ بعد میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے انھیں دہراتا رہتا یہاں تک کہ وہ حافظے پر نقش ہو جاتے۔ یہ حفظ بغیر سمجھے نہ ہوتا، اس میں نصاب کی مکمل تفہیم ہوتی۔ اس گوشہ نشینی کا اثر یہ تھا کہ اس کے ساتھ کے ہمسائے کمروں میں ٹھہرے لڑکے بھی اُسے پہچانتے نہ تھے۔ یہ میلی شلوار قمیص پہنے مطالعے میں مصروف رہتا، کئی وقت کا کھانا چھوڑ دیتا یا چند لقمے زہر مار کر لیتا۔

تین ماہ بعد اسلامیہ یونی ورسٹی میں جب ایم اے کے فائنل امتحانات ہوئے تو جاوید خاصا پر اعتماد اور پر امید تھا۔ جب کہ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ لاہور سے تازہ دم ہو کر آیا ہے۔

امتحانات کا نتیجہ نکلا تو اس نے امتحانات میں اول آ کر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کلاس فیلوز نے رزلٹ ماننے سے انکار کر دیا۔ احتجاج بڑھا تو انتظامیہ نے پرچے دوبارہ چیک کرنے کا اعلان کر دیا۔ چند دن بعد نتیجے کا اعلان کیا گیا تو جاوید کے نمبر پچھلے نمبروں سے بھی بڑھے

ہوئے تھے۔

غیر معمولی حافظہ، تصویرزایادداشت اوراس کا برمحل حوالہ قدرت کا تحفہ ہے۔

جاوید کا حافظہ واقعات، حوالہ جات، ناموں اور جزئیات کے حوالے سے قابلِ رشک حد تک مضبوط ہے۔ اسے ایک مرتبہ ملنے والے میرے دوستوں کے لباس کی تفصیل، جوتوں کا رنگ اور مونچھوں کی لمبائی تک یاد رہتی ہے، تاریخ کی کتابوں کے باب اور سیاحت کے مقامات کے علاوہ بے شمار تفصیلات یوں یاد ہوتی ہیں جیسے ماں کو نونہال کے چہرے کے خدوخال۔

دامن کوہ کے ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے ستمبر کی ایک سہ پہر میں نے اُس سے یادداشت کا راز پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ ایک تو یہ قدرت کا تحفہ ہے دوسرے وہ ہر چیز کو یوں بہ غور دیکھتا ہے جیسے بچہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ بچپن کی یادیں عموماً ساری زندگی ساتھ چلتی ہیں کہ وہ ذہن کی صاف سلیٹ پر ابتدائی نقوش ہوتے ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق بچپن میں وقت آہستہ اور بعد میں تیزی سے سرکتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں انسان ہر شے کو بغور دلچسپی سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ حال میں زندہ ہوتا ہے اس لیے زندگی کے ہر رنگ اور ہر لمحے کو محسوس کرتا ہے۔ بعد کی عمر میں چوں کہ انسان بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کر چکا ہوتا ہے اس لیے سرسری نگاہ کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ اپنا وقت ماضی اور مستقبل کی سوچ میں گزارتا ہے۔ یہ وقت حقیقی نہیں ہوتا بلکہ انسانی ذہن میں گزرتا ہے اس لیے بہت تیزی سے گزرتا ہے اور خواب کی طرح لگتا ہے۔

آج بھی کالم لکھتے ہوئے بہت سے معاملات وہ یادداشت کے زور پر حل کر لیتا ہے۔ اسے ریفرنس میٹیریل کی ضرورت تکنیکی یا تحقیقی موضوعات پر زیادہ پڑتی ہے۔

گلے میں گولڈ میڈل ڈالے وہ لاہور کے ایک اہم اخبار کے دفتر پہنچ گیا۔ اُس دور تک اخبارات کے دفاتر کو ایک تقدیس آمیز قدر سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ علمی، تہذیبی، سیاسی اور لسانی دانش گاہیں تھیں جن سے عام عوام کی تربیت بھی کی جاتی تھی اور وہ رائے عامہ پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ اخبار میں پڑھی خبرِ ایک مستند حوالہ بن جاتی تھی اور اس کی زبان لسانی راہ نمائی کا ذریعہ۔

لاہور کے اخبار کے دفتر میں ابتدائی دنوں میں وہ ریسیپشن سے آگے نہ بڑھ پایا۔ وہ اخبار کے چیف ایڈیٹر سے ملنے گیا تھا لیکن اُسے باہر ہی روک لیا گیا۔ وہ استقبالیہ میز کے سامنے بینچ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے پاس چند کیلے اور دو چار کتابیں تھیں۔ اُس نے کیلے کھائے اور کتابیں پڑھنے میں مگن ہو گیا۔ اگلے روز بھی اُس نے یہی کچھ دہرایا۔ وہ پورے ڈیڑھ ماہ اسی طرح روزانہ بینچ پر آ کر بیٹھ جاتا اور انہماک سے مطالعہ کرنا شروع کر دیتا۔ بالآخر ریسیپشن پر بیٹھے بندے کا دِل موم ہو گیا اور وہ اسے چیف ایڈیٹر کے چپراسی کے پاس لے گیا۔ چیف ایڈیٹر نے اسے نیوز ایڈیٹر عباس اطہر صاحب کے حوالے کیا۔ عباس صاحب نے اس کا امتحان لیا۔ وہ امتحان میں کام یاب نہ ہو سکا۔ وہ پھر روزانہ امتحان دینے کے لیے آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک ماہ اسی طرح گزر گیا۔ آخرکار عباس صاحب نے اس کی مستقل مزاجی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اُسے منظوری کی چٹھی کے ساتھ سینئر صحافی، ایڈیٹر ارتباط (کوآرڈینیشن) محمد اقبال زبیری صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اُس کی مستقل مزاجی کے امتحان کا پچھترواں دن تھا جب زبیری صاحب نے اُس کا ٹیلی فون نمبر لیتے ہوئے کہا ''بیٹا فی الحال ہمارے پاس گنجایش نہیں۔ جب نوکری کی جگہ نکلے گی، آپ کو ہم خود ہی اطلاع کر دیں گے۔''

اگلے روز یہ پھر اُن کے دفتر میں موجود تھا۔ اُنھوں نے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور بولے ''تم پھر آ گئے؟''۔ اس نے لجاجت سے کہا کہ وہ فون نمبر اس کے ہوسٹل کا ہے۔ اسے خدشہ ہے، چوں کہ فون مصروف رہتا ہے اس لیے اگر کال کی گئی تو اُس تک پیغام نہیں پہنچے گا۔ وہ سارا دن فارغ رہتا ہے۔ اگر زبیری صاحب اجازت دیں تو یہ روزانہ آ کر باہر شیشے سے اشارتاً پوچھ لیا کرے۔ زبیری صاحب نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ اب یہ روزانہ آتا، دروازے میں لگے شیشے سے اندر جھانکتا، زبیری صاحب نفی میں سر ہلا دیتے۔ یہ واپس لوٹ جاتا۔

نوے دن یعنی تین ماہ وہ روزانہ یہ عمل دہراتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز زبیری صاحب نے دروازہ کھولا، اسے اندر بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور نیوز ایڈیٹر کو بلا لیا۔ وہ آیا تو زبیری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ”میں نے آج تک اس جیسا مستقل مزاج نوجوان نہیں دیکھا۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ یہ بہت کام یاب ہوگا۔ میں نے اس کے لیے نظامی صاحب سے منظوری لے لی ہے۔ آپ اسے ڈیسک پر بٹھا لیں۔“

برسات کی ایک رات جب گیارہ بجے تھے اور بارش ہو رہی تھی کہ اُس نے مجھ سے ایک کیفے میں کافی پیتے ہوئے کہا کہ آؤ باہر واک کرتے ہیں۔ میں نے پہلے اُسے اور پھر باہر گرتے پانی کی چھنکتی بوندوں کو دیکھا تو وہ بولا ”بارش میں بھیگنا اور چلنا بھی زندگی کا خوب صورت تجربہ ہے۔“

ہم کوہسار مارکیٹ سے نکلے اور بھیگتے ہوئے پچھلی گرین بیلٹ سے ہوتے ہوئے چھوٹے سے جنگل میں نکل آئے۔ اگر کوئی لمحہ یادگار ہو تو اس میں کہی گئی سادہ، عام سی باتیں بھی یاد رہ جاتی ہیں۔ مارگلہ روڈ کو میریٹ ہوٹل سے ملاتی گھومتی سڑک پر رات کے بارہ بجے بارش کی بوندوں کو اپنے بدن پر محسوس کرتے ہم باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ ہم صبح تین بجے تک یونہی چلتے رہے۔ جاوید سے میں نے اُس کے کالم کی مشق کا پوچھا تھا۔

”چوں کہ مجھے مطالعے کا شوق تھا، مشاہدہ بھی تھا اور لکھنے سے خوشی ملتی تھی اس لیے میں نے کالم نگار بننے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کالم لکھنے کی مشق کرنی شروع کر دی۔ میں کسی موضوع کا خیال کرتا، اس پر مطالعہ کرتا، اپنی قطعی سوچی سمجھی عام ڈگر سے ہٹ کر خالص رائے قائم کرتا، کالم کی طوالت کی حد مقرر کرتا اور لکھنا شروع کر دیتا۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ الفاظ کی حد کے آخری لفظ پر آ کر کالم خود ہی ختم ہو جاتا۔ میں نے مشق کے لیے بے شمار کالم لکھے اور ضائع کر دیے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہو گیا۔ اب میں کسی بھی موضوع پر، یہاں تک کہ سامنے والے درخت کی ٹہنی اور آسمان سے نازل ہوتی بوندوں پر بھی لکھ سکتا تھا۔“ جاوید نے برساتی نالے پر سے چھلانگ لگا کر اسے عبور کرتے ہوئے کہا۔

یہ اُسی رات کی بات ہے جب ہم سبزے کی گیلی مہک کو اپنی یادداشت کا حصہ بنا رہے تھے کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ اتنے مطالعے کے بعد اگر اُسے کسی ویران جزیرے پر اپنے ساتھ مذہب اور دین کے علاوہ پانچ کتابیں لے جانے کا موقع ملے تو وہ کن کتابوں کا انتخاب کرے گا۔ اُس نے کچھ دیر سوچا اور پانچ کتابوں کا نام لے دیا۔ ان کتابوں کے بارے میں ہم دونوں کا اتفاق تھا۔

”امیر تیمور کی خودنوشت ”میں ہوں تیمور“، دیوان سنگھ مفتوں کی ”ناقابل فراموش“ قدرت اللہ شہاب کی ”شہاب نامہ“ احمد بشیر کا ناول ”دل بھٹکے گا“ اور صغیر ملال کے ترجمے اور تعارف کے ساتھ ”بیسویں صدی کے شاہ کار افسانے۔“

وہ روزنامہ ”نوائے وقت“ سے صحافت میں داخل ہوا تھا اور روزنامہ پاکستان سے ہوتا ہوا روزنامہ خبریں میں جا پہنچا۔ وہیں اُس کا ایک کالم میر شکیل الرحمان صاحب کی نظر سے گزرا اور انھوں نے اسے روزنامہ ”جنگ“ میں بہ طور کالم نگار آنے کی دعوت دے ڈالی۔

”جنگ“ سے جاوید چودھری کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ پاکستان کے سب سے بڑے روزنامے کے ادارتی صفحے کے مقبول ترین کالم نگاروں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس میں چند وجوہات قابلِ ذکر ہیں، اِن کالموں میں جذبات کی نارنجی تپش، دل چسپی کا عنصر، حکیمانہ اظہار، حکایت یا قصے کا سا انداز، سیاسی کے علاوہ معاشرتی اور مذہبی موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لانا شامل تھیں۔ اُس کے ہر کالم کا ایک مکمل موضوع ہوتا تھا اور سبھی الفاظ اُس موضوع کی جانب رخ کرتے تھے۔ بعد میں اس کا یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ بے شمار کالم نگاروں نے اسے اختیار کیا۔

تین معاملات میں اُسے اردو کالم نگاری میں رجحان ساز کہا جا سکتا ہے۔

پہلا اُس کا حکایت کا سا انداز۔ دوسرا وہ کالم کو ایک ایسی قابل قدر شے کے طور پر سامنے لایا جس سے کالم نگاروں کے مناسب

معاوضوں کا آغاز ہوا۔ تیسرا وہ کالموں کی کتاب کو ایک ریفرنس بک کی صف سے نکال کر بیسٹ سیلر کے درجے تک لے گیا۔

اُس کی ایک لحاظ سے ڈیل کارنیگی سے بھی تحریری مشابہت ہے۔ ڈیل کارنیگی میسوری، امریکا کے ایک فارم کے غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اپنی لیاقت اور قابلیت سے اُس نے اصلاحِ ذات اور شخصی بڑھوتری میں رجحان ساز کام کیا۔ اُس کی تحریریں سادہ، پُراثر، دل چسپ اور اچھوتی ہوتی تھیں۔ 1955 میں وفات پانے والے ڈیل کارنیگی کی کئی کتابیں آج بھی قابلِ رشک تعداد میں فروخت ہو کر لوگوں کی زندگیاں بدلتی ہیں۔

جاوید کی تحریر میں بھی سادگی، اثر، دل چسپی اور معلومات ہوتی ہے۔ وہ روایتی کالم نگاروں کے برعکس اپنے کالم کے لیے باقاعدہ تحقیق کرتا ہے، اس کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے اور اسے دل جمعی سے تحریر کرتا ہے۔ گو اس حد تک زود نویسی میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔

اُس دور میں جب کئی کالم نگار صبح جماہی لے کر اٹھتے تھے اور بستر پر لیٹے لیٹے کالم گھسیٹ کر غسل خانے کا رخ کرتے تھے اور اندر جا کر سگریٹ سُلگا کر دن کا آغاز کرتے تھے، جاوید ایک کالم پر سنجیدگی سے دن میں آٹھ سے بارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔

یہی وجوہات تھیں کہ جب وہ ‘‘جنگ’’ کو چھوڑ کر ‘‘ایکسپریس’’ میں گیا تو قارئین کی بڑی تعداد اُس کے ساتھ چلی گئی۔

اُس کے ‘‘ایکسپریس’’ جانے کی رُوداد بھی خاصی دل چسپ ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ‘‘جنگ’’ اخبار میں وہ بہت اچھی طرح سے اپنا مقام پیدا کر چکا تھا۔ بلکہ وہ ‘‘جنگ’’ کے لیے ایک جذباتی وابستگی بھی قائم کر چکا تھا۔ اسی دوران ٹیلی وژن کے شعبے میں ایک انقلابی تبدیلی آئی اور پی ٹی وی کے علاوہ نئے چینل بھی میدان میں ایک ایک کر کے آنے لگے۔ ‘‘جیو’’ ٹی وی ان کا سرخیل تھا۔ جاوید یہ سب خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنی پیشہ ورانہ ترقی کا خواہاں تھا۔ جب اُس نے دیکھا الیکٹرانک میڈیا میں پختگی آ گئی ہے اور وہ بھی ذہنی طور پر اس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اسی دوران پی ٹی وی نے اُس سے رابطہ کیا اور اسے ایک پروگرام کی پیش کش کر دی۔ اُس کی قلمی وابستگی جنگ کے ساتھ تھی سو اُس نے شرط رکھی کہ وہ اپنے ادارے جنگ کے لیے لکھتا رہے گا۔ پی ٹی وی نے اس کی شرط قبول کر لی اور اخبارات میں اُس کے پروگرام کا اشتہار دے دیا۔

جب یہ خبر جنگ انتظامیہ تک پہنچی تو اُس نے جاوید کے کالم روک دیئے۔ جاوید کے لیے یہ معاملہ خاصا پریشان کن بن گیا۔

میرا اُن ونوں اس سے لمحوں کے حساب سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں نے اس سے پہلے اُسے اتنا بے چین کبھی نہ دیکھا تھا۔ بالآخر اُس کی میر شکیل الرحمان صاحب سے کراچی میں ملاقات طے ہو گئی۔ وہ کراچی آیا تو میں نے اُسے ایئرپورٹ سے لیا اور ہم آرام کے ایک وقفے کے بعد پی سی ہوٹل روانہ ہو گئے۔

پی سی ہوٹل میں ہماری میر شکیل الرحمان اور اُن کے بیٹے میر ابراہیم سے ملاقات ہوئی۔ میں لابی میں بیٹھ گیا اور جاوید اُن کے ہم راہ چلا گیا۔ وہ قریباً گھنٹا بھر جاری ملاقات کے بعد واپس لوٹا تو اُس نے قہقہہ لگایا اور مجھے بتایا ‘‘میں نے جنگ چھوڑ دیا’’ میں پریشان ہو گیا' وہ کالم نگاری کی حیثیت سے اپنی پروفیشنل زندگی کی آخری سیڑھی پر کھڑا تھا' وہاں سے چھلانگ لگانا عقل مندی نہیں تھی' میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے اسی طرح قہقہہ لگا کر جواب دیا ‘‘یہ سمجھ رہے ہیں' میں جنگ کے بغیر کچھ نہیں ہوں' میں انہیں بتا آیا ہوں' میں اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی انسان کو خدا ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں’’ میں اس کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھا لیکن اس کا کہنا تھا ‘‘میں اپنے آپ کو آزمانا چاہتا ہوں' میں اگر اللہ کے کرم اور اپنی محنت کے بل پر میں ہوں تو میں نئی جگہ پر بھی کامیاب ہو جاؤں گا اور میں اگر جنگ کی وجہ سے میں ہوں تو پھر مجھے ختم ہی ہو جانا چاہیے’’۔ جنگ چھوڑنے کے چند دن بعد اس نے روزنامہ ایکسپریس جوائن کر لیا' یہ خبر اس وقت کی ایک بڑی خبر تھی' پھر میرے سامنے میر شکیل الرحمٰن کا اسے فون آیا' وہ اسے واپس بلا رہے تھے لیکن اس کا جواب تھا ‘‘شکیل صاحب میں آ گیا ہوں' میں اب واپس نہیں آؤں گا' انسان

کا کوئی کردار بھی ہونا چاہیے'' میرا خیال تھا' ایکسپریس ایک چھوٹا اخبار ہے' یہ شاید یہاں کامیاب نہ ہو سکے لیکن اس نے کمال کر دیا' اس نے ایکسپریس میں جنگ سے بہتر کالم لکھے' ایکسپریس نے 2008ء میں ٹیلی ویژن چینل لانچ کیا تو یہ ان کا سٹار اینکر بن گیا' یہ آٹھ سال سے کالم کے ساتھ ساتھ ملک کا پاپولر سیاسی پروگرام بھی کر رہا ہے' اس دوران اسے نصف درجن چینلز سے منہ مانگے معاوضے کی پیش کش ہوئی لیکن یہ پاکستان کے ان تین اینکرز میں شامل ہے جنہوں نے پیسے کیلئے ادارہ نہیں بدلا' یہ ہمیشہ کہتا ہے ''مجھے میری ضرورت کے مطابق معاوضہ مل رہا ہے لہٰذا مجھے صرف بینک یا پراپرٹی ڈیلروں کیلئے پیسے کمانے کی کیا ضرورت ہے؟''۔

جاوید نے کچھ عرصے سے پروگرام کے آغاز میں درود شریف بھی پڑھنا شروع کر دیا ہے'' ''کیوں؟'' میں نے اس سے پوچھا' اس نے جواب دیا ''راولپنڈی کے کسی صاحب نے ایک دن مجھے فون کیا' اس کی بیگم کو نبی اکرم کی زیارت ہوئی تھی' اس نے بیگم سے میری بات کرائی' خاتون پرہیز گار تھیں' انہوں نے بتایا' نبی اکرمؐ نے آپ کو پیغام بھجوایا ہے' آپ نماز بھی نہیں پڑھتے اور مجھ پر درود بھی نہیں بھجواتے'' میں نے خاتون کا شکریہ ادا کیا اور بات سنی ان سنی کر دی' کچھ عرصے بعد ملتان سے ایک صاحب کا فون آ گیا' انہوں نے بھی یہی پیغام دیا' میں ڈر گیا' میں نے اسے رسول اللہ ﷺ کا حکم سمجھا اور درود شریف کو اپنے تمام معمولات کا حصہ بنا لیا''۔ میں نے کہا ''ہو سکتا ہے یہ زیارت صرف تخیل ہو'' اس نے فوراً جواب دیا ''نہیں' یہ صرف تخیل نہیں تھی کیونکہ دونوں نے چند ایسے حوالے بھی دیئے تھے جن سے صرف میں واقف تھا اور اگر فرض کر لیں یہ صرف تخیل بھی ہو تو بھی درود شریف پڑھنے کا مشورہ غلط نہیں' یہ آپ کی روح کو توانا کر دیتا ہے اور میں روز اس توانائی کو محسوس کرتا ہوں''۔

جب میں پہلی مرتبہ جاوید کے گھر شہزاد ٹاؤن اسلام آباد میں گیا تو ایک عام صحافی کے باذوق اور خوب صورت آرکیٹیکچر والے کاٹیج نما گھر کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں درجنوں بار جانا ہوا۔ اُس نے گھر میں بچوں کو تربیت دے رکھی تھی کہ وہ مہمانوں کو خود مشروبات اور دیگر لوازم پیش کریں۔

''مجھے گھر کے اندر ملازم کے ہونے سے ذاتی زندگی میں مداخل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے بھی میری بیوی کو گھر گرہستی کا بہت شوق ہے۔'' اس نے بتایا تھا۔ تب اُس نے بچے بہت چھوٹے تھے اور گھرانا ابھی مکمل بھی نہ ہوا تھا۔

اُسے اپنی بیوی اور بچوں سے عشق ہے۔ بیوی بھی اُس سے ایسا عشق کرتی ہیں کہ ''میری خاطر بچے بھی چھوڑ سکتی ہے'' وہ تشکر بھرے لہجے میں کہتا ہے۔

اُس کے ابتدائی کالموں میں بچوں کا تذکرہ تواتر سے آتا تھا۔ بھلے وہ ''آف دی ریکارڈ'' کالم میں بچوں کے ساتھ اتوار کا دن بھرپور طریقے سے گزارنے کا تذکرہ ہو، ''بالٹیاں'' میں بیٹے کے بے پیندے بالٹی بھرنے کا تقاضا ہو، ''بندر آنکھیں مانگتا ہے'' میں بیٹے کا اندھے بندر کی تصویر اخبار سے کاٹ کر میز پر رکھ دینے کی بات ہو، ''تھینک یو ملک صاحب'' میں چھٹی کے دن بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کا ذکر ہو یا بے شمار دیگر کالموں میں بالواسطہ اپنے بچوں کا تذکرہ ہو یا بلاواسطہ ایک باپ کی حیثیت سے دوسروں کے بچوں کی تکالیف پر پدرانہ جذبے سے بلبلا اٹھنا ہو۔

میں نے بیٹیوں سے محبت کرنے والے بے شمار لوگ دیکھے ہیں لیکن جاوید جیسا باپ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ وہ اپنی بیٹیوں کو اکثر اسلام آباد کے مہنگے اسٹور پر لے جاتا ہے اور بچیاں جو چاہیں خرید لیتی ہیں' ایک بار ایک بیٹی نے ناسمجھی میں برف میں چلنے والے لانگ شو لے لیے۔ برانڈڈ لانگ شو خاصے مہنگے بھی تھے اور یہاں پر ان کا استعمال بھی نہ تھا۔ وہ ماتھے پر شکن تک نہ لایا اور انھیں پیک کروا کر بیٹی کو لے دیے۔ یہ اُس کی روٹین ہے' اس طرح بچوں کو ہفتے دس دن میں شاپنگ پر لے جاتا ہے اور ان کی من چاہی شاپنگ کرواتا ہے۔ بیٹیوں کے ذکر پر کہتا ہے۔

''اِن کے نخرے باپ ہی نے اٹھانے ہیں۔ میں نہیں چاہتا اِن کے دل میں کوئی حسرت رہ جائے۔'' بچے اسے اکثر ایس ایم ایس

کے ذریعے کھانے کی اشیاء لانے کا ‘‘آرڈر’’ کر دیتے ہیں' یہ رات کو ٹی وی پروگرام کے بعد ساڑھے گیارہ بجے گھر کی جانب جاتے ہوئے رستے میں رکتا اور بچوں کے لیے فاسٹ فوڈ، چٹ پٹے کھانے پیک کرواتا ہے۔ کئی مرتبہ میں ہمراہ ہوتا ہوں اور اُسے ٹوکتا ہوں بچے سو چکے ہوں گے تو وہ کہتا ہے ‘‘مجھے بھی معلوم ہے بچے سو چکے ہوں گے لیکن میں چاہتا ہوں جب بچے صبح فریج کھولیں اور سامنے پیک کیا ہوا رات کا کھانا دیکھیں تو یہ نہ سوچیں کہ اُن کا باپ رات کو اُن کی فرمائش بھول گیا تھا۔’’

ایک رات اپنے گھر پر اُس نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔

‘‘یہ 1996 کی بات ہے۔ میں نے ‘‘خبریں’’ اخبار میں نیا نیا کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ مجھے ہارون آباد سے ایک بندے نے جھنجھوڑ دینے والا خط لکھا۔ وہ دکھی بھی تھا اور ضرورت مند بھی۔ میں نے وہ خط اپنے کالم میں شائع کر دیا۔ نتیجتاً مدد کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک صبح مجھے ایڈیٹر خوشنود علی خان نے نیند سے جگایا اور بتایا کہ اُن کے جاننے والے ایک صاحب مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ خوشنود صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ صاحب فون پر مسلسل رو رہے تھے۔ اُسی روز خبریں کے دفتر میں ایک گم نام ٹھیکے دار تشریف لائے۔ اُن صاحب نے سونے کی گھڑی اور سونے ہی کی زنجیریں پہن رکھی تھیں۔ میری تنخواہ چھ ہزار روپے تھی۔ ان ٹھیکے دار صاحب نے ایک لاکھ روپے کی رقم ضرورت مند کے لیے بے حد ہم دردی سے دی۔ تب میں بھی گم نام تھا اور وہ ٹھیکے دار بھی۔ اُس کے جانے کے بعد خوشنود علی خان نے مجھے بتایا کہ وہ شخص فلاح عامہ کے کاموں بالخصوص پاکستانی جیلوں میں قید بنگلہ دیشی قیدیوں کی رہائی اور واپسی میں پیش پیش تھا۔ اُس ٹھیکے دار کا نام ملک ریاض تھا جو بعد میں بحریہ ٹاؤن کے حوالے سے مشہور ہوا۔’’ جاوید نے ملک ریاض سے اپنے پہلے تعارف کی رُوداد سنائی۔

‘‘ملک ریاض میں یقیناً کئی خامیاں ہوں گی اور اُس کے کاروباری طریقے سے اختلاف سہی لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے پاکستان میں وسیع پیمانے پر عمدہ اور پر سکون رہائش کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اُس کے فلاح عامہ کے بے شمار کام بھی قابل تعریف ہیں۔ ہمارے ہاں سیکڑوں ارب پتی لوگ ہیں۔ ان میں سے چند ایک ہی فلاحی کام کرتے ہیں۔ کم از کم ان لوگوں کے مثبت پہلو کی تعریف اور حوصلہ افزائی ضرور کی جانی چاہیے۔ لوگ ملک ریاض کے ساتھ تعلق کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں' مجھے گالیاں بھی دی جاتی ہیں لیکن میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں سو کسی کے بے جا خوف سے ضمیر کی آواز نہیں دبا سکتا۔’’

اُس نے دکھ سے مجھے کہا۔

‘‘ہم کام یاب لوگوں سے حسد کرتے ہیں اور اُن کی کام یابی میں نہ صرف سازش کا عنصر تلاش کر لیتے ہیں بلکہ تراش بھی لیتے ہیں۔ پوری دنیا میں سیلف میڈ لوگوں کی مثال دی جاتی ہے لیکن یہاں 'نو دولتیا' کہہ کر پیٹھ پیچھے تضحیک آمیز رویہ اور سامنے برخورداری کا سا انداز اختیار کر کے حسد کے لال قلعے پر منافقت کا جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔’’

جاوید دنیا کی سیاحت کرتا ہے، اعلیٰ فلمیں دیکھتا ہے، کتابیں پڑھتا ہے، ورزش کرتا ہے، تازہ ترین لطیفے سنتا سناتا ہے، خوب قہقہے لگاتا ہے اور زندگی کی رنگینی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ محبت کی رنگین گلابی پھوار سے بھی بھیگ بھیگ چکا ہے۔ یہ تعلق ابتدا میں فقط رسمی تھا، بعد ازاں وقت گزاری کا ذریعہ بن گیا۔ وہ ایک عام نوجوان صحافی تھا۔ اُسے پتا ہی نہ چلا کہ اس تعلق کی جڑوں نے برگد کی جڑوں کی طرح پھیل کر چند برسوں میں کس طرح آکٹوپس کی مانند اُس کے دل کو جکڑ لیا۔ جب جدائی کا لمحہ قدرت کی جانب سے نازل ہوا تب تک یہ تعلق بہ ظاہر بوجھ بن چکا تھا۔ جب تعلق سلگتی اگربتی کی طرح جل کر راکھ ہوا تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔

اُس کے چلے جانے کے بعد اس نے بہ ظاہر ایک بوجھ ہٹتا محسوس کیا۔ میں کہ محرمِ حالِ دل تھا سو واقفِ جذبات تھا۔

اس دوران مجھے بیرونِ ملک جانا پڑا تھا۔ واپس لوٹا اور اسے فون کیا تو اُدھر سے ہچکیوں اور رندھی آواز کے نم آلود سسکارے سنائی دیئے۔ میرا دوست چیخ رہا تھا، ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ پس وہ چند برس اُس نے ہول ناک تنہائی اور شدید رنج میں گزارے۔

یہ انھی دنوں کی بات ہے جب اُس پر جدائی کے عفریت کی حقیقت دینہ کے سمپورن سنگھ جو اَب تک بمبئی کا گل زار بن چکا تھا کے لکھے شعروں، ڈائیلاگوں اور ہدایت کردہ فلموں کی صورت میں عیاں ہوئی۔ یہ تبھی کی بات ہے کہ جب وچھوڑے کا دکھ اِسے آن لیتا ہے تو یہ گل زار کا مقتدی ہو جاتا ہے، اُس کے لکھے الفاظ اور اُن میں پھونکی روح خود جاوید کی کتابوں کی پشت پر رقم ہو جاتی ہے، ان میں جذبات کے ویسے ہی صنوفشانی افشاں کے وہی ذرّات اُتر آتے ہیں جو گل زار کی روح سے جھڑ کتے ہیں۔ نہ جانے اور کتنی روحوں کی پاتالوں سے جدائی سسکیاں اُٹھتی ہیں اور عرش تک اُبھرتی جاتی ہیں، رب جانے۔

گل زار کی شاعری اور فلموں بالخصوص ''اجازت'' سے متاثر ہو کر اس نے لکھا تھا۔

''تم نے جاتے ہوئے کچھ چیزیں چھوڑی تھیں۔ دیوسائی کے سرے پر ایک کنواری جھیل تھی، نیلے پانیوں کی یخ جھیل، پانیوں میں سیکڑوں رنگ کے ہزاروں پھولوں کا عکس تھا، عکس کے بیچوں بیچ بادلوں کی چادر سرک رہی تھی اور چادر کے ایک پلو میں نانگا پربت کی چوٹی بندھی تھی، اس وقت دنیا کی چھت پر صرف ہم دو انسان تھے، تم نے جھیل سے پاؤں نکالے، ہم نیلی چونچ اور سبز دُم والی چڑیا کے پیچھے بھاگے، چڑیا اُڑ گئی لیکن پھولوں کے مسلے کچلے بدن پر تمھارے پاؤں کے نشان رہ گئے، میں یہ نشان واپس کرنا چاہتا ہوں۔ جولیاں کی ہزاروں برس پرانی سیڑھیاں بھی تمھیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ ہم شگر محل کی بالکونی میں بیٹھے تھے، دریا ہمارے پیروں میں بہہ رہا تھا اور خوبانی اور سیب کے درخت ہمارے سروں پر جھکے تھے، تم نے مگ کے کناروں پر ہونٹ رکھ دیئے، وہ مگ، مگ کے کناروں پر ہونٹوں کے نشان اور مگ کی دیواروں پر کافی کی جھاگ ابھی تک باقی ہے، میں یہ جھاگ، یہ نشان اور کافی کا یہ مگ بھی واپس کرنا چاہتا ہوں، میں سیب اور خوبانی کے وہ درخت، وہ بہتا دریا اور شگر کا وہ محل بھی تمھیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ ہم نے کلر کہار کے ریسٹ ہاؤس مین زندگی کا پہلا اور آخری سگریٹ پیا تھا، میں نے شروع کیا تھا تم نے ختم، اس سگریٹ کی راکھ اور آنسوؤں کے داغ بھی باقی ہیں۔ لال سہانرا کے ریسٹ ہاؤس کے باتھ روم کے فرش پر وہ گیلا تولیہ بھی اسی طرح پڑا ہے، تمھارے کچلے، میلے، کھائے، رگڑے ٹشوز، تمھاری ساری کیٹیں، ساری سی ڈیز، ساری کتابیں، سارے کارڈز اور ساری جھوٹی سچی قسمیں بھی وہیں پڑی ہیں جہاں تم نے رکھی تھیں، چودھویں کے وہ سارے چاند بھی اسی طرح آسمان پر ٹنگے ہیں، جھیلوں میں پھینکے وہ سارے پتھر اور ان پتھروں کے بدن سے نکلے وہ سارے دائرے بھی اسی طرح موجود ہیں، تمھارے لمس کی وہ ہلکی ہلکی تپش اور تمھاری قمیص کا وہ ٹوٹا بٹن بھی وہیں پڑا ہے جہاں تم نے چھوڑا تھا، بستروں کی اجلی چادروں اور تکیوں کے سرخ غلافوں میں تمھاری خوشبو ابھی تک جاگ رہی ہے، تمھاری میری 52 راتوں اور 56 صبحوں کی آنکھوں تک ابھی نیند نہیں پہنچی اور میری پوروں کے حافظے میں ابھی تک تمھاری پلکوں کا ارتعاش باقی ہے اور میری گردن پر تمھاری سانس کا لمس بھی ابھی زندہ ہے، میں یہ سارے لمس، یہ ساری خوشبوئیں، گزرے ٹوٹے تعلق کی یہ ساری تصویریں بھی تمھیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا سارا ماضی تمھیں لوٹانا چاہتا ہوں۔''

یہ جذبات قلمی نہیں قلبی ہیں۔

جذبات کے رنگین پانی اب بھی اُس کے اندر دوپٹے رنگنے والے پانیوں کی طرح اُبلتے ہیں اور اُس کی روح کو اپنی پھوار سے ہولی رنگ کر دیتے ہیں۔

وہ تخلیقی مزاج کے باعث کچھ حسن پرست بھی ہے اور کچھ عشق پیشہ بھی۔ اس معاملے میں بڑھ بھی جاتا ہے۔ رنگین اور دل چسپ کرداروں میں خوش رہتا ہے۔ میری اُس کی وجہ سے نام ور سیاست دانوں، کام یاب بزنس مینوں، مشہور دانش وروں، اداکاروں اور عجوبۂ روزگار لوگوں سے ملاقاتیں رہی ہیں۔

ایک صاحب کو ہم کوڈ ورڈز میں ''خواجہ حلالہ'' کہتے ہیں۔ خواجہ صاحب خاصے تعلقات رکھتے ہیں سو جہاں کہیں سوئے اتفاق یا بوجہ غیظ و غضب نادانستگی میں طلاق ہو جائے تو ''حلالے'' کی غرض سے خاموشی سے اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں باہمی اعتماد

اور رازداری ضروری شرائط ہیں۔ شرماتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ اب تک سو کے قریب ضرورت مندوں کی خدمت کر چکے ہیں۔

اسی طرح ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ اکثر واک کرتے ہوئے ان کے دفتر آ جاتے ہیں اور اپنے کارنامے گنوانے لگتے ہیں۔ اُن سے معذرت کرنی ہو تو جاوید کو عجیب بہانے تراشنے پڑتے ہیں جن میں کسی دوست کی اچانک وفات سے لے کر بریکنگ نیوز کی کوریج تک شامل ہیں۔ اب تو اس کا عملہ اس حد تک تربیت یافتہ ہو چکا ہے کہ اِدھر وہ صاحب بلا اطلاع آ کر بیٹھتے ہیں اور دسیوں بار دہرایا کارنامہ پھر سے بیان کرنے لگتے ہیں اُدھر عملے کا گھبرایا ہوا فرد اندر داخل ہوتا ہے اور کسی ناگہانی وفات کی یا حادثے کی خبر سنا دیتا ہے۔ جاوید ہاتھ بڑھا کر اُن صاحب سے مصافحہ کرتا ہے، معذرت کرتا ہے اُنھیں دروازے تک چھوڑ کر آتا ہے اور اطمینان کی سانس بھر کر پروگرام کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔

جاوید نہ تو فرشتہ ہے اور نہ ہی شیطان۔ عام انسان ہے۔ اُس میں جہاں کئی خوبیاں ہیں وہاں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ وہ زود رنج ہے، مادۂ صبر جلد ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشنام طرازی کرے یا گالی دے تو اس کا فیوز اڑ جاتا ہے۔ تحریر میں مبالغے کا تڑکہ بھی لگا دیتا ہے۔ کچھ معاملات میں بڑھ بھی جاتا ہے۔ روزانہ سوشل میڈیا پر برے بھلے الفاظ پڑھ کر دکھی ہو جاتا ہے۔ میں اُسے تسلی دیتا ہوں ”اس وقت پاکستان کے میڈیا میں کون سا ایک شخص ایسا ہے جس کی عزت پر اجماعِ امت ہو؟“ تو لاجواب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے مگر کہتا ہے ”ہماری قوم کی یادداشت گولڈفش کی طرح تین سیکنڈ کی ہے۔ میں نے اپنے ضمیر اور سمجھ کے مطابق ہر حکومت اور ہر پارٹی پر جائز تنقید کی ہے۔ کبھی خود کو کسی کا آلۂ کار نہیں بننے دیا۔ اسی لیے کھل کر لکھتا ہوں مگر جب کوئی مجھے ”بکاؤ“ کہتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“

جاوید نے اپنے سگے خون کے بعض رشتوں سے فقط اس لیے ناراضی اختیار کی ہے کہ وہ ملازمین سے درشتی کا رویہ اختیار کرتے تھے، یہ ویٹر کو اونچی آواز سے پکارنے والوں سے لڑ پڑتا ہے، قطار توڑنے والوں سے ناراض ہو جاتا ہے، ہمیشہ قانون قاعدے کی پابندی کرتا ہے۔ ہمیشہ بروقت اور صحیح ٹیکس دیا۔ جب وہ مجھ سے دکھی لہجے میں یہ کہتا ہے ”یار میں نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، بیوی بچوں کے حقوق پورے کرتا ہوں، اپنے ملازمین سے محبت سے پیش آتا ہوں، ادارے کا کام دیانت دارانہ خلوص اور تن دہی سے کرتا ہوں تو بھی بعض ایسے لوگ جو نہ تو مجھ سے کبھی ملے ہیں اور نہ ہی مجھے جانتے ہیں کیوں کر میری ذات پر رکیک حملے کرتے ہیں؟“ تو تب میرے ذہن میں احمد ندیم قاسمی ایسا بے ضرر فن کار اور شکیل عادل زادہ جیسا وضع دار انسان آ جاتا ہے۔ یہ دونوں اساتذہ اسی سوال سے بندھے رہے ہیں۔ تب میں عرض کرتا ہوں ”جاوید آپ مٹھی بھر دشنام طرازوں کو مت دیکھیں۔ ان ہزاروں لاکھوں لوگوں کو دیکھیں جو آپ سے محبت کا چراغ اپنی آنکھوں میں روشن کیے اس کے لو میں آپ کا لکھا ہر لفظ پڑھتے ہیں اور دیکھتے سنتے ہیں۔“

وہ لمبی سانس بھرتا ہے اور کہتا ہے۔ ”محنت میری زندگی کا واحد اثاثہ ہے اور شکر میری واحد کامیابی‘ میں صبح دس بجے سے رات تین بجے تک کام کرتا ہوں‘ مجھے لکھنا نہیں آتا تھا‘ میں پانچ سال تک کالم کی پریکٹس کرتا رہا‘ میں روز رات کو ایک کالم لکھتا تھا اور صبح اٹھ کر پھاڑ دیتا تھا‘ میں پانچ سال یہ پریکٹس کرتا رہا‘ میں نے خوشحالی کیلئے دفتر کھولے‘ کمپنیاں بنائیں‘ بزنس کیا‘ میں آج بھی کاروبار کرتا ہوں‘ مجھے ٹی وی میں کام کرنا بھی نہیں آتا لیکن میں آٹھ سال سے ڈٹا ہوا ہوں‘ یہ کام اب سمجھ آ رہا ہے‘ چار کالم لکھتا ہوں‘ چار سیاسی پروگرام کرتا ہوں‘ روز ایکسرسائز کرتا ہوں اور فلمیں دیکھتا ہوں‘ روز کتابیں پڑھتا ہوں‘ فیملی کو وقت دیتا ہوں‘ میں نے کسی جگہ پڑھا سفر دنیا کی بہترین یونیورسٹی ہے‘ میں نے سفر شروع کر دیئے‘ میں نے اب تک 65 ملکوں کے سفر کئے اور مزید سفر کر رہا ہوں‘ دوستوں کیلئے بھی حاضر رہتا ہوں‘ جو کام شروع کرتا ہوں وہ سیکھنا شروع کر دیتا ہوں‘ آج کل کنسٹرکشن اور آرکیٹکچر میں دلچسپی ہے‘ یہ بھی سیکھ رہا ہوں‘ شوگر کو بھی مینٹین کرنے کی کوشش کرتا ہوں‘ نہ کسی کو چھیڑتا ہوں اور نہ کسی کو چھیڑنے دیتا ہوں‘ جو بھونکے اسے کہتا ہوں بھائی صاحب آپ اپنی گلی میں بھونکیں اور مجھے اپنی گلی میں بھونکنے دیں‘ بیوی سے محبت کرتا ہوں‘ بیٹوں کو دوست سمجھتا ہوں‘ بیٹیوں پر نثار ہوتا رہتا ہوں‘ پوری زندگی اچھا بیٹا اور اچھا بھائی بننے کی کوشش کی‘ ناکام رہا‘ والدین اور بہن

بھائیوں کو مطمئن نہ کر سکا، جب بھی پیسے کی ضرورت پڑتی ہے تو محنت بڑھا دیتا ہوں، تمام صحافیوں اور سیاستدانوں سے زیادہ ٹیکس دیتا ہوں، آرام دہ زندگی اچھی لگتی ہے، اللہ نے آرام دہ زندگی بخشی اس پر اس کا شکر گزار ہوں، عاشق رسولؐ ہوں، زندگی کا بہترین کالم نبی اکرمؐ پر تحریر کیا، روز ایک نئی چیز سیکھتا ہوں، بری عادتوں پر روز کڑھتا ہوں، سگریٹ نہیں پیتا، شراب نہیں پیتا، جواء نہیں کھیلتا، لوگوں کا خون بھی نہیں پیتا" آرٹ بک والٹ سے ملا، بک والٹ نے پوچھا "تم پاکستان میں اتنے پاپولر کیوں ہو" جواب دیا "میں شاید اچھا لکھتا ہوں" اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "نہیں، تم اچھا نہیں، پاپولر لکھتے ہو" میں نے فرق پوچھا، وہ بولے "پاپولر لکھنے والے منافق ہوتے ہیں، یہ لوگ صرف وہ چیزیں، وہ باتیں لکھتے ہیں جو لوگوں کو پسند آتی ہیں، یہ وہ نہیں لکھتے جو صحیح ہوتا ہے، آپ اس دن اچھے رائٹر بنو گے جس دن آپ صرف اپنے ضمیر کے مطابق لکھو گے اور لوگ تالیاں بجانے کی بجائے تمہیں گالیاں دیں گے مگر تم پیچھے نہیں ہٹو گے"۔ میں نے یہ نصیحت پلے باندھ لی میں اب 2010ء سے صرف وہ لکھ رہا ہوں جو سچ ہے یا پھر جسے میں سچ سمجھتا ہوں چنانچہ اب لوگوں سے دل کھول کر گالیاں سنتا ہوں، قہقہہ لگاتا ہوں اور اگلے دن دوبارہ وہی حرکت کرتا ہوں" وہ خاموش ہو گیا، میں نے پوچھا "آپ اللہ کے کرم کا بہت ذکر کرتے ہیں، کیوں؟" وہ بولا "دو وجوہات ہیں، پہلی وجہ، اللہ نے مجھ پر ترس کھایا، اللہ تعالیٰ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں لوگوں پر کرم اور رحم کرتا ہے لیکن مجھ پر اس نے ترس کھایا، اس نے مجھے نواز دیا، میں نے اللہ سے جو مانگا اس نے مجھے عنایت کر دیا، میں ترس کی اس عنایت پر اللہ کا شکر گزار ہوں، دوسری وجہ، میرے جیسے بیک گراؤنڈ کے لوگوں کو سختیاں منفی بنا دیتی ہیں، یہ شیطان بن جاتے ہیں، یہ سیریل کلر بن جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بچپن اور خوفناک جوانی کے باوجود مثبت رکھا، قدرت نے مجھے منفی نہیں ہونے دیا، یہ اس کا خاص کرم ہے" میں نے اس سے پوچھا "آپ میں کشف کی صلاحیت کیسے آئی، روحانیت کی طرف رغبت کیسے ہوئی"۔ وہ مسکرایا اور بولا "یہ بھی اللہ کا کرم ہے، اللہ جب کسی پر خوش ہوتا ہے تو وہ اسے رزق بھی دیتا ہے، نیک نامی بھی، علم بھی اور اس کی روح کو بھی سیراب کر دیتا ہے"۔

یہ اُسی شام کی بات ہے جب ہم دونوں بارش میں بھیگتے، مارگلہ روڈ کے درختوں کی شاخوں اور پتوں سے ٹپکتے پانی کے قطروں کے نیچے چلے جا رہے تھے، سامنے مارگلہ کی پہاڑیوں پر دھند سی اُتر رہی تھی، گھروں کی بتیاں روشن ہو کر پانی کی پھوار کے پیچھے ٹمٹما رہی تھیں کہ میں نے جاوید سے پوچھا تھا "آپ کی زندگی میں کوئی افسوس، کوئی ندامت؟" وہ فوراً بولا "ہاں ایک ندامت ہے، وہ جاتے ہوئے ناراض تھی، یہ بات دُکھ دیتی ہے۔" پھوار پانی کی بوچھاڑ میں بدل گئی اور اُس کے آنسو بارش کے قطروں میں مل کر بہنے لگے۔ ہم دونوں نے کالر اونچے کر لیے اور ایک گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔

دھندلا آدمی

محمد عاصم بٹ

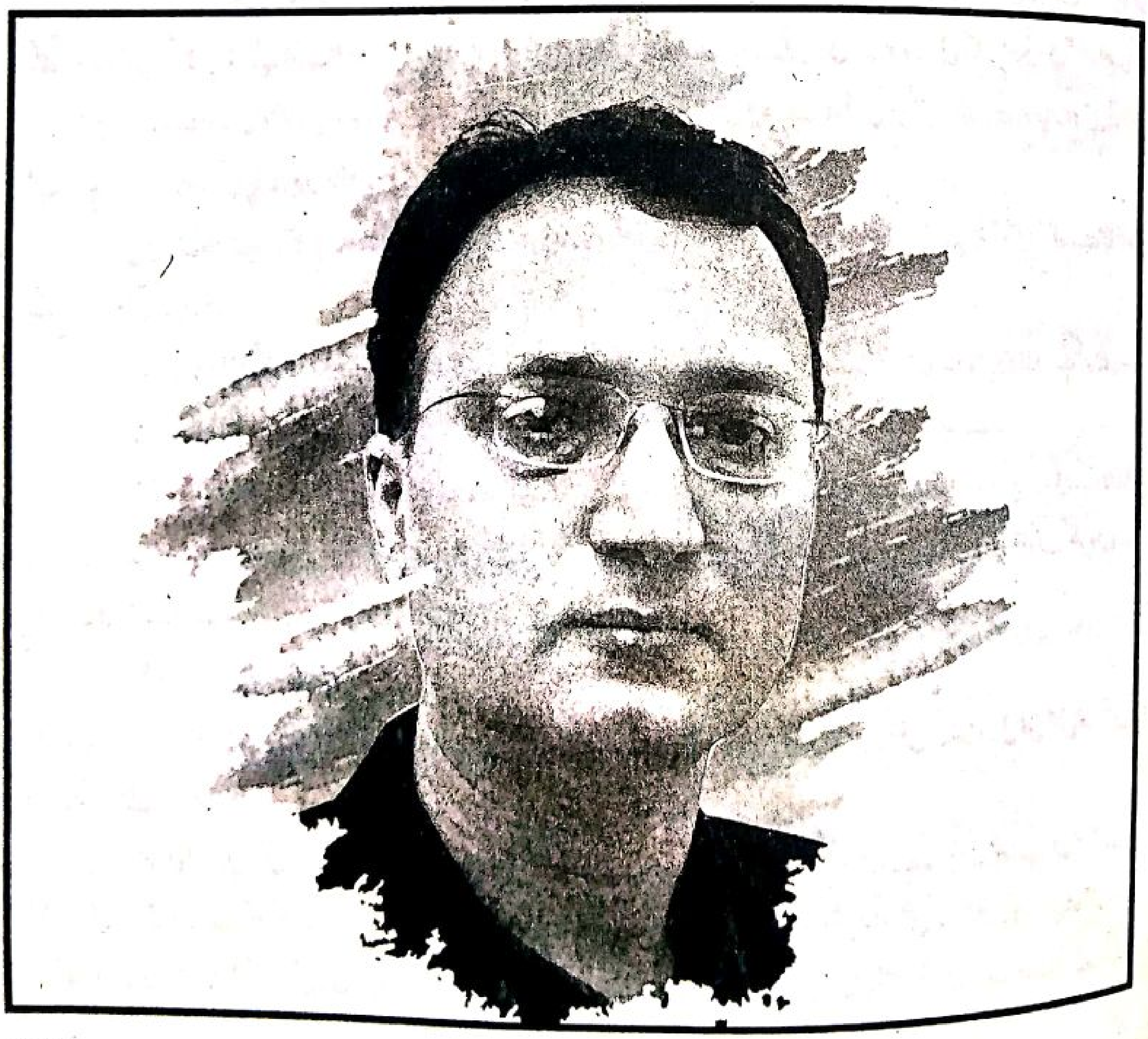

عاصم بٹ کو دیکھ کر مجھے کبھی کبھار اُس پر آنکھیں جھپکاتی، کاہلی سے ساحل پر غسلِ آفتابی کرتی سمندری سیل کا گمان ہوتا ہے۔ اُسے بڑی سے بڑی خبر سُنائی جائے تو اُس کے بے تاثر چہرے پر بے یقینی آہستہ آہستہ کچھوے کی چال چلتی چلی آتی ہے اور وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے فقط اتنا ہی پوچھتا ہے "واقعی؟" اگر کوئی مزاح کی بات سُنے تو زیرِ لب خرگوش کی طرح مسکرا دیتا ہے (گو کہ راقم نے کبھی خرگوش کو مسکراتے نہیں دیکھا، چناں چہ یہ بیان قیاس پر مبنی ہے)۔ قہقہہ آور بات پر ایک گھُٹا گھُٹا سا دھیما قہقہہ اُس کے ہونٹوں سے چھوٹ جاتا ہے اور بڑی بڑی آنکھیں مسکرا اُٹھتی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے کہا کہ اُس کی کچھ شباہت منٹو سے ملتی ہے۔ یہ سن کر وہ بڑا خوش ہوا۔ اُسے افسوس ہے کہ "بٹ" کا لاحقہ اُس کے نام کو غیر ادبی بنا دیتا ہے۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگا کہ جب کبھی کسی غیر ادبی محفل میں ذِکر ہو کہ بٹ صاحب ادب کا شوق رکھتے ہیں اور موصوف اس نازنین سے محبت میں مبتلا ہیں تو حاضرین بے یقینی سے صرف اتنا ہی کہتے ہیں "چھڈو جی، بھلا بٹ بھی ادیب ہوتے ہیں۔"

میں اُس کے اِس خیال سے جزوی طور پر متفق ہوں۔ اب اگر سعادت حسن منٹو جیسے پکے کشمیری کا نام سعادت بٹ ہوتا تو شاید اتنا منفرد نہ رہتا۔

ایک دور میں مختصر حرفی ناموں کا رواج تھا جیسے اے حمید، ن۔ م۔ راشد وغیرہ۔ اگر محمد عاصم بٹ اُس دور میں ہوتا تو اس کا نام م۔ ع۔ بٹ ہوتا بالفاظِ دیگر مع بٹ یعنی 'بٹ' کے ہم راہ۔ وہ واقعی ایک عاصم ہے جو بٹ کا لاحقہ پیٹھ پر لادے چل رہا ہے۔

اس کی ایک عادت مجھے بہت پریشان رکھتی ہے اور وہ اس کا بھلکڑپن ہے۔ بڑے سے بڑا وعدہ کر کے بھول جاتا ہے اور اپنی داخلی دُنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار مجھے اس پر دھونی رمائے برگد کے نیچے بیٹھے ایک سادھو کا گمان ہوتا ہے، سوچ کی پہنائیوں میں گم لیکن کبھی مجھے لگتا ہے کہ یہ آنکھیں بند کیے جوگ سنبھالے بیٹھا سادھو اِتنا بھی گم سُم نہیں بلکہ جب دُنیا بے خبر ہوتی ہے تو وہ اپنی ایک موٹی سی آنکھ کھول کر اِردگرد کا جائزہ لیتا ہے اور کسی کو متوجہ پا کر جلدی سے وہی آنکھ بند کر لیتا ہے۔ میری آنکھیں چند ایک بار اُس کی کھلی آنکھ سے دوچار ہوئیں تو اس میں مشاہدے اور ذہانت کی چمک یوں لشکارے مارتی تھی جیسے پہاڑی چشمے سے نہا کر نکلتی گوری کا جوبن۔

اگر اُس کا مشاہدہ اِتنا تیز نہ ہوتا تو وہ کیوں کر ایسے ادبی شاہ کار تخلیق کر لیتا، وہ عورت کا سا مشاہدہ رکھتا ہے جو آدھی آنکھ سے مخاطب کے عزائم کو جانچ لیتی ہے۔

عاصم کسی کو انکار نہیں کرتا، شاید وہ عورت ہوتا تو خاصے مسائل سے دوچار رہتا۔ دیگر احباب کہتے ہیں کہ وہ مردِ فولاد ہے مگر میرے سامنے تو وہ پس لبیک کی عملی تفسیر ہے۔ کسی بھی پروگرام پر لبیک صاد کرتا ہے، بھلے آخری لمحے میں خاموشی سے کھسک جائے۔

فولاد سے خوشونت سنگھ کا خیال آتا ہے۔ بزرگوار ایک مرتبہ جب پاکستان تشریف لائے تو لاہور کے ایئرپورٹ پر روانگی کے دوران اُن کی چیکنگ کرنے والے اہل کار کا دستی آلہ بار بار زیرِ ناف "ٹوں ٹوں" کی آواز سے چیخ اُٹھتا۔ بالآخر اہل کار نے مشکوک نظروں سے موصوف کی جانب دیکھا تو حضرت نے اپنے زیرِ ناف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"فولادی ہے فولادی۔"

اس پر اہل کار نے مسکرا کر انھیں جانے دیا۔ درحقیقت انھوں نے جو بیلٹ پہن رکھی تھی اُس کا بکل خاصا وزنی اور آہنی تھا جس کی وجہ سے آلہ بول اُٹھتا تھا۔

میری اُس کی دوستی کو دہائی بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اور ہم نے زیادہ تر وقت سڑکوں پر گزارا ہے۔ سڑک چھاپ بن کر نہیں بلکہ چہل قدمی کرتے ہوئے۔ مجھے لمبی پیدل سیر کا جنون ہے اور اسلام آباد کا سرسبز اور تازہ ماحول اس خواہش کو اور بھی جلا بخشتا ہے۔ ایسے میں اچھے دوست اور بہت اچھے سامع کی تلاش مجھے اس کی چوکھٹ تک لے جاتی ہے۔ ابتدا میں وہ سمجھا کہ ہم چند لمحے چہل قدمی کر کے لوٹ آئیں گے مگر

جب یہ تجربہ گھنٹوں پر محیط ہونے لگا تو وہ خوب صورت خواب آلود شاموں میں سیر کا وعدہ تو کر لیتا لیکن عین موقع پر غائب ہو جاتا۔ یہ اس کی وعدہ خلافی کا اظہار نہیں بلکہ طبعی شرافت اور وضع داری کی علامت ٹھیرا۔ چناں چہ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ جب وہ وعدہ کر لیتا تو میں اس کے چپڑاسی سے فون پر تصدیق کر لیتا کہ وہ دفتر بیٹھا ہے اور خاموشی سے وہاں پہنچ جاتا۔ دروازہ کھولتا تو اُسے روٹی کے ساتھ امرود کھاتے، خلاؤں میں گھورتے یا آس پاس بکھرے کاغذوں میں گم ’’رنگے ہاتھوں‘‘ پکڑ لیتا اور پھر ہم دونوں لمبی سیر پر نکل جاتے۔

سُنا ہے کہ آج کل اُس چپڑاسی کا تبادلہ کہیں اور کر دیا گیا ہے۔

ایک نکھری پاکیزہ روشن سہ پہر کو میں اور عاصم بٹ مارگلہ کی پہاڑیوں کے قدموں میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ صبح بارش ہوئی تھی، فضا شفاف تھی اور اب تک درختوں کے سبز پتوں پر نمی کے قطرے سورج کی کرنوں میں ہیروں کی طرح دمک رہے تھے کہ عاصم کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔

’’کیا آپ نے کبھی اپنی موت کے بارے میں سوچا ہے؟‘‘

مجھے گہری سوچ میں گم دیکھ کر وہ گویا ہوا۔

’’میں نے اپنی موت کے بارے میں سوچا ہے، میری خواہش ہے کہ میں لکھتے لکھتے مر جاؤں۔‘‘

جب عاصم یہ بات کہہ رہا تھا تو مجھے اس کے ہر لفظ پر اتنا ہی اعتبار تھا جتنا اپنے اوپر۔ اِس کی وجہ اُس کے الفاظ نہیں تھے بلکہ معمولات اور شخصیت تھے جسے میں کئی برس سے دیکھتا اور جانچتا آیا تھا۔

میلکم گلیڈویل ایک معروف مفکر ہے جس کی کتب کے سحر میں مَیں عرصے سے گرفتار ہوں۔ اس کی ایک کتاب "Blink" نے شہرۂ آفاق مقبولیت حاصل کی۔ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اِنسان کی تربیت یافتہ چھٹی حِس بعض اوقات لمبی چوڑی سوچ بچار اور منصوبہ بندی پر حاوی ہوتی ہے۔

اس نے کئی دل چسپ مثالیں بھی دی جن میں ایک ایسے مجسمے کا تذکرہ ہے جسے کیلی فورنیا کے مستند ماہرین اصل قرار دے کر اس کے نایاب اور بیش قیمت ہونے کی تصدیق کر چکے تھے لیکن ایک یونانی ماہر کی چھٹی حِس نے خبردار کیا کہ وہ مجسمہ جعل سازی سے تراشا گیا تھا، چناں چہ بعدازاں تحقیق نے یہ بات درست ثابت کر دی۔

اسی طرح جارج گوٹ مین نامی خانگی معاملات کے محقق کا تذکرہ ہے جو فقط ایک گھنٹا کسی شادی شدہ جوڑے کے ساتھ گزار کر فیصلہ سُنا دیتا ہے کہ آیا وہ پندرہ برس بعد اکٹھے ہوں گے یا تعلق علیحدگی پر منتج ہوگا۔ اس کے نتائج کی درستی کا تناسب 95 فی صد ہے۔ اس کتاب میں Thin slicing نامی اصطلاح بھی مذکور ہے۔

اس طرح انسانی چھٹی حِس اور قلبی تیقن کی اہمیت موجودہ دور کی معاشرت کے محققین کی جستجو میں مرکزی اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے اور میری چھٹی حِس مجھے عاصم کے ادب سے مجنونانہ لگاؤ کا کامل یقین دلا چکی ہے۔

عاصم کی ذات کا بَیل جس مدار کے گرد گھومتا ہے اس کا مرکز اور محور ادب ہے۔ یہ لگاؤ جنون کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی جنون نے عاصم سے ’’کافکا کہانیاں‘‘ سے لے کر بین الاقوامی شاہ کاروں کے ہزاروں صفحات ترجمہ کرا ڈالے، ’’دائرہ‘‘ اور ’’ناتمام‘‘ جیسے ادبی شہ پارے تخلیق کروائے اور درجنوں تہہ در تہہ افسانے تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

مجھے افسوس ہے۔ افسوس تو بہت سے معاملات پر ہے اور خود ملامتی بھی مگر زیادہ افسوس جن باتوں پر ہے اُن میں سے ایک ’’دائرہ‘‘ جیسے پُرکار و دل فریب شاہ کار کی کم پذیرائی پر ہے۔ یہ ناول عاصم سے میرے تعارف کا باعث بنا تھا۔

کئی برس اُدھر کی بات ہے، میں عاصم بٹ کے نام سے ناآشنا تھا کہ ناول اتفاقاً خرید ڈالا۔

اس ناول نے مجھ پر تحیر کے دروازے وا کر دیے۔ کیا لعل تھا جو پتھروں کے ڈھیر تلے نظروں سے اوجھل پڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے رستے اندر اُتر گیا اور دھمال ڈالنے لگا۔ میں کبھی جاگتے میں کام کرتے چونک اُٹھتا، اس کے منی ایچر کردار اپنی آوازوں اور چہروں کے ساتھ میرے سامنے میز پر کھیل کھیلنے لگتے، کبھی گاڑی چلاتے ہوئے بغیر ریڈیو، ٹیپ کے موسیقی سنائی دیتی تو اس کے امتیاز علی خاں سفید پاجامے اور کھدر کے ڈھیلے ڈھالے کُرتے میں ملبوس، ہونٹوں کو پان سے لال کیے، مختلف پتھروں کے نگینوں والی انگوٹھیاں پہنے، بیوی کی چنری اوڑھے اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ ہولے ہولے پیر تھرکاتے اور کبھی پاؤں فرش پر زور سے مار کر لرزہ طاری کرتے مست الست رقص میں گھومتے دکھائی دیے۔ تھا تھئی تھا تھئی دھا دھی دھا۔ اُن کا بوزنا میرے سر پر ناچ رہا ہوتا۔

اُس قصّے میں اندرونِ لاہور اپنی تمام تر مٹھاس، رنگینیوں اور بوالعجبیوں کے ساتھ یوں رچا ہوا تھا جیسے مٹی کے پیالے میں دھرے جلیب پر گرم دودھ۔ کردار ایسے زندہ جیسے ابھی تھاما اور کھینچ لیا، ماحول یوں حقیقی جیسے چاروں طرف کھنچے پردے پر عکس بند مناظر، اس میں قدیم حمام کے اندھیرے خانۂ غُسل کی دیواروں پر جمی میل پر کُھدے حروف کی سی فطری بے ساختگی بھی تھی اور گلی میں دوڑے چلے جاتے، گلے میں نقرئی گھنٹیوں کا ہار ڈالے بکری کے بچے کا بانکپن بھی۔

علم الابدان کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ہر انسان کے جسم کی مخصوص مہک مختلف اور منفرد ہوتی ہے، اسی بنا پر جانور انسان کو بنا دیکھے پہچان جاتے ہیں۔ عاصم کے جسم اور روح سے لاہور اور وہ بھی پرانے لاہور کی مہک آتی ہے۔ اس مہک نے ایک مدت سے اسے مسحور کر رکھا ہے۔ بھلے وہ اے حمید کا سا حساس فن کار ہو، کلچر کے روحانی عناصر جیسی معرکتہ الآرا تصنیف کا خالق الفاظ کا سامری داؤد رہبر ہو یا پھر چا چا ایف ای چودھری جیسا مرنجاں مرنج تصویر کش، سبھی اس نازنینِ دِلآرا کے عاشق ٹھہرے۔ خستہ ڈھتے اور ڈھے چکے دروازوں کے اندر مچلتا، زندگی برتتا لاہور اس کے شعور اور لاشعور میں گھس بیٹھا ہے۔ جب وہ اسلام آباد (بالکل سرکاری نام!) منتقل ہوا تو راتوں کو مکان کی چھت پر بیٹھ کر ٹکٹکی لگائے چاند کو دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ وہی چاند ہے جو لاہور میں بھی نکلا ہوگا۔ اس کی شاذ و نادر تحریر کا لوکیل پنڈی یا اسلام آباد ٹھیرتا ہے۔ جدھر دیکھو لاہور ہے۔ کلف لگے شلوار کُرتے والے لاہوری، دودھ دہی لسی کی دکانیں، رات میں لکشمی چوک کی رونق، رتن، نگار سینما، پنجابی فلمیں، نائی کی دکانیں، اندرونِ شہر کے احاطے، لارنس باغ، شالا مار باغ کی روشیں، کھٹی چٹنی والے اُبلے چنے، درختوں پر کندہ محبت نامے، رنڈیوں کے کوٹھے، دلالوں کی کوٹھیاں، مساجد کے منبر، موتیے کے ہار اور جیٹوں کے کھڑاک۔ ہر طرف لاہور یوں اُبل پڑتا ہے جیسے پتیلوں میں اُبلتا دوپٹے رنگنے والا رنگین پانی۔

جب میں نے اُس کا افسانہ ’’تین گبھرو‘‘ پڑھا تو یہ مجھے لاہور کی ثقافت کی زندہ تصویر لگا جس میں تین گبھرو لبھا دودھ دہی شاپ سے پیڑوں والی لسی پی کر موج مستی کرنے نکلتے ہیں اور سینما میں ’’شیرِ پنجاب‘‘ کی نمائشی تصویروں کو دیکھتے ہوئے، تفریحاً ایک مقامی جماعت کے جلسے میں شریک ہو کر خوب نعرے بازی کرتے ہوئے ایک مقرر کو ’’چیتا لگا اے‘‘ کہتے ہوئے موری دروازے کا رُخ کرتے ہیں۔

اس دوران ایک ویگن میں بیٹھی عورت سے نظر بازی کرتے ہوئے بالآخر براستہ ریلوے روڈ لکشمی چوک جا نکلتے ہیں اور فالودہ کھاتے ہوئے ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے ہیں اور فلم ’جٹ دا کھڑاک‘ دیکھنے سینما میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ ایک اور ماجرا ہے۔ بہ ظاہر یہ تین گبھروؤں کے ایک فارغ دن کی روداد ہے مگر میرا تجسّس مجھے مجبور کرتا رہا کہ میں دیکھوں کہ افسانہ نگار اسے کہاں آن کر ختم کرتا ہے اور جہاں عاصم اسے ختم کرتا ہے وہ اس کی مشاقی کی دلالت کرتا ہے اور انسانی فطرت کی فن کارانہ عکاسی کا ثبوت ہے۔

عاصم کے الفاظ میری سماعت پر گدگدیاں کرتے ہیں ’’’دائرہ‘‘ کا خیال مجھے ایک دم سوجھا۔ ایک رات میں لاہور کے پُر رونق رہنے والے بڑے شاپنگ سینٹر میں گیا۔ دن بھر وہاں اتنا رش ہوتا تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا اور بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے۔ رات میں وہاں سناٹا اور اندھیرا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی فلم کا ایک بہت بڑا سیٹ ہو جہاں لوگ، فن کار اور ایکسٹرا ہوں، جو رات کو گھروں کو لوٹ گئے

ہیں۔ پھر ایک خیال آیا، گویا ایک منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا جیسے وہاں یک دم روشنیاں ہو جائیں اور پس منظر کی عمارتیں پینٹنگ کی شکل اختیار کرلیں۔ اس جادو بینی نے مجھے اپنا اسیر کرلیا اور میں بے اختیار ہو گیا۔ پس کچھ حقیقت، کچھ طلسم اور کچھ ان دونوں کے بین بین عناصر میری تخلیق کے ابتدائی اجزا ٹھہرے۔"

اُس نے "دائرہ" ایسے جنون میں لکھا کہ عین تنہا نوجوانی میں گھر چھوڑ کر ایک علیحدہ کمرا لے کر اندرونِ شہر میں تنہا رہنے لگا۔ بعد ازاں جب وہ پنڈی آیا تو شہر کے وسط میں بسوں کے اڈے کے پاس ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا، جہاں نیچے سارا دن گاڑیاں ویگنیں، رکشے شور کرتے رواں دواں ہوتے اور رنگ برنگے مسافروں، راہ گیروں، گداگروں، کلرکوں، ویٹروں، سینما تماش بینوں، خریداری کرتی عورتوں اور سوداگروں کی چہل پہل کی تنجن آوازیں شہر میں انگڑائیاں لیتی اور کروٹیں بدلتی بھرپور زندگی کی عکاسی کرتیں۔ ایسے میں عاصم خستہ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں لکھنے میں مشغول ہوتا۔ وہ لکھتا رد کرتا پھاڑتا اور پھر لکھتا۔ اُس نے چھ مکمل مسودے لکھ ڈالے تو بھاپ دیتا ذائقہ دار پکوان تیار ہوا۔ خواب اور حقیقت میں گُندھا فن پارہ، خمیرِ انسان کی طرح۔

خواب، حقیقت، عدم حقیقت، وجود، عدم وجود، وقت، زمانہ اور قدرت کے اسرار انسان کو شروع سے خیال آرائی اور خامہ فرسائی کی جانب مائل کرتے آئے ہیں۔ وجود کے عدم وجود کی جانب سفر کا روح فرسا تصور انسان کے تخیل کو اِس طرح بے لگام کرتا رہا کہ وہ مختلف پناہ گاہیں تلاش کرتا رہا یا پھر گوشہ ہائے عافیت تخلیق کر کے ان میں دُبک کر بیٹھتا رہا۔ ازلی طور پر بے چین و مضطرب یہ مشتِ غبار چوں کہ تنوع کا طالب اور تحفظ کا متلاشی رہا اس لیے شعوری تشفی کے لیے راستے تو تخلیق کر لیے پر جب تحت الشعور میں ادراکِ حقیقت کا بے لگام گھوڑا بساطِ فن پر ہنہناتا بگٹٹ دوڑا تو کہیں پکاسو کے ہاں ذہنی شفاخانے میں مبہم شاہ کار مصور ہوئے تو کہیں کافکا کی دُھند آلود تحریریں بیسویں صدی کے نقار خانے میں اودھم مچانے لگیں۔

کچھ ایسا ہی واقعہ اردو کے ایوانوں میں بھی ہوا۔ جب نئے افسانہ نگاروں کی تشبیہ و علامت میں گندھی افسانوی تحریریں سامنے آئیں تو شاہ کار ٹھہریں، مستقبل کے محقق کے لیے تحقیق و تحیر کا وافر سامان لیے۔ عام قاری ان کے تحیر سے کچھ ایسا ہراساں ہوا کہ دُم دبا کر باہر کو بھاگا۔

عاصم بھی اس میدان میں دشت پیمائی کرتا ہے لیکن جلد ہی واپس لوٹ آتا ہے۔

عاصم اور اُس کے فن کو جدا کرنا ممکن نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں پیوست ہیں جیسے شبِ زناف کو دو بے قرار بدن، چوڑیوں کے ٹوٹے رنگین ٹکڑوں، گلاب کی مسلی پتیوں، عجلت میں ڈھیر کی گئی شیروانی، پائنتی سے لٹکتی انگیا اور چادر پر ذرہ ذرہ چمکتی افشاں کے بیچ ایک ہونے کی کوشش کرتے دو بدن کہ یونانی اساطیر میں مرد اور عورت ایک ہی بدن تھے جو جدائی کے بعد ہنوز یکجا ہونے کی جستجو میں ہیں۔

عاصم نے کہا تھا کہ وہ خواہش رکھتا ہے کہ اُسے لکھتے لکھتے موت آجائے تو اس پر ایک ظریف کی بات یاد آئی جس نے کہا تھا "میری خواہش ہے کہ مجھے اپنے دادا کی طرح میٹھی گہری نیند میں پرسکون موت آئے نہ کہ اُن ہم سفروں کی طرح جو حادثے سے ایک لحظہ پہلے دادا جان کی گاڑی میں چیخ و پکار کر رہے تھے جسے وہ چلاتے ہوئے سو گئے تھے۔"

عاصم یقیناً ایک جنونی ہے۔ وہ ایک سفاک جنونی ہے۔ بے تاثر اور خاموش چہرے کے پیچھے گھات لگائے آشفتہ سر۔ اُسے دیکھ کر اُس کے جنون کا اندازہ نہیں ہوتا۔

وہ لوگوں سے چھپاتا ہے لیکن اسی باقاعدگی سے سال ہا سال سے روزانہ سرِ شام لکھنے کی میز پر بیٹھتا ہے جس باقاعدگی سے جوش صاحب سرِ شام غرقِ مئے ناب ہونے سے پہلے وضو فرما کر پاک ہوا کرتے تھے۔

یہی جنون ہے جس نے اُسے مختلف اشغال پر آمادہ کیا۔ جب وہ پانچویں جماعت میں تھا تو لوہاری کی پر پیچ گلیوں کے تنگ

مکانوں میں سے ایک قدیم گھر سے منسلک دکان سے سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ چلتے چلتے کہیں سے سُن لیا کہ اگر مسلسل چلّے کاٹے جائیں تو رسول پاک کا دیدار ہوتا ہے، سو چلّے کاٹنے شروع کر دیے۔ ابھی یہ عمل جاری تھا کہ ایک رات ریڈیو پروگرام سنتے ہوئے خیال کی زد بھی تو ریڈیو مکینکی کا کورس کر ڈالا۔ ایک روز اندرونِ شہر ایک کھلے پکے احاطے میں چند نوجوان جوڈو کراٹے کی مشق کر رہے تھے۔ ان کا یکساں فوجی مہارت کا سا انداز کچھ ایسا بھایا کہ جوڈو کراٹے کا کورس کر ڈالا۔

یہ اُنھی دِنوں کی بات ہے جب وہ لوہاری کے محلّہ موہلیاں میں رہتا تھا جہاں دن بھر خوانچہ فروشوں کی صدائیں، ریڈیو پر فرمائشی پروگراموں کی بھنبھناہٹ، تنگ ہوٹلوں میں لگے ٹیپ پر گونجتے پنجابی فلمی گانے اور گھریلو عورتوں کی باتیں کرنے اور جھگڑنے کی آوازیں گلیوں کے پیچیدہ گنجلکوں میں آوارگی کرتی رہتیں۔ ایسے میں ایک آواز، بندھی آواز، سماعت میں خوش گوار مترنم سرگوشی کرتی۔ قریب میں موسیقی کا ریاض ہوا کرتا۔ شاہ عالمی میں ایک پرانی، دورِ گم گشتہ کی عمارت تھی۔ ''پری محل'' کیا نام ہیں 'شاہ عالمی' اور 'پری محل'۔ بالکل داستانوی۔ اس عمارت میں موسیقی اور کلاکاری کا دربار سجتا۔ پس اس کہن سالہ عمارت کے نیم اندھیارے میں کئی برس کلاسیکی راگ سیکھنے میں یوں بسر ہوئے کہ نوآموز و ناپختہ عاصم ایک صندوق میں بیٹھ کر کمبل اوڑھے ڈیڑھ انچ کی چپٹی پٹی منہ میں رکھ کر ریاض کرتا تاکہ اُس کی آواز باہر تک نہ جائے۔ ایسے میں اُس کا منہ اور گلا سُوج جاتے اور بدن پسینے میں شرابور ہو جاتا لیکن اُس کا جنون انگلی تھامے اُسے حصولِ شوق میں غلطاں رکھتا۔

اُس کی آواز غالباً گائکی کے لیے ناموزوں تھی اس لیے وہ اس میدان میں کام یاب نہ ہو پایا۔ یہ آواز بھی کیسا دھوکا دیتی ہے۔ ریڈیو یا فون پر خوش آواز عموماً بالمشافہ ملاقات میں مختلف ہوتے ہیں۔

قصّہ کوتاہ، مختلف جنون تھے جو اِس کا ہاتھ تھامتے رہے اور یہ اُن سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلتا رہا۔ البتہ ایک جنوں کا ایسا اسیر ہوا کہ اُس سے بیاہ رچا ڈالا ــــ حرف و حکایت کا جنون۔

ادب و کہانی کی وہ راکھ جو اُس نے سر پر بکھیری تھی آج بھی اس کے بالوں میں پُر افشاں ہے۔ یہ 1989ء کا واقعہ ہے کہ اُس نے مایہ ناز تخلیق کار شاعرہ اور مدیرہ 'ماہِ نو' کشور ناہید کو اپنا ایک افسانہ رائے اور اشاعت کے لیے بھیجا۔ 'ماہِ نو' ایک ممتاز ادبی پرچہ تھا۔ کشور نے وہ افسانہ شائع کر دیا اور مشورہ دیا کہ وہ کافکا کے اثرات سے باہر نکل کر لکھے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ عاصم تب تک کافکا کے کام سے ناواقف تھا۔ چناں چہ تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے کافکا کو پڑھنا شروع کیا اور مشق کے لیے اُس کی چند تحریریں ترجمہ کر ڈالیں۔

بعد ازاں اس کی ملاقات مظفر محمد علی جیسے جید صاحب علم سے ہوئی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ کافکا کا مکمل ترجمہ کر ڈالے۔ انھوں نے یہ مشورہ سرسری انداز میں دیا تھا لیکن عاصم نے اسے گرہ سے یوں باندھ لیا جیسے ایک دیہاتن کُرتے کے کنارے سے رقم پوٹلی کی شکل میں باندھ لیتی ہے۔ گورنمنٹ کالج سے فلسفے میں ایم اے کی ڈگری لے چکا تھا، مگر بے روزگاری کے دن تھے۔ چناں چہ روزانہ سویرے پنجاب پبلک لائبریری چلا جاتا اور شام تک کافکا کو ترجمہ کرتا رہتا۔ ایک برس بعد تراجم کا ضخیم پلندہ مظفر محمد علی صاحب کے حوالے کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ بعد ازاں یہ ترجمہ جنگ پبلی شرز کے ہاں سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اِس دوران اسے جنگ پبلی شرز کے ہاں ملازمت مل چکی تھی۔ وہاں دل جما کر کام کیا۔ ایک صبح سو کر اُٹھا تو خیال آیا کہ اگر دفتر نہ جائے تو کیسا رہے۔ سو بستر میں پڑا سوتا رہا۔ جب دو تین روز ایسے گزر گئے تو دفتر سے فون آیا کہ آ کر کم از کم تن خواہ ہی لے جائے۔ طبیعت نے گوارا نہ کیا سو وہ بھی وصول کرنے نہ گیا۔ طبیعت میں سیمابیت نے کچھ ایسا بسیرا کیا کہ پھر جم کر کوئی کام نہ کیا۔

برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں چند دہائی قبل سرمایہ دارانہ نظام کی میکانکی زندگی کے بطن سے جنم لینے والی جکڑ بندیوں کے خلاف انفرادی اور گروہی طور پر غیر منظم اور غیر مربوط تحریک چلی تھی جس نے ''ہپّی ازم'' کو جنم دیا۔ Pink Floyd کا معروف منترا "A Brick In The Wall" انفرادیت کے اوپر اجتماعیت کے غالب آ جانے کے خلاف احتجاج تھا۔ یہ پہلو عاصم کے ہاں بھی عموماً جھلک دکھا

کر لحظہ بھر کو نمایاں ہو جاتا ہے۔

اُس کا افسانہ ''چالیس سال پر محیط ایک لمحہ'' اسی نظام کی نشان دہی کرتا ہے جس میں ایک فرد نظام کی غلامی سے فرار ہو کر ایک روز دفتر نہیں جاتا اور قریبی پارک میں چلا جاتا ہے جہاں وہ ایک بچے سے خوب کھیلتا ہے۔ وہ بچہ اُس فرد کا اپنا بچپن ہوتا ہے۔ آزاد، بے فکر اور معصوم بچپن۔ یہ کہانی عاصم کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے تو اس کی بیش تر تخلیقات میں سوانحی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ کہانیاں گھڑتا ہے سُناتا ہے اور سُناتے سُناتے سو جاتا ہے۔ ایامِ رفتہ کی یاد میں سو جاتا ہے۔

جیسا کہ پیٹر ہینڈ کے نامی مفکر نے کہا تھا ''جو معاشرہ اپنے کہانی کو کھو دیتا ہے، وہ اپنے بچپن سے محروم ہو جاتا ہے۔''

عاصم اتنا دھیما اور کم گو ہے کہ اپنی کہانیوں کے پیچھے دھندلا جاتا ہے۔ یہ بات بھی اُسی نے مجھے بتائی کہ بہت سے فن کار اپنے مزاج کی کجی یا شخصیت کی سحر طرازی کے موجب زیادہ پہچانے گئے۔ بھلے وہ میرا جی کا سا پُراسرار شاعر و فلسفی ہو، منٹو جیسا بانکا، جوش جیسا منفرد شخص یا ناصر کاظمی ایسا ازلی تنہا آدمی۔ بسا اوقات ان کے تعارف پر فن سے سوا شخصیت کی چھاپ بھی نمایاں ہوئی۔

ایک شام میں اور عاصم، مستنصر حسین تارڑ صاحب جیسے منجھے ہوئے اور قدآور ادیب کے ہاں گئے اور انھیں اس کے ناول ''ناتمام'' کا مسودہ رائے کے لیے پیش کیا۔ تارڑ صاحب نے بہت محبت سے اُسے رکھ لیا۔ چند روز بعد میری تارڑ صاحب سے بات ہوئی تو کہنے لگے ''تمھارا دوست عاصم بٹ بہت باصلاحیت ہے۔ اس کے ناول نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے اسے میمونہ (بیگم) کو بھی پڑھنے کو دیا۔ اُسے میں بہت ہی خاص اور چنی ہوئی چیزیں دیتا ہوں۔ واقعی اس نے متاثر کن کام کیا ہے۔''

اس کے بعد جب انھوں نے اپنی توصیفی رائے لکھ کر دی تو خاص طور پر کہا کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں بلکہ عاصم اس کا صحیح حق دار ہے۔

یہ ناول بھی ایک قصۂ ناتمام ہے۔ یہ ایک ایسا فقیری ہار ہے جس میں رنگ برنگے منکے، خشک کھجور گٹھلیاں، موتی، فیروزی قرمزی پتھر ہیں۔ اس میں روایتی معاشرت کی تیز دھار آہنی ننگی زبان، رشتوں اور تعلق کی اُلجھی ڈوریں اور گرہیں، معاشرت کے گلتے انگور، کچرے کے انبار پر پڑے بچے کے پوتڑے، ماہ واری زدہ چیتھڑے، اور گندگی کے ڈھیر کے نیچے رینگتے مکوڑے ہیں۔ ہندی اساطیری کہانی متوازی چلتی ہے جو اس میں روایت کا رنگ گھول دیتی ہے۔ اس نے عام روایتی گھر اور بستی کی کہانی اُلو کی زبانی سنائی ہے۔ آنکھیں پھاڑے خاموشی سے دیکھتا ذہین اُلو۔ رات کا شناور۔

محبت کے حوالے سے ذکر اس کی پہلی خاموش محبت کا۔

وہ اس کے ہم سائے میں رہتی تھی۔ یہ کتابوں کا عاشق، وہ چنچل و شوخ، چوڑیوں کی شیدائی۔ پس آپس میں کچھ ایسی بن آئی کہ وہ اس سے کتابیں لے کر پڑھتی اور لوٹا دیتی۔ یہ اُسے دیکھا کرتا۔ آہستہ آہستہ محبت کا ایک کومل، لطیف اور نازک شربتی جذبہ اس کے دل میں حلاوت کرنے لگا۔ یہ میٹھا جذبہ اُس کی روح میں اس طرح گھلنے لگا جیسے شکر دودھ میں۔ عاصم ایک شرمیلا اور کم گو لڑکا تھا سو اظہارِ مدعا کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بالآخر ایک حل سمجھ میں آیا۔ قلم سنبھالا اور ایک خط لکھ کر اسے کتاب کے بیچ رکھ دیا۔ وہ آئی، اِٹھلا کر کتاب مانگی اور بانکپن سے لمبی گندھی چٹیا جھلاتی چل دی۔ چلتے چلتے اس کی نظر خط پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر رُک گئی اور دھیرے سے مڑ کر نپے تلے قدموں سے واپس چلی آئی۔ خط اسے تھمایا اور بولی کہ شاید وہ اپنا کوئی کاغذ کتاب میں بھول گیا ہے۔ اس نے خط واپس لے لیا۔ وہ اسے منتظر نظروں سے دیکھتی رہی۔ یہ بھی اُسے تک دیکھا کیا۔ بادلِ ناخواستہ یہ کہہ کر وہ خط واپس اپنی جیب میں ڈال لیا 'ہاں شاید میں اپنا کاغذ بھول گیا تھا۔' وہ مایوس لوٹ گئی۔ یہ اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

عاصم آج بھی اُس لمحے کے لوٹ آنے کا منتظر ہے۔ پر شاید اتنا بھی منتظر نہیں کہ قدرت نے اس ایک لمحے کا ازالہ اور بہت سے

لمحات سے کیا ہے۔

عاصم کی والدہ کہتی تھیں کہ اگر کوئی لڑکی عاصم کے کمرے میں بے لباس ہو کر بھی آجائے تو یہ اُس پر اچٹتی نگاہ ڈال کر دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو جائے گا۔ مائیں بھی کتنی معصوم اور خوش گمان ہوتی ہیں۔

اُس کی تسبیح روز و شب میں یقیناً ایسے کئی رنگین دانے ہیں۔

ایک روز میری اُس کی ملاقات طے تھی سو میں سہ پہر میں اُس کے دفتر چلا آیا۔ دفتری اوقات ختم ہونے کو تھے۔ ہمارا ارادہ لمبی سیر پر روانہ ہونے کا تھا۔ اُس نے چائے آرڈر کر دی۔ ابھی ادب عالیہ سے متعلقہ گفتگو ابتدائی مراحل میں تھی کہ یک دم دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک طرح دار نازنین خوش اندام اندر داخل ہوئی تو خوشبو کے لپیٹے ساتھ میں لیے آئی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور عاصم بھی چونک اُٹھا۔ وہ میرے بازو کی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ عاصم نے تعارف کروایا۔

’’میرے دوست ہیں۔‘‘

وہ مسکرائی اور بولی۔ ’’میں اُردو ادب کے ایک تھیسس پر کام کر رہی ہوں۔ عاصم کی مہربانی ہے کہ اس معاملے میں میری مدد کر دیتے ہیں۔‘‘

میں نے موضوع کا پوچھا اُس نے بتایا اور خاموش ہو گئی۔

عاصم نے سرسری طور پر پوچھا۔

’’عرفان آپ چائے تو نہیں پییں گے۔‘‘

مجھے چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی چناں چہ کچھ بولنے کو تھا کہ ایک لڑکا پیتل کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا اور ہمارے سامنے چائے کے مگ رکھ دیے۔ عاصم نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ وہ بوکھلا کر باہر چلا گیا۔

اب ہم چائے پینے لگے۔ کمرے کی خاموشی میں چائے پینے کی چسکی کی مدھم آواز شامل ہونے لگی۔

عاصم مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور سوچنے لگا کہ اسلام آباد شاموں میں کتنا دل فریب ہو جاتا ہے۔

اتنے میں عاصم کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ میں نے چہرہ موڑا تو عاصم مجھے مضطرب لگا۔ خاتون بھی کن اکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

یک دم میرے کشف کی تجلی نے صورتِ حال مجھ پر واضح کر دی اور میں حالات کی نزاکت اور علم کے ارفع مقاصد کی ترویج کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر عاصم مسکرا کر کھڑا ہوا اور گرم جوشی سے مصافحہ کر کے دروازے کی جانب چل پڑا۔ میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ باہر مجھے چھوڑتے ہوئے اُس نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

’’اچھا خاصا واک کا پروگرام تھا۔ آپ یک دم چل دیے۔‘‘

یہ سن کر میری آنکھوں میں ندامت کی نمی آ گئی اور میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

’’یار ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔‘‘

اُس نے گویا کچھ سمجھتے ہوئے میرا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔

’’آپ وعدہ خلاف ہوتے جا رہے ہیں۔‘‘

یہ سن کر میں اپنے آپ کو ملامت کرتا چلا آیا۔

جب عاصم کی شخصیت کا میں نے مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ درحقیقت انسانی نفسیات کی باریکیوں پر بھرپور نظر رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے بیش تر افسانے واقعاتی نہیں بلکہ داخلی مدوجزر کے عکاس ہیں۔ ناولوں کی البتہ بات اور ہے جن میں واقعات کی کڑیاں کچھ اس طرح نمایاں ہوجاتی ہیں جیسے پختہ عمری میں ہاتھوں کی پشت پر رگیں نمایاں ہوجاتی ہیں۔

اس کے نفسیاتی مطالعے کا خاص موضوع عورت ہے۔ وہ عورت کے اندر اُتر جاتا ہے اور اس کا وہ کردار تراش کر تحریروں میں لے آتا ہے جو حقیقت کے اس قدر نزدیک ہوتا ہے کہ اوہنری کے معروف ڈرامے ”والاسٹ لیف“ کی یاد دلاتا ہے۔ اس ڈرامے کی ہیروئن نمونیے کی بیماری کا شکار ہوکر بستر مرگ پر پڑی اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر درخت پر باقی چند ایک پتوں کو تکا کرتی ہے۔ جیسے جیسے درخت پر پتے کم ہوتے جاتے ہیں اس کی حالت بگڑتی جاتی ہے یہاں تک کہ اب درخت پر صرف ایک پتا رہ جاتا ہے۔ ہیروئن کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہ جب آخری پتا گرا تو وہ اس کی موت کا وقت ہوگا۔ اس کی ایک سہیلی اس کی نفسیاتی کیفیت سے واقف ہوتی ہے۔ وہ پریشانی میں، اپنے ہم سائے میں رہنے والے ایک ایسے ناکام مصور سے جو ایک شاہ کار تخلیق کرنے کا خواب دیکھا کرتا ہے، ہیروئن کا نفسیاتی مسئلہ بیان کرتی ہے۔ اگلی صبح وہ پتا اپنی جگہ پر ہوتا ہے۔ پھر وہ قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہیروئن تن درست ہوجاتی ہے مگر اُدھر مصور کی حالت بگڑ جاتی ہے اور وہ دم توڑ دیتا ہے۔ بالآخر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ مصور نے اس فیصلہ کن رات کی برف سردی میں ایک سیڑھی لے کر درخت کی دیوار کے اندر جھکی شاخ کے ساتھ میں ایک ایسا پتا مصور کردیا جاتا تھا جو ہو بہو اصل دکھتا تھا۔ اس مشقت کے دوران اسے ایسی ٹھنڈ لگی کہ وہ خود تو دم توڑ گیا لیکن اپنے شاہ کار کے بُوتے ایک لڑکی کو زندگی دے گیا۔ یہ بہ ظاہر سطحی کہانی اپنے دور کا شہ پارہ ٹھیری تھی۔

یہاں اس بیان کا مقصد کسی شہ پارے کا قرین حقیقت ہونا ہے۔

اگر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو شاید یہ بات کچھ وزن پائے کہ کم گو اور شرمیلا ہونے کے ناتے صنف مخالف سے روابط کی تحت الشعور میں ہمہ وقت موجود مردانہ جبلت کو مطمئن کرنے کے لیے نفسیاتی رستہ اختیار کرکے وہ بیک وقت اپنی جبلت اور فن کارانہ جستجو کی تسکین کرتا ہے۔ البتہ اپنی عام بول چال میں وہ ایسے موضوعات پر کم ہی بات کرتا ہے۔

عورت میں اس کی فن کارانہ دل چسپی کی توجیہ یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ جب وہ بچپن میں پیر بھولے شاہ میں نیو آصفہ اسکول میں پڑھتا تھا تو وہیں اس کی ہم جماعت ہیرامنڈی سے تعلق رکھنے والی دو لڑکیاں تھیں۔ ہیرامنڈی کے جوبن کے اس دور میں اپنی ایسی ہم جماعتوں کی موجودگی نے اس کے فطری تجسس کو اس حد تک ہوا دی کہ عورت اس کی نفسیات اس کی توجہ کا مرکز بن کر رہ گئی۔

عورت اور مرد اس کرے پر ہزاروں سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور آج بھی ایک دوسرے سے اتنے دُور ہیں جتنے ابتدا میں تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو جاننے کی جستجو میں رہتے ہیں اور اسی جستجو کے برگ سے تخلیق کی بے شمار کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

عاصم کو میں نے خواتین کے بیچ شرماتے ہوئے اور خاموش دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھا سامع ہے۔

ایک حکایت میں ایک شخص اپنی بیوی کے ہم راہ ایک دعوت میں شریک ہوتا ہے جہاں اُسے اپنا ایک دوست مل جاتا ہے۔ یوں تینوں ایک طرف بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسی اثنا میں اُس شخص کو چند شناسا مل جاتے ہیں سو وہ دوست اور اپنی بیوی کو باتیں کرتا چھوڑ کر وہاں سے اُٹھ آتا ہے۔

اگلے روز وہ شخص اپنے دوست کو ملتا ہے تو کہتا ہے۔ ”تم نے میری بیوی پر ایسا کیا جادو کردیا ہے کہ وہ بس کل سے تمھارے ہی گُن گائے جارہی ہے۔“

اس پر دوست حیرانی سے کہتا ہے۔

''میں تو کل کچھ بھی نہیں بولا۔ بس سارا وقت بہت توجہ اور دل چسپی سے تمھاری بیوی کی باتیں سُنتا رہا۔''

وہ نت نئے خیالات سامنے لاتا رہتا ہے۔ ایک روز مجھے کہنے لگا کہ لوگ مہاتما بدھ کو بہت محترم جانتے ہیں اور مختلف انداز میں اُن کی کہانیاں لکھی جاتی رہی ہیں، اگر کبھی اُن کی بیوی کے نقطۂ نظر سے، جسے وہ چھوڑ گئے تھے، کہانی لکھی جائے تو کیسی رہے۔ یہ اچھوتا خیال مجھے حیران کر گیا۔

ایک دل چسپ واقعہ ہے۔ وہ اتنا گم سُم آدمی ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بازار سے گھر لوٹا تو بیوی کو اپنا منتظر پایا۔ بیگم نے عاصم کا موبائل تھام رکھا تھا جس کی سکرین پر ایک نمبر دمک رہا تھا۔

یک دم عاصم کو خطرے کا احساس ہوا کہ گویا کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ اپنا موبائل گھر بھول گیا تھا۔ اب جب اس کی نظر نمبر پر پڑی تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ نمبر ایک ایسی خاتون کا تھا جس سے راہ و رسم کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا اور راہ و رسم بھی قطعی نصابی نوعیت کا۔ خیر خاتون خانہ کو تو یہ باور کرانے کے لیے کافی مشقت درکار ہوتی ہے۔

''کس کا نمبر ہے یہ؟ میں جانتی تو ہوں کیوں کہ میری ابھی بات ہوئی ہے مگر آپ کس طرح جانتے ہیں؟''

بیگم نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تو عاصم گڑبڑا گیا اور کافی دیر تک آنکھیں پٹپٹاتا بیوی کو دیکھتا رہا۔ پھر یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ ''ابھی مجھے کوئی وجہ نہیں سوجھ رہی۔ جب کچھ سمجھ میں آئے گا تو پھر بات کریں گے۔''

بیگم بے بسی سے اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔

ایک قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک شب جب عاصم رات کو تھکا ہارا گھر لوٹا تو آتے ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ جب بیوی کمرے سے جانے لگیں تو اس نے بتی بند کر کے جانے کا کہا تا کہ وہ آرام سے سو سکے۔ بیگم روشنی گُل کر کے اپنا من پسند پروگرام دیکھنے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

دو گھنٹے بعد دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئیں مبادا عاصم کے آرام میں خلل پڑے۔ دروازے کی جھری سے روشنی عاصم کے چہرے پر پڑی تو اُن پر انکشاف ہوا کہ عاصم اب تک جاگ رہا تھا۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ اب تک سوئے نہیں۔ پچھلے دو گھنٹے سے جاگ رہے تھے کیا؟''

اس پر عاصم نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اُس وقت سے پیشاب آیا ہوا ہے۔ تب سے سوچ رہا ہوں کہ ابھی کروں یا صبح اُٹھ کر کر لوں۔''

اور کروٹ بدل لی۔

بھلکڑ پن عاصم کے ساتھ یوں بندھا ہوا ہے جس طرح بھڑ کی دُم کے ساتھ دھاگا۔ بھلکڑ پن سے ذہن آئن سٹائن کی جانب چلا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آئن سٹائن کو دوپہر میں ایک دوست ایک چوراہے پر ملا اور لنچ کی دعوت دی۔

آئن سٹائن کسی گہری سوچ میں گم چلا آ رہا تھا۔ دعوت کا سن کر وہ چونک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دوست سے استفسار کیا کہ وہ کس جانب چلا آ رہا تھا۔ دوست نے ایک سڑک کی طرف اشارہ کیا تو آئن سٹائن نے یہ کہتے ہوئے لنچ سے معذرت کر لی کہ اس طرف تو اس کا اپنا گھر ہے اور چوں کہ وہ اپنے گھر کی جانب سے آ رہا ہے اس لیے وہ یقیناً لنچ کر چکا ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں عاصم سے ملنے اُس کے دفتر گیا۔ میں نے اس سے استفسار کیا کہ کیا اس نے کھانا کھا لیا ہے۔ وہ کمرے میں تنہا بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ یہ سن کر وہ چونک گیا۔ اسی دوران اس کا اردلی کمرے میں داخل ہوا تو عاصم نے اس سے پوچھا کہ کیا اس

نے لنچ کر لیا ہے۔ اس پر اردلی واپس مڑتے ہوئے ایک ایسی مانوس مسکراہٹ سے مسکرایا جو ماتحتوں ہی سے مخصوص ہوتی ہے اور تھوڑی دیر میں ایک پلیٹ میں چنوں کے ساتھ روٹی لے آیا۔

عاصم کو میں نے روزگار کے کئی سلسلوں سے منسلک دیکھا ہے۔

اُس نے کتابوں کے تراجم کیے ہیں، پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کی ہے، غیر ملکیوں کے لیے راہ نما اور مترجم کے فرائض سرانجام دیے ہیں اور اب چند برس سے اکادمی ادبیات سے وابستہ ہے۔

جب عاصم نے اکادمی میں ملازمت اختیار کی تو مجھے اُس کی افتادِ طبع کی پیش نظر خدشہ تھا کہ یہ تعلق بہت لمبا نہیں چلے گا مگر اب اُسے اس ادارے سے منسلک ہوئے خاصا عرصہ ہوگیا ہے۔

وہ ادھیڑ عمری کی جانب سفر کر رہا ہے، تلون مزاجی سے تھک چکا ہے اس لیے اب ایک کونے میں بیٹھ کر ستانا چاہتا ہے۔ وہ شعوری طور پر اپنی تھکاوٹ سے سمجھوتا کر چکا ہے، شاید اسی لیے زندگی کی رائگانی کا افسوس کرتا رہتا ہے۔ عبداللہ حسین سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا اور وہ یہ کہ تراسی سالہ ناول نگار عبداللہ حسین کو میں جب بھی ملا انھوں نے آیندہ کے منصوبوں اور کاموں کا ذکر کیا۔ گویا تب تک اُن میں اتنی تخلیقی حرارت اور زندگی کا ولولہ موجود تھا کہ وہ پیچھے کے بجائے آگے دیکھتے تھے۔

عاصم تو ابھی فقط پینتالیس سینتالیس برس کا جوان آدمی ہے۔ اُسے میں نے بورخیس، جس نے اپنا سنجیدہ کام پختہ عمری میں کیا، نوبل انعام یافتہ جوزے سارا ماگو، جنھوں نے ''بلائنڈنیس'' جیسا معروف اور اہم ناول 73 برس کی عمر میں لکھا، پاکستانی ناول نگار جمیل احمد جنھوں نے 74 برس کی عمر میں مغربی ادبی حلقوں میں اپنا واحد ناول ''داوانڈرنگ فالکن'' لکھ کر داد سمیٹی اور دیگر بے شمار بڑے ادیبوں کے حوالے دیے ہیں جس نے اپنے اہم کام خاصی عمر میں آ کر کیے تو عاصم میرے استدلال سے متفق تو ہو جاتا ہے مگر شاید مطمئن نہیں ہوتا۔ اُس کا یہ نفسیاتی مسئلہ تازہ افسانوں میں نظر آتا ہے جن میں کہانی ابہام کا شکار ہو جاتی ہے اور افسانہ غیر ضروری علامتوں سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ عاصم نے چند بہت اچھے افسانے لکھے ہیں جن میں شاید بہترین اُس کا پہلا افسانہ ''تیز بارش میں ہونے والا واقعہ'' ہے لیکن اُس کا "Forte" یعنی کمالِ فن ناول ہی ہے جہاں مشاقی اپنے جوہر دکھاتی ہے۔

اکادمی ادبیات کا تجربہ اُس کے لیے شاید بہت خوش گوار نہیں رہا۔ میرا دوست عرفان احمد عرفی کہتا ہے کہ جب تک آپ خاکے میں خامیوں یا بشری کمزوریوں کا تذکرہ نہ کریں تب تک اُس میں جان نہیں پڑتی۔ میں اُس سے اتفاق کرتے ہوئے والٹیئر کی جانب ذہن چلا جاتا ہے۔ والٹیئر جب بسترِ مرگ پر تھا تو پادری اُس کے سرہانے کھڑا ہو کر انجیلِ مقدس سے مختلف دعائیں پڑھنے لگا اور رب کی حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے تلقین کرنے لگا کہ وہ شیطانِ مردود پر لعنت بھیجے۔ جب اُس نے تواتر سے یہ تلقین کی تو والٹیئر نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔

''اے نیک پادری یہ موقع نئے دشمن بنانے کا نہیں۔''

عاصم نے اکادمی میں چند احباب کی مخالفت مول لی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اکادمی ایک فعال ادارے کے طور پر تازہ ادب کو سامنے نہیں لا رہی اور نئے ٹیلنٹ کی آب یاری نہیں کر رہی بلکہ ایک خوابیدہ سرکاری ادارہ بن چکی ہے۔ بہ تقاضائے انصاف اس رائے سے اتفاق کیے بنا بات نہیں بنتی۔ عاصم بھی اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہوا ہے۔

چند احباب کو یہ شکوہ بھی رہا کہ ایک اہم ادبی ادارے کا رکن ہونے کے ناتے عاصم نے نئے تخلیق کاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی نہیں کی۔ چند نکتہ چینیوں کو یہ گلہ بھی رہا کہ تخلیق کاروں کو دفتری اوقات و معاملات میں رعایت ملنی چاہیے، سخت ڈسپلن تخلیقی اُپج کو پابند کر کے بے ثمر کر دیتا ہے۔ میں نے گردشِ دوراں میں عاصم کے دوستوں کو شکوہ کناں نکتہ چینیوں کی صف میں کھڑے ہوتے دیکھا۔ دوست محبت اور خلوص آمیز رعایت کی توقع کرتے ہیں اور ہماری معاشرتی روایات میں یہ توقع بے جا نہیں۔ میں نے اُسے درویش منش بندے سے بہ تدریج پابندِ

قاعدہ سرکاری اہل کار میں اپنی جون بدلتے سُنا۔ گو کہ میرا اُس کا ذاتی تعلق کہنہ سال انگوری مشروب کی طرح دوآتشہ ہی ہوا ہے۔

دوستوں کے معاملے میں وہ بہت خوش نصیب نہیں نکلا۔ دوست سے منٹو صاحب یاد آتے ہیں۔ مختصر زندگی میں غالباً منٹو کی قریبی ترین دوست اُن کی اہلیہ صفیہ تھیں۔ دوستوں کی صف میں اُن کا ایک دل چسپ دوست بھی تھا۔ جب منٹو ذہنی شفا خانے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک سنجیدہ اور بردبار شخص منٹو کا معتقد اور دوست ہوا۔ اس شفا خانے کے تمام مریض اپنا کام خود کرتے تھے جس میں اپنے کپڑے دھونا اور دھوپ میں سکھانا بھی شامل تھا۔ ایک مرتبہ منٹو نے اپنے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے دھوپ میں ڈالے۔ جب اُنھیں واپس اکٹھا کرنے کا وقت آیا تو ایک زیر جامہ غائب تھا۔ منٹو اپنے اس زیر جامے کو ڈھونڈنے لگے۔ اسی اثنا میں وہ دوست منٹو صاحب کے پاس آیا اور پریشانی کی وجہ پوچھی۔ منٹو صاحب نے زیر جامے کی گم شدگی کا تذکرہ کیا۔ وہ بھی منٹو کے ہم راہ۔ تشویش آمیز سنجیدگی لیے تلاش میں مصروف ہو گیا۔ کافی وقت گزر گیا اور زیر جامہ نہ ملا۔ تھک ہار کر دونوں ایک طرف خاموش بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد دوست نے اپنا کرتا اُٹھایا اور پوچھا ''آپ کا زیر جامہ یہ تو نہیں؟'' اُس نے منٹو کا زیر جامہ پہن رکھا تھا۔

عاصم نے بہت پہلے ایک فیصلہ کیا تھا۔ جب اُس کے بھائی بہنوئی اور دیگر قریبی اعزا منفعت بخش کاروبار اور قابلِ ذکر آمدنی والی ملازمتیں اختیار کر رہے تھے تب اُس نے اپنی زندگی اردو ادب پر وارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج وہ لوگ معاشی طور پر قابل رشک حد تک متمول ہو چکے ہیں جب کہ عاصم جنگلی مور کی طرح روزانہ دانے دُنکے کی تلاش میں گھنے جنگلوں، ویران پگڈنڈیوں اور خواب ناک وادیوں کا رخ کرتا ہے۔ البتہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اُس کے ہم راہ اُس کے خوش نما اور پیارے اٹکھیلیاں کرتے بہار رنگ بچے ہیں۔ بہت سے تراجم، کئی افسانے اور تین ناول کچھ دھیمی چال چلتے اور دو تین ناچتے گاتے شوخ و چنچل مور بچے۔ وہ اُن کے جھرمٹ میں دھیرے دھیرے احتیاط سے ناچتا جا رہا ہے۔

e-mail:irfanjaved1001@gmail.com

عرفان جاوید لاہور میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور، انجینئرنگ یونی ورسٹی لاہور اور سندھ یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی تخلیقات اُردو کے مستند رسائل و جرائد ''فنون''، ''سویرا''، ''دُنیازاد''، ''معاصر''، ''نقاط''، ''سمبل'' وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں شامل خاکوں میں سے چند ''دروازے'' کے عنوان سے روزنامہ ''جنگ'' میں ایک برس تک سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''کافی ہاؤس'' اور آصف فرخی اور محمد الیاس کے افسانوں کے انتخاب مع تنقیدی تعارف ''سمندر کی چوری'' اور ''مورتیں'' شائع ہو چکے ہیں۔

اگر تذکروں کو الگ کر دیا جائے تو اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا محمد حسین آزاد سے ہوتی ہے۔ 'آبِ حیات' میں ہمارے متعدد بڑے شعرا کا تذکرہ ہے، لیکن زیادہ زور اس بات پر ہے کہ جس شاعر کے بارے میں وہ لکھ رہے ہیں اس کے عادات و خصائل، اس کی شکل و شباہت، اس کی افتادِ مزاج کو بھی اس طرح بیان کریں کہ شاعر کی شخصیت جیتی جاگتی ہمارے سامنے آ جائے۔ 'آبِ حیات' کی یہ عبارتیں محمد حسین آزاد کا شاہکار ہیں۔ اور یہ تحریریں کیا ہیں، مرصع تلواریں ہیں کہ جب بے نیام ہوتی ہیں تو صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے پردوں کو کاٹ کر اصل کو ہمارے آگے بے نقاب کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید انشا سے بے حد محبت کے باوجود محمد حسین آزاد ان کی کمزوریوں کے بیان سے نہیں جھجکتے (صرف ناسخ کے باب میں وہ ذرا شرما گئے ہیں اور انھوں نے ناسخ کی امرد پرستی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس زمانے کے لوگ شاید ایسی باتوں کو چھپانا ہی بہتر سمجھتے تھے)۔

محمد حسین آزاد کے بعد دوسرا نام میرے ذہن میں رشید احمد صدیقی کا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں جن سے وہ بہت متاثر تھے اور جن میں انھیں برائی بظاہر نظر نہ آتی تھی۔ رشید احمد صدیقی صرف انھی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں وہ ذاتی طور پر جانتے ہیں۔

عرفان جاوید کی یہ تحریریں دراصل اصطلاحی معنی میں خاکے نہیں ہیں، بلکہ مصنف کی اپنی شخصیت کی بھرپور آمیزش، صاحبِ خاکہ کے بارے میں دوسروں کے بھی تاثرات کی عکاسی کی بنا پر یہ تحریریں افسانوی رنگ رکھتی ہیں۔ یعنی یہ افسانے ہیں، لیکن سچے افسانے۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت میں کبھی اس کے اندازِ تحریر میں کھو گیا تو کبھی اس میں بیان کردہ واقعات اور حقائق کا تماشائی بن گیا۔ ایسی کتابیں کم ہوتی ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی (الٰہ آباد انڈیا)

عرفان صاحب خوب لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ یاد رہتے ہیں اپنی تہذیب کی وجہ سے اور کچھ تہذیبیں اور تمدن یاد رہ جاتی ہیں کچھ لوگوں کی وجہ سے! اس باب میں ایک پوری کی پوری تہذیب زندہ ہو جاتی ہے عرفان صاحب کے بیان سے۔ افسوس کہ وہ لوگ نہ رہے لیکن تغیر کو کون روکے۔ نہ لوگ رُکتے ہیں، نہ وقت رُکتا ہے، نہ تہذیبیں، نہ تمدن۔ تغیر لازمی ہے۔

گلزار (ممبئی، انڈیا)

حیرت ہے کہ اس کم عمری میں عرفان جاوید نے اتنا طویل تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ اپنے سے کہیں سینئر ادیبوں پر کمند پھینک کر اُن کے برابر جا کھڑے ہوئے ہیں اور اُن کے ورق ورق کو الٹ کر اُن کے کام اور اُن کی زندگی کو منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ جن ادیبوں پر انھوں نے کاوش کی ہے اُن میں سے مجھے دو میں زیادہ دل چسپی پیدا ہوئی ہے۔

اوّل، محمد عاصم بٹ، جو واقعتاً ایک بند کوزے کی مانند ہیں۔ جس طرح عرفان جاوید نے اُن کے ایک ایک پت کو چھیل کر اُن کے باطن کو ظاہر کیا ہے، ایک معرکے سے کم نہیں۔ اب ہمیشہ کے لیے جب بھی میں عاصم بٹ کا خیال کروں گا وہ ایک ادھ چھلے پیاز کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

دوم، نصیر کوی صاحب۔ ان کی روداد نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ تنگ دستی میں گزارا کرتے رہے، صلہ کچھ طلب نہ کیا، عقیدہ کسی حالت میں ترک نہ کیا، اور آخر میں گم نامی کی موت مرے۔ یہ ایک عام آدمی کے heroism کی کہانی ہے۔ میرے نزدیک نصیر کوی ایک یونانی المیے کے کردار ہیں جو نامساعد حالات کے مقابل اپنے اصول ترک کرنے سے انکار کرتے کرتے ڈھیر ہو گئے۔ ایک معمولی آدمی کو نامور لوگوں کے برابر کھڑا کر کے عرفان جاوید نے انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

عبداللہ حسین

کراچی میں شنید ہے کہ ایک سمندر ہے۔ وہی سمندر جس کے ساحل پر کھڑے ہو کر منیر نیازی نے اُس کی لہروں کی جانب ایک جام اچھال دیا تھا کہ ''کا کا تو بھی خمار میں ہو جا!'' اس سمندر میں میرے لیے تین جزیرے عافیت اور پناہ کے ہیں۔ محمد حنیف، نقوی اور عرفان جاوید...... یہ تین نہ ہوتے تو میں کب کا اس کی اجنبیت اور لاتعلقی میں ڈوب چکا ہوتا۔

عرفان ایک بھٹکی ہوئی خودسر اور بے چین روح ہے اور روحوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ بھٹک کر کہاں نکل جائیں۔ وہ افسانے کے کوچے میں تو بھٹکتا ہے ہی لیکن جب کبھی خاکہ نگاری کی گلی میں آ نکلتا ہے تو اپنی جادوگری سے ہم سب کو متحیر کر دیتا ہے۔ وہ اُس ادبی شخصیت کو صرف بیان نہیں کرتا بلکہ اُس کے رگ و پے میں حرکت کرتا اُس کا ایک حصہ ایسے بن جاتا ہے کہ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ان میں ہیر کون ہے اور رانجھا کون سا ہے۔

عرفان جاوید کے یہ خاکے کبھی خاک نہیں ہوں گے کہ ان کے اندر وہ خود گردش کرتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ

Rs. 1200.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2997-9
ISBN-13: 978-969-35-2997-5
9789693529975